جوامع السیرت ﷺ

محسنِ انسانیت ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر
برصغیر کے جید حکیم علماء کی کتابوں سے
ماخوذ جامع سیرت مبارکہ تعلیماتِ وحی
اور مقاصدِ نبوت کی روشنی میں انقلاب کے
اور سیرت النبی ﷺ کا جامع مطالعہ جس
میں امت کے لیے اعلیٰ انسانی شخصیت
کے تعمیر، تہذیب اخلاق، تعمیر ملت،
دعوت و تبلیغ کے قرآنی اصول آیات و
احادیث کی روشنی میں شرح و بسط سے
بیان کیے گئے ہیں۔



حکیم الاسلام مولانا سید محمد میاں صاحبؒ
امام الہند مولانا ابو الکلام آزادؒ
امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ

برصغیر کے تعلیمی اداروں اور محققین کے لیے حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ کی طرف سے
مرتب کردہ جامع سیرت کی کتاب

جوامعِ السیرت ﷺ

پیغمبرِ انسانیت ﷺ کی حیات طیبہ پر برصغیر کے جید حکیم علماء کی کتابوں سے ماخوذ جامع سیرت مبارکہ تعلیمات وحی اور مقاصدِ نبوت کی روشنی میں انقلاب مکہ اور سیرت النبی ﷺ کا جامع مطالعہ جس میں امت کے لیے اعلیٰ انسانی شخصیت کے تعمیر، تہذیب اخلاق، تعمیر ملّت ، دعوت و تبلیغ کے قرآنی اصول آیات و احادیث کی روشنی میں شرح وبسط سے بیان کیے گئے ہیں۔

حکیم الاسلام مولانا سید محمد میاں صاحبؒ
امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ
امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ

حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ

جوامع السیرت ﷺ

از

حکیم الاسلام مولانا سید محمد میاں صاحبؒ
امام الہند مولانا ابو الکلام آزادؒ
امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ

اشاعت اول: جنوری 2009ء
اشاعت دوم: جولاء 2009ء
اہتمام: ابو الفضل نور احمد
کمپیوٹر لے آؤٹ: ندیم احمد سولنگی
طابع: ذکی سنز پرنٹرز، کراچی
ناشر: حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ، کراچی

ہدیہ: =/300روپے
اعلیٰ ایڈیشن: =/400روپے

ایڈریس
حکمتِ قرآن اِنسٹیٹیوٹ
6سندھی، جماعت کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی، جوگی موڑ بس اسٹاپ
نیشنل ہائے وے، کراچی75030
رابطے کیلئے021-4213117
0300-2707097

Web:www.hikmatequran.org

فہرست مضامین

*

مقدمہ

مطالعہ ٔسیرت کے تقاضے

پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت پر مختلف زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر مسلم اہلِ علم کی لکھی ہوئی ان کتابوں کے مطالعے کے بعد عمومی طور پر ایک بات محسوس ہوتی ہے، وہ یہ کہ یہ کتابیں زیادہ تر تقدس کے جذبے کے تحت لکھی گئی ہیں۔ یہ طریقہ عقیدت مندانہ مطالعہ کے اعتبار سے اہم ہو سکتا ہے مگر اس طرز پر لکھی گئی کتابوں کی وہ اہمیت نہیں ہوتی جو علمی انداز سے قلمبند ہونے والی کتابوں کی ہوتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت سے دلچسپی محض حصول ثواب کی خاطر ہو تو ایسی کتابوں سے ممکن ہے یہ مقصد حاصل ہو جائے لیکن انسانیت کی ہدایت و ترقی کے لیے خیرِ امت کی ذمہ داری اس طرح کسی بھی صورت میں سرانجام نہیں دی جا سکتی۔ اس قسم کی مدحیہ تحریروں میں قاری کو صرف افتخار یا تقدیس کی غذا ملتی ہے، لیکن وہ رہنمائی نہیں ملتی جس کو قرآن میں اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب۔ ۱۲) کہا گیا ہے۔ اسی رہنمائی کے نتیجے میں مسلمانوں سے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (توبہ۔۳۳) کا وعدہ کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کی گذشتہ ایک ہزار سالہ تاریخ غلبہ ٔ اسلام کے بجائے غلامیوں اور ہزیمتوں کی ایک نہ ختم ہونے والی داستان بنی ہوئی ہے۔ اس صورتِ حال کی وجوہات کے بارے میں امت کے اکثر روشن فکر اربابِ علم اس بات پر متفق رہے ہیں کہ ایک تو قرآن حکیم کی تعلیماتِ توحید سے روگردانی کی گئی ہے اور دوسرا پیغمبر اسلام کی بعثت کے اصل مقاصد اور طریقہ ٔ نبوت سے انحراف کر کے رسمی مذہبیت اور جھوٹی تقدیس کو دین بنا دیا گیا ہے۔

سیرت کی زیادہ تر کتابیں مقاصدِ نبوت کو پیشِ نظر رکھنے کے بجائے برکت کے حصول کے جذبے سے ہی لکھی گئی ہیں۔ اس حوالے سے مولانا وحید الدین خان نے اپنی کتاب "سیرت کا مطالعہ" میں سیرت کے موضوع پر اک مشہور مصنف کی کتاب "السیرۃ النبویۃ" کا حوالہ دیا ہے جس کے مقدمے میں صاحبِ کتاب لکھتے ہیں کہ:

"مولف کو معلوم تھا کہ سیرت کے موضوع پر لکھنے والوں نے بہت سی اہم کتابیں لکھی ہیں۔ مگر مؤلف نے اس کو اپنی سعادت سمجھا کہ وہ سیرت کے عظیم موضوع پر ایک نئی کتاب لکھے اور اس طرح

وہ سیرت نگاروں کی اس نورانی لڑی میں شامل ہو جائے:

وکان یری السعادۃ فی تالیف کتاب جدید فی السیرۃ النبویۃ لینخرط فی سلک المؤلفین النورانی فی ھذا الموضوع الحبیب الجلیل۔ (صفحہ10)

ظاہر ہے کہ یہ مطالعے کا کوئی علمی طریقہ نہیں۔ اس طرزِ مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیرت کا موضوع مسلمانوں کے درمیان علمی وفکری ارتقا کا ذریعہ نہ بن سکا۔ وہ صرف عقیدت مندانہ جذبات کی تسکین یا فخر ومباہات کے اظہار کا ذریعہ بن کر رہ گیا۔

موجودہ زمانے میں سیرت کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر اسی نوعیت کی ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لیے کتابِ فخر تو ضرور ہیں، مگر وہ حقیقی معنوں میں ان کے لیے کتاب اسوہ یا کتابِ رہنمائی نہیں۔

ہمارے سیرت نگار جب سیرت کے موضوع پر لکھتے ہیں تو وہ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ بعثت سے قبل عرب کی حالت کی نہایت تاریک تصویر پیش کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ بعثت سے قبل سارا عرب تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اخلاقی اعتبار سے لوگ وحشی بنے ہوئے تھے۔ درجنوں عورتوں سے نکاح کر کے ان کو اپنے گھر میں رکھ لیا کرتے تھے۔ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی باتیں پیغمبرِ اسلام ﷺ کے کارنامے کو نمایاں کرنے کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ جب تک عربوں کو آخری حد تک برا ثابت نہ کیا جائے، پیغمبرِ اسلام ﷺ کی عظمت ظاہر نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ نہ صرف تاریخی حقائق کے خلاف ہے بلکہ خود قرآن وحدیث کے بھی خلاف ہے۔

اس طرح کی باتوں کا نقصان یہ ہے کہ مسلمانوں میں علمی نقطۂ نظر پیدا نہ ہو سکا۔ مسلمان حقیقت پسند قوم بننے کے بجائے پر اسرار خیالات میں جینے والی ایک قوم بن گئے۔ کسی بھی حقیقت کو علمی اور تاریخی حیثیت سے سمجھنا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔ ان کے اکابر تک کا یہ حال ہے کہ وہ صرف پر اسرار اصطلاحوں میں سوچنا جانتے ہیں۔ سائنٹفک اصطلاحوں میں سوچنا ان کے لیے ممکن ہی نہیں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبرِ اسلام ﷺ کو بہترین لوگوں میں پیدا کیا اس کی مزید تفصیل روایات میں آئی ہے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا پھر مجھ کو بہترین انسانوں میں اٹھایا (ان اللہ خلق الخلق فجعلنی فی خیر خلقہ)

(تفسیر ابن کثیر ۲/۳۷۱)

اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ جن عربوں کے اندر مبعوث کیے گئے وہ اخلاق وکردار کے اعتبار سے پوری دنیا میں سب سے بہتر لوگ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی لیے یہ ممکن ہوا کہ آپ ایک ایسا انقلاب لائیں جس کی نظیر تاریخ میں موجود نہیں۔ اگر عرب کے یہ لوگ ویسے ہی

برے ہوتے جیسا کہ ہماری کتابوں میں بتایا جاتا ہے تو اصحابِ رسول کی وہ اعلیٰ ٹیم ہی نہ بنتی جس کو قرآن میں خیرِ امت کہا گیا ہے (آل عمران۔۱۱۰) اور جس کی وجہ سے دینِ توحید کی عظیم تاریخ وجود میں آئی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حدیث کے ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: خیارکم فی الجاھلیة خیارکم فی الاسلام اذا فقھوا (فتح الباری ۷/۷۴۷)

اخلاق و کردار کے حوالے سے تاریخِ اسلام کا یہ واقعہ اس تمام مبالغے کو رد کرنے کے لئے کافی ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے جب ہرقل شہنشاہِ روم کو اسلام کی دعوت کا خط لکھا تو وہ خط سے متاثر ہوا اور اس نے ابوسفیان کو بلایا جو اس وقت شام میں مکہ کے ایک تجارتی کارواں کی قیادت کر رہا تھا۔ ہرقل اور ابوسفیان کے درمیان پیغمبرِ اسلام ﷺ کے متعلق جو مکالمہ ہوا وہ سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ اگرچہ اس وقت ابوسفیان پیغمبرِ اسلام ﷺ کا سخت ترین دشمن تھا لیکن یہ ان کی اخلاقی کردار کی بڑائی تھی کہ وہ اس دشمنی کے باوجود رسول اللہ ﷺ اور ان کی تحریک کے متعلق پوچھے گئے تمام سوالوں کے جوابات ٹھیک ٹھیک دے رہا تھا۔

تمدنی طور پر حقائق کو دیکھا جائے تو عربوں کے ہاں مکہ کی شہری ریاست تمام ضروری منظمات کے ساتھ موجود تھی جس میں عدالتی، فوجی اور انتظامی امور کا نظام قائم تھا، تاہم اس میں افراط و تفریط اور طبقاتی تضاد بہرحال موجود تھا جو ایک بڑی تبدیلی کا خواہاں تھا۔

مطالعۂ سیرت کے مذکورہ اسلوب نے پورے معاملے کو غیر علمی بنا دیا۔ مثلاً ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ بعثت سے پہلے عرب کے لوگ درجنوں کی تعداد میں بیویاں رکھتے تھے۔ دوسری طرف انھیں کتابوں میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ عرب اپنی لڑکیوں کو پیدا ہونے کے بعد مار ڈالتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس سماج میں لڑکیاں زندہ در گور کی جارہی ہوں وہاں عورتیں اتنی زیادہ تعداد میں کیسے پائی جائیں گی کہ لوگوں کو یہ موقع ملے کہ وہ لامحدود تعداد میں اپنے گھروں میں عورتیں رکھ لیں؟

امرِ واقعہ یہ ہے کہ زیادہ تعداد میں نکاح کرنے کا رواج صرف کچھ سرداروں میں تھا، نہ کہ عام عربوں میں۔ اور یہ سردار بھی یہ عمل اس لیے کرتے تھے کہ مختلف قبائل سے رشتہ داریاں قائم کرکے انھیں اپنی سرداری کے تحت متحد کر سکیں۔ اسی رواج کو پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی اسلام کے حق میں استعمال کیا۔ آپ نے بھی مختلف قبائل کی خواتین کو اپنے نکاح میں لیا تاکہ ان قبائل کو جنگ کے بغیر اسلام کا حامی بنا سکیں۔

جہاں تک لڑکیوں کو زندہ در گور کرنے کا معاملہ ہے تو وہ صرف استثنائی طور پر بعض غریب قبائل میں تھا۔ عام عرب اس کو سخت معیوب سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ غریب خاندانوں کی مالی مدد کرتے تھے تاکہ وہ اس وحشیانہ رسم سے باز رہیں۔ ایک ہی صحابی کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ قبل

از اسلام اپنی بیٹی زندہ در گور کرنے پر، بہت درد اور کرب میں مبتلا رہتا تھا اور تادمِ مرگ اس درد میں روتا رہا۔

علمی مطالعے کے بجائے عقیدت مندانہ مطالعے سے یہ نقصان ہوا کہ ہمارے سیرت نگار بہت سی ایسی حقیقتوں کو دریافت نہ کرسکے جو قرآن میں صراحتہً مذکور تھیں۔ ان میں سے ایک معجزہ نبی کا مسئلہ ہے۔ ہمارے سیرت نگار عام طور پر کثرت سے پیغمبرِ اسلام ﷺ کے معجزات کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر یہ پورا تصور قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کو اس قسم کے معجزے نہیں دیے گئے جو پچھلے پیغمبروں کو دیے گئے تھے۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ سے آپ کے مخالفین یہ مطالبہ کرتے تھے کہ اگر تم پیغمبر ہو تو دوسرے نبیوں جیسا حسی معجزہ ہمیں دکھاؤ۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ لوگوں کی ہدایت کی امید میں یہ چاہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا کوئی معجزہ ظاہر کیا جائے۔ مگر قرآن میں آپ کی اس خواہش کو رد کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا: "اور اگر ان کی بے رخی تم پر گراں گزر رہی ہے تو اگر تم ایسا کرسکتے ہو تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے لیے کوئی نشانی (معجزہ) لے آؤ۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ پس تم نادانوں میں سے نہ بنو۔" (الانعام۔۳۵)

دوسری جگہ قرآن میں اس مستقل پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے کہ پچھلے پیغمبروں کے برعکس، پیغمبرِ آخر الزماں کو حسی معجزے نہیں دیے جائیں گے۔ قرآن کی درجِ ذیل آیت اس حوالے سے حتمی بیان کا درجہ رکھتی ہے:

وَمَا مَنَعَنَآ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ کَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ‌ؕ وَاٰتَیۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَةَ مُبۡصِرَةً فَظَلَمُوۡا بِهَا‌ؕ وَمَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّا تَخۡوِیۡفًا ﴿۵۹﴾ (بنی اسرائیل ۵۹)

"اور ہم کو نشانیاں (معجزے) بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا۔ اور ہم نے ثمود کو اونٹنی دی ان کو سمجھانے کے لیے۔ پھر انھوں نے اس پر ظلم کیا۔ اور نشانیاں ہم صرف ڈرانے کے لیے بھیجتے ہیں۔"

ہمارے ہاں جو غیر علمی رویہ اختیار کیا گیا اس کے پس منظر میں غالباً یہ نفسیاتی رویہ کار فرما رہا ہے کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کو حسی معجزے نہیں دیے گئے تو وہ پچھلے انبیاء کے مقابلہ میں کچھ کم ہو جائیں گے۔ اس لیے غیر واقعی طور پر انھوں نے آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ بہت سے معجزے وابستہ کر دیے۔ حالانکہ قرآن میں صراحتہً اس کی تردید موجود تھی۔

خود حدیث میں بھی اس کی صراحت موجود ہے کہ آپ کو اس قسم کے معجزے نہیں دیے گئے جس طرح کے معجزے پچھلے نبیوں کو دیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں صحیح بخاری کی یہ حدیث قول فیصل

کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "نبیوں میں سے ہر نبی کو ایسی نشانی دی گئی جس کو اس زمانے کے لوگ مانتے تھے۔ اور مجھ کو وحی (قرآن) کا معجزہ دیا گیا۔ اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ قیامت میں مجھ پر ایمان لانے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔"

مامن الانبیاء نبی الا اعطی من الایات ما مثله امن علیه البشر و انما کان الذی اوتیته وحیا اوحاه الله الی فارجوان اکون اکثرهم تابعا یوم القیامة (فتح الباری ۸/۶۱۹)

اصل یہ ہے کہ جن واقعات کو پیغمبرِ اسلام ﷺ کے معجزات کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ وہ سب نصرت کے واقعات ہیں جو ہر مومن کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اور وہ پیغمبر اسلام کو زیادہ اعلیٰ اور افضل صورت میں دیے گئے۔ معجزہ ایک ایسے خارقِ عادت واقعہ کا نام ہے جو مخاطبین کے مطالبے پر پیش کیا گیا ہو۔ مثلاً عصاء موسیٰ کا معجزہ۔ مگر اس نوعیت کا کوئی معجزاتی واقعہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی زندگی میں ثابت نہیں۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت کو سمجھنے میں دوسری بڑی رکاوٹ محسنِ انسانیت ﷺ کو ایک ایسے مذہبی رہنما کا درجہ دینا بھی ہے جس کے مطابق حضور ﷺ بس چند اعتقادات، چند رسوم و عبادات، چند اوراد و وظائف، چند اخلاقی سفارشیں اور چند فقہی احکام پہنچانے آئے تھے اور آپ کا منشا ایسے افراد پیدا کرنا تھا جو شخصی طور پر معاشرے کی عام خامیوں اور گندگیوں سے مبرّا ہوں اور ایسے لوگ طہارت، نماز، روزہ، نوافل و اذکار کے پابند ہوں۔ علاوہ ازیں یہ لوگ انفرادی اخلاقی حد تک اپنے اندر سنتِ رسول ﷺ پر قائم رہنے والے ہوں۔ سنت کے اسی محدود اتباع کے نتیجے میں خیرِ امت کے طور پر انسانیت کے لیے وہ تحریک اور اس کی سرگرمی پیدا ہی نہیں ہوسکی جو دنیا کے عظیم عملی انسان کے پیروکاروں کا وتیرہ ہونا چاہیے۔

اسی طرح پیغمبرِ اسلام ﷺ انسانیت کی ہدایت و نجات کیلئے جس طرح سرگرداں اور سرگرم رہتے تھے تا آنکہ جبرئیل آکر کہتا تھا کہ "اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالو گے کیا؟ آپ ﷺ نے اس طرح خود کو اپنے مقصد کی تکمیل میں مصروف کرلیا تھا اور وہ استغنا اختیار کیا کہ تین تین دن تک گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ یہ ساری باتیں ہمارے لیے اتباعِ سنت کا مواد نہیں ہیں۔ ان کی جگہ پر مخصوص لباس جس میں مسواک کی جیب بھی لازمی لگی ہوئی ہو ہمارے لیے سنت کے اتباع کا بہت بڑا منہاج بن گیا ہے!

سیرتِ نبوی ﷺ کو سمجھنے میں تیسرا اہم پہلو قرآن کی فکری تعلیم کو نظر انداز کرنا ہے۔ قرآن کی اس بنیادی تعلیم کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے کہ اسلام معاشرے کی طبقاتی نہج کو تبدیل کرکے توحیدی معاشرہ قائم کرنے والی انقلابی تحریک تھی، اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اس تحریک کو ایسی بنیادوں پر ایسا استحکام عطا کیا کہ معاشرے کی طبقاتی نہج آئندہ کی تمام انسانیت کیلئے مذموم قرار پائی۔

انسانوں کی اجتماعی زندگی، تمدن اور معاشرے کی ایسی تشکیل جس میں تمام انسانی غلامیوں کا خاتمہ، نیکی، عدل و انصاف، اور تمام انسانوں کو رزق کے وسائل مہیا کرنا انسانوں کی مشترکہ ذمہ داری ہو، یہ تمام کام نبوت کے مقاصد سے خارج کر دیے گئے ہیں۔ بنیادی انسانی حقوق، امن و آشتی اور سماجی انصاف کے ذریعے افراد کے انسانی جوہر کی ترقی اور کامرانی کے ذرائع جن سے انسانیت حَسَنَةً فِي الدُّنْيَا کے ذریعہ حَسَنَةً فِي الْاٰخِرَةِ (بقرہ۔۲۰۱) سے بھی بہریاب ہوسکے آج ہمارے ہاں دین کے کام کا حصہ نہیں رہے اور صرف سیکولر لوگوں کے کرنے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں۔

قرآن میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی ذات اور مشن کو نہایت پر عظمت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ (الانبیاء۱۰۷)

یعنی "ہم نے تم کو سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ اپنے مشن کے ذریعے ایک ایسا کارنامہ انجام دیں گے جو دنیا کے تمام انسانوں کے لیے رحمت کا سبب بن جائے۔ لیکن سیرت نگاروں نے سیرت کے حوالہ سے اس رحمت کو بھی پیغمبرِ ﷺ کے قائم کردہ نظام کے بجائے ان کے معجزات میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے مشن کے بارے میں قرآن حکیم نے صاف کہا ہے کہ:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾ (آل عمران۔۱۶۴)

"بلاشبہ یہ اللہ کا مومنوں پر بڑا ہی احسان تھا کہ اس نے ایک رسول ان میں بھیج دیا جو انھیں میں سے ہے۔ وہ اللہ کی آیتیں سناتا ہے، ہر طرح کی برائیوں سے پاک کرتا ہے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے (اس نے ہدایت کی راہ ان پر کھول دی) حالانکہ اس سے پہلے گمراہی میں مبتلا تھے۔"

تعلیماتِ قرآن کے ذریعے انسان کی سربلندی، انسان کا تزکیہ و شخصی ارتقا اور حکمت کے ذریعے تعمیر و تسخیرِ کائنات نبوت کے مقاصد قرار دیے گئے۔ پھر ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک برتر نظام کے ساتھ جماعت کی تشکیل / پارٹی ڈسپلن اور اس کی خوبیاں قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمائیں:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ (الفتح۔۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔"

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَي الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

(التوبہ۳۳)

''اسی نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت او دینِ حق کے ساتھ تاکہ اس کو سارے دین پر غالب کردے خواہ یہ مشرکین کو کتناہی ناگوار ہو۔''

قرآن کی ان آیتوں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی بعثت کوئی سادہ بات نہ تھی۔ وہ ایک عظیم انقلابی منصوبہ تھا۔ آپ کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کو ایک عظیم واقعہ ظہور میں لانا تھا، ایک ایسا واقعہ جو پوری انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دے۔ لیکن سیرت کی عام کتابیں پیغمبر کے اس عظیم کارنامے کی تصویر نظر نہیں آتیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے خدا کے ایک جلیل القدر پیغمبر اور ایک عظیم رہنما کی حیثیت میں اپنے دور کی تمام انسانی غلامیوں کا خاتمہ کرکے، توحید کی بنیاد پر ایک نئے عالمی نظام کو ایک منظم جماعت کی تشکیل سے نہ صرف جزیرۃ العرب میں غالب کیا بلکہ اس وقت کی دو بڑی غاصب سلطنتوں قیصر و کسریٰ کے نظامِ استبداد کی ہلاکت کی بنیادیں ڈال دیں۔ اس کے بعد انسانی حقوق، آزادی، جمہوریت، مساوات اور انسانی اور فلاح و سعادت کا ایسا دور شروع ہوا جس سے پوری انسانیت پیغمبر اسلام ﷺ کی رحمۃ للعالمینی سے فیضیاب ہوتی رہی۔ اب یہ فلاح و سعادت صرف انسانوں کی اس زمینی حیات سے تعلق نہیں رکھتی تھی بلکہ اسی زمینی حیات کے افعال و اعمال پر معاد (آخرت) اور مستقل حیات کی فلاح و سعادت منحصر ہوئی۔ اور اسی سے امر خیر اور حسنِ عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی دائمی سعادت کی زندگی بھی انسانوں پر آشکار ہوئی۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ کی اسی سیرتِ طیبہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لیے زندگی کا بہتر نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ ختمِ نبوت کے بعد لیظہرہ علی الدین کلہ کی ذمہ داری اب خیرِ امت پر ہے جو اسی اسوۂ حسنہ پر مذکورہ ذمہ داری کو سرانجام دے گی۔ اگر یہ امت انھی مقاصد اور منشائے خداوندی کے تحت یہ کام سرانجام نہیں دے گی تو طرح طرح کے امراضِ قلوب ان کی زندگی کو مستقل روگ بنادیں گے۔ ہم مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ تاریخ اس قسم کے روگ اور دکھوں سے بھری پڑی ہے۔ ہم نے ان امراض کی مسیحائی فضائل میں بھی تلاش کی ہے، اور اوراد و وظائف میں بھی، صلوٰۃ و سلام سے بھی مداوا چاہا ہے اور ختمِ بخاری سے بھی۔ زندگیوں کو پارسائی کے مخصوص قالب دینے کی کوششیں بھی کی ہیں اور اپنی پسند کی فرمانبرداریوں کے جالے بھی بنے ہیں۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود ہمارے فرمانبرداری کے معیار ہماری سمت کو درست نہیں کرسکے ہیں۔ یہ سب کوششیں ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ کی جماعت کا وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ (الفتح۔۲۹) نہیں بنا سکی ہیں۔ اسوۂ حسنہ کے مطابق اس عملِ صالح کی توفیق نہیں دے سکیں جو ہماری مغفرت اور اجرِ عظیم یعنی ہماری نجات اور کامرانی کا باعث بن سکے۔

ہماری نجات اور کامرانی کا صرف یہی حل ہے کہ ہم قرآن کو مطلوب اسوۂ حسنہ کے مطابق زندگی جییں یہ وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ہماری انفرادی اور ملی زندگی کے راستے ہم پر آسان

ہو جائیں گے۔ سچ کہا ہے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے کہ:

"اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجۃ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحب قرآن کی سیرت ہے۔ اور جب تک دنیا باقی ہے صاحبِ قرآن کی سیرت وحیاتِ مقدس کے مطالعے سے بڑھ کر نوعِ انسانی کے تمام امراض وعللِ ارواح کا اور کوئی علاج نہیں۔" (رسولِ رحمت ص ۱۳)

قرآن حکیم کی بتائی ہوئی پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت کے تین مرکزی نکات مثالی کردار، عظیم پیغام اور جہد واستقامت اس طرح تکوں بنے ہوئے ہیں کہ اس کا ہر کونہ اپنی بستگی کو ضیا پاشی عطا کر رہا ہے۔ ان تینوں کونوں سے ہی اسلامی انقلاب کی عظیم تشکیل کا رنگ ساری انسانیت نے دیکھا۔ اس لیے سیرت کے مطالعے میں ان تینوں عنوانات کو سمجھنے کی بے حد ضرورت ہے۔

مثالی کردار

داؤد بن حصین کا بیان ہے کہ عرب کے لوگ عام طور پر یہ کہتے سنے جاتے تھے کہ محمد بن عبد اللہ ﷺ اس شان سے جوان ہوئے کہ آپ اپنی قوم میں سب سے زیادہ با اخلاق، پڑوسیوں کی خبر گیری کرنے والے، حلیم وبردبار، صادق وامین، جھگڑے سے دور رہنے والے، فحش گوئی اور دشنام طرازی سے پرہیز کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کی قوم نے آپ کا نام "الامین" رکھا تھا۔ (خصائص کبری جلد ا ص۹۱)

شباب کی عمر کو پہنچے تو مکہ میں آنے والے مسافروں کی خبر گیری، مساکین کی امداد اور مظلوموں کی مدد کو اپنا شعار بنالیا۔ نوجوانوں کا ایک گروپ تشکیل دیا جو یہ کام مشنری اسپرٹ سے کرتے رہے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حکم بن حزام اس گروپ میں ساتھ تھے۔ فجار کی لڑائی کی وجہ سے سیکڑوں گھرانے برباد ہوئے اور ہر سُو انار کی پھیلی ہوئی تھی۔ اس صورتِ حال سے تنگ آکر کچھ خیر پسندوں نے اصلاح کی ایک تحریک شروع کی، آنحضرت ﷺ کے ایک چچا زبیر ابن عبد المطلب کے تحرک پر عربوں کا ایک کنونشن "حلف الفضول" کے نام سے منعقد ہوا۔ نوجوانوں کی طرف سے حضرت محمد ﷺ نے اس میں بھرپور کردار ادا کیا۔ چنانچہ یہ معاہدہ ہوا کہ ہم:

(۱) ملک سے بدامنی دور کریں گے

(۲) مسافروں کی حفاظت کیا کریں گے

(۳) غریبوں کی امداد کریں گے

(۴) مظلوم کی حمایت کریں گے

(۵) کسی ظالم کو مکہ میں نہ رہنے دیں گے۔

متشدد قبائلی عصبیت کے سماج میں غریبوں کے معاشی استحکام کی منصوبہ بندی اور ہر مظلوم کی حمایت کا عہد خواہ مظلوم کوئی بھی ہو۔ یہ ایک غیر معمولی تحریک اصلاح اور نظام کی تبدیلی کی جستجو تھی۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ اس معاہدے میں سرگرم شرکت پر ہمیشہ فخر کرتے رہے۔ اگرچہ عربوں کی انتقامی اور عصبی جاہلیت نے بعد میں اس معاہدے کو کالعدم قرار دے دیا جب خود حضور ﷺ کی مخالفت میں ظالم و مظلوم کا امتیاز بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ لیکن پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اسلامی فکر سے عالمِ انسانیت کو جو مستقل اقدار عطا کیں اس سے ان قدروں کو انسانیت کے لیے دائمی ورثے کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

آنحضرت ﷺ ذریعۂ معاش کے لئے قریش کے تجارتی سلسلہ میں شامل ہوگئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کے حسنِ معاملہ اور دیانتداری کے ہر طرف چرچے ہونے لگے جس کی وجہ سے ہر شخص چاہتا تھا کہ اپنے کاروبار میں حضور ﷺ کو بھی شریک کرے۔ آپ کی شخصی دیانتداری اور حسنِ معاملہ کا وہ اعلیٰ معیار تھا جس کی بنا پر قوم نے متفقہ طور پر آپ ﷺ کو "امین" کا لقب دے دیا۔ قبل از نبوت روزانہ کی عام زندگی میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کے جو معمولات تھے اس میں اپنے گرد موجود سماج کی اصلاح کے لیے تفکر اور عملی کوششوں کی روداد پر تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں تمام تفصیل کے ساتھ واقعات مذکور نہیں ہیں۔ شاید قبل از نبوت کی پیغمبر اسلام کی بھرپور سماجی زندگی کو نبوت سے علاحدہ دنیوی کاموں میں شمار کر کے ان کو سیرت کی کتابوں کا حصہ بنانا ضروری نہ سمجھا گیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود سیرت کی کتابوں میں جمع شدہ واقعات کا بغور مطالعہ کرنے سے پیغمبرِ اسلام ﷺ کی اس متحرک سماجی زندگی کا بھی ایک واضح عکس ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

مثلاً پہلی وحی کی آمد کے بعد پیغمبرِ اسلام ﷺ جب اضطراب کی حالت میں گھر پر تشریف لائے تو بی بی خدیجۃ الکبریٰ نے اطمینان دلاتے ہوئے جن الفاظ میں شہادت دی تھی، تاریخ نے ان الفاظ کو سیرت کے کئی پہلوؤں کا مینار بنا دیا ہے۔ بی بی خدیجۃ الکبریٰ کی شہادت ان الفاظ میں تھی:

"اللہ کی قسم! آپ کو اللہ تعالیٰ کبھی بے مدد نہیں چھوڑے گا۔ آپ صلۂ رحمی کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، ناتوانوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور جائز ضرورتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔" (الرحیق المختوم ص۹۹)

بی بی خدیجۃ الکبریٰ کی پندرہ سالہ رفاقت کی یہ شہادت پیغمبرِ اسلام ﷺ کی قبل از نبوت سماجی زندگی کا جامع اور بھرپور تعارف ہے۔ آپ ﷺ اپنے سماج کو بدلنے، انسانی غلامیوں سے نجات دلا کر ان کو ایک اللہ کی عبدیت میں لانے کے لیے ایک طرف غار حرا کی تنہائیوں میں غور و فکر کر رہے ہیں اور دوسری طرف سماج میں اپنے ایک مؤثر عملی انسان دوست کردار سے سماج کی تبدیلی کے کام کا آغاز کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ یہی وہ عملی کردار تھا جس کو لیکر پیغمبر اسلام ﷺ صفا کی پہاڑی پر

کھڑے ہو کر مکہ کی آبادی کے لوگوں کے درمیان پیش کرتے ہیں کہ (میری چالیس سالہ زندگی کے کردار کی روشنی میں) بتاؤ۔ اگر میں یہ خبر دوں کہ پہاڑی کے پیچھے اک لشکر تمہاری تباہی کے لیے کھڑا ہے تو کیا تم مجھے سچا مانو گے؟ اس وقت تمام موجود لوگوں نے بیک آواز کہا تھا کہ "ہاں! تم امین و صادق ہو ہم تمھاری بات سچ مانیں گے۔" پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اس وقت دعوت الی اللہ کے لیے کسی معجزے کے بجائے اپنے کردار کو پیش کیا، حالانکہ صاحب نبوت کی حیثیت سے وہ کوئی بھی خرقِ عادت واقعہ رونما کر کے اپنی صداقت کا یقین و اعتقاد حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن چونکہ آپ ﷺ ایک نئے دور کو جنم دینے والے تھے جس میں کردار و عمل کی اصل اہمیت ہو گی، اس لیے اپنے اسی کمال معجزہ کے ساتھ صفا کی پہاڑی پر اعتماد کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور اپنے تمام دعوتی متبعین کے لیے یہ مثال قائم کر دی کہ آنے والے دور میں انسانوں کے درمیان معجزوں اور کرامات کی بنیاد پر نہیں جانا ہو گا بلکہ انقلاب اور تبدیلی کے لیے وہی اشخاص انسانوں کے درمیان جا سکیں گے جن کے پاس عمل اور کردار کی ٹھوس بنیادیں ہوں گی۔ اور یہی عمل اور کردار ان کی کامرانیوں کا پیش خیمہ بنے گا۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ کے اسی کردار کا قرآن مجید بھی اس طرح ساکھی بنا کہ نبوت ملنے کے بعد جب ہر طرف سے مخالفت کا ہجوم اُمڈ آیا، تو لوگ آتے اور آپ کے دعویٰ کا ثبوت طلب کرتے تو حضور ﷺ فرماتے کہ میں کہیں باہر سے نہیں آیا۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٦﴾ (یونس۔۱۶)

"میں اس سے پہلے تمہارے درمیان ایک عمر بسر کر چکا ہوں، پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟"

میں نے تمہارے درمیان اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا میری زندگی میری صداقت کی زندہ شہادت نہیں؟ کیا تم میری اس چالیس سالہ زندگی میں جس کا ایک ایک لمحہ تمھارے درمیان بسر ہوا ہے کوئی ایک واقعہ بھی ایسا پیش کر سکتے ہو جس سے میری صداقت کے متعلق ذرا سا شبہ گزرے؟ یہ چیلنج پوری قوم کو دیا گیا اور اس کے خلاف کسی نے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ کسی کے آئینہ صفت ہونے کی اس سے بڑھ کر شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ دشمنوں کے ہجوم میں خود بسر کی گئی زندگی کو اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کیا جائے اور اس کے سامنے سب کی نگاہیں جھک جائیں۔

عظیم پیغام

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے کسی اعتقاد، کسی نظریے اور کسی نقشۂ فکر کے بغیر اصلاح و تعمیر کا کام یونہی شروع نہیں کر دیا۔ محض ایک مبہم جذبہ نہیں تھا، کوئی ذاتی ولولۂ خام نہ تھا، بلکہ حضور ﷺ کون و مکان کی عظیم ترین سچائی کی مشعل لے کر اٹھے تھے۔ انتہائی حساس قلب کے ساتھ برسوں حضور ﷺ نے

زندگی کے رمز و معنی کو پانے کی جستجو کی تھی، غارِ حرا کی خلوتوں میں مدتوں اپنے اندرون کا بھی مطالعہ کیا اور بیرونی عالم پر بھی غور کیا۔ تمدن کے صلاح و فساد کے اصولوں کو سمجھنے میں بھی دماغ کھپایا، لیکن عملی اقدام اس وقت تک نہیں کیا جب تک علمِ الٰہی نے آپ کے قلب کو حقیقت سے منور نہیں کر دیا اور سب سے بڑی سچائی پوری طرح آپ کے سامنے بے نقاب نہیں ہو گئی۔ سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ کائنات کا ایک مالک ہے اور انسان اس کا بندہ ہے۔ یہ توحید کا مژدہ ایک نئے نظام کی بنیاد تھی۔ انسانی آزادیوں کا ایک ایسا اعلان کہ مکہ کے سردار، رئیس، دولتمند اور مذہبی پروہت اس اعلان سے بدک گئے۔ مکہ کے یہ طبقات تمام انسانوں کو ہر قسم کی غلامیوں سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی اور غلامی میں لانے کے اس اعلان سے مشتعل ہو گئے۔ انھوں نے الوہیت کے حقوق خدائے واحد سے الگ کر کے اپنے درمیان بانٹ رکھے تھے۔ انسان کا اپنا نفس اور اس کی خواہشیں، خاندان اور برادری کی رسمیں، نسلی، قومی اور قبیلائی روایات، جاگیردار اور برہمن طبقوں کی بالادستی، شاہی خاندانوں اور درباری اشرافیہ کی کبر پسندی (جس کو قرآن نے مُسْتَكْبِرِيْنَ (المؤمنون۔٦٧) کا نام دیا ہے)۔ یہ مختلف طبق بر طبق الوہیتیں تھیں جن کے نیچے عام آدمی پس رہا تھا۔ عام لوگ غلامانہ انداز سے ان طبقات کی اناؤں، مفادات، اور خواہشات کی تکمیل کے لیے کولھو کے بیل کی طرح کی زندگی جیتے رہے تھے۔

توحید ان تمام مروجہ الوہیتوں کے انکار کا پیغام تھا جو غلامی کی ان تمام بنیادوں کو جڑ سے اکھاڑ کر صرف اللہ تعالیٰ کی عبدیت کی نئی عمارت کھڑی کر رہا تھا۔

اہلِ مکہ توحید کے پیغام میں مضمر انسانی آزادیوں، حریت اور مساوات کی اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے اس لیے وہ صفا کی پہاڑی پر یہ پیغام سنتے ہی سیخ پا ہو گئے۔ اگر یہ پیغام محض چند عقائد و عبادات کے طریقہ کار پر مشتمل ہوتا یا انفرادی زندگی کے کچھ اصلاحی و اخلاقی طریقوں کا مجموعہ ہوتا تو اس پر اہلِ مکہ یہ ردِ عمل ظاہر نہ کرتے۔ کیونکہ ان کی اکثریت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مورثِ اعلیٰ مانتی تھی۔ نماز، روزہ اور عبادت کا ایک سسٹم بھی ان کے ہاں موجود تھا اور عبادات کے اس سسٹم کی اصلاح ان کو اس انتہائی ردِ عمل تک نہیں لے جاتی کہ وہ مکہ کے ایک بااثر خاندان کے بے حد نیکوکار شخص کے قتل پر بھی آمادہ ہو گئے۔ اصل میں توحید کا پیغام توہمات اور غلامیوں اور طبقاتی تضاد کے پورے سماج کی تبدیلی کا پیام تھا اور اس کے لیے ان کا ردِ عمل بھی اس کے مطابق تھا۔

جب مُسْتَكْبِرِيْنَ اور مُتْرَفِيْنَ (غاصب و آمر رؤسا اور دولتمند) طبقوں کی اقلیت احبار و رہبان یعنی مذہبی پیشہ ور طبقوں کے تعاون سے مُسْتَضْعَفِيْنَ یعنی کمزور اکثریت پر اپنے خدائی اختیار کی حد تک غاصب بنی ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ کی مشیت نے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اسی طرح اس سماج کو بدلنے کا ارادہ فرمایا جس طرح نمرود و فرعون اور قارون کے استبداد و غلامی سے انسانوں کی آزادی کا حضرت

ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے نجات اور ہدایت کا بندوبست فرمایا تھا۔ قرآن میں پیغمبروں کے تاریخی پس منظر سے واضح ہو جاتا ہے کہ نبوت اور انبیا کی بعثت کا مقصد دراصل غلام اور آقا پر مشتمل معاشرے کی ہیئت ترکیبی کو بدلنا تھا۔ یعنی توحیدِ الٰہی کے نظریے کو عمرانی لحاظ سے معاشرے پر منطبق کرتے ہوئے متضاد معاشی طبقات کے معاشرے کو ختم کرکے توحیدی غیر طبقاتی معاشرہ قائم کرنا تھا، جو خوف یعنی جنگ وفساد اور بغاوتوں اور رہزن یعنی غربت، بھوک، ناداری، جہالت اور غلامی سے پاک معاشرہ ہو۔

توحید کا پیغام واشگاف الفاظ میں یہ اعلان تھا کہ خدا کے سوا کسی کی عظمت مجھے تسلیم نہیں، کسی کی بالا دستی قبول نہیں، کسی کا بنایا ہوا ضابطہ و قانون منظور نہیں، کسی کے حاصل کردہ فوق الانسانی حقوق جائز نہیں، کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا جائے گا۔ کسی کی رضا جوئی اب نہیں کی جائے گی اور کسی کے اشارۂ ابرو پر اب زندگی کا نظام نہیں چلے گا اور خدا کے سوا ہر دوسری خدائی توڑ دی جائے گی۔ سب انسان بنیادی انسانی حقوق میں یکساں ہونگے۔ سب انسانوں کو اللہ کے عیال کی حیثیت حاصل ہو گی۔ سب کو ایک جیسا انصاف مہیا ہو گا۔ سب کی بنیادی انسانی ضرورتیں مساوی ہوں گی۔ فخر و کبر کی تمام روایتیں ختم ہوں گی۔ اب اکرام و عظمت کی بنیاد صرف اللہ تعالیٰ سے تعلق کی بنیاد پر ہو گی جو اس کے قوانین کا احترام کرے گا وہی محترم ہو گا۔ جو لوگ ان قوانین کے مطابق زندگی گزاریں گے، اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں وہی لوگ فلاح پائیں گے۔

اس کے دوسرے جز میں یہ اقرار شامل تھا کہ انسانی ہدایت اور سماج کی اصلاح کے لیے واحد ذریعہ وہ سلسلۂ نبوت و رسالت ہے جو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ زندگی کا اصل علم وہ ہے جو وحی کے ذریعہ آیا ہے اور اسی سے عقلِ انسانی کو سوچنے کے رہنما اصول ملتے ہیں۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی سلسلۂ رسالت کی تکمیل فرمانے والے ہیں اور اب زندگی کی رہنمائی اسی ہستی کے واسطے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اب اسی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر توحید کے اسی مفہوم کے ساتھ یہ خیرِ امت انسانوں کو فلاح و کامرانی عطا کرنے کی ذمہ دار بنائی گئی ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دینِ حق کی تعلیم دی اس کا مقصد صرف ظاہری عبادات و رسوم کی ادائیگی اور مساجد کی تزئین و آرائش کرنا نہیں تھا، بلکہ دنیا سے بلا لحاظ مذہب و ملت، جہالت، غربت و افلاس، قتل و غارت گری، جنسی آوارگی، شراب نوشی و قمار بازی، محنت کے استحصال، مذاہب کے درمیان نفرت و جارحیت اور فساد و بدامنی کا خاتمہ کرنا تھا۔ اسلامی انقلاب ایک انٹرنیشنل تحریک تھی اور معاشرے کی اس تبدیلی کا مقصد یہ تھا کہ فرد اپنی مادی جسمانی ضروریات سے مطمئن ہو کر اپنا یقین اللہ پر قائم کرنے کے قابل ہو جائے۔ تاکہ وہ وعدہ کی گئی اپنی سعادت و راحت، فلاح و کامرانی کی ابدی زندگی کو پا سکے جہاں وہ خالقِ کائنات اللہ کی ذات سے راضی ہو اور اللہ اس سے

راضی ہو۔

جہد و استقامت

جہد و استقامت پیغمبر اسلام ﷺ کی عملی زندگی کا تیسرا اہم معیار ہے۔ جس کام کو سر انجام دینے کا آپ نے بیڑہ اٹھایا اس کو جہد و سرگرمی کی انتہائی کوششوں سے کامیابی کی منزل تک پہنچایا۔ دعوت کے کام سے لے کر اسلامی انقلاب کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو ختم کرنے تک اور غارِ حرا کے پہلے پیغام سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک، ہر لمحہ اسی دعوت کی فکر تھی اور اسی دعوت کی تڑپ تھی۔ مکہ کی گلیوں میں رات دن ایک کر کے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانا، عکاظ کے میلوں کا گشت، طائف کے کوچہ و بازار میں خون آلود ہونا، بدر و حنین کے معرکے اور جزیرۃ العرب کو سلامتی کی آماجگاہ بنانا غرض ایک ایک لمحہ سخت جہد و استقامت کا لمحہ ہے۔

مکہ میں دعوت کے ابتدائی دنوں میں صعوبتوں و آلام کی جو صورتِ حال تھی اور بادِ مخالف کا جھکڑ، سرکشوں اور مستبد قوتوں کا گھیراؤ ہر وقت زندگی کا چراغ گل کرنے کے درپے تھا۔ جب چچا ابو طالب نے اس گھیراؤ کو تنگ محسوس کیا اور بھتیجے کو توحید کے پیغام میں مصالحت کی پیش کی تو پیغمبرِ اسلام ﷺ کے پائے استقامت میں ذرّہ برابر لغزش نہیں آئی۔ آپ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ:

> ”چچا جان! خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں کہ میں اس کام کو اس کی انتہا تک پہنچائے بغیر چھوڑ دوں، یہ ممکن نہیں۔“

توحید کی دعوت کے لیے قسم قسم کی صبر آزما اور جگر گداز وادیوں سے گزرنا پڑا۔ یہ دعوت ہر طاغوتی مستبد قوت کے خلاف اعلان جنگ تھی۔ لیکن پیغمبرِ اسلامؐ تنہا ان سب کی مخالفت کا مقابلہ کرتے رہے۔ پھر اس کشمکش میں فریب کاریوں اور سوقیانہ جملہ بازیوں سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس داعیِ حق و صداقت نے ان حملوں کے مقابلے میں اخلاق و شائستگی اور تہذیب و اصول پسندی کا دامن نہیں چھوڑا۔

مخالفین آپ کے کھلے دشمن تھے، اس لیے دنیا کے عام معیاروں کے مطابق، ان کے ساتھ آپ کا تعلق، انتقام اور عداوت کا تعلق ہونا چاہیے تھا۔ لیکن آپ ﷺ کا ان کے ساتھ تعلق اس قسم کا نہیں تھا۔ آپ کا ان کے ساتھ ایسا ہی تعلق تھا جیسے کسی طبیبِ مشفق کا مریض سے ہو۔ آپؐ دیکھتے تھے کہ ان کی انسانیت مجروح ہو چکی ہے، اس لیے آپ چاہتے تھے کہ ان کا علاج ہو جائے۔ لیکن ان کی ضد اور سرکشی ایسا ہونے نہیں دیتی تھی۔ اس لیے وہ اس کے قریب نہیں آتے تھے۔ یہ طبیبِ مشفق جانتا تھا کہ ان کا مرض انھیں کسی نہ کسی طرح ہلاکت و تباہی کی طرف کھینچے لیے جا رہا ہے۔ اس لیے ان کی ضد پر آپ کا دل کڑھتا تھا اور ان کی گمراہی کا غم آپ کو بے چین کیے دیتا تھا۔ قرآن اس کی شہادت ان الفاظ

میں دیتا ہے:

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ (النمل ۷۰)

"(اے پیغمبر!) ان کے اوپر غم نہ کھاؤ اور جو کچھ یہ لوگ خفیہ تدبیریں کرتے ہیں، ان کی وجہ سے دل میں تنگی محسوس نہ کرو۔"

پیغمبر اسلام ﷺ کو ان تکالیف سے زیادہ اپنے اس مشن کی کامیابی کی امید تھی جس میں انسانیت کو معرفت خداوندی کے ذریعے فلاح و کامرانی سے ہمکنار ہونا تھا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کی ایک عظیم جماعت تشکیل دی جن کی منظم طاقت سے ایمان، دعوت و جہاد کی اعلیٰ حکمت عملیوں سے عظیم مقاصد حاصل کیے گئے۔ اور توحید کی عالمگیر ترویج و اشاعت کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو ہٹا دیا گیا۔

انسانی آزادیوں اور مساوات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے میثاقِ مدینہ کے ساتھ ایک ربانی سماج وادی جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی جس کے ذریعے قرآن حکیم کے انسانیت کی فلاح و کامرانی کے بتائے ہوئے اصولوں کو عملی شکل میں لا کر امن و آشتی اور فلاح و کامرانی کا مثالی نظام قائم کیا گیا۔ اس طرح پیغمبرِ اسلام ﷺ کی قائم کردہ جماعت کے ذریعے پوری انسانیت کو پیغام دیا گیا کہ آنے والوں ادوار میں استحصال و غلامی، ظلم و جبر اور آمریت کی بنیاد پر کوئی بھی نظام انسانیت کے لیے قابل قبول نہیں ہو گا۔

سیرت کے متذکرہ جامع پہلوؤں کی روشنی میں برصغیر کے اندر گذشتہ چند دہائیوں میں کسی قدر جو تحقیقی کام ہوا ہے، ان میں شیخ الاسلام مولانا محمد میاں کی کتاب "محمد رسول اللہ۔ قرآن و تاریخ کے آئینے میں"، امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی کتاب "رسول رحمت"، مولانا پروفیسر محمد اجمل کی کتاب "رسولِ عربی"، ڈاکٹر الطاف جاوید کی کتاب "انقلابِ مکہ، سیرت نبوی نزول قرآن کی روشنی میں"، مولانا وحید الدین کی کتاب "پیغمبرِ انقلاب" اور ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی کتاب "پیغمبر اعظم و آخر ﷺ" اردو زبان کی قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔ اس میں اوّل الذکر چار کتابیں مقاصدِ نبوت اور قرآنی فکر کا جامع علمی استفادہ ہیں اور آخر الذکر دونوں کتابیں طریقۂ نبوت کا عمدہ بیان ہیں۔ موجودہ دور کے ان محققین کے لیے جو اسلام کے ربانی، سماج وادی، انقلابی فکر سے آشنا ہیں، سیرت کے اساسی مآخذات کے ساتھ مذکورہ کتابیں ایک مبسوط جامع سیرت لکھنے کے بہتر عصری ماخذ ہیں۔

حال ہی میں کراچی میں قائم حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ میں قرآن حکیم کی اعلیٰ تعلیم کے کورسز کے لیے ایک جامع سیرت کی کتاب کی ضرورت پیش آئی تو شیخ الاسلام مولانا محمد میاںؒ اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی سیرت پر تحقیق کی گئی دو کتابوں کے اختصار اور حکیم الاسلام مولانا عبید اللہ سندھی کی تفسیر سے اشاراتِ سیرت کا انتخاب کرکے یہ "جوامع السیرت ﷺ" کتاب مرتب کی گئی

ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ کے طلبہ کے علاوہ سیرت النبی کے موضوع پر دیگر محققین و قارئین کے لیے بہتر استفادہ کا ذریعہ بنے گی۔ اور یہ کوشش اس روایت کی بنیاد بنے گی کہ سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ صرف و محض برکت حاصل کرنے کا ذریعہ نہ سمجھا جائے بلکہ اس کی روشنی میں تبدیلی کے لیے اپنے کردار کا تعین کیا جائے اور اس ضمن میں اس سے رہنمائی حاصل کی جائے اور اس طرح اسلامی انقلاب کی اساس و استحکام کے فکری و عملی، اجتماعی طریقوں کا شعور پختہ کیا جائے۔ اس وقت اسلامی دنیا میں اسلامی تحریکیں جس اضطراب اور فکری کشمکش سے گزر رہی ہیں، ایسے میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت اور اسلامی انقلاب کی ربانی، سماج وادی بنیادیں ان تحریکوں کے لیے روشنی کے مینار ہیں۔ اگر اندھی تقلید اور روایتی عقیدتوں کو ترک کر کے تبدیلی کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کیا جائے اور ایمان کے قرآنی معیار کو حاصل کیا جائے تو اسلام کی ترویج اشاعت اور فروغ کے امکانات روشن سے روشن تر ہو جائیں گے۔ اگر مسلمان بھٹکتی انسانیت کو اب بھی ربانی، سماج وادی نظام کی برکتوں سے فیضیاب کرنے کی ذمہ داری سے محروم رہتے ہیں تو یہ ان کی بدنصیبی ہو گی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ پوری انسانیت کے لیے بھی بڑے خسارے کی بات ہو گی اور پھر یاد رکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ ربِّ کائنات اپنا کام روکتا نہیں بلکہ یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ (محمد:۳۸) اس کا اصول ہے۔ وہ یہ کام کسی اور افراد اور ذریعے سے بھی کر سکتا ہے۔

ابوالفضل نور احمد
ڈائریکٹر
حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ

محمد رسول اللہ ﷺ

قرآن و تاریخ کے آئینے میں

(اختصار کے ساتھ)



محدث کبیر، مورخ اسلام، مجاہد ملت
حضرت مولانا سید محمد میاںؒ

مکّہ

محل وقوع۔۔۔۔۔ اہمیت

دنیا کے وہ مقام جن کو بین الاقوامی تعلقات کے بارہ میں درمیانی کڑی (جنکشن) کی حیثیت حاصل تھی مکہ ایسے ہی مقامات میں ایک ممتاز مقام تھا۔

مکہ شہر بعد میں آباد ہوا مگر اس کے محل وقوع کی یہ حیثیت اس وقت سے تھی جب سے ہند، سندھ، افغانستان، ایران، یمن اور شام کے ممالک تمدن سے آشنا ہوئے تھے اور ابن آدم کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں نے اجناس و مصنوعات کے تبادلہ کا سلسلہ ایجاد کیا تھا۔

عرب کا یہ صوبہ جس میں مکہ شہر ہے اس کو حجاز کہا جاتا ہے کیونکہ یہ صحراءِ اعظم کے ریگ و بالو اور دو سمندروں (بحر احمر و بحر قلزم) کی موجوں کے درمیان قدرتی آڑ[1] (حجاب) ہے۔ حجاز نے بے شک سمندر کو صحراء عرب اور اس کے شمال مشرقی شہروں سے کئی سو میل دور ہٹا دیا، مگر سمندر کا یہ قدرتی احسان ہے کہ اس نے حجاز کے ساتھ علیحدگی پسندی کا سلوک نہیں کیا۔ بلکہ پہلے تو عربوں کو جہاز رانی سکھائی پھر ان کے جہازوں کو اپنے سینہ پر چڑھا کر نہ صرف یمن، سندھ، مصر، افریقہ اور ایران بلکہ دنیا کے مشرقی کناروں (جزائر شرق الہند) تک پہنچایا۔ حجاز جس کا قلب مکہ ہے اس کی یہی اہمیت تھی جسکی وجہ سے اس پر قبضہ کے لئے تین ہم عصر سلطنتوں میں رقابت چلی آئی تھی (رومی، ایرانی اور حبشی) یہ تینوں اس پر قبضہ کے خواہشمند رہیں۔

روایت ہے کہ سکندر ذوالقرنین نے ضروری خیال کیا تھا کہ اس شہر کے معبد "خانہ کعبہ" کی زیارت کرے[2]۔ جدہ جو مکہ سے صرف پچاس میل کے فاصلہ پر حجاز کی بندرگاہ ہے جو فی زمانہ حجاج ہند کے استقبال کا عادی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب نوع انسان کا گلہ وجود وحیات کی پہلی منزل میں تھا تو جدہ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اہلیہ محترمہ (حضرت حوا) کا استقبال بھی اسی شان سے کیا تھا جب وہ لنکا سے

---

[1] حجاز کے معنی آڑ ہیں۔

[2] البدایہ والنہایہ ص ۱۰۵، ج ۲۔

روانہ ہو کر ہندوستان سے گزرتے ہوئے سرزمین حجاز میں فروکش ہونے کے لئے مکہ جارہے تھے۔ جہاں انہوں نے پہلی بار خانہ خدا کعبہ کی بنیاد رکھی۔ یہ کعبہ طوفان نوح میں اٹھالیا گیا تھا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا۔(بحوالہ عہد زرین جلد اول)

بناء مکہ، بانی مکہ اور کعبہ

تقریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے کی بات ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام [1] نے شام سے آکر علاقہ حجاز کی ایک وادی غیر ذرع (بنجر میدان) میں اپنے جگر گوشہ اسماعیل علیہ السلام کو آباد کیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد خدا کے گھر کی مٹی ہوئی بنیادیں ابھاریں۔ اس خانہ خدا کا نام کعبہ ہے اور جو شہر یہاں آباد ہوا وہ مکہ ہے۔

اس نونہال (حضرت اسماعیل علیہ السلام) کے ساتھ صرف اس کی ماں تھی۔ وہی اس چشمہ کی مالک تھی جو یہاں ان کی سکونت کے ساتھ ساتھ [2] برآمد ہوا تھا۔

یہ چشمہ برآمد ہوا تو ہاجرہ علیہا السلام سے اجازت لے کر یہاں قبیلہ جرہم [3] بھی آباد ہو گیا تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہوئے تو ان کی شادی بھی اسی قبیلہ میں ہو گئی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہوئی تو عرب قدیم میں ایک نئی نسل کا اضافہ ہو گیا جس کو عرب مستعربہ [4] اور بنو اسماعیل کہا گیا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام یہاں تنہا تھے۔ ایک ماں کے علاوہ نہ ان کا کوئی دادھیالی رشتہ دار تھا نہ نانھیالی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام خدا کے نبی تھے۔ نبی کی اخلاقی اور روحانی تربیت خود قدرت کی جانب سے ہوتی ہے اور نظر بظاہر حضرت ابراہیم علیہ السلام مربی تھے وہ یہاں آتے رہتے تھے۔ بنو جرہم سے ان کو سماجی

---

[1] ہندوستان کی جنتا برہم کو پوری عظمت کے ساتھ مانتی ہے۔ مگر یہ نہیں بتا سکتی کہ "برہم" کون تھے۔ کوئی انسان تھے تو کہاں کے رہنے والے تھے اور ان کا مذہب و مسلک کیا تھا۔ مگر بائبل برہام، اور ابرہام کو موجودہ نسل انسانی کا باعظمت انسان، توحید کا علم بردار اول اور ان مذاہب کا ہادی اعظم مانتی ہے جو الہام، وحی اور نبوت رسالت کے قائل ہیں۔ قرآن حکیم نے بھی حضرت ابراہیم کو یہی حیثیت دی ہے۔

[2] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی اور لخت جگر کو یہاں آباد کیا تو تھوڑے سے کھجور اور پانی کا ایک مشکیزہ توشہ میں دیا تھا چند روز بعد پانی ختم ہو گیا ماں سے پہلے بچہ پیاس کی وجہ سے لب دم ہو گیا تو قدرتی طور پر ایک چشمہ برآمد ہو گیا اسی کا نام "زمزم" ہے جو اب خانہ کعبہ کے قریب کنویں کی شکل میں ہے۔

[3] اس قبیلہ کا اصل وطن یمن تھا۔ اب وہ الگ سرزمین اپنی آبادی کے لئے چاہتا تھا۔ یہ میدان اور چشمہ اس کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھا جس نے اس قبیلہ کی مراد پوری کر دی۔

[4] یعنی جو پہلے عرب نہیں تھے اب عرب بن گئے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ کیوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اگرچہ عربوں کی طرح اولاد سام میں سے تھے۔ مگر ان کا اصل وطن عراق تھا۔

راہ و رسم کی مدد ملی اور ادھر بنو جرھم پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اخلاق کا یہ اثر ہوا کہ وہ ان کے معتقد ہوگئے پھر ان کا مسلک قبول کر لیا۔ توریت کی روایت کے بموجب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر ایک سو سینتیس ۱۳۷ سال ہوئی۔ [1] اس عرصہ میں مکہ چند گھر کی آبادی کے بجائے پورا شہر بن چکا تھا اور کعبہ نے بھی مرکزی عبادت گاہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی قوم کے مقتدا بھی تھے اور کعبہ کے متولی بھی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ لڑکے ہوئے۔ [2] اگر وہ سب مکہ میں رہتے تو بہت ممکن تھا مکہ میں ان کی اکثریت ہو جاتی مگر یہ صاحبزادگان جو اولوالعزم نبی کی اولاد تھے ان کا مطمح نظر اور نصب العین دعوت الی اللہ اور اصلاح خلق تھا۔ وہ اسی مقصد کو لے کر مکہ سے نکلے اور ملک کے مختلف علاقوں میں آباد ہوگئے۔ جہاں جہاں وہ پہنچے وہاں اس زمانہ کی گمراہیوں یعنی کواکب پرستی اور اصنام پرستی وغیرہ کے مقابلہ میں خدا پرستی کا علم بلند ہو گیا۔ [3]

مکہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے صرف ایک فرزند قیدار قیام پذیر رہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد وہ ہی خانہ کعبہ کے متولی ہوئے۔ پھر ان کی اولاد متولی ہوتی رہی اور سیاسی اقتدار ان کے ننھیال "بنو جرھم" کو حاصل رہا۔ کئی صدی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر وہ وقت آیا کہ بنو جرھم اپنے اقتدار کے نشہ میں ایسے مست ہوئے کہ ان کو اولاد اسماعیل علیہ السلام کی اتنی مداخلت بھی گوارہ نہ ہوئی کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی رہیں چنانچہ ان کو مکہ سے نکال دیا۔ اور اب مرکز توحید یعنی خانہ کعبہ پر بھی انہیں کا اقتدار ہو گیا

-

قریش اور قصی بن کلاب مصلح قریش

قریش کا تعارف:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں تقریباً بیس پشت کے بعد ایک شخص مُضَر ہوا ہے۔ باپ کا نام "کنانہ" اس کی اولاد کو "قریش" کہا جاتا ہے۔

مضر کی آٹھویں پشت میں ایک شخص ہوا جس کا عُرفی نام قصی تھا (اصل نام زید، باپ کا نام کلاب، ماں کا نام فاطمہ بنت سعد) قصی بن کلاب کو قوم نے مُجَمِّع کا خطاب دیا۔ اس کی پانچویں پشت میں فخر

---

[1] توریت (بائبل قدیم) باب پیدائش ب ۲۵، فقرہ ۱۶، ۱۷

[2] ایضاً

[3] سیرۃ ابن ہشام ص ۷۲، ج ۱

موجودات، سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کا ظہور اقدس ہوا۔ سلسلہ نسب یہ ہے: محمد ﷺ بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد المناف بن قصی۔

قصی اور تولیت کعبہ:

قصی بچپن ہی میں باپ کے سایہ سے محروم ہو گیا تھاماں نے قبیلہ بنی عذرہ کے ایک شخص سے جس کا نام ربیعہ بن حرام تھا دوسرا نکاح کر لیا۔ بنو عذرہ، شمال عرب کے حدود میں شام کے قریب سرغ میں آباد تھے۔ قصی نے ماں کی آغوش میں یہیں پرورش پائی۔ ہوش سنبھالا تو وطن اور نسل کی جستجو ہوئی ۔کچھ سراغ لگا تو یہ مکہ پہنچا۔ وہاں بڑے بھائی سے ملاقات ہوئی جس کا نام زہرہ تھا۔ جو بوڑھا ہو چکا تھا اس کی بصارت بھی جاتی رہی تھی۔ [1]

مکہ پر بنو جرھم کے بعد اب قبیلہ خزاعہ کا قبضہ تھا۔ قصی نے یہیں بود و باش شروع کر دی اور یہاں تک تعلقات بڑھائے کہ خانہ کعبہ کے متولی [2] نے اپنی لڑکی کا نکاح قصی سے کر دیا۔

قصی نے قریش کے انتشار کو ختم کر کے ان کو ایک مرکز پر جمع کیا، اس لئے اس کا لقب [3] مجمع ہو گیا۔ [4]

قص بنو خزاعہ کے مقابلہ پر ایک مضبوط محاذ قائم کر کے چند ایک مقابلوں کے بعد قریش کا مکہ پر تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس طرح کئی ہزار سال کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ بنو اسماعیل کو مکہ پر سیاسی اقتدار حاصل ہوا۔

سیاسی رابطہ:

شام کے قریب جو عربی قبائل آباد تھے اگرچہ وہ خود مختار تھے مگر بازنطینی شہنشاہیت (سلطنت روم) کے زیر اثر تھے۔ کچھ قبیلوں نے عیسائی مذہب بھی قبول کر لیا تھا۔ قصی اس علاقہ میں بڑھ کر جوان ہوا تو اس کی بلند پرواز فطرت نے اس کو شہنشاہ روم تک پہنچا دیا۔ بنو خزاعہ کی جنگ میں قیصر روم (بازنطینی شہنشاہ) کی حمایت بھی قصی کو حاصل تھی اور بقول ابن قتیبہ قیصر روم نے اس کو کمک بھی پہنچائی تھی [5] یہ بھی ایک گٹھ جوڑ تھا۔

بین الاقوامی سیاست کبھی بھی اپنے مفادات کے تحفظ سے آزاد نہیں رہی ہے۔ بظاہر منشاء یہ بھی

---

1. ابن سعد ص ۳۷، ج ۱
2. حلیل بن حبشیہ خزاعی، لڑکی کا نام حبی، البدایہ والنہایہ ص ۲۱۰، ج ۲
3. معارف ابن قتیبہ
4. ابن سعد ص ۴۰، ج ۱
5. داعانہ قیصر علیہا، معارف ابن قتیبہ ص ۲۱۵ ملوک الشام

تھا کہ عرب کے اندر اپنے اثرات بڑھائے اور ہندوستان سے خشکی کی راہ سے ہونے والی تجارت کے گذر گاہ کو اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے لے۔

قصی نے مکہ پر قبضہ کیا تو شہر مکہ کی تعمیر جدید کا منصوبہ بھی تیار کیا۔ کعبہ کے اطراف میں موجود اس جنگل کو صاف کرایا جو خانہ کعبہ کے احترام میں جھاڑیوں کی صورت میں صدیوں سے موجود چلا آرہا تھا۔ لوگوں کے وہم کو دور کرنے کے لئے سب سے پہلے خود کلہاڑا چلایا اور اعتراض کا جواب یہ دیا کہ ہمارا مقصد آبادی ہے۔ بربادی مقصود ہو تو بے شک درخت کاٹنے ممنوع ہیں۔ ❶ پھر ایک خاص نقشہ کے ساتھ مکہ کو آباد کرنا شروع کیا۔ خالی اراضی کے پلاٹ بنائے اور قریش کے ہر ایک خاندان کو ایک پلاٹ دے دیا۔ یعنی ہر قبیلہ کی الگ کالونی آباد کردی۔ انہیں کالونیوں کے محل وقوع کے لحاظ سے قریش ظواہر اور قریش بطاح کی اصطلاحیں ایجاد ہوئیں۔ ❷

اس عقیدے کو بھی ختم کیا کہ خانہ کعبہ کے قریب مکان نہ بنائے جائیں بلکہ قریش کے کچھ خاندان یہاں آباد کئے اور کچھ خاندان شہر کے بیرونی حصہ میں۔ البتہ یہ ہدایت کردی کہ کعبہ کے قریب دوسری منزل تعمیر نہ کی جائے۔ ❸

اس جدید نقشہ میں خانہ کعبہ وسط میں رہا۔ خانہ کعبہ کے گرد بہت وسیع میدان چھوڑ دیا گیا۔ محلوں (کالونیوں) کے بیچ میں راستے رکھے گئے۔ یہ راستے (سڑکیں) خانہ کعبہ کے میدان پر آکر ختم ہوتے تھے۔ ان میں وہ سڑک بھی تھی جس کو "طریق ابی شیبہ" کہا جاتا تھا۔ یہ سڑک بہت وسیع اور سب سے زیادہ چالو تھی۔

وہی قصی جس کا بچپن یتیمی میں گذرا تھا اس انقلاب کے بعد اپنی قوم کا سب سے بڑا شخص تھا۔ وہ گویا پوری قوم کا مالک تھا جس کی عظمت دلوں کی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ ❹ یہاں تک کہ لوگ اس سے برکت حاصل کیا کرتے تھے۔

قوم کے پاس پہلے سے کوئی دستور العمل یا قانون نہیں تھا تو اسی کا قول قانون ہوتا تھا۔ اور نہ صرف زندگی میں بلکہ بقول ابن سعد اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے قول کی ایسی ہی تعظیم کی جاتی تھی جیسے کسی مذہبی حکم کی ❺ مگر نہایت عجیب اور دور حاضر کے سیاست دانوں کے لئے بہت زیادہ قابل

---

❶ ابن سعد ص ۴۰ ج ۱

❷ ابن سعد ۴۰ ج ۱

❸ احمد السباعی ص ۴۴

❹ ابن سعد ص ۴۰ ج ۱

❺ ابن سعد ص ۳۹ ج ۱

قدر اور سبق آموز بات یہ ہے کہ اس تمام عظمت اور اقتدار کے باوجود قصی نے نہ تاج شاہی سر پر رکھا نہ اپنے آپ کو بادشاہ کہلوانا پسند کیا۔ اس نے اپنے رسمی اعزاز اور اپنی وجاہت و عظمت کے مقابلہ میں ابراہیمی عظمت توحید اور قوم کی روایات اور ان کے اطوار کا احترام کیا۔ حریت اور آزادی اس قوم کا وہ جوہر تھا جس نے کبھی بھی کسی شاہ یا شہنشاہ کے سامنے اس قوم کی گردن نہیں جھکنے دی تھی۔ قصی نے تخت سلطنت اور تاج شاہی کے مقابلہ میں اس جوہر کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کی کوشش کی۔ اس سے بڑھ کر اپنی قوم کے ساتھ اخلاص کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے دربار شاہی کے بجائے دارالندوہ تعمیر کیا اور اس کا ایسا نظام بنایا جس کے لئے جمہوری کے علاوہ اور کوئی لفظ مناسب نہیں ہو سکتا۔ جس میں فرد یا شخص کی نہیں بلکہ نظام کی تعظیم تھی اور ملوکیت یا شخصی اقتدار سے یہاں تک اجنبیت تھی کہ نہ دارالندوہ کا کوئی صدر (چیئرمین) تھا نہ اس جمہوری نظام میں صدر کا کوئی عہدہ تھا۔ بہت سے فرائض، پورٹ فولیو تھے جو مختلف قبائل پر تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ قبیلہ کا سربراہ اس فریضہ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

مکہ کی شہری ریاست

جدید تنظیمات

نادی۔ دارالندوہ۔ شعبے اور منصب

دیہات میں اور قصبات کے محلوں میں ایسے مکانات ہوتے ہیں جن کو چوپال کہا جاتا ہے۔ یہ عموماً محلہ یا گاؤں کے بڑے آدمی کی حویلی کا مردانہ حصہ ہوتا ہے جس میں گاؤں یا محلہ والوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ کوئی تقریب منائیں کوئی مشاورتی اجتماع یا تفریحی مجلس کریں۔ چوپال میں وعظ کے جلسے بھی ہوتے ہیں بیاہ شادی کی تقریبات بھی۔ مشاعرے اور ادبی مجلسیں بھی ہوتی ہیں اور کبھی رقص و سرود کی رنگین محفلیں بھی جمتی ہیں۔ (جدید دور میں کمیونٹی سینٹر اس کے متبادل بنے ہیں۔)

چوپال ایک بڑا ہال ہوتا ہے اور موجودہ زمانہ میں بھی عموماً دیہات میں یہ ہال خام ہوتا ہے یعنی دیواریں مٹی یا کچی اینٹوں کی ہوتی ہیں اور چھت کڑیوں کی۔ بیچ میں شہتیر (اور دور حاضر میں گاڈر) رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے اوپر دو طرفہ کڑیاں ہوتی ہیں اس وجہ سے اس کو دوکڑیہ بھی کہتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے مدینہ والے اس کو سقیفہ کہتے تھے مگر مکہ معظمہ میں اس کے لئے نادی[1] کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

نادی (مقاصد اور فوائد)

جو کام ہمارے یہاں چوپالوں میں ہوتے ہیں وہ ان اندیہ (نادیوں) میں بھی ہوا کرتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ:

(۱) سلسلہ نسب کے بارے میں کوئی اعلان ہوتا تھا تو وہ ان نادیوں میں کیا جاتا تھا۔

---

[1] نادی۔ ندیٰ سے ماخوذ ہے۔ نَدی کے معنی ہیں رطوبت، تراوٹ اسی سے نداء بمعنی آواز بھی ماخوذ ہے کہ جس کے حلق میں تراوٹ زیادہ ہوتی ہے اس کی آواز بلند ہوتی ہے۔ نادی، میں جام و سبو کی تراوٹ بھی رہا کرتی تھی اور داد و دہش کی سیرابی بھی اور جس طرح بحث و مباحثہ میں آوازیں بلند ہوتی تھیں، شعراء کے ترنم اور مغنیوں کے طرب انگیز نغمے بھی ہوتے تھے۔ یہی مناسبتیں وجہ تسمیہ ہی۔

(۲) قبیلہ میں داخل کر لینے کا ایک خاص قاعدہ اور رواج تھا۔ جس کو داخل کرتے تھے وہ مولی کہلاتا تھا اور جو معاہدہ اس سے ہوتا تھا اس کو عقد موالات کہا کرتے تھے۔ یہ عقد موالات نادیٰ ہی میں ہوتے تھے۔

(۳) عقد موالات کے بر عکس خلع یا طرد کا اعلان بھی اسی نادیٰ میں ہوتا تھا یعنی جس کو مولیٰ بنایا گیا تھا اگر وہ معاہدہ کی پابندی نہ کرتا یا اپنے عمل اور کردار میں غلط ثابت ہوتا تو اس کو قبیلہ سے خارج بھی کیا جاسکتا تھا۔ اس کو خلع کہتے تھے (الگ کر دینا)۔ اور طرد کا لفظ بھی اس کیلئے استعمال کرتے تھے (دھکے دے کر نکال دینا)۔ یہ شخص خلیع، مخلوع یا مطرود کہلاتا تھا۔

(۴) خرید و فروخت کے اہم معاملات تجارتی کاروانوں کا استقبال اور ان کی روانگی کی تقریب۔

(۵) تفریحی مجلسیں، رات کو قصہ خوانی (مسامرہ) رقص و سرود اور سوانگ (ڈرامے) بھی نادیٰ میں ہوا کرتے تھے۔

نظم و نسق کے لحاظ سے یہ نادی قبیلہ کی ہےئت حاکمہ اور شیخ قبیلہ کی اجتماعی طاقت ہوتی تھی۔ ہر ایک نادی کے ساتھ ایک اعلانچی بھی ہوتا تھا جس کو موذن، منادی یا نقیب کہا کرتے تھے۔

دارالندوہ:

قبیلہ وار نظام کی طرح پورے شہر کا کوئی مرکزی نظام نہیں تھا۔ ضرورت کے وقت عام اجتماع ضرور ہو جاتے تھے مگر ان کا کوئی ضابطہ تھا، نہ کوئی جگہ ان کے لئے متعین تھی۔ مصلح قصی کا قابل فخر کارنامہ یہ تھا کہ اس نے شہری اجتماع کا ایک نظم اور ضابطہ مقرر کیا۔ اپنا مکان جو اس نے کعبہ کے شمالی میدان میں اس طرح بنایا تھا کہ اس کا دروازہ مسجد حرام کی طرف تھا، مرکزی نظام کے لئے عام کر دیا اور دارالندوہ اس کا نام رکھا۔

دارالندوہ کے ضابطے:

ندوہ کمیٹی یا مجلس کو کہتے ہیں۔ یہ کمیٹی جس کے نام پر یہ دارالندوہ تھا اس کی تشکیل کا ضابطہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔ قیاس یہ ہے کہ قبائلی مجالس (نادیٰ) کے شیوخ اور سربراہ اس کے ارکان ہوتے تھے۔ البتہ ارزقی نے اخبار مکہ [1] میں اور ابن درید نے کتاب الاشتقاق [2] میں تصریح کی ہے کہ دارالندوہ کے اجلاس میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے تھے جن کی عمر کم سے کم چالیس سال ہوتی

---

[1] اخبار مکہ ص ۱۰۷ ج ۱

[2] کتاب الاشتقاق ص ۹۷

تھی۔ صرف دارالندوہ کے بانی (قصی) کی اولاد اس شرط سے مستثنیٰ تھی ❶

اجلاس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا جب ضرورت ہوتی اجلاس کر لیا جاتا تھا۔ دارالندوہ کا منتظم اجلاس کا داعی ہوتا تھا، صدر کوئی مقرر نہیں تھا۔

دارالندوہ میں انجام پانے والے کام:

(۱) شہر مکہ اور قوم قریش سے تعلق رکھنے والے معاملات کے متعلق مشورے اور فیصلے ❷ (۲) کسی قبیلہ یا گروہ سے جنگ یا صلح کے فیصلے (۳) مدافعتی تدابیر (۴) جنگ کے وقت علمبردار کا تقرر (۵) تجارتی معاہدات (۶) بیرونی مہمانوں کا استقبال (۷) قصی کی شخصیت سے برکت حاصل کرنے کے لئے شادی کی تقریبات بھی یہاں ہوا کرتی تھی (۸) قافلوں کی روانگی اور واپسی پر ان کا استقبال بھی یہاں ہوتا تھا۔ (۹) ایک خاص رسم رائج تھی کہ جب لڑکی سن بلوغ کو پہنچ جاتی تھی تو اس کو درع پہنایا جاتا تھا (بڑا کرتا) اور چھوٹا کرتا اتروا دیا جاتا تھا۔ یہ رسم بھی یہاں انجام دی جاتی تھی ❸ (۱۰) قومی ملکیت کی چیزیں بھی یہیں محفوظ کر دی جاتی تھیں۔ ❹

مختلف شعبے اور منصب

مکہ جو صرف ایک شہر یا ایک آزاد ریاست نہیں بلکہ پورے عرب کا متبرک مرکز بھی یہی تھا، جہاں عرب کا مرکزی معبد کعبہ تھا۔ اس کے انتظامات کی جو صورتیں پہلے تھیں قصی نے ان کو باقی رکھا۔ ان کے علاوہ اور بہت سے شعبے قائم کئے، ان کے منصب اور منصبدار (عہدہ دار) مقرر کئے، کچھ شعبے اپنے پاس رکھے۔ تفصیل یہ ہے:

(۱) دارالندوہ۔ اس کا نظم و نسق مستقل شعبہ تھا جو قصی سے متعلق تھا اس کے بعد عبدالدار سے متعلق ہوا۔

(۲) مشورہ۔ یعنی مشاورتی اجتماع کا انتظام

(۳) حجابت۔ کلید برداری یعنی کھولنے اور بند کرنے کی ذمہ داری اور خانہ کعبہ کے اندر داخل ہونے کی

---

❶ کتاب الاشتقاق ص۹۷

❷ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دینے کا فیصلہ بھی یہیں کیا گیا تھا۔

❸ سیرۃ ابن ہشام ۹۔۱۷، ابن سعد ص ۳۹، ج ۱

❹ مثلاً غزوہ احد کی تیاری کے لئے جو تجارتی مال لایا گیا تھا اس کا نفع مصارف جنگ میں صرف کیا جائے گا وہ مال یہیں جمع رکھا گیا تھا۔ (ابن ہشام وغیرہ)

اجازت دینے کا اختیار۔

(۴) سدانت۔ دربانی، کھولنے بند کرنے اور صاف رکھنے کی خدمت۔ یہ کوئی مستقل منصب نہیں تھا بلکہ منصب حجابت ہی سے متعلق تھا۔

(۵) حرم کعبہ کا عام انتظام اور نگرانی۔ اس منصب کا ذمہ دار یہ نگرانی بھی رکھتا تھا کہ حرم میں شور و غل یا جھگڑا فساد نہ ہو۔

(۶) ایسار [1]۔ بتوں سے استخارہ یعنی فال لینا جس کا قاعدہ مقرر تھا۔

(۷) اموال محجرہ۔ یعنی محفوظ مال۔ خانہ کعبہ کو جو چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے ان کی حفاظت کا شعبہ ۔

خانہ کعبہ میں ایک پختہ گڑھا کنوئیں کی طرح تھا۔ چڑھاوے کی طلائی اور نقرئی چیزیں اس کنوئیں میں ڈال دی جاتی تھیں۔ اسی کنویں کے کنارہ پر صنمخانہ کعبہ کا سب سے بڑا بت ہُبل تھا۔

حج سے متعلق:

رفادہ۔ حجاج کے کھانے کا انتظام:

قصی کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ جب اس نے قریش کو مکہ میں آباد کیا تو ان کے ذہن نشین کرایا کہ آپ محافظ اور خادم کعبہ ہیں۔ زائرین جو عرب کے کونہ کونہ سے آتے ہیں یہ آپ کے مہمان ہونے چاہئیں اور ان کے خورد و نوش کا انتظام آپ کو کرنا چاہیے۔ یہ قریش کی عالی حوصلگی تھی کہ انہوں نے اس تجویز کو منظور کیا۔ اور پھر یہ طے ہو گیا کہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اس مقصد عظیم کے لئے جمع کرا دیا کریںگے۔ تجارتی مال میں یہ حصہ کم سے کم عشر (دسواں حصہ) ہوتا تھا۔ بعض باحوصلہ اس سے بھی زیادہ دیدیا کرتے تھے۔ اس تجویز کی سیاسی مصلحت یہ تھی کہ:

(۱) عام عرب بنو خزاعہ کو بھول گئے جن سے قصی نے اقتدار چھینا تھا۔

(۲) قریش کے تسلط کو نعمت اور رحمت سمجھنے لگے۔

(۳) شہر مکہ اور حرم کعبہ میں قصی نے جو انقلاب برپا کیا تھا کہ عرب کے عقیدے کے خلاف جھاڑیاں اور درخت کٹوا کر قریش خاندان آباد کر دیئے۔ عرب نے اس کو برداشت کیا۔ فریق مخالف (خزاعہ) جو اس کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے عرب کو مشتعل کر سکتے تھے اس کے راستے بند

---

[1] اس کا ماخذ میسرہ ہے۔ میسرہ کے معنی قمار اور جوا (قاموس) چھوٹے چھوٹے تیر جن کو ازلام کہا جاتا تھا۔ وہ جوا کھیلنے کے کام میں آتے تھے۔ انہیں کے ذریعہ فال بھی نکالا جاتا تھا۔

ہو گئے۔ اس طرح خطرات ختم ہو گئے۔

(۴) نہ صرف سرزمین مکہ میں بلکہ پورے عرب میں قریش کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ چنانچہ عام عرب کے لئے صرف چار ماہ حرم میں ان کو کہیں آنے جانے میں خطرہ نہیں ہوتا تھا اور قریش کے لئے پورے بارہ مہینے حرم ہو گئے۔ اس سے بسل کی اصطلاح ایجاد ہو گئی۔ یعنی باقی آٹھ ماہ کا بھی حرام ہونا۔

یہ قریش کا اعلیٰ درجہ کا تدبر تھا کہ رفادہ کے باعث انہوں نے خرچ سے زیادہ منافع کی صورتیں پیدا کر لیں اور ان کے عظمت و احترام میں بھی چار چاند لگ گئے۔ پھر احرام کا انتظام بھی قریش نے اپنے ذمہ لے لیا۔ یعنی جب عرفات سے واپس ہو کر طواف کعبہ کریں جو ۱۰ تا ۱۲ ذی الحجہ کو ہوا کرتا تھا تو یہ طواف ان کپڑوں میں نہ ہونا چاہئے جو سال بھر پہنے جاتے ہیں، جن کو پہن کر سینکڑوں گناہ کئے جاتے ہیں۔ بلکہ اس طواف کے لئے احرام کا کپڑا قریش دینگے اور اگر کوئی شخص کسی وجہ سے قریش کا یہ عطیہ حاصل نہ کر سکے تو وہ برہنہ بدن طواف کرے۔ [1]

سقایہ:

حجاج کے لئے پانی کا انتظام۔ یہ شعبہ بھی رفادہ کی طرح بہت اہم اور بہت کٹھن تھا۔

خزاعہ سے شکست کھا کر جب بنو جرھم مکہ سے فرار ہوئے تو ان بھاگنے والوں نے سب کچھ تباہ کر دینے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے زمزم کو بھی (جو پہلے چشمہ تھا پھر یہاں کنواں بنالیا گیا تھا اور چشمہ کنویں کا سوت ہو گیا تھا جس کی وجہ سے کنویں کا پانی کبھی کم نہیں ہوتا تھا) نہ صرف بند کر دیا تھا بلکہ لاپتہ کر دیا تھا۔ قصی نے جب کعبہ کا حرم بنایا اور اس کے قریب قریش کو آباد کیا تو یہاں کوئی کنواں نہیں تھا تو زائرین کے لئے پانی کی سخت دشواری ہوتی تھی۔ شعبہ سقایہ کا کام یہ تھا کہ مکہ کے مختلف محلوں میں جو کنویں تھے وہاں سے پانی لاتے اور حوضوں میں بھر دیتے تھے۔

زائرین صرف حرم کعبہ ہی میں نہیں رہتے تھے بلکہ عرفات اور مزدلفہ بھی جاتے تھے۔ اور منیٰ میں تو کئی روز تک جشن رہا کرتا تھا۔ پانی کا انتظام سب جگہ کیا جاتا تھا۔ واٹر پروف قسم کی چیز اس وقت نہیں تھی البتہ چمڑہ ان کے یہاں ہوتا تھا جو حبش وغیرہ بھی بھیجا جاتا تھا۔ بڑے بڑے حوض چمڑے [2] ہی کے بنائے جاتے تھے یہ سب انتظام شعبہ سقایہ سے متعلق تھا۔

---

[1] ابن سعد ص ۱۴۱ ج ۱

[2] ابن سعد ص ۱۴۱ ج ۱

وقادہ[3]:

۹ذی الحجہ کی شام کو حاجی عرفات سے روانہ ہو کر مزدلفہ پہنچتے ہیں۔ رات کو مزدلفہ میں قیام رہتا ہے۔ صبح کو وہاں سے منیٰ آتے ہیں۔ یہی دستور زمانہ جاہلیت میں تھا۔ یہ رات اگرچہ چاندنی ہوتی ہے مگر پھر بھی قصی نے یہ انتظام کیا تھا کہ مزدلفہ کے ٹیلوں پر آگ جلائی جاتی تھی جس سے میدان مزدلفہ روشن رہتا تھااور آنے والوں کو سہولت ہوتی تھی[1] اس کو وقادہ کہاجاتا تھا۔

اجازہ یاافاضہ:

روانگی کا پروگرام بنانا۔ پہلے گزر چکاہے کہ یہ اختیار "صوفہ" کو حاصل تھا کہ وہ طے کیا کرتے تھے کہ مثلاً عرفات سے کونسا قبیلہ پہلے اور کونسا بعد کو روانہ ہوگا۔

قُبَّہ

حج کے موقع پر ہر ایک قبیلہ کا قیام گاہ (پڑاؤ) الگ ہوتا تھا جس کو منزل کہاجاتا تھا۔ کمبلوں کے خیمے ہوتے تھے۔ مگر قریش کے خیمے سرخ چمڑے کے ہوتے تھے۔ ایسے خیمہ کو قبہ کہاجاتا تھا(جمع قباب) ان کے انتظام کاایک شعبہ تھا، اس کو قبہ ہی کہتے تھے۔

عدالت اور فصل خصومات:

حکومت۔ عام مقدمات کی سماعت اور فیصلہ اس شعبہ سے متعلق تھا۔

اشناق۔ قتل کے سلسلہ میں بعض صورتیں ایسی ہوتی تھیں جن میں دیت واجب ہوتی تھی۔ دیت کی ایسی صورت ہوتی تھی کہ اس کو اجتماعی جرمانہ کہاجاسکتاہے۔ پوری دیت کے سو اونٹ[2] ہوتے تھے جو مقتول کے وارثوں کو دیئے جاتے تھے۔ مگر یہ اونٹ قاتل نہیں دیتا تھا۔ بلکہ اسکی ادائیگی عاقلہ کے ذمہ ہوتی تھی۔ یعنی وہ سوسائٹی جس میں یہ رہتا تھا۔ پھر قبائل کے جو معاہدات ہوتے تھے ان میں ایک دفعہ یہ بھی ہوتی تھی کہ اگر کسی قبیلہ پر دیت ادا کرنی لازم ہو تو اس کا اتنا حصہ وہ قبیلہ ادا کرے گا اور اتنا

---

[3] وقادہ: آگ روشن کرنا بمعنی وقود

[1] ابن سعد ص ۱۴۱ج ۱

[2] پہلے ایک انسان کی دیت دس اونٹ ہوا کرتی تھی جب عبد المطلب کی منت ماننے کے مشہور واقعہ مین عبد اللہ کے فدیہ میں سو ااونٹ پر قرعہ نکلااور عبد المطلب نے عبد اللہ کے فدیہ میں سو اونٹ ذبح کئے تب سے ایک انسان کی دیت سو اونٹ قرار دی گئی جس کو اسلام نے بھی باقی رکھا۔ ابن سعد ۴۵

حصہ اس کا حلیف اور معاہد قبیلہ ادا کرے گا۔

پھر اگر جان ہلاک ہوئی ہے تو پوری دیت لازم ہوتی تھی اور اگر ناک، کان یا کوئی عضو کاٹ دیا ہے تو بعض صورتوں میں پوری دیت اور بعض صورتوں میں دیت کا ایک حصہ لازم ہوتا تھا۔ چونکہ اسلام نے بھی دیت کے طریقہ کو (جزوی اصلاحات کے بعد باقی رکھا) تو اس کے احکام کتب فقہ میں بھی ہیں۔ بہر حال قتل و دیت کے مقدمات نہایت اہم ہوتے تھے اور ان میں فیصلہ طلب امور یہ ہوتے تھے کہ پوری دیت لازم ہوتی ہے یا دیت کا جزو۔ اور جو بھی صورت ہو اس کی ادائیگی صرف قاتل کے قبیلہ اور اس کے عاقلہ پر لازم ہوگی یا اس قبیلہ کے حلیف قبائل پر بھی۔ اور اگر حلیفوں پر بھی لازم ہوتی ہے تو بروئے معاہدہ کتنی۔ اور اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی۔ اس شعبہ کا نام (جس کے ذریعے ان مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا تھا) اشناق [1] تھا اور اس کا ذمہ دار وہی ہو سکتا تھا جو اونچے درجہ کا معاملہ فہم ہو اور صحیح فیصلہ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اسلام سے پہلے یہ شعبہ ابو بکر بن قحافہ کے سپرد تھا، جن کو اسلام نے صدیق اکبر کا خطاب دیا۔

فوجی نظام

غیر موزوں نہ ہوگا اگر "بے ضابطہ فوج" کا لفظ استعمال کیا جائے۔ بے ضابطہ فوج سے مراد قبائل کے وہ جنگجو ہیں جو کسی بھی مقابلہ کے وقت میدان میں آجاتے تھے۔ ان کے اسلحہ [2] خود اپنے ہوتے تھے۔ ان کا کوئی کمانڈر مستقل نہیں ہوتا تھا۔ اس کا انتخاب [3] وقت پر ہوتا تھا۔ ہر قبیلہ کا جھنڈا الگ ہوتا تھا اس کو لواء کہا جاتا تھا اور ایک علم پوری فوج کا ہوتا تھا اس کو عقاب کہتے تھے۔ پوری فوج کے سالار اعظم کو قائد۔ اس منصب کو قیادت اور اس کے کیمپ کو قبہ کہا کرتے تھے۔

خاص خاص سرداروں کے ساتھ یہ عہدے اور جھنڈے سپرد کئے جاتے تھے سپرد کرنے والے بھی خاص سردار ہوتے۔

---

[1] اشناق شنق سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں جزو دیت اور زکوۃ کے جو نصاب اسلام نے مقرر کئے ہیں تو دو نصابوں کے درمیان جو کسر ہوتی ہے اس کو بھی شنق کہا جاتا ہے۔ مثلاً چالیس بکریوں پر ایک بکری زکوۃ میں ادا کرنی ہوتی ہے اور ایک سو بیس پر دو بکریاں، تو چالیس سے زائد اور ایک سو بیس سے کم تعداد شنق ہوئی۔

[2] تلوار، نیزہ، اور حفاظت کے لئے ڈھال، فدہ (درع) اور خود (بیضہ) خود کے آہنی جھالر جن سے گردن کی حفاظت ہوتی تھی مغفر کہلاتے تھے۔

[3] جو عموماً قرعہ کے ذریعہ ہوتا تھا قبائل کے سردار امیدوار ہوتے تھے۔ جنگ فجار کے موقع پر حضرت عباسؓ کا نام نکل آیا۔ یہ اس وقت بچے تھے تو ان کو ایک ڈھال پر بٹھا کر لے گئے۔ العقد الفرید ۴۶، ج ۲۔

قسمیں:

فوج کی چند قسمیں ہوتی تھیں۔ تیر انداز، رماۃ جمع رامی، پیادہ رجالہ، سوار، خیل۔
سوار فوج کے لئے اعنہ کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا۔
فتح کے وقت لوٹ کے مال کو غنیمت کہاجاتا تھا۔ اس کا اتنا نظام تسلیم شدہ تھا کہ ایک چوتھائی قائد فوج یا سردار اعظم کا ہوتا تھا اس چوتھائی کو مرباع کہتے تھے (چوتھ)۔ [1] باقی تین حصے مختلف طریقوں سے تقسیم کئے جاتے تھے۔ [2] اس خاکہ کے بموجب فوج کے منصب دار یہ ہوتے تھے:
(۱) قائد اعظم (۲) علمبردار جس کے پاس عقاب رہتا تھا (۳) کیمپ یعنی قبہ کا منتظم اور محافظ (۴) سوار فوج کا سردار، صاحب اعنہ، اس کو مختصر کر کے اعنہ کہتے تھے۔

باضابطہ فوج یا پولیس:

قریش نے حفاظتی مقاصد کے لئے ایک مستقل نظام بھی بنایا تھا اس کو قائم کہتے تھے۔ مگر اس کی حیثیت تنخواہ دار پولیس کی تھی۔ لڑائیوں کے وقت قبائل کے جنگجو بھی اپنے مفاخر کے ترانے گاتے ہوئے میدان میں آیا کرتے تھے اور مقابلہ بھی ان سے کرتے تھے جو ان کے ہمسر ہوتے تھے۔ غزوہ بدر میں سرداران قریش نے انصاری مجاہدین کو مقابلہ پر دیکھا تو لڑنے سے انکار کر دیا کہ یہ کاشتکار اور کسان ہیں۔ قریش کے ہم پلہ نہیں ہیں۔ یہ بھی ایک ضابطہ تھا۔
قصی نے اپنے بعد عبدالدار کو جانشین کر دیا اور جو شعبے قصی کے پاس تھے وہ سب عبدالدار کے حوالہ کر دیے۔ لیکن قصی کے موت کے بعد اس کے دوسرے بیٹے عبد مناف کی اولاد نے مکہ کی ریاست کے شعبوں کا انتظام تقسیم کرتے ہوئے ریاست پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

کارنامہ:

قصی نے اگرچہ بادشاہت کا دعویٰ نہیں کیا مگر قریش پر اور قریش کے ذریعہ پورے عرب پر اس کا اقتدار کسی بادشاہ سے کم نہیں تھا اور اس لحاظ سے اس کی اولاد کی حیثیت وہی تھی جو شہزادوں اور راج

---

[1] عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان بھی چوتھ سے ناآشنا نہ تھا۔ شیواجی عالمگیر سے اس پر لڑتا رہا کہ وہ چوتھ مانگتا تھا یعنی یہ کہ عالمگیر یہ تسلیم کرے کہ شیواجی کو اپنے میں چوتھ حاصل کرنے کا حق ہو گا۔ سلطان عالمگیر اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

[2] عموماً تین چوتھائی باقی ساتھیوں پر اگر کچھ مال دشمن کی شکست اور عام لوٹ سے پہلے مل جاتا تھا۔ اس کو نشیطہ کہاجاتا تھا۔ فضول سے مراد ناقابل تقسیم کسرات ہوتے تھے اور صفیٰ کسی ایسی منتخب چیز کو کہتے تھے جو مہم کا سردار اپنے لئے منتخب کر لیا کرتا تھا، مثلاً کوئی تلوار یا کوئی گھوڑا وغیرہ۔ سردار کو اس انتخاب کا حق ہوتا تھا۔

کماروں کی ہوا کرتی تھی۔

عبد مناف کی اولاد نے اپنی شخصیت اور اپنی اس حیثیت کو پہچانا اور اس سے کام لیا۔ چنانچہ انہوں نے پڑوسی ممالک کے بادشاہوں اور شاہنشاہوں سے تعلقات پیدا کئے اور ان کو بڑھایا۔ اور قابل قدر بات یہ ہے کہ ان تعلقات کے فوائد کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان تعلقات سے کام لے کر اپنی قوم کے لئے تجارتی مراعات اور سفروں میں آسانیاں پیدا کیں۔ چنانچہ مطلب نے جو سب سے بڑا تھا شاہ حبش نجاشی اور یمن کے ملوک (ملوک حمیر) سے، ہاشم [1] نے بازنطینی شہنشاہ ہرقل سے اور نوفل نے شہنشاہ ایران کسریٰ سے اپنی قوم کے لئے آزاد تجارت کے فرامین حاصل کر لئے کہ قریش تاجر جو ان کے ملکوں میں جائیں گے ان سے کوئی محصول یا ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔ [2] ظاہر ہے تجارت پیشہ قوم کے لئے اس سے بڑی نعمت کیا ہو سکتی ہے۔ اسی لئے ان کو مجیرون کہا جاتا تھا۔ [3]

تقسیم مناصب [4] جب آفتاب اسلام طلوع ہوا تو مناصب کی تقسیم اس طرح تھی:

شعبے	نمبر شمار	منصب	خدمات و فرائض	قبیلہ	منصب دار
نظم و حفاظت کعبہ مکرمہ	۱	حجابہ و سدانہ	خانہ کعبہ	بنو عثمان بن عبدالدار بن قصی	عثمان بن طلحہ
	۲	عمارت	حرم کعبہ کا عام انتظام اور نگرانی		
	۳	ایسار	فال نکالنے کی خدمت جس کا قاعدہ مقرر تھا	بنو جمح	صفوان بن امیہ
	۴	اموال محجرہ	بتوں کے نام پر حاصل شدہ نذرانوں کی حفاظت اور ان کا انتظام	بنو سہم	حارث بن قیس
حج اور عمرہ و ضروریات حجاج	۵	سقایہ	حاجیوں کے لئے پانی کا انتظام	بنو ہاشم	ابو طالب
	۶	رفادہ	حاجیوں کے لئے کھانے اور احرام کے کپڑوں کا انتظام		
	۷	اجازہ یا افاضہ	عرفات سے واپسی میں ترتیب قائم کرنا	صوفہ	
	۸	وقادہ	مزدلفہ میں روشنی کا انتظام	بنو عبد مناف	
	۹	نسی	لوند کا مہینہ معین کرنا	صوفہ	ابو ثمامہ جنادہ بن عوف
	۱۰	قبہ	حج کے موقع پر قبائل کے لیے قیام گاہوں نیز جنگ کے وقت خیموں اور خرگاہوں کا انتظام		

---

[1] البدایہ والنہایہ ۲۵۳، ج ۲

[2] طبقات ابن سعد ۴۳ ج ۱، البدایہ والنہایہ ۲۵۳ ج ۲

[3] ایضاً

[4] ماخوذ از طبقات ابن سعد ج ۱، اخبار مکہ العقدان، وسیرت ابن ہشام ج ۱

عدل وانصاف اور اجتماعی امور	۱۱	ندوہ	سماعت مقدمات اور درع وغیرہ کی تقریبات کا انتظام	بنو عبد الدار	عثمان بن طلحہ
	۱۲	مشورہ	اہم امور میں مجلس مشاورت کا انتظام	بنو اسد	یزید بن زمعہ
	۱۳	اشناق	خون بہا، جرمانہ اور مالی تاوان کا فیصلہ اور نظم	بنو تمیم	ابو بکر (الصدیق)
	۱۴	حکومت	مقدمات کی سماعت وفیصلہ	بنو سہم	حارث بن قیس
فوج وجنگ	۱۵	قیادت	فوجوں کی کمانداری	بنو امیہ	ابو سفیان بن حرب
	۱۶	لوار	علم برداری	بنو عبد الدار	
	۱۷	اعنہ	سواروں کے رسالہ کی سپہ سالاری	بنو مخزوم	خالد بن الولید
امور خارجہ	۱۸	سفارت	دوسرے ملک یا دوسرے فریق جنگ سے جنگ یا صلح کی گفتگو اور پیغام رسانی	بنو عدی	عمر فاروقؓ

بلند حوصلہ ہاشم بن عبد مناف

رفادہ اور سقایہ سب سے اہم شعبے تھے جن کے لئے دولت کی ضرورت بھی تھی اور محنت کی بھی ۔ یہ اگرچہ عبد مناف کے چاروں بیٹوں کے سپرد ہوئے تھے مگر ان میں پیش پیش ہاشم رہا۔ یہ سب بھائیوں میں سب سے زیادہ بلند حوصلہ، باسلیقہ، صاحب الرائے اور رسا آدمی تھا۔ رفادہ اور سقایہ کو جس قدر رقم کی ضرورت تھی ہاشم کا حوصلہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا۔

پہلے گزر چکا ہے قصی نے قریش کو سمجھایا تھا کہ زائرین (جو حج کو آتے ہیں) وہ قریش کے مہمان ہونے چاہئیں۔

حجاج کی خدمت کیلئے دعوتوں کا یہ سلسلہ ۷ ذی الحجہ (یوم الترویہ) سے ایک دن پہلے سے شروع ہو کر ۱۴ تک رہتا تھا۔ عرفات، منیٰ اور مزدلفہ جہاں جہاں حاجی جاتے تھے یہ دعوتیں ہوتی تھیں۔ ❶

ہاشم کا ذریعہ آمدنی تجارت تھی۔ شہنشاہ روم (ہرقل) سے تعلقات بہت اچھے تھے۔ ایسے ہی شاہان ایران ویمن اور حبش سے تعلقات تھے۔ اس نے ان تمام فرامین کی تجدید کرائی جو پہلے ہو چکے تھے اور رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیۡفِ (القریش۔۲) کا طریقہ اسی نے ایجاد کیا کہ قریش کا تجارتی قافلہ سردیوں میں یمن اور حبش جاتا تھا اور گرمیوں میں شام سے غزہ تک اور کبھی انقرہ تک پہنچ جاتا تھا۔ یہاں کے بادشاہ اور امراء ان قافلوں کا اعزاز کرتے تھے۔ ❷

---

❶ ابن سعد ص ۴۵ جلد ۱

❷ ابن سعد ص ۴۳ جلد ۱

مطلب ہاشم سے بڑے تھے۔ ہاشم کے بعد رفادہ اور سقایہ انہیں کے سپرد رہا مگر یہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے۔ کچھ دنوں بعد یمن گئے وہیں "روان" میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ❸ مطلب کے بعد عبدالمطلب جانشین ہوئے۔ یہ ان کی خداداد صلاحیت تھی کہ ہاشم کے صحیح جانشین ثابت ہوئے اور چند کام ایسے کئے جن سے نہ صرف قریش یا عرب کی تاریخ متاثر ہوئی بلکہ تاریخ اسلام بھی ان سے متاثر ہے۔ مثلاً: (۱) چاہ زمزم کی برآمدگی (۲) خزاعہ سے معاہدہ (۳) دیت کے اونٹوں کی تعداد میں اضافہ (۴) اصحاب فیل کے واقعے میں اہل مکہ کو محفوظ کر لینا۔

عبدالمطلب کے بعد خواجہ ابوطالب اور حق سقایہ

آنحضرت ﷺ کی عمر تقریباً ۸ سال تھی جب عبدالمطلب کا انتقال ہوا۔ عبدالمطلب کے جانشین ابو طالب قرار دیئے گئے۔ خدمت سقایہ ان کے سپرد ہوئی۔ ابوطالب اخلاق اور کمالات میں سب بھائیوں سے ممتاز تھے مگر دولت میں کم تھے۔ حج کا زمانہ آیا تو ہاتھ خالی تھے اور خدمت سقایہ کے لئے دس ہزار کی ضرورت تھی۔ انہوں نے یہ رقم اپنے بھائی عباس سے ایک سال کے وعدہ پر قرض لی۔ دوسرا سال آگیا قرض ادا نہ ہو سکا اور مزید خرچ کی ضرورت پیش آگئی تو بھائی عباس سے پھر ایک سال کے لئے چودہ ہزار قرض لئے۔ مگر اس مرتبہ عباس نے یہ طے کر لیا کہ اگر آئندہ سال تک یہ رقم ادا نہ ہو سکے تو آپ خدمت سقایہ میرے حوالہ کر دیں۔ خواجہ ابوطالب نے یہ شرط منظور کر لی۔ پھر یہ اتفاق ہوا کہ ابوطالب ادائیگی قرض کا انتظام نہ کر سکے تو حسب وعدہ خدمت سقایہ عباس کے حوالے کر دی۔ ❶ آنحضرت ﷺ نے اس کا احترام فرمایا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد بھی یہ خدمت سقایہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے نام پر ہی باقی رکھی۔

پورے عرب پر قریش کا ہمہ گیر اثر

نظام بت پرستی:

پورے عرب کو چند منطقوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر ایک منطقہ کا بت الگ ہوتا تھا۔ اس کا مندر الگ ہوتا تھا جس کے ساتھ اس کے تمام لوازمات ہوتے تھے۔ مثلاً بنو ثقیف نے "لات" کو اپنا دیوتا بنا رکھا تھا۔ طائف میں اس نام کا بت تھا۔ باشندگان یثرب (قبائل اوس اور خزرج) اور جو ان کے ہم مشرب و پیرو تھے ان کا مخصوص دیوتا "منات" تھا جو ساحل سمندر پر مشلل کے ایک جانب قدید میں تھا

---

❸ ابن سعد ص ۴۵ جلد ۱

❶ البدایہ والنھایہ ص ۲۴۷ ج ۲

جو ایک مقام کا نام تھا۔ ❷

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے جو دیوتا بنا رکھے تھے جب عرب میں بت پرستی کا رواج ہوا تو احیائی ذہنیت نے ان فراموش شدہ دیوتاؤں کو پھر یاد دلا دیا۔ پھر کسی طرح وہ مورتیاں بھی برآمد کر لی گئیں تو مختلف قبائل ان دیوتاؤں کے بھگت (پوجاری) ہو گئے۔ سیدنا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی تفصیل یہ بیان کی ہے۔ ❶

وُدّ: بمقام دومتہ الجندل۔ قبیلہ کلب اس کا بھگت تھا۔

سواع: بمقام رہاط، ساحل سمندر کے قریب۔ قبیلہ ہذیل اس کا بھگت تھا۔

یغوث: بمقام جرف (یمن) پہلے قبیلہ مراد اس کی خدمت کیا کرتا تھا پھر بنو غطیف اس کے خادم اور بھگت بن گئے۔

یعوق: اہل ہمدان اس کے پجاری تھے۔

نسر: ذی الکلاع (جو علاقہ حمیر) کا مشہور خاندان تھا اس کا بھگت تھا۔ یہ تمام صنم اور ان کے مندر اگرچہ علاقائی حیثیت رکھتے تھے مگر طواف، نذرانہ اور قربانی وغیرہ کی رسومات جو کعبہ میں انجام دی جاتی تھیں وہ یہاں بھی پوری کی جاتی تھیں۔ اور خانہ کعبہ کے خدام کے جو منصب تھے، کلید برادری، دربانی اور ایسار وغیرہ یہ تمام منصب ان علاقائی کعبوں کے خدام کے بھی ہوا کرتے تھے۔ اس طرح پورے عرب میں مندروں یا چھوٹے بڑے کعبوں کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ خدام اور پوجاریوں کے سیکڑوں خاندان اس نظام سے وابستہ تھے۔ اس پورے نظام کا مرکز کعبہ تھا۔ ❷ اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا "بیت اللہ" سمجھا جاتا تھا اور اسی کے گرد طواف کر کے حج کا مقدس فرض انجام دیا جاتا تھا۔ پس جو یہاں کے خادم تھے وہ پورے عرب کے مخدوم تھے اور جب کہ یعمر بن عوف کا یہ فیصلہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ وراثت ابراہیمؑ اور تولیت کعبہ کا حق قریش کو ہے تو قریش پورے عرب کے مخدوم اور مذہبی مقتدا تھے۔

سیاسی قیادت

بت پرستی کے اس نظام نے قریش کو پورے عرب کا مذہبی پیشوا ضرور بنا دیا تھا مگر قریش کی عظمت صرف اس نظام پر موقوف نہیں تھی، بلکہ اس زمانہ کے بین الاقوامی سیاسی گٹھ جوڑ نے بھی قریش

---

❷ بخاری شریف ۳۲۲

❶ بخاری شریف ص ۷۳۲

❷ سیرت ابن ہشام ص ۵۴ ج ۱

کو ایسی حیثیت دیدی تھی کہ پورے عرب کا اس سے متاثر ہونا ضروری تھا۔

روم (بازنطینی)، ایران اور حبش تینوں سلطنتوں کے بیچ میں عرب حد فاصل تھا۔

تینوں سلطنتیں عرب پر نظر رکھتی تھیں۔ قریش اس حیثیت کو پہنچانتے تھے اور اس سے کام لینا بھی جانتے تھے۔ قصی نے بنو خزاعہ کا مقابلہ کیا اور ان کو مکہ سے نکالا تو نہ صرف یہ کہ شہنشاہ روم (بازنطینی شہنشاہ) کی حمایت اس کو حاصل تھی بلکہ ابن قتیبہ کی شہادت یہ ہے کہ اعانہ قیصر علیہا ❸ (قیصر روم ❶ نے اس کو کمک بھی پہنچائی تھی)

قصی کے پوتوں نے ان تعلقات کو وسیع کیا اور لطف کی بات یہ ہے کہ ایران، روم، حبش اور ملوک یمن آپس میں ایک دوسرے کے حریف تھے مگر آل عبد مناف (قصی کے پوتوں) نے سب سے قریش کے لئے یکساں حقوق اور رعایتیں حاصل کرلیں۔ چنانچہ مطلب نے شاہ حبش (نجاشی) اور اس کے حریف شاہان یمن (ملوک حمیر) سے، نوفل نے شہنشاہ ایران (کسریٰ) سے اور ہاشم نے بازنطینی شہنشاہ ہرقل سے قریش کے لئے آزاد تجارت کے فرامین حاصل کرلئے۔ ❷

ابن سعد کا بیان ہے: ہاشم ایک شریف آدمی تھا۔ یہی ہاشم ہے جس نے قیصر (شہنشاہ روم) سے یہ حلف لیا تھا (فرمان حاصل کرلیا تھا) کہ اس کے حدود مملکت میں قریش کو آزادی ہوگی۔ ان کے جان ومال کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ قیصر روم نے یہ فرمان اپنی مملکت کے لئے دیا اور اپنے دوست ملک (حبش) کے بادشاہ نجاشی کو بھی لکھ دیا کہ وہ اپنے ملک میں قریش کو آمدورفت اور کاروبار کی اجازت دیں۔ ❸

ہاشم نے فرامین سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قریش کی تجارت کو منظم کیا۔ تجارتی قافلوں کا ایسا پروگرام بنایا کہ وہ سال بھر رواں رہتے اور جہاں جاتے موسم کی خوشگواری ان کا استقبال کرتی۔ سردیوں میں یمن کی طرف جاتے اور حبشہ تک تجارتی قافلے پہنچتے اور گرمیوں میں شام کی طرف غزہ تک اور کبھی انقرہ تک تجارتی قافلے پہنچتے تھے۔ بسا اوقات ہاشم خود ان کی قیادت کرتا تھا۔ ❹

دیگر قبائل کے لئے مراعات:

ان طویل راستوں میں جو قبائل پڑتے تھے ان کے لئے مراعات یہ تھیں کہ قریش کے قافلے ان

---

❸ معارف ابن قتیبہ ۲۱۵ ملوک الشام

❶ بازنطینی شہنشاہ کو عرب قیصر کہا کرتے اور ایران کے شہنشاہ کو کسریٰ اور شاہ حبش کو نجاشی کہا کرتے تھے۔

❷ طبقات ابن سعد ۴۳ جلد ۱

❸ ابن سعد ۴۵ ج ۱

❹ ابن سعد ۴۳، ۴۵، ج ۱

کا سامان بھی لے جاتے۔ مزید احسان یہ کرتے کہ سامان لیجانے لانے کا محصول تو در کنار بار برداری کا خرچ بھی نہ لیتے تھے۔ [5]

مکہ مکرمہ پورے عرب کا مرکزی شہر (ام القریٰ) تھا۔ سیاسی قیادت کے لئے یہی کافی تھا کہ قریش ام القریٰ پر قابض اور اس کے مالک تھے۔ مزید بر آں آل مناف نے پڑوسی ممالک سے یہ رعایتیں حاصل کرکے قریش کے آسمان قیادت کو ماہ و پروین اور کہکشاں سے آراستہ کردیا۔ اب پورا عرب قریش کا کلمہ گو اور اس کے احسانات کا ممنون تھا۔

عرب کا تجارتی نظام اور قریش کی سربراہی

بت پرستی کے منطقوں کی طرح عرب کے ایسے علاقے بھی ہو گئے تھے جن کو تجارتی منطقہ کہا جاسکتا تھا۔

قصبوں اور شہروں میں چھوٹے بڑے بازار بھی تھے۔ ہفتہ وار بازار بھی جگہ جگہ لگا کرتے تھے۔ لیکن ہر ایک منطقہ کے مرکزی مقام پر ایک میلہ سالانہ ہوتا تھا جس میں نہ صرف عرب بلکہ قریب کے (غیر عرب) علاقوں کے تاجر بھی مال لاتے، دوکانیں لگاتے اور نفع کماتے تھے۔ یہ پہلے سال کے بارہ مہینوں میں دائر سائر رہتے۔ مورخین نے ان میلوں کی تفصیل و ترتیب یہ بیان کی ہے۔

(۱) دومتہ الجندل میں جو شام و حجاز کے مابین ہے۔ یکم ربیع الاول کو میلا لگتا جو پورے مہینہ رہتا۔

(۲) یہاں سے لوگ چل کر بحرین میں مشقر آتے۔ یہاں یکم سے آخر جمادی الاخریٰ تک میلہ لگتا اور دومتہ الجندل کی طرح یہاں بھی مقامی حکمران کو عشر (دس فیصدی) (چنگی یا کسٹم) دیا جاتا۔ ایران تک کے تاجر سامان لے کر یہاں آتے۔

(۳) یکم رجب کو مشقر سے بازار اجڑتا تو صحار کے لئے روانگی ہوتی جو عمان کا پر رونق شہر تھا۔ تقریباً بیس دن راستہ میں صرف ہوتے۔ یہاں پانچ دن کا میلہ ہوتا اور بادشاہ جُلندی کو عشر دیا جاتا تھا۔

(۴) رجب کے آخر میں دبا کا میلہ شروع ہوتا۔ یہ عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھا۔ یہاں سندھ، ہند، چین اور مشرق و مغرب کے لوگ آتے اور خشکی اور سمندر کے راستوں سے سامان لاتے، یہاں کا عشر بھی بادشاہ جلندی کو ملتا۔

(۵) اس کے بعد مہرہ کے شہر شجر میں وسط شعبان سے میلہ لگتا جہاں بری اور بحری جہاز دبا سے چل کر آتے۔ یہ کھالوں اور کپڑے کی خاص منڈی تھی۔ مقامی پیداوار کی جنسیں ایلوا، لوبان وغیرہ بھی

---

[5] ابن سعد ۴۵ قرآن حکیم نے اس سلسلہ کو ایلاف سے تعبیر کیا ہے (یعنی مانوس کرنا) تشریح آگے آئے گی۔ انشاءاللہ۔

یہاں سے خریدی جاتیں۔

(۶) پھر یکم رمضان سے عدن میں میلا لگتا۔ عدن میں جو عطر بنتا تھا اس کی دور دور تک شہرت تھی۔ بحری راستہ سے آنے والے سندھ اور ہند تک اور خشکی کے راستہ سے آنے والے ایران اور روم تک یہاں کا عطر لے جاتے تھے۔ یہاں کا عشر ایران کے نو آباد کار افسر لیتے تھے۔

(۷) عدن کے بعد صنعاء (یمن) کا میلہ لگتا جو وسط رمضان سے آخر رمضان تک رہتا۔ یہاں روئی، زعفران، مختلف قسم کے رنگوں اور لوہے کی منڈیاں تھیں یہاں کا عشر بھی شاہ ایران کا گورنر لیتا تھا۔

(۸،۹) وسط ذی قعدہ سے آخر ماہ تک دو میلے لگتے :

(الف) رابیہ میں جو علاقہ حضر موت کا ایک شہر تھا۔

(ب) عکاظ میں جو مکہ اور عرفات کے درمیان شہر تھا۔

(۱۰) عکاظ کے قریب ذی المجاز ہے۔ یہاں یکم ذی الحجہ سے میلہ لگتا جو دس ذی الحجہ تک رہتا۔

(۱۱) زمانہ حج میں (۱۰ ذی الحجہ سے ۱۵ ذی الحجہ تک) منیٰ میں میلا لگتا۔

(۱۲،۱۳) منیٰ سے فارغ ہو کر لوگ خیبر یا یمامہ جاتے جہاں محرم کی دسویں سے میلے لگتے۔

(۱۴،۱۵) اس کے بعد جنوبی فلسطین میں بصریٰ اور اذرعات کے میلے لگتے۔ [1]

ان تمام میلوں میں سب سے زیادہ اہمیت عکاظ اور ذوالمجاز کے میلوں کو تھی۔ کیونکہ (الف) یہ میلے شہر حرم میں لگتے تھے۔ جو پورے عرب کے لئے امن و پناہ کے مہینے تھے۔ اس لئے سب طرف سے بڑی بڑی تعداد میں تاجر اور زائرین امن کی بانسری بجاتے ہوئے یہاں آتے، رسومات حج ادا کرتے، مال خریدتے اور عیش و تفریح کی مجلسیں جماتے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس میلہ میں عام نگرانی، حفاظت اور جو ہنگامے ہو جاتے ان کے مقدمات کی سماعت اور ان کا فیصلہ کرنا "قبیلہ تمیم" کے متعلق ہوتا تھا۔ جبکہ قبیلہ تمیم کا مسکن عرب کی انتہا، مشرق تھا اور مکہ و عکاظ انتہا مغرب میں تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ان میلوں سے پورے عرب کا تعلق رہتا اور تعلق بھی عقیدتمندانہ ہوتا تھا۔

میدان تجارت میں قریش کی سربراہی

(۱) عکاظ اور ذی المجاز کے مذکورہ بالا عظیم الشان میلوں کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ تھی کہ اس موقع پر بڑے بڑے اجتماعات بھی ہوا کرتے تھے جن میں پورے عرب کے اساتذہ شعر و سخن شرکت کرتے، ادبی مقابلے ہوتے، دھوم دھام سے مشاعرے ہوتے۔ مشہور مقررین کی تقریریں

---

[1] کتاب المحبر واسواق العرب لمحمد بن حبیب (مرزوقی)

ہوتیں جن میں وہ اپنے قبائل کے کارنامے بیان کرتے۔ مختصر یہ کہ مذہبی جشن (حج) کے ساتھ قومی جشن بھی منائے جاتے تھے۔ ان میلوں کے جملہ انتظامات قریش سے متعلق تھے یا قریش کے تعاون سے ہوتے تھے۔ اس طرح میلوں کے سلسلہ میں بھی قریش کو سربراہی حاصل تھی۔

(۲) قریش نے جب تجارت کو منظم کرتے ہوئے رحلتہ الشتاءوالصیف موسم گرما اور سرمائی قافلوں کا طریقہ ایجاد کیا اور اس طرح ان کا تجارتی سلسلہ عرب کے چپہ چپہ میں پھیل گیا تو انہوں نے ایک حفاظتی فوج بھی تیار کی جس میں حبشی غلام اور تنخواہ دار سپاہی ہوتے تھے۔ اس کو قائمہ کہا جاتا تھا۔ یہ فوج قریش کے قافلوں کی طرح حلیف قبائل کے قافلوں کی بھی حفاظت کرتی تھی۔ [1]

(۳) جیسا کہ [2] پہلے گذر چکا ہے عرب میں نہ کوئی سلطنت تھی نہ حکومت، نہ فوج، نہ پولیس، البتہ قبائلی معاہدات کا ایک سلسلہ تھا جو افراد کی جان ومال کی حفاظت کا ذریعہ ہوتا تھا۔ قبائل کے معاہداتی گروپ تھے۔ جو فرد کسی گروپ سے تعلق رکھتا تھا تو پورا گروپ اس کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ اس ذمہ داری کا نام خَفارت [3] تھا۔ راہرو کو اس کی سند دیدی جاتی تھی تو وہ اس گروپ کے حدود تک محفوظ رہتا تھا۔ اس سند کو بھی خفارت ہی کہا جاتا تھا (یعنی پروانہ راہداری یا ویزا) کبھی خفارت پر معاوضہ بھی لیا جاتا تھا۔

قریش کے تعلقات کا دائرہ پورے عرب کو گھیرے ہوئے تھا تو اس کا "پروانہ راہ داری" خفارہ بھی پورے عرب کے لئے کافی ہوتا تھا۔

(۴) تنظیم تجارت اور تجارتی قافلوں کے ذریعہ جب دوسرے ممالک سے تجارتی تعلقات قائم ہوئے تو پہلے تو یہ ہوا کہ تجارتی قافلے واپسی کے وقت شام اور یمن وغیرہ سے غلہ بھر کر لاتے تھے تو مکہ اور اطراف مکہ جہاں کاشت کا نام ونشان نہیں تھا وہاں غلہ کی فراوانی ہوگئی۔ پھر ان ممالک کے باشندوں نے خود بھی غلہ کی روانگی (سپلائی) شروع کر دی۔ خشکی کے راستوں سے بھی غلہ آتا اور بحری راستہ سے بھی جدہ کی بندرگاہ پر غلہ اتارا جاتا تھا۔ [4]

یہ تھے وہ اسباب جن کی بناء پر قریش کو مذہبی عظمت اور سیاسی قیادت کی طرح اقتصادی برتری اور تجارتی سربراہی بھی حاصل ہوگئی۔

---

[1] المحبر لمحمد بن حبیب

[2] زیر عنوان معاہداتی حکومت

[3] اس ذمہ داری کی خلاف ورزی کو اخفاء کہتے تھے۔ کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانه من صلی الغداۃ فی ذمة اللہ فلا یخفرن اللہ فی ذمته (مجمع البحار)

[4] ابن قتیبہ کے استاذ محمد بن حبیب المتوفی ۲۴۵ھ، ۸۵۹ عیسوی نے اپنی کتاب المحبر میں اس کی تفصیل دی ہے ص ۲۶۳، ۲۶۴۔

واقعہ اصحاب فیل

قصی کا زمانہ بظاہر چوتھی صدی عیسوی کا وہ ابتدائی نصف ہے جب مسیحیت، جدید ترتیب کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی تھی۔ تثلیث کو جزو دین بنایا گیا تھا اور قسطنطین اول نے مسیحیت قبول کر کے حکومت کا مذہب بھی عیسائیت قرار دیدیا تھا۔ جب مسیحیت کا مرکز رومتہ الکبریٰ اٹلی بنا تو مسیحیت کی لہران تمام علاقوں میں پہنچی جو بازنطینی شہنشاہیت کے زیر اثر اور اس بلاک میں داخل تھے۔ عرب کے وہ علاقے جو شام سے متصل تھے، افریقہ کے علاقے خصوصاً حبش اور یمن کے بھی کچھ علاقے عیسائیت سے متاثر ہوئے۔[1]

بازنطینی شہنشاہ (قیصر روم) نے قصی کی امداد کی پھر ہاشم کے ساتھ یہ مراعات کی کہ قیصر نے اپنی طرف سے بھی اس کو آزادانہ تجارت کا پروانہ دیا اور شہنشاہ حبش سے بھی مراعات دلوائی۔ اس کا مقصد خالص سیاسی بھی ہو سکتا ہے کہ ایران کے مقابلہ میں عربوں کو اپنی طرف مائل اور تجارتی راستوں کو اپنے زیر اثر رکھے۔ اور اس کا مقصد مذہبی بھی ہو سکتا ہے کہ عرب میں عیسائیت کو رواج دے۔ غالباً اسی سلسلہ کی آخری کڑی یہ تھی کہ ابرہہ نے (جو خود عیسائی تھا اور حبش کے عیسائی بادشاہ نجاشی کی طرف سے یمن کا گورنر تھا) یمن کے مرکزی شہر صنعاء میں نہایت عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا[2] تو عربوں کو ہدایت کی کہ وہ خانہ کعبہ کے بجائے اس کلیسا کو اپنا معبد بنائیں اور اسی کا طواف کیا کریں۔ مگر جب عربوں نے اس کا انکار کیا تو ابرہہ نے لشکر کشی کر دی۔

ابرہہ نے دریافت کیا: آپ کیا چاہتے ہیں۔ خواجہ عبدالمطلب نے جواب دیا۔ آپ کی فوج نے میرے دو سو اونٹ لوٹ لئے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کو واپس کرادیں ۔ ابرہہ حیران ہوا۔ اس نے ترجمان سے کہا: ان سے کہو کہ آپ کی وجاہت اور شاندار صورت سے میں متاثر ہوا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ آپ کوئی بڑا مطالبہ پیش کرینگے، آپ نے صرف اپنے اونٹوں کی واپسی کی درخواست کی اور تعجب ہے آپ نے اس کعبہ کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جو آپ کا اور آپ کے آباو اجداد کا دین اور دھرم رہا ہے۔

خواجہ عبدالمطلب نے جواب دیا:

”اس بیت کا ایک رب ہے اس کا محافظ وہ ہے اس کی فکر وہ کرے گا۔ میں اس بیت کا مالک نہیں ہوں، میں ان اونٹوں کا مالک ہوں جن کی واپسی کی میں نے درخواست کی ہے۔“

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں ص، ۲۸۴ تا ۳۰۱

[2] ابن سعد ص ۵۵، ج ا

ابن ہشام ❸ کی روایت ہے کہ حناطہ نے عبد المطلب سے پہلے دو اور سرداروں کو پیش کیا تھا۔ ایک قبیلہ بنی بکر کے شیخ عمر بن نفاثہ اور دوسرے قبیلہ ہذیل کے سردار خویلد بن نائلہ۔ ان دونوں نے یہ پیش کش کی تھی کہ مکہ میں جو کچھ دولت ہے اس کی ایک تہائی ابرہہ منظور کرلے اور ہدم کعبہ کے ارادہ سے باز آجائے۔ مگر ابرہہ نے اس پیش کش کو مسترد کردیا۔ اس روایت کو سامنے رکھا جائے تو عبد المطلب کی یہ موقع شناسی تھی کہ انہوں نے کعبہ کے متعلق ابرہہ سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ صرف اپنے اونٹوں کی بات کی اور کعبہ کا معاملہ رب کعبہ کے حوالہ رکھا۔

ابرہہ نے اونٹ واپس دلوادیئے۔ عبد المطلب ان کو لے کر مکہ میں آئے۔ تمام اونٹ ❶ قربانی کے لئے وقف کردیئے اور مکہ والوں کو ہدایت کی کہ شہر خالی کرکے پہاڑوں پر چلے جائیں۔

پھر تنہا اور ایک روایت کے مطابق چند ساتھیوں ❷ کو لے کر حرم کعبہ میں آئے اور خانہ کعبہ کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر حلقہ باب کو سنبھالا اور یہ منظوم دعا❸ کی:

۱۔ لاھم ★ ان العبد یمنع رحلہ فامنع حلالك

۲۔ لا یغلبن صلیبھم و محالھم غدوا محالك

۳۔ ان کنت تارکھم وقبیلتنا فامر مابدالك

یہ تین اشعار ابن سعد اور ابن ہشام نے نقل کئے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ دو شعر بھی مروی ہیں:

۴۔ جروا جموع جموعھم۔ والفیل کی یسبو عیالك۔

۵۔ عمدوا حماك بکیدھم۔ جھلا و مارقبوا جلالك

ترجمہ: (۱) اے اللہ! ایک غلام اپنے کجادہ کی حفاظت کرتا ہے۔ بس خداوند تو ان کی حفاظت کر جو تیرے بیت کے پڑوسی اور مجاور ہیں۔ (۲) ایسا ہرگز نہ ہو کہ ان کی تدبیر اور ان کا مکر و فریب کل کو تیری تدبیر پر غالب آجائے۔ (۳) اگر میں ان دشمنان کعبہ کو اور اپنے قبیلہ کو چھوڑ کر جارہا ہوں (کہ میں مجبور اور بے بس ہوں۔ میرے لئے کوئی چارہ کار نہیں ہے تو خداوندا) جو تیرا ارادہ ہو اس کا حکم کردے۔ (۴) یہ اپنے بے شمار لشکروں کو لے آئے ہیں اور ہاتھیوں کو لائے ہیں تاکہ باشندگان مکہ کو جو تیرے عیال ہیں قید کرلیں۔ (۵) انہوں نے اپنے مکر و فریب اور جہالت سے تیرے حِما (محفوظ

---

❸ سیرۃ ابن ہشام ص ۴۳ جلد ۱

❶ ابن سعد ص ۵۶، ج ۱

❷ عمرو بن عائذ۔ مطعم بن عدی۔ ابو مسعود ثقفی ابن سعد ۵۶ ج ۱

❸ عبد المطلب نے جو جوابات دیئے ان سے نیز اس دعا سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خدا پرست موحد تھے: والاشبہ انہ من اھل الفترۃ وممن لم تبلغہ الدعوۃ (حاشیہ سیرۃ ابن ہشام ص ۴۳ ج ۱)

★ اصل اللّٰھمّ

علاقہ۔ حرم) کا قصد کیا ہے۔ انہوں نے تیری عظمت کا پاس ولحاظ نہیں کیا۔"

اس کے بعد کیا ہوا۔ تاریخ عالم کا وہ عبرت انگیز اور ہولناک حادثہ پیش آیا جس کا تذکرہ قرآن حکیم نے بھی کیا ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ ابرہہ عظیم الشان مسلح فوج کے ساتھ تیرہ قلعہ شکن ہاتھی لایا تھا۔ ان میں سب سے بڑا ہیبت ناک اور بڑے ڈیل ڈول کا ہاتھی محمود تھا۔ وہ ہاتھیوں کی کمان کر رہا تھا۔ جب حملہ کا وقت آیا تو یہ ہاتھی اپنی جگہ جم گیا۔ بہت مارا پیٹا مگر یہ آگے کی طرف حرکت نہ کرتا، دائیں بائیں اس کا رخ کر دیا جاتا تو خوب لپک کر چلتا۔

یہاں ہاتھی کا یہ تماشا ہو رہا تھا۔ ادھر آسمان پر پرندوں کی قطار نمودار ہوئی۔ ایک پرندہ تین کنکریاں لئے ہوئے تھا۔ ایک ایک چونچ میں دو دو پنجوں میں۔ یہ کنکریاں چنے کی اور مسور کے دانے کے برابر تھیں۔ یہ کنکریاں جس پر پڑتیں اس کا چورا کر دیتی تھیں۔ پھر پانی کی ایک رو آئی اس نے ان سب کو بہا کر سمندر میں ڈال دیا۔ ابرہہ اور اس کے مخصوص ساتھی اس وقت ختم نہیں ہوئے۔ وہ بھاگے اور طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا ہو کر راستہ ہی میں مر گئے۔ ابرہہ کو ایسی بیماری لگی کہ اس کا بدن گل گیا، ایک ایک عضو گل کر گرتا رہا۔ وہ صنعا پہنچ گیا مگر اس حالت میں پہنچا کہ گوشت کا لوتھڑا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس کا سینہ پھٹا۔ دل باہر نکل آیا اور دل کے ساتھ جان بھی نکل گئی۔ [1]

واقعہ اصحاب فیل کے نتائج

جیسے یہ واقعہ غیر معمولی تھا، قدرتی بات تھی کہ نتائج بھی غیر معمولی ہوئے۔ سیاسی لحاظ سے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

(۱) عربوں کو قیصر روم اور اس کے ماتحت حکومتوں سے نفرت ہوئی۔ اس واقعہ سے تقریباً پچاس سال بعد جب روم کی فوجوں کو ایران نے شکست دی تو مکہ والے بہت خوش ہوئے۔ [2]

(۲) یمن کی وہ طاقتیں جو ابرہہ کی طاقت کے سامنے جھک گئی تھیں ابھریں اور انہوں نے شہنشاہ ایران (کسریٰ) سے مدد لے کر ابرہہ کے باقی ماندہ اثرات کو یمن سے ختم کیا۔

(۳) یمن کی یہ ابھرنے والی طاقتیں اچھی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں۔ ان میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تو کسریٰ نے براہ راست یمن کے ایک علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور وہاں اپنا گورنر مقرر کر دیا۔ [3]

---

[1] ابن ہشام ۵۴ ج ۱

[2] سورہ روم کی ابتدائی آیتوں میں اس کی طرف اشارہ ہے

[3] جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو کسریٰ کی طرف سے یمن کا گورنر باذان تھا جو دولت اسلام سے مشرف ہوا۔ (ابو الفداء)۔

تصدیق کلام

اصحاب فیل کا یہ واقعہ جس طرح قادر ذوالجلال کی قدرت بے پایاں کا مظاہرہ تھا ایسے ہی قریش پر احسان عظیم بھی تھا۔ قریش خراب وخستہ تھے مگر رب ذوالجلال کو ان سے کام لینا تھا۔ یہی قریش تھے جنھوں نے کچھ دنوں بعد دنیا کا چولا بدلا اور عالم انسانیت کو ایسے زیور سے آراستہ کیا جو اسی طرح بے مثال وبے نظیر ہے جس طرح تاریخ عالم میں اصحاب فیل کا واقعہ بے نظیر ہے۔

سورہ فیل میں اللہ تعالیٰ نے اسی احسان عظیم کا تذکرہ فرمایا ہے۔ خطاب اگرچہ آنحضرت ﷺ کو (یا ہر اس شخص کو ہے جو قابل خطاب ہو) مگر روئے سخن قریش کی طرف ہے۔ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے الفاظ میں کسی قدر تشریح کے ساتھ یہ ہے:

"تونے نہیں دیکھا، کیا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ۔ کیا نہ کر دیا ان کا داؤ غلط۔ اور بھیجے ان پر اڑتے جانور تنک تنک (ٹکڑیاں بناکر) پھینکتے ان پر پتھریاں کنکر کی (ٹھیکرے کی) پھر کر ڈالا ان کو جیسے بھس ہو کھایا ہوا۔"

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے قریش کو خاص طور سے حکم دیا ہے کہ وہ رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ کی عبادت کریں اور اس حکم کی معقولیت کے لئے وہ احسانات شمار کرائے ہیں، جن کی تفصیل وہ ہے جو اس کتابچہ کے اوراق میں پیش کی گئی۔ مختصر یہ ہے کہ

(۱) اس سورت میں سب سے زیادہ بیت پر زور دیا گیا ہے، یہاں تک کہ ذات معبود کے لئے اللہ یا رحمن کے بجائے رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ کا لفظ لایا گیا ہے کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ عظمت قریش کے قلعہ معلی کا سنگ بنیاد بیت ہی تھا (یعنی کعبہ)۔

(۲) یہی بیت تھا جس کی وجہ سے قریش کا اثر عرب پر قائم ہوا۔ قریش نے بیت کی خدمت کی اور وہ عرب کے سرتاج بنے۔

(۳) قریش نے بیت اللہ کی زیارت کرنے والوں (حجاج) کی خدمت کی وہ پورے عرب میں محبوب ہوگئے۔

(۴) یہی محبوبیت تھی جس کی بناء پر پورے عرب کی پر آشوب اور خوں آشام زمین ان کے لئے امن کا گہوارہ بن گئی۔ چار ماہ کے بجائے پورے بارہ ماہ ان کے لئے حرم رہتے تھے اور بلا خطر جہاں چاہتے جاتے تھے۔

(۵) یہی عظمت تھی جس کی بنا پر وہ قیصر وکسریٰ اور نجاشی تک پہنچے اور ان سے تجارت کے پروانے حاصل کئے۔

(۶) اندرون عرب عربوں کی عقیدت اور ان کی ارادتمندی اور احسان شناسی اور بیرون عرب فرامین شاہی کی طاقت نے قریش کو موقع دیا کہ ان کا رہنما ہاشم رِحْلَةَ الشِّتَآءِ اور رِحْلَةَ الصَّيْفِ الصیف کا طریقہ ایجاد کرسکا اور تجارت کو منظم کرسکا۔

(۷) مکہ اور اطراف مکہ میں غلہ عنقا تھا۔ شکار کا گوشت اور کھجوریں عام غذا تھی۔ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّيْفِ کی

ایجاد نے ان کو موقع دیا کہ وہ واپسی کے وقت غلہ لاسکیں اور عرب کا فاقہ توڑ سکیں۔

(۸) کلبی کی تحقیق یہ ہے کہ ہاشم ابن عبد مناف پہلا شخص ہے جو شام کے علاقہ میں تجارتی قافلہ لے کر گیا اور وہاں سے گیہوں بھر کر لایا۔ ❶

(۹) اسی سورت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد یہ ہے کہ قریش کی حالت نہایت ابتر تھی وہ فاقہ کش تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہاشم کو توفیق بخشی کہ انہوں نے رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّيْفِ کا طریقہ ایجاد کیا۔ اب ان کو بہت کافی نفع ہوتا تھا۔ بڑے تاجر اپنے منافع غریبوں اور فقیروں کو تقسیم کر دیا کرتے تھے تو ان کے فقیر بھی امیروں کی طرح ہو جاتے تھے۔ ❷

(۱۰) جب رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّيْفِ سے تجارتی تعلقات دوسرے ممالک سے قائم ہو گئے تو پھر غلہ کی درآمد کیلئے ان قریشی قافلوں کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ بلکہ دوسرے ممالک خود غلہ بھیجنے لگے۔ یمن میں تُبالہ اور جُرش میں بہت غلہ پیدا ہوتا تھا۔ وہاں کے کچھ تاجر بحری راستہ سے بندر گاہ جدہ پر غلہ پہنچاتے تھے۔ کچھ تاجر خشکی کے راستہ سے براہ راست مکہ غلہ پہنچاتے تھے۔ اسی طرح شام کے تاجر بھی غلہ سپلائی کرتے تھے۔ ❸ یہ اونٹ اور خچر اور گدھے جن پر خشکی کے راستوں سے غلہ آتا تھا ان کا پڑاؤ محصبّ ہوتا تھا جس کو ابطح، بطحا اور خیف بنی کنانہ بھی کہتے تھے ❹ جو مکہ اور منیٰ کے درمیان ہے۔ یہ ہے اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ (کھانا دیا بھوک میں) کا احسان عظیم۔

(۱۱) حرم کعبہ کا احترام اگرچہ حضرت اسماعیل و حضرت ابراہیم علیہ اسلام کے زمانہ سے چلا آرہا تھا اور اس وجہ سے حرم مکہ کے رہنے والے مامون رہا کرتے تھے۔ مگر جب رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّيْفِ کے سلسلہ میں مامونیت کا تذکرہ ہے تو اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ قریش کے یہ سرمائی اور گرمائی قافلے مال لیجانے اور لانے میں راستہ کے قبائل کی جو خدمت کیا کرتے تھے، اس حسن سلوک نے قریش کو خارج حرم ان قبائل کی حدود میں بھی محفوظ و مامون کر دیا تھا جن کا پیشہ ہی غارتگری تھا۔ عبادت رب کے حکم کی معقولیت سمجھانے کیلئے ان گیارہ احسانات کی طرف اس سورت (سورہ قریش) میں اشارہ کیا اور ایک احسان عظیم وہ تھا کہ مکہ اور اہل مکہ کو اصحاب فیل سے محفوظ رکھا۔ اس کی نوعیت چونکہ جداگانہ تھی کہ وہ دنیاوی اسباب سے بالا و برتر محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کا معجزہ تھا، تو اس کو مستقل سورت میں ذکر فرمایا اور بظاہر یہی حکمت ہے ان دونوں سورتوں کے متصل ہونے کی۔

---

❶ تفسیر مظہری (تفسیر سورۃ قریش)
❷ ایضاً
❸ معالم التنزیل
❹ معجم البلدان

ولادت محمدی ﷺ

ظہور بشارت عظمیٰ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو بشارت دی تھی یاتی من بعدی اسمہ احمد (میرے بعد ایک رسول آئے گا جس کا نام احمد ہو گا) (٦١:٦)

۲۵ اپریل ۵۷۱ء کو اس جان آفریں بشارت کا ظہور ہوا۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ ہدایت و رحمت کا یہ آفتاب افق مکہ پر طلوع ہوا۔ ربیع الاول کی بارہ تھی۔ ❶

نام نامی:

اس چہیتے بچہ کا نام دادا نے "محمد" والدہ نے "احمد" رکھا۔ باپ (عبد اللہ) کا انتقال دو مہینے پہلے ہو چکا تھا۔ ❷

والدہ کا نام آمنہ تھا اور دادا کا نام عبد المطلب جو قریش کے سردار اور مکہ کے بڑے لوگوں میں سے تھے۔ آمنہ کے باپ کا نام وہب تھا پسر عبد مناف پسر زہرہ پسر کلاب پسر مرہ۔ کلاب پر مادری اور پدری دونوں سلسلے جمع ہو جاتے ہیں۔

---

❶ مشہور یہی ہے ھذا ھوالمشھور عندالجمھور (البدایہ والنہایہ ۲۶۰ ج ۲) مگر مورخین نے ۱۲ کے علاوہ اور تاریخیں بھی بیان کی ہیں۔ فلکیات کے ماہر علامہ محمود فلکی نے ۹ ربیع الاول صحیح قرار دی ہے۔ حضرت الاستاذ العلام المحدث مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمتہ اللہ، ان کے علاوہ علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی علامہ محمود فلکی کی تحقیق کو تسلیم کیا ہے۔ یعنی ۹ ربیع الاول ۲۱ اپریل ۵۷۱ء

❷ وہ تجارتی قافلہ میں شام گئے تھے غلہ لینے کے لئے۔ واپسی میں جب قافلہ مدینہ پہنچا تو عبد اللہ بیمار ہو گئے۔ مدینہ کے مشہور قبیلہ بنی عدی بن نجار سے ننھیالی رشتہ تھا۔ عبد اللہ یہیں ٹھہر گئے قافلہ والوں نے مکہ پہنچ کر خواجہ عبد المطلب کو عبد اللہ کی بیماری کی خبر دی۔ عبد المطلب نے اپنے بڑے لڑکے حارث کو مدینہ بھیجا۔ مگر عبد اللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ دار النابغہ میں ان کو دفن کیا گیا۔ پچیس سال عمر ہوئی۔ ترکہ میں بکریوں کا ایک گلہ، پانچ اونٹ ایک باندی "ام ایمن" چھوڑی۔ (طبقات ابن سعد ص ٦١ ج ١)

رضاعت و شیر خوارگی اور مرضعات

(دودھ پلانیوالی مائیں)

زعم برتری اور خوش حالی کا ایک تکلف یہ تھا کہ بیگمات اپنے بچوں کو خود دودھ نہیں پلاتی تھیں۔ کچھ عرصہ بچہ ماں کے پاس رہتا تو دودھ پلانے میں خاندان کی عورتیں یا باندیاں مدد کیا کرتی تھیں۔ پھر بچہ کو مستقل طور پر کسی ماما کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔

قریش کو اپنی زبان سے عشق تھا۔ وہ شخص قوم کا سردار نہیں مانا جاسکتا تھا جو فصیح نہ ہو۔ بچپن ہی سے زبان کی حفاظت کی جاتی تھی اور بچوں کو فصیح عربی کا عادی بنایا جاتا تھا۔ مکہ شہر میں یہ ممکن نہیں تھا کہ بچے ٹکسالی فصیح عربی کے عادی ہوں کیونکہ یہ ایک تیرتھ تھا جہاں غیر قریشی عرب جو فصاحت سے ناآشنا ہوتے تھے، ہمیشہ آتے رہتے تھے۔ یہاں قیام کرتے تھے۔ تجارت کے سلسلہ میں بھی آمدورفت رہتی تھی اور زبان کے لحاظ سے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ یہاں عجمی (شام اور افریقہ وغیرہ کے غلام) بکثرت رہتے تھے۔ ایک ایک گھرانے میں کئی کئی غلام ہوتے تھے۔ ان کی مخلوط عربی مضحکہ خیز ہوتی تھی اور بچوں کا واسطہ زیادہ تر انہیں غلاموں سے پڑتا تھا۔ اس لئے قریش نے کچھ ایسے دیہاتی قبائل منتخب کر رکھے تھے جن کی زبان فصیح مانی جاتی تھی۔ انہیں قبائل کی عورتوں کو وہ اپنے بچوں کی "ماما" بناتے تھے۔ ان قبائل کی عورتیں مکہ میں آتیں اور بچوں کو لے جاتیں۔ وہی دودھ پلاتیں اور وہی پرورش کرتیں۔ انہیں کی ٹکسالی عربی کے الفاظ بچوں کے کانوں میں پڑتے۔ انہیں الفاظ کی ادائیگی کے لئے بچوں کی زبان پہلی مرتبہ پلٹتی اور فصاحت گویا ان کی گھٹی میں پڑ جاتی۔

زبان کی حفاظت کے علاوہ صحت کے لحاظ سے بھی دیہات کی کھلی ہوا بچوں کے لئے مفید ہوتی تھی۔ اس سماجی رسم کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ بچوں کی نشوونما صحت مندانہ [1] ہو۔ اخلاق و خصائل کے لحاظ سے بھی یہ قبیلے پست نہیں تھے۔ یتیم عبداللہ کے دور رضاعت کو خاندانی آداب کے اسی سانچہ میں ڈھلنا پڑا۔ چنانچہ آپ کی والدہ نے تو صرف سات یا نو روز دودھ پلایا۔ پھر ابولہب کی آزاد کردہ باندی ثوبیہ نے سات ماہ دودھ پلایا۔ ابولہب کی باندی ثوبیہ نے جب گوشہ جگر عبداللہ کی ولادت کی خبر سنائی تو ابولہب نے اس خوشی میں اس باندی کو آزاد کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ کچھ اور خواتین کے نام بھی لئے جاتے ہیں جنہوں نے دودھ پلایا۔ اس کے بعد آپ حضرت حلیمہ کے سپرد کئے گئے جو آپ کو قبیلہ بنی سعد میں لے گئیں۔ کم و بیش چار سال آپ نے اسی قبیلہ میں گزارے۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۱۰۱، ج ۱

سیّدہ آمنہ مدینہ میں

مدینہ منورہ جس کا نام اُس وقت یثرب تھا۔ سیدہ آمنہ کا وہاں ننہیالی رشتہ تھا۔ حضرت محمد (ﷺ) حلیمہ سعدیہ کے یہاں سے آ گئے تو تقریباً تیرہ سال بعد سیّدہ آمنہ مدینہ گئیں۔ اپنے نور چشم لختِ جگر کو بھی لے گئیں اور خدمت کے لیے متوفی عبد اللہ کی باندی "ام ایمن" بھی ساتھ گئیں۔ وہاں دارالنابغہ میں قیام کیا۔ یتیم عبد اللہ۔ آمنہ کا لال جس طرح حُسن و جمال میں موتی تھا۔ اُس کی خصلتیں بھی سب بچوں سے نرالی تھیں۔ ذہین بچے شریر ہوتے ہیں مگر آمنہ کے اس جگر گوشہ میں ذہانت تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، شرارت کا نام نہ تھا۔ ہر بات میں ادب اور تہذیب۔ ہر ایک کام سلیقہ کا۔ بھولی بھولی بات چیت بہت شیریں۔ سمجھداری اور شرافت ایسی کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ دوسروں سے تذکرہ کرتے وہ اس بچّہ کو دیکھنے آتے تھے۔ مدینہ سے دو دو تین تین میل کے فاصلہ پر یہودیوں کی بڑی بڑی بستیاں تھیں۔ وہاں بڑے بڑے عالم رہتے تھے۔ وہ آنے والے نبی کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے اور اُس کی آمد کے منتظر تھے۔ نجومیوں اور جوتشیوں (کاہنوں) کی باتیں بھی مشہور تھیں۔ اس بچہ کی خبر رفتہ رفتہ ان یہودیوں کو پہونچی تو وہ دیکھنے آنے لگے۔ کوئی دیکھ کر بچہ کی تعظیم کرتا اور کوئی ہکا بکا دم بخود رہ جاتا کہ جو باتیں آنے والے نبی کی ہیں وہ اس بچہ میں پائی جاتی ہیں۔ پھر اپنی تنگ نظری سے جزبز ہونے لگتا کہ نبوت تو ہمارے خاندانوں کا حصّہ ہے۔ قریش میں یہ بچہ کیوں پیدا ہو گیا۔ اس طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ سیّدہ آمنہ کو حلیمہ کی بات یاد آ گئی کہ وہ ایک یہودی کے پاس اس نونہال کو لے گئی تھیں تو اُس نے شور مچا دیا تھا کہ اس بچہ کو ختم کر دو ورنہ انقلاب برپا کر دے گا، تمہارے مذہب بدل دے گا۔ سیدّہ آمنہ کو فکر ہوئی اُنھوں نے مدینہ کا قیام مختصر کیا۔ صرف ایک مہینہ ٹھہریں۔ پھر اپنے آنکھوں کے نور، دل کے سرور کو لے کر مکّہ روانہ ہو گئی۔ لیکن اس یتیم بچہ کی انوکھی بات یہ بھی تھی کہ قدرت نے ابھی سے اس کو آزمانا شروع کر دیا تھا۔ سیّدہ آمنہ مدینہ سے چلیں تو طبیعت خراب ہو گئی۔ اب جیسے جیسے قافلہ چل رہا تھا، اُن کا مرض بڑھ رہا تھا۔ ایک مقام ابواء تھا۔ وہاں قافلے پڑاؤ کیا کرتے تھے۔ جب سیّدہ آمنہ یہاں پہونچیں تو مرض اور بڑھ گیا۔ آگے چلنے کی ہمت نہیں رہی، مکہ کے بجائے آخرت کے لئے رختِ سفر باندھ لیا اور دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یہیں اُن کو سُپرد خاک کر دیا گیا۔ "ام ایمن" ساتھ تھیں۔ وہ اس یتیم کو جو اب یسیر بھی ہو گیا تھا، لے کر مکہ معظمہ آئیں۔ دادا کو خبر ہوئی تو بہت صدمہ ہوا۔

اس واقعہ سے تقریباً پچاس سال بعد جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ پہونچے تو آپ ﷺ کو بچپن کی باتیں یاد تھیں۔ آپ بتایا کرتے تھے کہ یہاں ہم ٹھہرے تھے۔ یہاں والدہ کا قیام ہوا تھا۔ یہودی مجھے آ آ کر دیکھا کرتے تھے۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ "بنی عدی بن نجار" کے محلہ میں ایک بادلی تھی،

میں اُس میں تیراکی کی مشق کیا کرتا تھا۔ ام ایمن بیان کرتی تھیں کہ مجھے خوب یاد ہے۔ یہودی کہا کرتے تھے کہ یہ بچہ اس اُمت کا نبی ہو گا، مکہ سے ہجرت کر کے آئے گا یہ اس کا دارالہجرت ہے۔ ❶

دادا عبد المطلب کی سرپرستی اور وفات

یہ غم زدہ معصوم مکہ معظمہ پہنچا تو عبد المطلب نے اپنے یتیم و یسیر پوتے کو چھاتی سے لگایا اور اپنے ساتھ رکھنے لگے۔

یہ معصوم بھی دادا سے لگ گیا اور اتنا کھل گیا کہ ان کے پاس جاتا تو بلا تکلف ان کی گدی پر بیٹھ جاتا تھا۔ خانہ کعبہ کی دیوار کے نیچے ان کے لئے فرش بچھایا جاتا تھا۔ فرش پر عبد المطلب بیٹھتے اور کنارے پر لڑکے بیٹھا کرتے تھے۔ مگر یہ معصوم "محمد" آگے پہنچ جاتے تھے۔ چچا تائے منع کرتے تھے لیکن عبد المطلب خوش ہوتے اپنے پاس بٹھالیتے۔ کمر پر ہاتھ پھیرتے اور فرمایا کرتے تھے یہ میرا بیٹا بہت بڑا آدمی ہو گا۔ اس کی خاص شان ہو گی۔ ❷ یہودی کہتے ہیں کہ یہ نبی ہو گا۔ ❸ اُم ایمن جن کو برکت کہتے تھے ان کو تاکید کیا کرتے کہ دیکھو برکت! میرے محمد کا ہر وقت خیال رکھا کرو، کہیں باہر نہ جانے دیا کرو۔ ❹

لیکن عبد المطلب چراغ سحری تھے۔ ❺ سو سال سے بھی زیادہ عمر ہو چکی تھی۔ صرف دو سال پوتے کی دیکھ بھال کر سکے پھر ان کی وفات ہو گئی۔ ام ایمن کہا کرتی تھیں کہ اس روز میں نے دیکھا کہ جنازے کے پیچھے "محمد" روتے جارہے تھے۔ (ﷺ)

آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا: آپ کو دادا کی وفات یاد ہے فرمایا خوب یاد ہے میری عمر اس وقت آٹھ سال تھی ❻

خواجہ ابو طالب کی سرپرستی

عبد المطلب نے زندگی کے آخری ایام میں ہی یتیمِ عبد اللہ کو ابو طالب کے سپرد کیا۔ ابو طالب کو پہلے

---

❶ طبقات ابن سعد ج ۱، ص ۷۳

❷ سیرت ابن ہشام ص ۱۰۶

❸ طبقات ابن سعد ص ۴۵، ج ۱

❹ ایضاً ص ۷۵

❺ ایک روایت ہے کہ ایک سو دس سال اور دوسری روایت میں ہے کہ ایک سو بیس سال عمر ہوئی۔ یہ بھی روایت ہے کہ بیاسی سال عمر ہوئی حجون میں دفن کیا گیا۔ طبقات ص ۷۵ ج ۱

❻ طبقات ابن سعد ص ۷۵ ج ۱

سے بھی اس بھتیجے سے محبت تھی اب یہ محبت اور بڑھ گئی بقول [1] ابن عباس (رضی اللہ عنہ) اپنی اولاد سے زیادہ اس بھتیجے سے محبت کرتے تھے۔ ابو طالب کو ایسی محبت کبھی کسی سے نہیں ہوئی تھی۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے۔ کہیں جاتے تو ساتھ لے جاتے۔ رات کو اپنے پاس لٹاتے تھے۔ دستر خوان بچھ جاتا سب بچے بیٹھ جاتے مگر ابو طالب اس وقت تک نوالہ نہ توڑتے جب تک ان کا چہیتا "محمد" نہ آجاتا تھا۔ محمد کی باتیں بھی ایسی تھیں کہ ابو طالب کے دل کو لبھاتی رہتیں۔ دستر خوان پر جب بچے اکٹھے ہوتے تو چیخ و پکار اور چھین جھپٹ کرتے مگر یہ بھولے صاحبزادے "محمد" خاموش بیٹھے رہتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ انہیں کچھ بھی نہ ملتا، دوسرے بچے ہی جھپٹ لیتے تھے۔ ابو طالب نے محمد کا کھانا الگ کر دیا [2] مگر یہ بات محمد کی فطرت کے خلاف تھی کہ الگ کھائیں یا کوئی چیز ان کو مل جائے اور دوسروں کو نہ ملے۔ اس لئے الگ کھانے پر محمد راضی نہ ہوئے سب کے ساتھ ہی کھاتے اور اپنے کھانے سے زیادہ دوسروں کے کھانے سے خوش ہوتے۔ کبھی خود اپنے پاس سے اٹھا کر دیتے تھے۔

علماء سیرت و تاریخ کا ایک متفقہ بیان ہے۔ اس موقع پر اس کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے:

محمد ﷺ اس کردار کے ساتھ جوانی کی منزل پر پہنچے کہ زمانہ جاہلیت کی باتوں سے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ آپ کو محفوظ رکھا۔ آپ ایسے نوجوان تھے کہ مروت میں سب سے افضل، شرافت کی باتوں میں سب سے اعلیٰ، اخلاق میں سب سے بہتر، میل جول میں نہایت شریف، جواب دینے میں نہایت مہذب اور باسلیقہ، گفتگو نہایت شیریں، سمجھ بوجھ میں سب سے برتر، نہایت بردبار، نہایت امانت دار، بات کے سچے، زبان کے پکے، ہر ایک برائی سے کوسوں دور، ہر ایک کے خیر خواہ، کبھی کسی کو آپ سے تکلیف نہ پہنچی، کبھی کسی کو سخت بات نہیں کہی، نہ کسی سے لڑائی نہ کسی سے جھگڑا کیا۔ انہیں خوبیوں نے آپ کی قوم کو آپ کا گرویدہ بنادیا۔ آپ کی سچائی اور امانتداری نے لوگوں میں جذبہ پیدا کیا کہ آپ کو الامین (الصادق) کہیں اور اسی نام سے آپ کو یاد کریں۔

اپنا تکفل خود اور دوسروں کی مدد

اپنی زندگی خود بناؤ، اپنا بوجھ خود سنبھالو، دوسروں کی مدد کرو۔

عبد المطلب کی وفات کے بعد ابو طالب ان کے جانشین بنائے گئے۔ قبیلہ کے شیخ اور مکہ کے ایک سردار مانے گئے۔ اس لحاظ سے عزت تو کافی تھی مگر دولت ناکافی۔ بڑا کنبہ، عیال کثیر آمدنی کا ذریعہ محدود، یتیم عبد اللہ (محمد ﷺ) آپ کے سپرد ہوئے تو اگرچہ یہ یتیم عمر عزیز کی ابھی آٹھویں منزل ہی طے کر رہا

---

[1] بدایہ ونہایہ ص ۲۸۲ ج ۲

[2] بدایہ ونہایہ ص ۲۸۲ ج ۱

تھا مگر چچا کی پریشان حالی کے احساس نے اس کو اس ننھی سی عمر میں ہی فکر مند بنا دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اپنے مربی چچا کی مدد وہ کس طرح کر سکتا تھا۔ مگر مکہ میں نہ کوئی دستکاری تھی نہ کوئی سرکار جس کی نوکری کی جا سکے۔ اس زمانہ کی دنیا کارخانوں سے بھی آشنا نہ تھی اور مکہ کی پتھریلی اور ریتلی زمین اور آس پاس کے جھلسے ہوئے کالے اور بھوسلے پہاڑوں کو کسی چشمہ یا دریا کی سیرابی بھی میسر نہ تھی کہ وہاں کھیتی باڑی ہو سکے۔ البتہ بھیڑ بکری اور اونٹ یہاں بکثرت تھے اور قدرت نے ان کا چارہ یعنی ببول کے درخت اور اذخر جیسی گھاس بھی وہاں پیدا کی تھی۔ انہیں مویشی کے گلے اس زمانہ کی قیمتی دولت تھے اور جن کے پاس یہ دولت ہوتی تھی وہ ان کے چرانے اور دیکھ بھال کے لئے مزدور اور اجیر بھی رکھا کرتے تھے۔ یہ گلہ بانی سوسائٹی کی نظر میں کچھ بھی حیثیت رکھتی ہو مگر آمدنی اور گذر کا ایک جائز ذریعہ تھی۔ سردار قریش عبدالمطلب کے یتیم پوتے محمد ﷺ نے اسی ذریعہ کو اختیار کیا اور اس کے ننھے سے وجود کے لئے اونٹوں کی گلہ بانی مشکل تھی تو بکریاں چرانے کی مزدوری کرنے لگے۔ اس طرح اپنی زندگی خود بنالی۔ اور نہ صرف یہ کہ اپنا بوجھ خود سنبھالا بلکہ پریشان حال چچا کی مدد بھی کرنے لگے۔

مکہ تجارتی نقطہ نظر سے:

مکہ کی زمین اگرچہ پیداوار کے قابل نہیں تھی مگر تجارتی کاروبار کے لئے نہایت موزوں تھی۔ یہاں مشرق و مغرب کے ڈانڈے ملتے تھے۔ ایران و عراق، یمن، شام اور افریقہ کے تجارتی تعلقات کی درمیانی کڑی یہی شہر تھا۔ قریش اس قدرتی نعمت کو پہچانتے تھے اور جہاں تک ان کی گنجائش تھی وہ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

بعثت نبوی (آنحضرت ﷺ کے نبی بنائے جانے) سے تقریباً دو سو برس پہلے قریش کے مشہور اور ممتاز سردار ہاشم نے رحلة الشتاء والصیف (سردی اور گرمی کے موسم کے دو کوچ) کا دستور ڈال دیا تھا۔ گرمیوں میں مکہ والوں کے تجارتی قافلے شام اور انقرہ جاتے تھے جہاں اس زمانہ میں ٹھنڈ ہوتی تھی۔ وہ خوشگوار موسم، صحت بخش آب و ہوا۔ کا لطف بھی اٹھاتے اور تجارت بھی کرتے تھے، اور سردیوں میں یہ قافلہ حبشہ اور یمن جاتے تھے۔ ہاشم اور اس کے بھائیوں نے مختلف ممالک سے عربوں کے لئے آزاد تجارت کے سرٹیفکیٹ (پروانے) بھی حاصل کر لئے تھے۔ عرب میں قریش کی عظمت کا ایک بڑا سبب یہ تجارتی اقتدار بھی تھا۔

حضرت محمد ﷺ کی عمر نے ترقی کی اور اس قابل ہوئے کہ تجارتی قافلے کے ساتھ سفر کر سکیں تو آپ نے اس شریف پیشہ کو اپنانا چاہا۔ لیکن روپیہ آپ کے پاس نہیں تھا تو آپ نے دوسروں کے سرمایہ سے تجارت شروع کر دی۔ بیرونی تجارت میں بھی حصہ لیا اور جیسا کہ (عبداللہ بن ابی الحمس) کے واقعہ سے

معلوم ہوتا ہے کہ آپ مکہ میں گھوم پھر کر بھی کاروبار کرتے تھے۔ تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔ یہی دور تھا جب آپ نے چچا ابو طالب کی مستقل مدد یہ کی کہ نونہال "علی" کے مصارف سے ان کو سبکدوش کر دیا۔ ان کو اپنے ساتھ رکھا اور جملہ مصارف کے ذمہ دار خود ہو گئے۔

قومی خدمت کا جذبہ:

بچپن کا یہی معصوم دور جس کی خودداری نے اس معصوم نونہال کو گلہ بانی پر آمادہ کیا تھا، فطری طور پر قومی خدمت کے جذبے سے معمور تھا۔ کعبہ عربوں کا قومی اور مذہبی نشان تھا چونکہ وہ پہاڑوں کے نشیب میں واقع ہے تو جب بھی زور دار بارش ہوتی تھی سیلاب کی دھاریں اس کو چھوتی رہتی تھیں اور کبھی کبھی اس کو نقصان پہنچا دیا کرتی تھیں۔

مکہ اگرچہ ساحل سمندر سے صرف چالیس میل کے فاصلہ پر ہے مگر مون سون اس طرف نہیں جاتا۔ برسات تو وہاں ہوتی ہی نہیں۔ بارش بھی کبھی کبھی ہوتی ہے۔ بسا اوقات کئی سال گزر جاتے ہیں بارش کی ایک بوند نہیں برستی اور کبھی ایسی زور دار برستی ہے کہ مکہ میں طوفان آجاتا ہے۔ اس وقت کا ایک واقعہ ہے جب آنحضرت ﷺ کی عمر تقریباً دس سال ہوگی کہ مکہ کے پہاڑوں پر زور دار بارش ہوئی پھر سیلاب بھی ایسے زور کا آیا کہ کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچ گیا۔ سیلاب اترا تو کعبہ کی مرمت شروع کی گئی۔ سن رسیدہ اور نوجوان رضاکار اپنے اس قومی نشان کی مرمت کر رہے تھے تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک بچہ بھی نوجوانوں کی طرح سرگرم ہے اور اگرچہ بساط کچھ بھی نہیں مگر جذبہ اور شوق کا یہ عالم ہے کہ بھاری بھاری پتھر مونڈھے پر اٹھا رہا ہے اور کعبہ کی دیوار تک پہنچا رہا ہے۔ مونڈھے پتھروں سے چھلے جا رہے ہیں، بوجھ اٹھانے سے سانس چڑھ رہا ہے مگر اس کے ولولہ میں کوئی فرق نہیں آرہا ہے۔

اور یہ بہادر بچہ وہی ہے جسے "محمد" کہا جاتا ہے (ﷺ)

شرم وحیا:

اس فلمی دور میں شرم وحیا ایک مذاق کی چیز بن گئی ہے۔ مگر دنیائے اخلاق میں یہ بہت قیمتی چیز ہے کیونکہ یہ درحقیقت اس خصلت کا نام ہے جو انسان کو ایسی باتوں سے روکے جو انسانیت اور شرافت کی نظر میں معیوب مانی جاتی ہیں۔

سیدنا محمد ﷺ کی فطرت کو جو شرم وحیا کی جنس گراں مایہ عطا ہوئی تھی اس کا ایک نمونہ اس موقع پر دیکھنے میں آیا۔

کعبہ کی مرمت کے سلسلہ میں جب آپ پتھر اٹھا رہے تھے تو آپ کے چھوٹے چچا عباس جو آپ سے دو سال بڑے تھے وہاں موجود تھے انہوں نے دیکھا کہ بے ڈول اور نوکیلے پتھروں سے ان کے معصوم بھتیجے محمد کے مونڈھے چھلے جا رہے ہیں۔ نیم وحشی عربوں میں برہنگی زیادہ معیوب نہیں تھی۔ وہ بسا اوقات اپنے عقیدے کے مطابق حج جیسے مقدس فرض ادا کرتے ہوئے خانہ کعبہ کے قریب (جو ان کے نزدیک سب سے زیادہ واجب الاحترام مقام تھا) مادر زاد برہنہ ہو جاتے تھے۔ عقیدہ یہ تھا کہ جن کپڑوں میں سال بھر گناہ کرتے رہے ہیں انہیں کپڑوں میں یہ مقدس فرض انجام دینا صحیح نہیں ہے۔ بہر حال عباس کو بھولے بھالے معصوم بھتیجے پر ترس آیا اور یہ چاہا کہ کوئی کپڑا بھتیجے کے مونڈھے پر ڈال دیں۔ کوئی اور کپڑا نہیں ملا تو اپنے یہاں کے عام دستور کے مطابق انہوں نے ارادہ کیا کہ بھتیجے کی لنگی کھول کر مونڈھے پر رکھ دیں۔ مگر اتنی سی برہنگی بھی اس شرمیلی اور باحیا فطرت کے لئے ناقابل برداشت تھی جو حضرت محمد ﷺ کو عطا ہوئی تھی۔ چنانچہ ابھی لنگی کھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ اس برادرزادہ سعید کی حالت غیر ہونے لگی۔ چہرے پر سوائیاں اڑنے لگیں اور ایک ایسی اضطرابی صورت پیدا ہو گئی کہ عباس گھبرا گئے اور لنگی جوں کی توں باندھ دی۔

غیر اللہ کی پرستش سے پرہیز:

یہ عجیب بات ہے کہ مکہ کے باشندے بے دینی اور مذہب سے آوارہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مذہبی سمجھتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت عیسائیوں اور یہودیوں کے نزدیک مسلم تھی۔ کیونکہ عیسائی اور یہودی جو عام طور پر بنی اسرائیل تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ وہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نسلی اعتبار سے مورث اعلیٰ مانتے تھے، ایسے ہی مذہبی اعتبار سے بھی ان کو اپنی ملّت کا بانی مانتے تھے۔ یہی حال اس زمانہ میں عربوں کا بھی تھا۔ کیونکہ عرب عموماً اور قریش خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے فرزند یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے۔ اس نسلی رشتے کے علاوہ خانہ کعبہ اور خود مکہ شہر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تاریخی یادگار تھے۔ قریش خانہ کعبہ کے محافظ اور متولی بھی تھے جس کی بنا پر تمام عرب ان کی تعظیم کرتے تھے۔ اس لحاظ سے مکہ والوں کے لئے مذہبیت ایک لازمی چیز تھی۔ مگر ان کی یہ مذہبیت شرک اور اوہام پرستی کا جال بن کر رہ گئی تھی۔ ایک طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا نام زبان پر تھا جنہوں نے شرک کے خلاف توحید کا جھنڈا بلند کیا تھا۔ اور دوسری طرف حالت یہ تھی کہ حرم کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے اور ان کے علاوہ ہر ایک قبیلہ کا دیوتا اور اس کا بت الگ الگ تھا۔

شرک کی اس گرم بازاری میں کسی بچہ کا غیر اللہ کی پرستش سے بچنا ناممکن تھا۔ مگر جس کو قدرت نے وہ سنجیدگی عطا فرمائی تھی جس نے اس کو کھیل، تماشے اور قصہ گوئی کی محفلوں سے الگ رکھا۔ جو برہنگی

کے تصور سے بھی لرز جاتا تھا۔ وہ عبادت کے معاملہ میں یہ بے جوڑ بات اور یہ مذاق گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توحید پرستی کے قصے سنے اور دوسری طرف اپنی پیشانی غیر اللہ کے سامنے جھکا دے۔ ایک وقت اپنے ہاتھ سے مورتی بنائے اور دوسرے وقت اسی مورتی کے سامنے ماتھا ٹیک دے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ کبھی آپ کی گردن غیر اللہ کی عبادت کے لئے نہیں جھکی۔

جس فطرت سلیم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھا دیا تھا کہ چاند سورج اور آسمان کے چمکدار تارے جن کو ان کی قوم معبود مانتی ہے ہر گز قابل پرستش نہیں ہیں۔ کیونکہ انسان کی طرح رات دن کی تبدیلیوں کا ان پر بھی اثر ہوتا ہے بلکہ وہ انسان سے زیادہ پابند اور بے بس نظر آتے ہیں۔ جو پابند ہو اور جس پر رات دن کی تبدیلیوں کا اثر ہوتا رہتا ہو وہ معبود نہیں ہو سکتا۔

اسی فطرت سلیم نے پاک طینت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوش سنبھالتے ہی بتا دیا تھا کہ جس کو انسان خود بنائے وہ معبود نہیں ہو سکتا نہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ انسان اس کے سامنے گردن جھکائے یا ماتھا رگڑے۔

بتوں کو چھونے سے پرہیز:

لوگ خانہ کعبہ کا طواف جب بھی کیا کرتے تھے وہاں پیتل کے دو بت[1] اساف اور نائلہ تھے۔ طواف کرنے والے ان کو بوسہ دیا کرتے تھے اور ان پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے غلام زید بن حارثہ نے اپنے بیٹے حضرت حارثہ کو واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ بچپن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طواف کر رہا تھا۔ چکر لگاتے ہوئے جب ہم اساف اور نائلہ کے پاس پہنچے تو میں نے چاہا کہ میں بھی انہیں چھولوں۔ حضرت محمد نے منع فرمادیا۔ اگلے چکر میں میں نے نظر بچا کر چھولینا چاہا اور چھو بھی لیا۔ مگر آپ کی جیسے ہی نظر پڑی آپ نے سختی سے ڈانٹا کہ میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا۔[2]

---

[1] ایہ مرد اور عورت کے دو مجسمے ساتھ ساتھ تھے جن کو پوجا کرتے تھے اور ان پر بھینٹ چڑھایا کرتے تھے روایت ہے کہ خاص کعبہ مکرمہ میں فحش حرکت کرتے ہوئے مسخ کر دیئے گئے تھے۔ عجائب پرستی کی انتہا تھی کہ جب پتھر بن گئے تو انکی پوجا شروع کر دی گئی۔ (اخبار مکہ۔ ازرقی ص۱۲۱ ج۱)

[2] ہدایہ ونہایہ ص۲۸۸ ج۲ بروایت بیہقی

دور شباب اور جوہری کردار

تجارت:

نوخیز و نوجوان محمد ﷺ گلہ بانی سے آگے بڑھ کر میدان تجارت میں آئے تو آپ کے تعلقات وسیع ہوئے۔ لوگوں کو آپؐ کے آزمانے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے آپؐ کو زیادہ قریب سے دیکھا وہی آپؐ کے سب سے زیادہ گرویدہ ہوگئے۔ اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ صرف دس بارہ سال کے عرصہ میں آپ کی غیر معمولی امانت داری، راستبازی اور سچائی نے سب ہی مکہ والوں کو یہاں تک موہ لیا کہ وہ آپ کا نام لینا بے ادبی سمجھنے لگے۔ یہی مکہ کے بڑے بڑے تاجر اور سیٹھ جن کو اپنی دولت پر ناز تھا جن کو اپنے بین الاقوامی تعلقات پر فخر تھا کہ ان کے تجارتی قافلے شام، یمن، فارس وغیرہ جاتے رہتے تھے۔ افریقہ کے بازاروں میں ان کا لین دین رہتا تھا۔ ان ملکوں کے امیروں اور بادشاہوں سے ان کی راہ و رسم تھی، ان سے اپنی بات منواسکتے تھے۔ یہی رؤساء قریش جو اپنے سوا کسی کو نظر میں نہیں لاتے تھے، جو دوسروں کی گردنیں اپنے سامنے جھکوانا چاہتے تھے، جن کے مشاعروں کی جان ان کے وہ فخریہ قصیدے ہوا کرتے تھے، جن میں وہ اپنی عظمت اور بڑائی کے ترانے گاتے اور کوئی ان کی توڑ کرتا تھا تو لڑپڑتے تھے۔ یہاں تک کہ خونریز جنگ کی نوبت آجاتی تھی۔ دنیا جانتی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ یتیم عبداللہ کی غیر معمولی سچائی اور امانت داری نے ان سیٹھوں اور رئیسوں کو یہاں تک متاثر اور گرویدہ بنادیا تھا کہ وہ آپ کو "الصادق" یا "الامین" ہی کہتے تھے اور نام لینا بے ادبی سمجھتے تھے۔ یہ دو لفظ یہاں تک زبانوں پر چڑھ گئے کہ انہوں نے قومی لقب کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔

مؤرخ حیران رہ جاتا تھا کہ وہ کردار اور وہ کیرکٹر کس درجہ بلند ہوگا جس نے تیس بتیس سال کی عمر کے نوجوان کو اتنا اونچا اٹھادیا کہ بڑے بڑے لوگوں کی گردنیں اس کی صداقت و امانت کے سامنے جھک گئیں۔ ممکن ہے خاندانی رقابت کے سبب سے کچھ لوگ اس خطاب کو پسند نہ کرتے ہوں لیکن وہ مجبور تھے کہ آپ کو اس خطاب سے یاد کریں۔ کیونکہ کوئی ایسی بات یا کوئی ایسا بہانہ ان کو نہیں ملتا تھا کہ وہ تردید کرسکیں اور عوام کے جذبات کا مقابلہ کرسکیں۔

تاریخ کی یہ پرانی عادت بہت ہی تکلیف دہ اور مایوس کن ہے کہ کسی شخص کے واقعات قلمبند کرنے کے لئے وہ اسی وقت قلم اٹھاتی ہے جب وہ شخص تاریخی انسان بن چکتا ہے۔ اس سے پہلے اس کے قلم کو

جنبش نہیں ہوتی۔ اس نے محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بھی اسی بخل سے کام لیا اور ان تمام واقعات سے دامن سمیٹے رکھا جو نبوت سے پہلے محمد ﷺ کی روز مرہ کی زندگی میں پیش آتے رہتے، جو قریش کے گردن درازوں کو متاثر کرتے رہے۔ تب بھی چند واقعات ایسے ہیں جو کسی طرح تاریخ کے سکڑے ہوئے دامن میں پڑ گئے اور تاریخ نے ان کو صحیح سندوں کے ساتھ محفوظ رکھا۔ قیاس کرنے کے لئے یہ واقعات ہی کافی ہیں اور ان سے قبل نبوت کی زندگی روشنی میں آجاتی ہے۔

عبداللہ بن ابی الحمساء عامری ایک معمولی آدمی تھے۔ اگر آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس کا یہ معاملہ نہ ہوا ہوتا جو یہاں ذکر کیا جارہا ہے تو دنیا نہ اس کو پہچانتی اور نہ پہچاننے کی ضرورت محسوس کرتی۔

یہ عبداللہ حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ سے کوئی سودا کر رہا تھا۔ بات چیت کرتے ہوئے اسے کوئی کام یاد آگیا۔ اس نے حضرت محمد ﷺ سے کہا: آپ ٹھہریئے میں ابھی آتا ہوں، تب بات کروں گا۔ آپ کی زبان سے نکل گیا: اچھا۔

اب بات کی پختگی اور زبان کی پابندی ملاحظہ فرمایئے۔

عبداللہ بن ابی الحمساء یہاں سے چلا تو اس کو کوئی اور ضرورت پیش آگئی وہ اس میں ایسا لگا کہ اس کو اپنے وعدہ کا خیال بھی نہ رہا۔ یہ دن یونہی گزر گیا۔ پھر اگلا دن بھی گزر گیا۔ تیسرے دن اسے خیال آیا کہ میں محمد بن عبداللہ ﷺ سے معاملہ کر رہا تھا یہ بات یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ میں ان کو ٹھہرا کر آیا تھا۔ اب چل کر بات پوری کر لینی چاہئے۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی الحمساء آپ کے مکان پر پہنچا معلوم ہوا کہ دوروز گزر گئے آج تیسرا دن ہے وہ مکان پر نہیں آئے۔ گھر والے خود پریشان ہیں۔ عبداللہ بن ابی الحمساء یہاں سے روانہ ہوا۔ جہاں جہاں خیال تھا سب جگہ آنحضرت ﷺ کو تلاش کیا۔ کہیں نہ ملے تو احتیاطاً اس جگہ بھی پہنچا جہاں بات چیت ہو رہی تھی اور وہ آپ کو وہاں ٹھہرا کر آیا تھا۔

عبداللہ بن ابی الحمساء اس مقام پر پہنچا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ محمد بن عبداللہ ﷺ وہیں موجود ہیں، عبداللہ بن ابی الحمساء کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور زیادہ حیرت اس کو اس بات پر ہوئی کہ مسلسل تین دن تک انتظار کی زحمت اٹھانے کے بعد بھی جب عبداللہ بن ابی الحمساء سامنے آئے تو نہ لڑائی جھگڑا تھا نہ ڈانٹ ڈپٹ۔ کہا تو صرف اتنا کہا اور وہ بھی دھیمی آواز سے یافتی لقد شققت علیّ انا ھھنا منذ ثلاث انتظرك [1] (اے صاحب! آپ نے پریشان کر دیا۔ تین دن ہو گئے یہاں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔)

کہہ سکتے ہیں کہ وعدہ کی یہ صداقت اور پختگی وہ متبرک ترکہ تھا جو آپ کو اپنے جد اعلیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملا تھا سیدنا اسماعیل علیہ السلام سے بھی ایک شخص نے کہا تھا کہ آپ یہاں ٹھہریں میں ابھی آتا

---

[1] ابوداؤد شریف باب فی العدۃ کتاب الادب۔

ہوں وہ اپنے کام میں لگ کر بھول گیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام وعدہ کی پابندی کی بناء پر وہیں ٹھہرے رہے۔ وہ تیسرے دن جب اس کو یاد آیا اور وہاں پہنچا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام اسی جگہ انتظار کر رہے تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا یہ وصف یہاں تک مقبول ہوا کہ وحی الٰہی نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خصوصیات میں اس کو شمار کرایا ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ (مریم۔۵۴) آنحضرت ﷺ کے اوصاف الگ الگ وحی الٰہی نے شمار نہیں کرائے بلکہ ایک جامع اور مکمل سند یہ دیدی: وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (قلم۔۴) ،یعنی اخلاق کی مثالیں جو انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ میں الگ الگ بیان کی گئیں آپ ان سب کا مکمل مجموعہ ہیں۔

قیس بن سائب بن عویمر ایک صحابی تھے۔ اس زمانہ میں جب آپ کاروبار کیا کرتے تھے وہ آپ کے شریک اور ساجھی رہے تھے۔ وہ ہمیشہ تعریف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے:

کان رسول اللہ ﷺ شریکی فی الجاھلیۃ فکان خیر شریك لا یداری ولا یماری۔

"محمد ﷺ جب نبی نہیں بنائے گئے تھے (زمانہ جاہلیت میں) میرے ساجھی تھے۔ بس بہت ہی اچھے ساتھی تھے۔ نہ کبھی سخت بات کہتے تھے نہ جھگڑتے اور بحث کرتے تھے۔

یہ کاروباری سلسلہ کی باتیں تھیں۔ اب ہمدردی نوع انسان اور احترام انسانیت کی ایک مثال مطالعہ فرمایئے جو اس زمانہ میں بھی اپنی نظیر آپ تھی اور تہذیب کی دعویدار موجودہ دنیا بھی اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

بردہ فروشی عرب میں عام تھی اور بسا اوقات شریف گھرانوں کے بچے بھی اس شکنجہ میں کس لئے جاتے تھے۔ چنانچہ قبیلہ بنی القین بن جسر کے آدمی ایک لڑکے کو پکڑ لائے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے برادر زادے "حکیم بن حزام بن خویلد" کے ہاتھ بیچ دیا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنے بھتیجے کے یہاں گئیں تو یہ غلام ان کو پسند آگیا۔ انہوں نے فرمائش کی اور بھتیجے نے یہ غلام پھوپھی کی نذر کر دیا۔ حضرت محمد ﷺ کی نظر اس پر پڑی تو اس کی معصوم زندگی اور اس کی مظلومیت سے دل بے چین ہو گیا۔ آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اس کو خرید لیا۔ پھر بچہ سے اس کے ماں باپ کا نام اور خاندان و قبیلہ کا پتہ دریافت کیا۔ بچہ ذہین تھا اس نے برجستہ جواب دیا: میرا نام زید، میرے والد حارثہ بن شرجیل بن کعب اور والدہ سعدی بن ثعلبہ ہیں اور قبیلہ طے کے خاندان بنی معن سے ہمارا تعلق ہے۔ آنحضرت ﷺ کو اس کے باپ کا نام اور پتہ معلوم ہو گیا تو اس کے والد کو خبر پہنچائی۔ والد حارثہ خبر پاتے ہی اپنے بھائی کو ساتھ لے کر مکہ آگیا اور دریافت کرتا ہوا حضرت محمد ﷺ کے پاس پہنچا۔ بچہ کو دیکھا، چوما، پیار کیا گلے لگایا اور شفقت پدری کے بموجب یہ چاہا کہ اپنے لخت جگر، نور چشم کو ساتھ لے جائے اور حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں کچھ رقم بطور فدیہ پیش کر دے۔ آنحضرت ﷺ نے رقم لینے

سے تو انکار کر دیا اور اس کی اجازت دیدی کہ بچہ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ البتہ یہ فرمادیا کہ خود بچہ سے بھی دریافت کرلیں کہ وہ آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہے یا یہاں رہنا چاہتا ہے۔

بچہ آپ کے یہاں آیا۔ اس کے والد کو اس زمانہ کے ذرائع اور وسائل کے بموجب خبر دی گئی۔ وہ اپنے علاقہ طے سے سفر کر کے یہاں آیا اس میں کچھ دن لگ گئے۔ بچہ اس عرصہ میں حضرت محمد کی شفقتوں سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ اس کو آپ سے جدا ہونا گوارا نہ ہوا۔ اس نے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ باپ نے بہت سمجھایا مگر بچہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ آخر میں باپ اور چچا نے چبھتی ہوئی بات کہی: بیٹا تم غلام ہو، غلام رہنا پسند کرتے ہو، باپ کے ساتھ آزاد رہنا پسند نہیں کرتے۔

آنحضرت ﷺ نے اب تک باپ بیٹے کی گفتگو میں دخل نہیں دیا تھا۔ مگر یہ بات ایسی تھی جس کا تعلق آنحضرت ﷺ کے سلوک اور آپ کے انداز فکر سے تھا۔ کیا واقعی زید کو آپ غلام سمجھتے ہیں۔ زید کو غلام کی حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کسی آزاد بچہ کے لئے غلامی پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے فوراً باپ بیٹے کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے فرمایا: غلام نہیں بیٹا۔ زید میرے پاس رہے گا تو بیٹا بن کر۔ میں تمہارے سامنے یہ کہتا ہوں اور تمہیں اس سے اطمینان نہ ہو تو چلو، مجمع میں یہ اعلان کئے دیتا ہوں۔ چنانچہ آپ باپ چچا اور زید کو لے کر ایک چوپال میں پہنچے، جہاں قریش کے سردار اور چودھری موجود تھے اور آپ نے اعلان فرمادیا کہ: زید میرا بیٹا ہے میں اعلان کرتا ہوں آپ لوگ گواہ رہیں۔

حارثہ (زید کے باپ) کی یہ آخری تدبیر تھی۔ زید کو پھسلانے کی جو قطعاً ناکام رہی۔ اب حارثہ کو کہنا پڑا: اچھا آپ بیٹا بنا کر رکھتے ہیں تو مجھے بھی عذر نہیں۔ فطرت محمد (ﷺ) کی یہ بلندی بھی نظر انداز نہ ہونی چاہیے کہ آپ نے عبدِ محمد (محمد کا غلام) کہلانا پسند نہیں کیا۔ آپ نے "ابن محمد" کہلایا اور اسی نسبت سے ان کی شہرت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ اس واقعہ سے تقریباً ۳۰ سال بعد آیت نازل ہوئی: اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ (احزاب۔۵)۔[1]

محمد ﷺ کا یہی کردار تھا جس نے سرداران قریش کی گردنیں اس کی تعظیم کے لئے خم کیں۔ یہاں تک کہ نام لینا بے ادبی سمجھتے اور "الصادق" اور "الامین" کے خطاب آپ کے لئے عام ہو گئے۔

آپ کے مربی چچا ابو طالب آخر تک مسلمان نہیں ہوئے۔ اپنے باپ دادا کے مذہب پر رہے اسی مذہب پر جان دی مگر بھتیجے کے اخلاق و کمالات اور ہمدردی خلق کا جو جذبہ بھتیجے کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اس کے یہاں تک گرویدہ تھے کہ بھتیجے کی تعریف میں قصیدے کہا کرتے تھے۔

---

[1] الاستیعاب ذکر زید بن حارثہ

ایک قصیدہ جس میں تقریباً سو شعر ہیں اس کو ابن ہشام نے نقل کیا ہے جس کا مشہور شعر یہ ہے، جس سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض بے پناہ کا اندازہ ہوتا ہے:

وابیض یستسقی الغمام بوجهه ثمال [1] الیتامی عصمة للارامل

وہ نورانی چہرے والا جس کی ذات اور جس کے چہرے کی برکت سے بادل بھی سیرابی حاصل کرتا ہے۔ یتیموں کا مربی بیواؤں کی عزت و آبرو کا محافظ۔"

و ان فخرت یوماً فان محمداً هو المصطفی من سرها و کریمها [2]

"اور اگر کسی دن (کسی موقع پر) فخر کرنا چاہو تو محمد وہ منتخب شخصیت ہے جس سے کمالات قریش [3] کے مخفی خزانے نمایاں ہوتے ہیں جو پورے قریش میں صاحب کرم اور صاحب شرف ہے۔"

نکاح

وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ (نور۔۲۶)

نکاح:

مکہ کی رہنے والی ایک ادھیڑ عمر کی خاتون (خدیجہ) جس کی عمر چالیس سال سے کم نہیں ہے، جو کئی بچوں کی ماں ہے، دو مرتبہ بیوہ ہو چکی ہے۔ تیسری مرتبہ شادی کے لئے ایک پچیس سالہ نوجوان سے سلسلہ جنبانی کرتی ہے۔ یہ نوجوان حسب نسب کے لحاظ سے مکہ کے تمام شریف اور باعزت خاندانوں میں "نگ" ہے۔ جسمانی صحت بہت عمدہ، شکل و صورت بے مثال۔ اخلاق و عادات میں پورے مکہ کا قیمتی ہیرا۔ اس کے یہاں دولت کے انبار نہیں ہیں مگر کامیاب تجارت میں وہ نام پیدا کر چکا ہے کہ اس کے مقابلہ میں دولت و ثروت ایک پرچھائیں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ بیشک اس بیوہ کے لئے اس رشتہ میں بہت سی دلچسپیاں ہو سکتی ہیں مگر اس پچیس سالہ نوجوان کے لئے دلچسپی کی ایک ایک چیز ختم ہے۔ یہ خاتون دولت مند ضرور ہے لیکن جس خود دار نوجوان نے اپنی زندگی خود بنائی، جس نے بچپن میں بھی گوارا نہ کیا کہ اپنا بار دوسروں پر ڈالے، کسی خاتون کی دولت و ثروت اس کی خودداری اور غیرت کے لئے چیلنج تو ہو سکتی ہے

---

[1] الثمال کالغیاث الذی یقوم بامر قومه

[2] البدایہ والنہایہ ص۲۵۸، ج۲، و سیرۃ ابن ہشام ص۱۰۷، ج۱

[3] چونکہ پہلے اشعار میں قریش کا ذکر ہے۔ اس لئے یہاں یہ مفہوم لیا گیا۔ اس سیاق کا لحاظ نہ کیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ شخصیت ہے جس سے کمالات انسانیت کے مخفی خزانے نمایاں ہوتے ہیں۔ جو پوری نوع انسان میں صاحب کرم اور صاحب شرف ہے۔

دلچسپی اور کشش کا باعث نہیں بن سکتی۔ ہاں، ایک بہت بڑی دولت اور ہے۔ نیک نفسی، راست بازی، امانتداری، سچائی اور خلق خدا سے ہمدردی۔ محمد ﷺ کی ذات ستودہ صفات ان اوصاف کا خزانہ تھی۔ اور یہ نیک نفس خاتون جو دنیا کی تمام بہاروں سے آسودہ ہو چکی تھی ان اوصاف کی قدردان تھی، یعنی ایک طرف جوہر تھا تو دوسری طرف جوہری۔

قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

یہی سبب تھا کہ یہ رشتہ جو بظاہر ان مل بے جوڑ تھا ایسا مبارک ثابت ہوا کہ خاندان اور کنبہ والے اس پر رشک کیا کرتے تھے۔ خود آپ کی وہ بیویاں جو بعد میں آپ کی حرم بنیں، جب آنحضرت ﷺ کی زبانی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی تعریفیں سنتی تھیں تو رشک کیا کرتی تھیں۔

رشتہ کا سبب:

واقعہ اس طرح پیش آیا کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا جب دوسری مرتبہ بیوہ ہو چکیں تو اپنی تجارت کو باقی رکھنے کیلئے انہیں کسی ایسے امانتدار شخص کی ضرورت تھی جو کاروباری سلیقہ اور تجارتی تجربہ بھی رکھتا ہو۔

آنحضرت ﷺ کی عمر اگرچہ تقریباً ۲۴ سال تھی مگر آپ کے اوصاف حمیدہ کے چرچے شروع ہو گئے تھے۔ کاروباری سلیقہ کی بھی شہرت ہو چکی تھی اور تجارتی قافلہ کے ساتھ شام جا کر بیرونی تجارت کا بھی آپ کو تجربہ ہو چکا تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی یہ شہرتیں سنیں پھر ذاتی طور پر بھی واقفیت حاصل کی، تو اپنے وسیع کاروبار کے لئے آپ کو زیادہ سے زیادہ موزوں پایا۔ چنانچہ آپ نے جوان صالح حضرت محمد بن عبد اللہ القریشی المکی ﷺ کو پیشکش کی کہ وہ کاروبار کی ذمہ داری سنبھال لیں۔ نفع میں ایک حصہ ان کا ہو گا۔ آنحضرت ﷺ نے یہ پیشکش منظور فرمائی اور مال لے کر شام تشریف لے گئے۔ واپسی کے وقت آپ نے ایسا مال تلاش کیا، جس کا مکہ میں فوراً نکاس ہو جائے۔ آپ نے شام سے یہ مال لا کر مکہ معظمہ میں فروخت کیا، تو نفع بدرجہا زائد ہوا۔ آنحضرت ﷺ کی اس کاروباری دانشمندی، ہوشیاری اور مستعدی نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اس رائے کی تصدیق کر دی جو وہ اس "ترقی پسند" نوجوان کے متعلق پہلے قائم کر چکی تھیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے شام جاتے وقت جب مال سپرد کیا تو خاص اپنے بھروسے کے غلام "میسرہ" کو بھی ساتھ کر دیا تھا۔ بہانہ یہ تھا کہ وہ خدمت کرتے رہیں گے اور مقصد یہ تھا کہ مال کی نگرانی بھی رکھیں اور آنحضرت ﷺ کے طور و اطوار کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہیں۔

سفر شام سے واپسی پر آنحضرت ﷺ نے منافع کا مال حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سپرد کیا اور "میسرہ"

نے نہ صرف امانتداری بلکہ آپ کے عام اخلاق کی بھی ایسی تعریف کی کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا جو اپنی زندگی کا یہ آخری دور کسی راست باز کے حوالہ کرنا چاہتی تھیں "دامان محمد" ﷺ میں ان کو گوہر مراد نظر آنے لگا۔ انہوں نے آپ کے خاص احباب اور بزرگوں کے ذریعہ رشتہ کی سلسلہ جنبانی کی۔ جس نے منظوری کا شرف عظیم حاصل کیا اور نکاح ہو گیا۔ نکاح کے بعد تجارت اور کاروبار کی طرف خاص توجہ کا تذکرہ تو نہیں آتا، البتہ خدمت قوم، ہمدردی خلق، خدا پرستی اور خدا ترسی کے اوصاف روز افزوں نظر آتے ہیں۔ ادھر خدیجہ رضی اللہ عنہا جن کے لئے یہی اوصاف باعث کشش تھے ان کی گرویدگی دن بدن بڑھ رہی ہے۔ یہاں تک کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا محض خانگی زندگی ہی میں رفیقہ حیات نہیں رہیں بلکہ قومی اور ملی خدمات میں بھی دہنا ہاتھ بنی رہیں۔ آنحضرت ﷺ کی ذات پر تو ان کا ایک حبہ بھی کبھی صرف نہیں ہوا۔ البتہ قومی اور ملی کاموں میں ان کی پوری دولت صرف ہو گئی۔ حتیٰ کہ وفات کے وقت وہ اس گھرانہ کی صاحب خانہ (گھر ستن) تھیں جس کا فخر اور امتیازی نشان فقر وفاقہ تھا۔ خود آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے لوگوں نے مجھے امداد سے محروم رکھا۔ خدیجہ نے میری مدد کی۔ لوگوں نے مجھے جھٹلایا، مگر خدیجہ نے ہر موقع پر میری تصدیق کی اور ہمت بڑھائی۔ [1]

پچیس برس تک حضرت خدیجہ زندہ رہیں۔ چھ بچے ہوئے دو لڑکے جو بچپن ہی میں وفات پا گئے، چار لڑکیاں جو زندہ رہیں۔ ان کے نکاح بیاہ بھی ہوئے مگر آنحضرت ﷺ کی وفات سے پہلے یہ لڑکیاں بھی وفات پا چکی تھیں۔ صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا زندہ رہیں جن کے دو لڑکوں (سیدنا حضرت حسن اور سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہما) کی اولاد کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کو سادات کہا جاتا ہے۔

اخلاقی بدحالی۔ جذبہ اصلاح
امن پسندی اور صلح جوئی

چھٹی صدی عیسوی جس کے آخری حصہ میں یہ آفتاب طلوع ہوا۔ ایک اندھیری رات تھی جس پر گمراہیوں اور ظلم و ستم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔

دولت پر غرور، جاگیر و جائیداد پر گھمنڈ، نسلی اور خاندانی اونچ نیچ، اپنے آپ کو اونچا، دوسروں کو نیچا

[1] البدایہ والنہایہ ص۱۲۹ ج ۲ والاستیعاب وغیرہ

سمجھنا، یہاں تک کہ ان سے چھوت چھات کرنا، غریبوں کو دبانا، کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا، عورتوں کو ایک خدمت گزار جاننا، شوہروں کے مرنے کے بعد ان کی زندگی کو اکارت ماننا، یہاں تک کہ ان کی خودکشی کو ان کے لئے ذریعہ نجات سمجھنا، خدا سے انکار کرنا، یا سینکڑوں ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے سامنے ماتھا رگڑنا، من مانی باتوں کو مذہب اور دھرم سمجھ لینا، خود غرضی، بے رحمی، سود، زنا، شراب، رشوت، جوا وغیرہ ایسی بیماریاں تھیں جن کی وبا پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ عرب میں ان عام بیماریوں کے علاوہ:

(۱) ایک بیماری یہ تھی کہ پورے ملک کی کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی۔ ہر ایک قبیلہ اپنی جگہ آزاد تھا

(۲) کچھ انسانوں کو ناپاک سمجھنے کا عقیدہ تو نہیں تھا مگر انسانی خون کو سستا اور مہنگا سمجھنا ان کا قومی مزاج بن چکا تھا، یعنی کسی معمولی قبیلہ کا کوئی آدمی اگر مارا جاتا خواہ وہ اس قبیلہ کا سردار ہی ہوتا تو اس کے خون کے عوض میں چند اونٹ دینے کافی سمجھے جاتے تھے جس کو وہ دیت کہا کرتے تھے۔ لیکن اگر کسی بڑے قبیلہ کا کوئی معمولی آدمی بھی مارا جاتا تو اس کے عوض میں قاتل کے ایک سے زائد اور انتہا یہ کہ کبھی پورے قبیلہ کو تباہ کر دینا بھی اپنا حق سمجھتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

(۳) فطرت جنگجو تھی، اس بنا پر معمولی بات پر بھی بڑی سے بڑی جنگ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو سالہا سال جاری رہتا۔ مثلاً:

ایک شخص کا اونٹ کھیت میں چلا گیا۔ کھیت والی عورت نے اسے مارا۔ اونٹ والے نے عورت کی چھاتی کاٹ ڈالی۔ اس بات پر ۴۹۴ء سے ۵۳۵ء تک برابر لڑائی رہی۔ یعنی اکتالیس سال برابر، کہتے ہیں ستر ہزار آدمی اس میں مارے گئے۔

داحس ایک گھوڑا تھا۔ گھوڑ دوڑ میں وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر اسے بدکا دیا۔ اتنی بات پر ایسا رن پڑا کہ قبیلے کے قبیلے کٹ مرے۔ اس لڑائی کا خاتمہ اس وقت ہوا جب اسلام کی امن پسندی نے محارب قبیلوں کے مزاج بدل دیئے۔

مختصر یہ کہ ان قومی اور بین الاقوامی بیماریوں اور علتوں نے نہ صرف یہ کہ امن و امان کی زندگی کو ناممکن بنا دیا تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ رحم، رواداری، بھائی چارگی، عدل و انصاف، مروت و شرافت، مختصر یہ کہ انسانیت کی تمام شریف خصلتوں کے چراغ گل تھے۔ قریش جیسے قبائل اگرچہ تمدن میں اپنا ممتاز مقام رکھتے تھے۔ مگر روح تمدن سے وہ بھی محروم تھے۔ ان کی کاروباری منڈیاں بڑھ رہی تھیں مگر اخلاق کی جنس ان میں ناپید تھی۔

حضرت محمد ﷺ نے جیسے ہی بیدار مغز جوان صالح کی حیثیت سے شہری زندگی میں قدم جمایا، جس

طرح آپ کو اپنے خالق اور پروردگار کی عبادت و پرستش کا شوق بڑھا، قوم کی یہ ابتر حالت بھی آپ کے دل کا درد اور جگر کا سوز بن گئی۔ یہ سوزش آپ کو ہر وقت بے چین اور مضطرب رکھتی۔ مگر کوئی معمولی نسخہ شفاء اس درد کے لئے کارگر نہیں تھا۔

اس درد کے علاج کیلئے ایک بہت بڑے سماجی انقلاب کی ضرورت تھی۔ لیکن وقتی طور پر ایک واقعہ نے موقع دیا کہ آپ اس میدان میں آگے بڑھیں۔

واقعہ یہ تھا کہ یمن کا ایک سوداگر کچھ مال مکہ معظمہ میں لایا۔ مکہ کے ایک بیوپاری عاص[1] بن وائل سہمی نے اس کا مال خرید لیا اور جب قیمت ادا کرنے کا وقت آیا تو اس کو مار پیٹ کر بھگا دیا۔ وہ مکہ والوں کے سامنے رویا دھویا مگر کسی نے پرواہ نہیں کی اور عاص بن وائل کا مقابلہ کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی۔ مکہ جیسے تجارتی شہر کیلئے یہ بدنامی بہت خطرناک تھی۔ اس پر مکہ کے کچھ شرفاء نے ایک کنونشن کا انعقاد کیا۔ محمد ﷺ اگرچہ ابھی بیس سالہ نوجوان تھے مگر امن و آشتی اور صلح و مصالحت جو آپکا فطری جذبہ تھا اس کا یہ اثر تھا کہ جیسے ہی آپ کو خبر ہوئی آپ بھی مجمع میں پہنچ گئے۔ آپ کی شرکت کی یہ برکت تھی کہ واقعہ کا تعلق اگرچہ تجارت اور کاروباری سلسلہ سے تھا مگر غور و فکر کے دائرہ کو وسیع کیا گیا اور ایک ایسی سوسائٹی (انجمن) بنائی گئی جس کے ارکان کا یہ عہد ہوتا تھا: (۱) ہم اپنے وطن سے بے امنی دور کرینگے (۲) مسافروں کی حفاظت کیا کرینگے (۳) غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے۔(۴) طاقتور کو کمزور پر، بڑوں کو چھوٹوں پر ظلم کرنے اور ناانصافی سے روکا کریں گے۔[2]

مگر جب تک دلوں کی سطح ہموار نہ ہو اس طرح کے معاہدے پائیدار نہیں ہوتے کیونکہ ان کا منشا علاج نہیں ہوتا۔ بلکہ دفع الوقتی ہوتا ہے۔ وقت گزرتا جاتا ہے تو یہ معاہدے بھی فراموش ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح کا ایک معاہدہ پہلے بھی ہو چکا تھا جب مکہ پر قبیلہ جرہم کا قبضہ تھا۔ مگر اب اس معاہدہ کا صرف نام یاد رہ گیا تھا۔ یعنی "حلف الفضول"

بہر حال وقتی طور پر یہ امن اور حفاظت جان و مال کے لئے ایک اچھا اقدام تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اسی ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ اس میں حصہ لیا کہ نبوت کے بعد جب ایک مضبوط نظام مسلمانوں کا قائم ہو گیا تھا تب بھی آپ فرمایا کرتے تھے کہ قریش اگر حلف الفضول کو زندہ کریں تو میں سب سے پہلا شخص ہوں گا جو اس میں حصہ لوں گا۔[1]

---

[1] اپنے قبیلہ کا بارعب سردار بھی تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حلیف تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے تو اس نے ان کو پناہ دی تھی۔ حضرت عمرو بن العاص انہیں کے فرزند تھے۔

[2] ابن ہشام ص ۸۳ و ص ۸۴ ج ۱

[1] ابن ہشام ص ۸۴، ج ۱

خدا پرستی اور معرفت حق

خدا کو ایک ماننا اور اس کی عبادت کرنا، عقل سلیم کا تقاضا ہے۔ مگر خدا پرستی کے وہ طریقے جن سے انسان روحانی ترقی اور ابدی سکون حاصل کر سکے، انسان اپنی عقل سے نہیں معلوم کر سکتا۔

عقل ان فیصلوں میں بھی بسا اوقات غلطی کر جاتی ہے جن کا تعلق مشاہدہ سے ہے۔ انتہا یہ کہ وہ طاقتیں جو انسان کے اندر موجود ہیں اور تندرستی یا بیماری کی وہ کیفیتیں جو جسم انسان میں پائی جاتی ہیں، چونکہ ان کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا تو عقل ان کو پوری طرح پہچاننے سے بھی قاصر رہتی ہے اور پہچانتی ہے تو بسا اوقات غلطی کر جاتی ہے۔ انتہا یہ کہ ایکسرے جیسی نظر آنے والی چیز کے بعد بھی ڈاکٹروں کی تشخیص مختلف رہتی ہے، جن میں کوئی ایک صحیح ہوتی ہے اور کبھی ایک بھی صحیح نہیں ہوتی۔ پس وہ معاملات جن کا تعلق ان حقیقتوں سے ہے جن تک مشاہدہ کی رسائی نہیں ہو سکتی، نہ ان کے تجربہ کی کوئی صورت ممکن ہے ان کے بارہ میں عقل کے فیصلوں پر وہی شخص اعتماد کر سکتا ہے جو انصاف جیسی نعمت سے محروم ہو، یا موجودہ زندگی کے فلسفہ اور فکر مستقبل سے غافل اور لاپرواہ ہو۔ مگر وہ صاحب فہم و فراست جو دیکھتا ہے کہ ہر ایک فعل کی ایک تاثیر ہے اور یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ معمولی کمی بیشی سے تاثیروں میں بے انتہا فرق آجاتا ہے۔ اگر صحیح توازن قائم رہے تو انسان ایٹم بم اور راکٹ تک بنا سکتا ہے اور چاند تاروں تک پہنچ سکتا ہے، لیکن توازن میں کچھ بھی فرق آجائے تو ساری محنت رائیگاں اور دولت برباد ہو جاتی ہے۔ وہ ہرگز جرأت نہیں کر سکتا کہ مشاہدہ سے بالا چیزوں کے بارہ میں عقلی فیصلوں پر اعتماد کر لے۔ وہ لامحالہ کسی ایسے مخبر اور ایسے رہنما کی تلاش کرے گا اور اس کی جستجو میں بے چین اور مضطرب رہے گا جو انسانی زندگی کے منتہا اور انجام کی صحیح خبر دے سکے۔ اور وہ متوازن چیزیں بتا سکے جن سے روحانی صحت اور ترقی حاصل ہو اور ابدی سکون میسر آئے۔

آنحضرت ﷺ کی فطرت سلیم نے آپ کو ایک خدا کی یاد پر آمادہ کیا۔ اس کا شوق پیدا ہوا۔ ایک طرف قومی زندگی میں آپ وہ اعتماد حاصل کرتے رہے کہ آپ کو "الصادق الامین" کا خطاب دیا گیا۔ دوسری جانب یاد خدا کا شوق اتنا ہی بڑھتا رہا۔ یاد خدا کے شوق کے ساتھ لامحالہ نوع انسان کی اصلاح و ترقی کے سوالات بھی آپ کے سامنے آتے رہے۔

☆ یہ اصلاح و ترقی صرف مادیات تک ہو یا اس کا تعلق روحانیت سے بھی ہو؟

☆ انسانی زندگی صرف اسی ظاہری زندگی تک ہے یا اس کے بعد بھی اس کا تعلق ہے؟

☆ اگر انسان مرنے کے بعد بھی ایک وجود رکھتا ہے تو اس کی فلاح و بہبود کس طرح ہو سکتی ہے؟

☆ اصلاح کا وہ طریقہ کیا ہو کہ انسان اس زندگی میں بھی امن و سکون اور ترقی سے ہمکنار ہو اور اس کے بعد کی زندگی بھی ایک خوشگوار زندگی ہو اور اس طرح یہ اصلاح مکمل اصلاح ہو۔

یہ وہ سوالات تھے جو آنحضرت ﷺ کے قلب حساس میں خلش پیدا کرنے لگے اور ان کی خلش یہاں تک بڑھی کہ آپ کو اس غور و فکر میں لطف آنے لگا۔ گویا یہی غور وخوص، فکر و مراقبہ آپ کی حیات مقدسہ کا جوہر بن گیا۔ اور چونکہ شہری زندگی اس میں ہارج تھی تو آپ کو تنہائی پسند آنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ وابستگی یہاں تک بڑھی کہ آپ شہر سے باہر پہاڑ کی ایک کھو میں رہنے لگے۔

حرا پہاڑ کا چار گز لمبا اور پونے دو گز چوڑا غار جہاں سے کعبہ مکرمہ بھی نظر آتا رہتا ہے اب بھی موجود ہے۔ یہ مکہ شہر سے تقریباً تین میل ہے۔ راستہ اتنا دشوار کہ یہ تین میل تیس میل سے بھی زیادہ کٹھن پڑتے ہیں۔ طاقتور نوجوان بھی وہاں پہنچتے پہنچتے تھک جاتے ہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ نے یہ عادت بنالی تھی کہ پانی اور ستو ساتھ لیتے اور اس غار میں پہنچ جاتے اور جب تک پھر ضرورت نہ ہوتی آپ وہیں یاد خدا، غور و فکر اور مراقبہ میں مشغول رہتے۔

رفیقہ حیات حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی پوری وفاداری اور دل سوزی سے حق رفاقت ادا کرتی رہیں۔ وہ پانی اور ستو کا ایک اندازہ رکھتیں اور جب ان کے اندازہ سے آنحضرت ﷺ کی واپسی میں تاخیر ہوتی تو وہ خود پانی اور ستو لیکر اس غار پر پہنچ جاتیں۔

آخر میں چھ ماہ❶ ایسے گزرے کہ آپ کو عجیب و غریب خوابیں آتی تھیں اور وہ اپنی تعبیر میں ایسی ہی سچی ہوتی تھیں جیسے سپیدہ صبح طلوع آفتاب کی پیشن گوئی میں صادق ہوتا ہے۔ پھر آفتاب طلوع ہوتا ہے تو آفتاب آمد دلیل آفتاب، بقول سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، آنحضرت ﷺ کا خواب بھی گویا سپیدہ صبح ہوتا تھا جس کے بعد آفتاب تعبیر کی درخشانی لازمی ہوتی تھی۔❷

---

❶ یعنی نبوت سے چھ ماہ پہلے

❷ بخاری شریف والبدایہ والنہایۃ وغیرہ

نبوت

آپ اسی غار میں تھے کہ ایک وجود نمودار ہوا۔ اس سے گھبراہٹ نہیں ہوئی بلکہ دل کو سکون ہوا۔ جیسے سوکھے ہونٹوں کو ٹھنڈا پانی مل گیا۔

اس نے فرمائش کی: "اِقْرَاْ" پڑھو۔

حضرت محمد ﷺ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ آپ نے عذر پیش کر دیا، میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس وجود نے دوبارہ یہی کہا، اِقْرَاْ۔ پڑھو۔ اس مرتبہ بھی حضرت محمد ﷺ کا وہی عذر تھا۔ اس وجود نے تیسری مرتبہ یہی کہا۔ اس مرتبہ جواب میں حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: کیا پڑھوں۔ اس وجود نے یہ آیتیں پڑھوائیں:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝١ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝٢ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝٣
الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝٤ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝٥

ترجمہ: پڑھ [1] اپنے رب کے نام سے جس نے (ساری مخلوق کو) پیدا کیا۔ بنایا انسان کو لہو کی پھٹکی (جمے ہوئے خون) سے پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔ سکھایا آدمی کو جو نہ جانتا تھا"

آپ نے یہ آیتیں پڑھیں۔ آیتیں ذہن نشین ہو گئیں۔ مگر ساتھ ساتھ ذمہ داری کا احساس بھی ہوا۔ ایک طرف اپنی عاجزی کا غیر معمولی احساس تھا۔ آپ کی خصوصیت یہ تھی کہ اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ ہیچ در ہیچ سمجھتے تھے۔ دوسری طرف اتنی بڑی ذمہ داری، اور ایسی ذمہ داری جس کا کوئی تجربہ اب تک نہیں تھا۔ یعنی بھٹکی ہوئی مخلوق کو پڑھنے پڑھانے، تعلیم دینے اور سدھارنے کی ذمہ داری، اور ایسی صورت سے جو بالکل اجنبی صورت تھی۔ جس کا کبھی وہم و گمان بھی نہیں آیا تھا نہ کسی سے ایسی باتیں سنی

---

[1] یہ آیت ۶۲۲ئ میں نازل ہوئی، یعنی ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں جو یورپ کے قرون وسطیٰ کا تاریک ترین زمانہ تھا جب مغربی یورپ پر جہالت کی گہری گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ مشرقی یورپ میں کچھ تعلیم کا چرچا تھا تو اس کو کلیسا نے اپنی مخصوص جائداد سمجھ رکھا تھا۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ دست درازی کر سکے۔ ہندوستان میں جو کچھ علم تھا وہ چند گھرانوں کی ملکیت تھا۔ کسی غیر تک اگر بھنک پہونچ جاتی تو اس کے کان میں سیسہ پلا دیا جاتا تھا۔

تھیں۔ اس طرح کے خیالات اور غیر معمولی احساس کا اثر یہ ہوا کہ دل کانپنے لگا۔ آپ مکان پر پہنچے تو لرزہ جیسی کیفیت تھی۔ آپ نے رفیقہ حیات (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) سے کہا:

"میرے اوپر کپڑا ڈال دو"۔ [1]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کیا بات ہے؟ طبعیت کو سکون ہوا تو آپ نے پورا قصہ سنایا اور یہ بھی فرمایا۔ مجھے خوف ہے کہ ایسی بڑی ذمہ داری کس طرح اٹھا سکوں گا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سمجھدار خاتون تھیں۔ حضرت محمد ﷺ کو جس طرح پندرہ سال سے دیکھ رہی تھیں، ان کو یقین تھا کہ اس غیر معمولی شخص کے لئے کوئی غیر معمولی صورت نمودار ہو گی جس کی شان نرالی ہو گی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پورا واقعہ سنا، پھر وہ آیتیں سنیں جن میں اس طرف اشارہ تھا کہ خدا قادر جو خون کے لو تھڑے سے جیتا جاگتا انسان بناتا ہے۔ قلم کے ذریعے لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے۔ انسان کو وہ باتیں بتاتا ہے جن کو وہ اپنے ذہن سے نہیں معلوم کر سکتا تھا۔ وہ خدا قادر کسی استاد یا قلم کی مدد بغیر محض اپنی قدرت سے علم کے دروازے آپ پر کھول دیگا۔

یہ آیتیں سن کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو یقین ہو گیا کہ جس غیر معمولی صورت کی توقع تھی وہ سامنے آگئی ہے۔

وہ اس واقعہ کے متعلق کوئی فیصلہ تو نہیں کر سکیں۔ البتہ حضرت محمد ﷺ نے جو اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ ان ذمہ داریوں کے بوجھ سے میری جان جاتی رہے گی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اس کا اطمینان دلایا کہ ایسا نہیں ہو گا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی زندگی کا مرقع پیش کر کے بہت لطیف پیرایہ میں اطمینان دلایا کہ آپ یہ بار اٹھا سکیں گے کیونکہ اب تک کی زندگی میں جو بوجھ اٹھاتے رہے ہیں وہ کم نہیں وہ بھی غیر معمولی ہیں۔ پس اگر کوئی اس سے بھی بڑی ذمہ داری آپ پر پڑے گی آپ اس کو بھی اٹھا سکیں گے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا: کلا واللہ لایخزیك اللہ ابداً انك لتصلُ الرحم و تحمل الکل وتکسب المعدو مروتقری الضیف و تعین علی نوائب الحق (بخاری شریف ص ۲۴۰) ترجمہ: خدا شاہد ہے ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا۔ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ناکام کر دے۔ آپ کی مدد نہ کرے آپ رشتہ داروں کا خیال رکھتے ہیں، ان کی مدد کرتے ہیں، ان کو منزل تک پہنچاتے ہیں۔ آپ ایسے احسانات کرتے ہیں اور ایسی خدمات انجام دیتے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی۔ جو دوسری جگہ قطعاً نایاب ہیں۔

---

[1] خود قرآن پاک کی عظمت اور اس کا وقار ایک با احساس کو لرزہ براندام کرنے کے لئے کافی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ لو انزلنا هذا القرآن علیٰ جبلٍ لرایته الخ۔ اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تو دیکھتا کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا (سورہ حشر آخری رکوع پ ۲۸)

باہر کے مسافر جو بے ٹھکانا ہوتے ہیں آپ ان کو اپنا مہمان بناتے ہیں۔ برپا ہونے والے ہنگاموں اور ناگہانی حوادث میں آپ حق کی حمایت کرتے ہیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اس طرح تسلی دی۔ لیکن یہ ان کی رائے اور ان کا اپنا اعتقاد تھا کہ جو اس طرح صاحب خیر ہو، خدا کی طرف سے اس کی مدد ہوگی۔ اس کو ذلیل ورسوا اور ناکام نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس طرح کے معاملہ کی حقیقت وہ بھی نہیں جانتی تھیں، کیونکہ نبوت اور الہام کی باتوں سے وہ بھی واقف نہیں تھیں۔ ان کو ایک شخص کا خیال آیا۔ یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ہم جد تھے۔ رشتہ کے بھائی ہوتے تھے، عیسائی مذہب اختیار کئے ہوئے تھے۔ عالم فاضل تھے۔ نبوت اور الہام کی باتیں جانتے تھے۔ عبرانی زبان پر ان کو عبور تھا۔ عبرانی کی اصل انجیل کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ عربی میں اس کا ترجمہ بھی کیا کرتے تھے۔ اب بہت بوڑھے تھے۔ بصارت سے بھی معذور ہو چکے تھے۔ مگر لوگ ان کی قدر کرتے تھے۔ ان کا نام ورقہ تھا ولدیت نوفل۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر ان کے یہاں پہنچی اور کہا: آپ کے برادرزادے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عجیب صورت پیش آئی ہے۔ یہ خود ہی بیان کرینگے۔ آپ غور سے سنئے اور رائے دیجئے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا واقعہ بیان کیا۔

ورقہ نے جیسے ہی سنا برجستہ جواب دیا:

یہ تو وہی ناموس [1] (فرشتہ) ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا تھا۔

ورقہ نے کہا: میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کاش میں جوان ہوتا! کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی!

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا کہ قوم ان کو نکالے گی تو بہت تعجب ہوا۔ یہ قوم جو یہاں تک گرویدہ ہے کہ عقیدت اور احترام میں نام لینا بے ادبی سمجھتی ہے، مجھ سے دعائیں کراتی ہے اور بڑے معاملات کا فیصلہ کرنا میرے حوالے کر دیتی ہے، کیا وہ ایسی آنکھیں پھیر لے گی کہ مجھے مکہ سے نکال دیگی؟

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے محبوب رہنما کے لئے یہ بہت ہی عجیب بات تھی۔ آپ نے تعجب سے دریافت کیا: "کیا میری قوم مجھے نکالے گی؟"

ورقہ! بیشک آپ کو نکالے گی اور یہ انوکھی بات نہیں ہے۔ جو شخص بھی ایسی بات پیش کرتا ہے جو آپ پیش کرنے والے ہیں اس کے ساتھ قوم کا برتاؤ یہی ہوا کرتا ہے۔ کاش میرے سامنے وہ دن آئے تو

---

[1] رازدار فرشتہ فتح الباری

میں آپ کی پوری پوری مدد کروں!

ورقہ تو زندہ نہیں رہے۔ کچھ دنوں بعد ان کی وفات ہو گئی مگر جو بات انہوں نے کہی تھی وہ پوری ہوئی۔

یہ تھا نبوت کا آغاز اور یہ تھی وحی کی ابتداء جس میں پڑھنے پڑھانے، علم اور قلم کا تذکرہ اور عالمانہ زندگی کی ترغیب ہے۔ (واللہ اعلم) ابتدائی ظہور کے بعد یہ سلسلہ کچھ عرصہ کیلئے بند ہو گیا۔

تبلیغ اور دعوت عام سے پہلے تربیت

حضرت محمد ﷺ کی چالیس سالہ مثالی زندگی نے آپ کو الصادق اور الامین اور ایسا محبوب رہنما بنا دیا تھا جس کے اعلیٰ اخلاق اور بہترین کردار پر مکہ کے ہر ایک چھوٹے بڑے کو پورا اعتماد تھا۔ مگر ان اعلیٰ اخلاق کے باوجود منصب نبوت کے فرائض اور اداء فرائض کے طریقوں سے آپ قطعاً ناواقف تھے۔ قرآن مجید نے آپ کی شان یہ بیان کی ہے۔

(الف) نہ آپ لکھ سکتے تھے، نہ لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے، نہ آپ نے کہیں تعلیم پائی تھی۔ [1] نہ آپ شاعر تھے۔ نہ ادیب کی حیثیت سے آپ کی شہرت تھی۔ [2] نہ آپ کاہن یا نجوم داں تھے۔ [3] نہ سابق مذہبوں سے آپ کو واقفیت تھی۔ [4] نہ آپ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے، آسمانی کتاب کیا ہوتی ہے [5] نہ آپ کو کبھی یہ خیال آیا تھا کہ آپ پر کوئی کتاب نازل ہوگی۔ [6] نہ اس شہر میں جہاں آپ پلے تھے، بڑھے تھے، نبوت یا رسالت کا چرچا تھا انتہا یہ کہ وہ قوم جس کے آپ فرد تھے اُمی تھی یعنی نبوت سے نا آشنا کیونکہ اس میں کوئی نبی نہیں ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم ں کا نام سنا تھا۔ مگر ان کی تعلیمات فراموش ہو چکی تھیں صرف دھندلے سے نشان باقی تھے۔ لیکن اب آپ پر یہ ذمہ دری ڈالی گئی تھی کہ ایسی قوم میں مکمل انقلاب برپا کریں۔ جو اگرچہ گمراہ ہے مگر اپنے آپ کو تمام دنیا کی قوموں میں سب سے بہتر اور برتر سمجھتی ہے اور یقین رکھتی ہے کہ حق وہی ہے جس [7] پر وہ قائم ہے۔ اور اس انقلاب کا آغاز خاص اس گروہ سے کریں جس کو نہ صرف اس کا یقین ہے کہ وہ حق پر ہے بلکہ یہ فخر بھی ہے۔ کہ وہ اپنے مذہب مے ں نہایت پختہ اور کٹر ہیں

---

1. سورہ عنکبوت ۲۹ آیت ۴۸
2. سورہ یٰسین ۳۶ آیت ۶۹
3. سورہ الحاقہ ۶۹ آیت ۴۱ و ۴۲
4. سورہ قصص ۲۸ آیت ۴۴ تا ۴۶
5. سورہ شوریٰ ۴۲ آیت ۵۲
6. سورہ قصص ۳۸ آیت ۸۶
7. سورہ الانفال آیت ۳۲ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَالْحَقَّ الخ

❶ ـ

اس قوم (عرب) سے متصل ایک طرف ایران، عراق، فارس اور ان سے متصل ہندوستان ہے۔ ان کے مذہب اگرچہ مختلف ہیں مگر پرستش غیر اللہ (شرک) میں سب شریک ہیں۔ کوئی بت پرست ہے کوئی کواکب پرست، کوئی عجائب پرست، ہر ایک کے پاس ایک فلسفہ ہے اور ہر ایک کو اپنی روایات، اپنے تمدن، اپنی عقل و دانش اور اپنے فلسفہ پر ناز ہے۔

دوسری طرف شام، مصر، افریقہ اور یورپ کے علاقوں میں باز نطینی شہنشاہیت کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ اور اگرچہ آج بیسویں صدی عیسوی میں چھٹی ساتویں صدی عیسوی کے دور کو قرون وسطیٰ کا پس ماندہ غیر مہذب اور غیر ترقی یافتہ تاریک ترین دور کہا جاتا ہے۔ مگر یہی علاقے ہیں جہاں رومتہ الکبریٰ کا مشہور قانون (رومن لا) جاری ہے او اسی علاقہ میں سقراط، بقراط، ارسطو، افلاطون، فیثاغورث جیسے باکمال فلاسفہ اور موجد گزر چکے ہیں۔ جن کے فلسفہ کو آج بیسویں صدی میں بھی زندہ فلسفہ کہا جاتا ہے۔

پس ماندہ لیکن کٹر عرب ❷ کا ایک اُمی ان تمام علاقوں اور ان میں بسنے والے انسانوں یعنی پورے نوع بشر کے لئے ہادی اور رہنما بنایا جارہا ہے۔ منصب رسالت اس کے سپرد ہونے والا ہے تو اس سے پہلے کہ وہ دوسروں کو دعوت دے ضروری ہے کہ جن باتوں کی وہ دعوت دے ان کا نمونہ وہ خود ❸ بن جائے۔ چنانچہ نبوت کے بعد کم و بیش تین سال ایسے گزرے جن میں حضرت محمد صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو عام دعوت و تبلیغ کا حکم نہیں تھا۔ ہاں، کچھ سعادت مند وہ تھے جنہوں نے مشک کی خوشبو خود سونگھ لی اور وہ خود ہی اس شمع کے پروانے بن گئے۔ ان میں سب سے پہلے یہ حضرات ہیں ابو بکر، خدیجہ، علی، زید بن حارثہ اور اُم ایمن (رضوان اللہ علیہم اجمعین) یہ تعداد میں صرف پانچ ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان کا تعلق آزاد، غلام، مرد، عورت، بچے یعنی نوع انسان کے ہر طبقہ سے ہے۔

آزاد مردوں میں ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ)

آزاد عورتوں میں خدیجہ (رضی اللہ عنہا)

بچوں میں حضرت علی (رضی اللہ عنہ)

آزاد کردہ غلاموں میں زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) جو اس وقت زید بن محمد کہلاتے تھے

---

❶ اپنے آپ کو وہ احمس یا حمس کہتے تھے یعنی اپنے مذہب میں کٹر اور نہایت پختہ

❷ قبیلہ قریش اور ثقیف وغیرہ چند قبائل اگرچہ متمدن تھے مگر عرب قوم متمدن نہیں تھی۔ اس کی بڑی تعداد بادیہ نشین صحرا نورد تھی۔ محمد میاں

❸ تاکہ مقصد رسالت پورا ہو۔ کیونکہ نبوت اور رسالت اس لئے نہیں کہ پیغام پہنچادیا جائے بلکہ بشر کو نبی یا رسول بنانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ نوع بشر کے سامنے عملی نمونہ بھی پیش کیا جائے۔ (دیکھو سورہ ۶ الانعام آیت ۷ تا ۱۰)

آزاد کردہ باندیوں میں اُم ایمن (رضی اللہ عنہا) جو بچپن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ماما (خادمہ) تھیں۔

ان حضرات نے بھی ابھی تبلیغ شروع نہیں کی۔ لیکن کچھ اور افراد جن کے کردار نے مستقبل میں ثابت کر دیا کہ وہ بہترین انسان اور پورے سماج کے قیمتی جواہر تھے، وہ خود متاثر ہوئے اور دعوت عام سے پہلے آغوش اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں (ان کے پر تقدس کارنامے تاریخ عالم کے سینے پر نقش ہیں جو شہادت دے رہے ہیں کہ یہ حضرات کس درجہ صداقت پسند، حق گو، دلیر اور بہادر تھے اور اسی لئے وہ سب سے پہلے الصادق الامین اور اس کے پیغام کے گرویدہ ہو گئے تھے)

عثمان بن عفان، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام، سعد بن ابی وقاص، عثمان بن مظعون، ابوعبیدہ بن الجراح، عبدالرحمن بن عوف، ابوسلمہ بن عبدالاسد، ارقم بن ابی ارقم ❶ (رضوان اللہ علیہم اجمعین)۔ تعلیم و تربیت کے اس بنیادی دور میں ان کی تربیت بھی ہوتی رہی۔

نصاب و طریقہ تربیت

قرآن پاک کی وہ سورتیں جو ابتداء میں نازل ہوئیں انہیں کو نصاب کہا جاسکتا ہے۔ ان سورتوں میں عقائد و نظریات کی بھی تعلیم دی گئی اور طریقہ تربیت بھی بتایا گیا ہے۔ عجیب بات جو ایک طالب حق کو مطمئن اور گرویدہ بنا دیتی ہے یہ ہے کہ جن عقائد و نظریات کی تعلیم ابتداء میں دی گئی، باقی ۲۳ سالہ زندگی میں ان کی ہی تشریح اور توضیح ہوتی رہی، ترمیم کسی ایک میں بھی نہیں ہوئی۔ بنیادی تعلیمات درج ذیل ہیں ۔ آیتوں اور سورتوں کے نمبر حاشیہ میں لکھ دیئے گئے ہیں۔

☆ پوری کائنات کا ایک خالق ہے جسکی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ رب العالمین اور ارحم الراحمین ہے (یعنی مخلوقات کے جس قدر طبقات اور درجات کائنات عالم میں ہیں وہ ان کا پیدا کرنے والا اور پالنے والا ہے۔ اس نے ہر مخلوق کی ایک فطرت بنائی اور اس فطرت کے بموجب نشوونما، بقا و تحفظ، تدریجی ترقی اور درجہ کمال تک پہنچنے کیلئے جن چیزوں کی ضرورت تھی اس کی رحمت نے ان کو مہیا کیا اور برابر مہیا کرتی رہتی ہے)۔ تمام جہانوں کا رب اور سب پر رحم کرنے والا وہی ہے۔ تمام کمالات اسی کو حاصل ہیں۔ تمام تعریفوں کا وہی مستحق ہے۔ ❷

☆ مشرق و مغرب کا رب وہی ہے۔ وہی معبود ہے اس کے سواء اور کوئی پرستش کے قابل نہیں ہے۔ ❸

☆ اس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، اس کو دولت علم سے نوازا اور ترقی کے راستہ پر لگایا

---

❶ البدایہ والنہایہ ص ۷ ۳ ج ۳

❷ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سورہ ۱ آیت ۱ و ۲

❸ سورہ مزمل ۷۳ آیت ۹ ،

ہے۔[1]

☆ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ قلم اور لکھنے پڑھنے کے ذریعہ تعلیم کا طریقہ اسی نے بتایا[2] وہ اس ذریعہ کے بغیر بھی جس کو چاہے عالم وفاضل اور سر تاج فضلاء بنا سکتا ہے۔

☆ وہ ایک ہے، یکتا ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں سب اس کے محتاج ہیں، نہ اس کے اولاد ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔[3]

☆ انسان کا ہر ایک عمل اچھا ہو یا برا ایک حقیقت ہے۔ ہر ایک عمل اپنا اثر رکھتا ہے۔ انسان اپنے اعمال کے جال میں اس طرح پھنس جاتا ہے جیسے کوئی قیدی۔[4]

☆ کوئی شخص کسی کا گناہ اپنے اوپر نہیں لے سکتا کسی پر دوسرے کا گناہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ ہر شخص اپنا اور اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ انسان کو صرف وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا۔ انسان جو کچھ کماتا ہے وہ اس کے سامنے آئے گا۔[5]

☆ ایک خاص دن ہو گا جس میں انسان کے تمام اعمال کا حساب اور ہر معاملہ کا انصاف ہو گا۔[6]

☆ خدا کی مخلوق صرف وہی نہیں ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے، بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مخلوق ہے۔ ایک خاص مخلوق وہ ہے جس کو فرشتہ کہا جاتا ہے۔ ان کی تعداد کا علم صرف ان کے خالق اللہ رب العالمین ہی کو ہے۔[7] وہ خدا کے حکم کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔[8] ان کی زندگی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل اور خدا کی حمد و ثناء کرتے رہتے ہیں۔ وہ خدا کے حکم سے انسانوں پر خدا کی نعمتیں بھی نازل کرتے ہیں اور خدا کے حکم سے خدا کا قہر بھی بندوں پر اتارتے ہیں۔[9]

☆ اللہ تعالیٰ انسانوں کی صحیح رہنمائی کے لئے نبی اور رسول بھیجتا ہے۔[10] نبی اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا، صرف وہ کہتا ہے جو خدا اس کو بتاتا ہے۔[1]

---

[1] سورہ علق ۹۶ آیت ۲و۴
[2] سورہ علق ۹۶ آیت ۳
[3] سورہ اخلاص ۲ ۱۱
[4] سورہ مدثر ۷۴ آیت ۳۸
[5] سورہ والنجم ۵۳ آیت ۳۸، ۳۹، ۴۰،
[6] سورۃ الفاتحہ ۱ آیت ۳
[7] سورہ مدثر ۷۴ آیت ۳۱
[8] سورہ والنجم ۵۳ آیت ۲۵
[9] سورہ مدثر ۷۴ آیت ۳۱
[10] سورہ مزمل ۷۳ آیت ۱۵
[1] والنجم ۵۳ آیت ۳۔۴

☆ علم اور یقینی بات وہی ہے جو اللہ کے بتانے سے رسول بتاتا ہے۔ اسکے علاوہ جو کچھ انسان کے پاس ہے وہ ظن ہے (تخمینی اور اٹکل کی باتیں ہیں)، جو علم و یقین کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ ❷

☆ تزکیہ نفس اور دل کو پاک کرنے اور روحانیت کو ترقی دینے کی صورتیں یہ ہیں۔

اللہ کو یاد کرو۔ دن کو یاد کرو۔ رات کو جاگ کر خدا کو یاد کرو۔ ❸ نمازیں پڑھو۔ زکوٰۃ ادا کرو (جو ایک لازمی فریضہ ہے اور زکوٰۃ کے علاوہ) اللہ کو قرض دو (ملی اور قومی کاموں میں خرچ کرو وہ اللہ تعالیٰ پر قرض ہو گا) کوئی نیک عمل ضائع نہیں کیا جائے گا۔ جو نیکی کرو گے خدا کے یہاں اس سے بہتر اور بڑھا ہوا پاؤ گے۔ جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہوتی رہیں اللہ تعالیٰ سے ان کی معافی اور مغفرت چاہتے رہو۔ ❹

☆ دولت کو اللہ کا انعام سمجھو۔ ہر ایک غرض سے بلند ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کے فرمان کی تعمیل اور اس کی رضا حاصل کرنے کیلئے ہر ایک ضرورت مند کی مدد کرو اور اس سے کہہ دو کہ ہم کوئی بدلہ نہیں چاہتے صرف اللہ کی رضا چاہتے ہیں۔ ❺

☆ روحانیت کی پاکی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جسم کو پاک رکھو۔ لباس پاک رکھو ہر ایک پلیدی کو (ظاہری ہو یا باطنی) دور کرو۔ ❺

☆ عذاب کے کام (جن سے انسان کی ابدی زندگی برباد ہوتی ہے اور دوزخ کا مستحق ہو جاتا ہے) یہ ہیں: نماز نہ پڑھنا، غریبوں کی امداد نہ کرنا، بیکار باتوں (اور خدا سے غافل کرنے والے کاموں) میں منہمک رہنا، عذاب و ثواب یعنی پاداش عمل پر یقین نہ رکھنا ❻ کسی کے ساتھ اچھا سلوک کر کے اس پر احسان جتانا۔ ❼

ایسی صورتیں اختیار کرنا کہ دولت اپنے پاس جمع رہے اور غریبوں اور ضرورتمندوں کی امداد نہ ہو۔ ❽

---

❷ والنجم ۵۳ آیت ۲۸
❸ سورہ مزمل ۷۳ آیت ۲، ۳، ۴
❹ سورہ مزمل ۷۳ آیت ۲۰
❺ سورہ دہر ۷۶ آیت ۸، ۹ و سورہ مدثر ۷۴ آیت ۶
❺ سورہ مدثر ۷۴ آیت ۴ و ۵
❻ سورہ مدثر ۷۴ آیت ۴۳ تا ۴۶
❼ ایضاً آیت ۶
❽ سورہ القلم ۶۸ آیت ۱۶ تا ۳۰

☆ اچھے آدمی جن کے نقش قدم پر چلنا چاہئے وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام سے نوازا۔ [1]

یعنی [2] (الف) خدا کے برگزیدہ نبی : جو ایسے پاک فطرت ہوتے ہیں کہ ہمیشہ گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

(ب) صدیق: جو اپنے قول و فعل میں نہایت سچے، جن کا ضمیر سچا، جن کے ہر فعل میں سچائی اور صداقت، یہاں تک کہ وہ سچائی کا پیکر اور صداقت کی تصویر ہوتے ہیں۔

(ج) شہید: جو حق و صداقت کے راستہ میں ہر ایک قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں جن کا جذبہ یہی ہوتا ہے کہ راہ حق میں قربان ہوں۔ اس کے علاوہ اور اپنے تمام جذبات قربان کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔

(د) صالح: نیک کردار، پاکباز، پاک طینت، جو اچھے کاموں کی بہترین صلاحیت رکھتے ہیں اور اس صلاحیت کو عمل میں لاتے رہتے ہیں۔

☆ مومن صالح اور سچا مسلمان وہ ہے جو راتوں کو جاگ جاگ کر خدا کو یاد کرے۔ دن کے کاموں کو خوبی سے انجام دے اور دل میں یاد خدا رکھے۔ اسی سے اس کا دل لگا رہے۔ اسی پر بھروسہ رکھے، نمازیں پڑھے، زکوٰۃ ادا کرے۔ قومی اور ملی کاموں کے لئے دولت خرچ کرتا رہے۔ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگتا رہے۔ مخالفین کی باتوں کو ضبط و تحمل سے برداشت کرے۔ برداشت سے باہر ہو جائیں تو خوش اسلوبی، سنجیدگی اور نرمی کے ساتھ ان سے الگ ہو جائے [3]۔ جو قول و قرار کے پکے ہوں، جو منت مان لیں یا عہد کر لیں اس کو پورا کریں۔ جو بلا لحاظ مذہب و فرقہ مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کی امداد کو اپنا فرض سمجھیں۔ اپنی ضرورتیں پیچھے ڈالیں ان کی ضرورتیں پوری کریں۔ خدا کی خوشنودی ان کا نصب العین ہو۔ جو کچھ کریں خدا کے لئے ہی کریں۔ کسی انسان سے کوئی معاوضہ گوارا نہ کریں۔ یہاں تک کہ یہ بھی نہ چاہیں کہ کوئی انسان ان کا کسی طرح شکریہ ادا کرے۔ خوف خدا، خدا کی عظمت اور اپنے انجام کی فکر ان کے دل و دماغ پر چھائی رہے۔ جو کچھ کریں اسی لئے کریں۔ [4]

☆ بدترین انسان وہ ہیں جو حکومت اور اپنے اقتدار پر گھمنڈ کریں۔ جن کو اپنی شاہنشاہیت پر ناز ہو (جیسے

---

[1] سورہ فاتحہ ۱ آیت ۵

[2] یہ تشریح قرآن پاک میں بعد میں نازل ہوئی (سورہ نساء ۴ آیت ۶۹) لیکن عمل پہلے دن سے اسی پر تھا۔

[3] سورہ مزمل ۷۳ آیت ۱۔۷،۸،۹،۱۰ و ۲۰

[4] سورہ دہر آیت ۷، ۸، ۹ و ۱۰

فرعون)۔ جو اپنی دولت کے نشہ میں صداقت سے منہ موڑیں۔ حقائق کو جھٹلائیں۔ ❺

جن کو اپنی دولت پر، اپنی اولاد پر، اپنے مادی ذرائع و وسائل پر ناز ہو انہیں کی بڑھوتی کی اڈھیڑ بن میں رات دن لگے رہیں۔ ذخیرہ اندوزی کے حریص ہوں، حق کے مقابلہ میں اکڑ جائیں، سچائی کی توہین کریں، عبرت کی آنکھیں بند رکھیں۔ ❶ خدا کی مخلوق کو بھول جائیں۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹی قسمیں کھانے سے نہ شرمائیں۔ بلکہ اس کو ہوشیاری اور فن کاری سمجھیں۔ کسی کو چڑھائیں کسی کا اتاریں۔ لگی بجھی کرتے رہیں۔ چغلیاں کریں۔ نہ ان کی نظر میں شرافت اور اخلاق کی قدر ہو نہ عصمت اور پاک دامنی کی۔ جن کی کوشش یہ ہو کہ غریبوں کا حق دبائیں اور اپنا سرمایہ بڑھائیں۔ ❷

طریقہ تربیت

☆ رات کو اٹھو، جاگو، آدھی رات یا آدھی رات کے قریب یاد خدا میں کھڑے ہو کر گزارو۔ ❸

☆ قرآن کو ٹھیر ٹھیر کر اطمینان سے پڑھو۔ ❹ (تبلیغ خصوصاً فرائض نبوت کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ ریاضت و مجاہدہ یعنی محنت کرنے اور مشکلات کو برداشت کرنے کی عادت ہو۔ ضمیر پاک ہو۔ اس کی تمام صلاحیتیں بیدار ہوں۔ جو بات نکلے دل سے نکلے۔ ہر ایک بات نہایت ٹھیک اور سنجیدہ ہو۔ شب بیداری سے یہ خصلتیں پیدا ہوتی ہیں اور ترقی کرتی ہیں کیونکہ) یہ حقیقت ہے کہ رات کے اٹھنے میں دل اور زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور ہر بات خوب ٹھیک نکلتی ہے۔ ❺ (لہٰذا شب بیداری کرو تاکہ یہ خصلتیں پیدا ہوں کیونکہ) ہم عنقریب ڈالیں گے تم پر بھاری کلام۔ ❻

☆ پورے دن کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھو۔ ❼

☆ اپنے رب کے نام کا ذکر جاری رکھو۔ ❽

☆ اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو جاؤ۔ ❾

---

❺ سورہ مزمل ۷۳ آیت ۱۵، ۱۶ و آیت ۱۱
❶ سورہ مدثر ۷۴ آیت ۱۱ تا ۱۶
❷ سورہ قلم ۶۸ آیت ۸۔ ۱۰ تا ۲۴
❸ سورہ مزمل ۷۳ آیت ۲، ۳
❹ ایضاً آیت ۴
❺ ایضاً آیت ۶
❻ ایضاً آیت ۵
❼ سورہ مزمل ۷۳ آیت ۷
❽ ایضاً آیت ۸
❾ ایضاً آیت ۸

☆ خدا کو اپنا وکیل اور ذمہ دار بنالو [10] اسی پر بھروسہ رکھو۔
☆ اس عقیدہ کو اپنے اوپر حاوی کرلو کہ مشرق و مغرب (اور تمام عالم) کا رب وہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں جو معبود اور الٰہ ہو۔ [1]
☆ جو کچھ وہ (مخالفین) کہتے ہیں اس پر ضبط و تحمل سے کام لو [2]۔ زیادہ سے زیادہ برداشت کی عادت ڈالو۔
☆ دنیاداروں سے کنارہ کرو (مگر خوبصورتی کے ساتھ [3]۔ یہ کنارہ کشی ایسی ہو کہ اپنے اندر جمال رکھتی ہو۔ نفرت نہ ہو بلکہ ایسی ہو جیسے طبیب، بیمار کی بیماری سے اپنا بچاؤ کرتا ہے۔ مگر اس طرح کہ اس بچاؤ میں بھی دلداری ہوتی ہے۔ مرض کا علاج کرتا ہے، مریض کا دل نہیں توڑتا)۔

داعی الی اللہ کے اوصاف اور ان کی تربیت و تکمیل

جس ذات کو اس لئے اٹھایا جارہا ہو کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے، بھٹکی ہوئی مخلوق کو حق و صداقت کے صراط مستقیم اور نیکی اور سچائی کے شاہراہ اعظم پر چلائے۔ اس کے کچھ اوصاف ہونے چاہئیں۔ قرآن حکیم میں جابجا ان اوصاف کی طرف اشارے اور کہیں تصریح پائی جاتی ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ایک بہترین مثال ہے اور ان اشاروں اور تصریحات کی شہادت یہ ہے کہ محمد رسول اللہ کی ذات اقدس بہترین مثال اور نمونہ اس لئے تھی کہ مقاصد دعوت و ہدایت کے لئے آپ کی تربیت خاص طور پر کی گئی تھی۔ داعی حق کے تمام اوصاف اس مختصر کتابچہ میں بیان نہیں کئے جاسکتے یہاں صرف چند اوصاف بیان کئے جارہے ہیں۔

(ا) ہمدردی: کامیاب داعی اور ہادی کو شمع اور چراغ ہونا چاہئے۔ شمع پوری محفل کو فیض پہنچاتی ہے۔ تاریک مجلس کو روشنی سے بھر دیتی ہے۔ مگر اس طرح کہ اہل محفل کے لئے خود فنا ہوتی رہتی ہے۔ ایک سوز ہوتا ہے جو اس کے تن من کو تحلیل کرتا رہتا ہے۔ داعی حق بھی اسی طرح سوزو گداز کا پیکر ہوتا ہے۔ وہ اپنی بقاء اسی میں سمجھتا ہے کہ راہ حق میں خود کو فنا کردے۔ قرآن حکیم کی شہادت یہ ہے کہ محمد ﷺ سراج منیر (شمع سوزاں) تھے [4] اور درد دل کا عالم یہ تھا کہ جان عزیز اسی میں گھلا رہے تھے [5] کہ بھٹکے ہوئے انسان سیدھے راستہ پر آجائیں۔

---

[10] ایضاً آیت ۹
[1] ایضاً آیت ۱۰
[2] ایضاً آیت ۱۰
[3] ایضاً آیت ۱۰
[4] یَاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۝ وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝ (احزاب ۴۵، ۴۶)
[5] فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ (شعراء آیت ۳۔ نیز سورہ ۱۸ کہف آیت ٦)

(۲) اذعان اور یقین: (الف) ایک شخص اونچے پہاڑ پر کھڑا ہوا، دشمن کے لشکر کو دیکھ رہا ہے جو تیزی سے حملہ کرنے کے لئے آرہا ہے۔ اس کی بستی کے آدمی، پہاڑ کے پیچھے ہیں وہ نہیں دیکھ رہے۔ یہ دیکھنے والا شخص جس خطرہ سے اپنی قوم کو آگاہ کر رہا ہے، وہ اس کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اس لئے وہ اپنی پوری طاقت صرف کر رہا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ بستی کے غافل لوگوں کو جگادے اور اپنے مشاہدہ کا یقین ان کو دلادے۔ داعی حق کو اپنی دعوت پر ایسا ہی یقین ہونا چاہئے۔ [1] گویا قبول حق اور کفر و انکار کے نتائج کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

(ب) ایک نہایت شاداب باغیچہ میں ایک گہری خندق ہے جس میں آگ کے بڑے بڑے انگارے دہک رہے ہیں۔ خندق کے کنارے پھسلوان ہیں۔ سیر کرنے والوں کو اس کی خبر نہیں ہے۔ جس کو خبر ہے وہ سیر کرنے والوں کو پورے یقین کے ساتھ خطرہ سے آگاہ کرتا ہے اور اگر باغ کی سیر کرنے والے اس کے دوست اور عزیز قریب ہوتے ہیں تو وہ اپنی پوری طاقت صرف کر دیتا ہے کہ ان کو اس خندق کی طرف نہ جانے دے۔

داعی حق باخبر باغبان ہوتا ہے جس کو مخلوق خدا سے ایسی ہی محبت ہوتی ہے، جیسی اپنے اہل و عیال سے۔ وہ خندق کی طرف جانے والوں کو منع کرتا ہے۔ کوئی آگے بڑھ جاتا ہے تو اس کو کمر پکڑ کر کھینچتا ہے۔ اس وقت اس کی ہمدردی سراسر اضطراب بن جاتی ہے۔ [2] اس کا سوز و اضطراب ناقابل بیان ہوتا ہے۔

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوز نہاں جلتی ہے

(۳) داعی حق کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ اس کی شوکت و حشمت کے سامنے لوگوں کی گردنیں جھک جائیں۔ بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ اس کی دعوت کی معقولیت، دلائل کی مضبوطی، اس کے اخلاص، قول اور فعل کی صداقت اور اس کی سچی خیر خواہی اور ہمدردی، بے لوث زندگی اور بلندی اخلاق کے سامنے لوگوں کے دل جھک جائیں۔ ان میں گرویدگی اور عقیدت پیدا ہو جائے۔ لہٰذا سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ:

(الف) کوئی جور اور جبر نہ ہونا چاہئے۔ ہر صاحب فکر کی رائے کو آزادی حاصل ہو۔ وہ خود اچھے برے اور اندھیرے اور اجالے کو پہچانے اور اپنے ضمیر کی شہادت پر عمل کرے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔ (بقرہ۔ ۲۵۶)

(ب) بیشک داعی حق اصلاحی مسائل پیش کرے گا۔ لوگوں سے مطالبہ کرے گا کہ وہ اس کے اصول

---

[1] بخاری شریف ص ۹۶۰ حدیث ابی موسیٰ فیہ انا النذیر العریان

[2] بخاری ص ۹۶۰ حدیث ابی ہریرہ۔

تسلیم کریں اور ان پر عمل کریں۔ لیکن ضروری ہے کہ انداز نہایت سنجیدہ، دانش مندانہ، نصیحت آمیز اور خیر خواہانہ ہو۔ تبادلہ خیالات اور بحث و مباحثہ کی نوبت آئے تو اس کا انداز اور طرز بھی ایسا حسین ہو کہ اس سے زیادہ نرم، دل کش اور پیار بھرا انداز نہ ہو سکے۔

اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ [1] (نحل۔ ۱۲۵)

(ج) گمراہ، سرکش، شورہ پشت، شرارت پسند، بدکردار جن کو سیدھے راستہ پر لانا مقصود ہے ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ داعی حق کی بات سنجیدگی سے سنیں گے اور شرافت کا جواب شرافت سے دینگے۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ ان کی عزت و عظمت، شہرت یا ان کے کسی مفاد کو نقصان پہنچ رہا ہو تو وہ لامحالہ حق کے مقابلہ میں اپنی ہر ایک شرارت کو کام میں لائیں گے اور پوری قوت سے سرکشی اور بغاوت کا مظاہرہ کریں گے۔ اس صورت میں داعی حق کا فرض کیا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: معافی اور درگزر کو اپنا اصول بنالو، نیکی کی ہدایت کرتے رہو اور جاہلوں (نادانوں) سے کنارہ کرتے رہو۔ (اعراف۔ ۱۹۸، نحل۔ ۱۲۷، مزمل و مدثر و دہر وغیرہ)

(۴) اگرچہ قانون یہ ہے کہ برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہوتی ہے وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثۡلُهَا (شوریٰ ۴۸)

مگر داعی حق اس قانون پر عمل نہیں کرتا بلکہ اس کا اصول یہ ہوتا ہے: بدی کا جواب نیکی سے دیتے ہیں، بھلائی کرکے برائی کو دفع کرتے ہیں۔

وَّيَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (الرعد۔ ۲۲)

(۵) عدل کے معنی برابری پیدا کرنے کے ہیں۔ اسی کو انصاف کہا جاتا ہے، اس سے مساوات تو قائم ہو جاتی ہے مگر بدی ختم نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ بدی کو بڑھاتا اور اس کے دائرہ کو وسیع کر دیتا ہے۔ داعی حق کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ بدی اور برائی دنیا سے ختم ہو۔ لہٰذا اس کا اصول یہ ہو گا کہ جب کوئی بدی پیش آئے گی تو اس کے اسباب تلاش کرکے ایسا راستہ اختیار کرے گا کہ بدی اور برائی کی جڑ کٹے، دوست دشمن بن جائیں، جو برے ہیں وہ اچھے ہو جائیں۔

وَلَا تَسۡتَوِى الۡحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِىۡ بَيۡنَكَ
وَبَيۡنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيۡمٌ (حم سجدہ۔ ۳۴)

---

[1] پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے (اے نبی) اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ اس طرح کہ حکمت (دانشمندی) کی باتیں بیان کرو۔ اور اچھے طریقہ پر پند و نصیحت کرو اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو تو (وہ بھی) ایسے طریقہ پر کہ حسن و خوبی کا طریقہ وہی ہو (اس سے اچھا نہ ہو سکے) تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا اور کون راہ راست پر ہے۔

مگر یہ آسان بات نہیں ہے۔ اس کو وہی کر سکتے ہیں جو ضبط و تحمل کے عادی ہوں۔ جو مکارم اخلاق کے خوگر ہوں۔(ایضاً آیت ۳۵)

لیکن عالم اسباب میں کسی چیز کی عادت جب ہی ہوتی ہے جب پہلے اس کی تربیت ہو چکی ہو۔ مختصر یہ کہ اس دور میں تربیت کا ایک مکمل باب یہ بھی تھا کہ ان کمالات و اوصاف کا عادی بنایا گیا جو سب سے افضل اور آخری پیغمبر اور سب سے زیادہ جلیل القدر داعی کے لئے ضروری تھے۔

ثمرہ تربیت

جن کی فطرت سلیم نے بلا دعوت اور بلا فرمائش خود بخود محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی کو پوری زندگی کا نصب العین بنایا تھا۔ اس زمانہ تربیت میں جو رنگ محمد نبی اللہ ﷺ پر غالب آتا رہا اسی رنگ میں یہ بھی رنگے جاتے رہے۔ ثمرہ یہ ہوا کہ ایک جماعت ایسی تیار ہو گئی۔

۱۔ جو خدا شناس اور سچی خدا پرست تھی۔

۲۔ جو سب کو چھوڑ کر اپنا رشتہ خدا سے جوڑ چکی تھی۔

۳۔ جس کا پورا بھروسہ اپنے خالق اور مالک پر تھا۔

۴۔ جس کا دل ہر ایک طمع سے پاک اور صرف اپنے خالق کی محبت سے لبریز تھا۔

۵۔ جس کے دل پر صرف خالق کائنات کی عظمت کا سکہ تھا، اسی کا خوف اس کے قلب و جگر کا داغ تھا۔ جس نے خوف خدا کے سوا ہر ایک خوف و خطر کے دھبے کو مٹا دیا تھا۔

۶۔ جس کو خالق کی ہر ایک مخلوق سے محبت تھی، کیونکہ وہ اس کے رب کی پالی ہوئی مخلوق ہے۔ ہر ایک انسان کا درد اس کے دل میں تھا، کیونکہ یہ انسان خدا کی قدرت کا شاہکار تھا جس سے اس کو عشق ہو گیا تھا اور جس کے لئے یہ سب کچھ قربان کر دینے کو زندگی کا نصب العین اور دل کی آخری آرزو بنا چکا تھا۔

۷۔ اس جماعت کو ان سے نفرت ہو گئی: (الف) جن کے دل اپنے خالق اور رب کی عظمت اور اس کی مخلوق کے درد سے نا آشنا تھے۔(ب) جو خدا کو چھوڑ کر اپنی اغراض کی پوجا میں لگے ہوئے تھے۔ (ج) جن کو مال اور اولاد پر ناز تھا اور انہی کی ترقی ان کی زندگی کا محبوب نصب العین تھا۔(د) جن کو غریبوں سے نفرت تھی کیونکہ وہ دولت سے محروم ہوتے تھے۔(ہ) جو یتیموں اور بیواؤں کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے تھے کہ ان کی امداد کرنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان سے کہیں زیادہ انہیں اپنی تجوریوں سے محبت تھی۔(و) کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا، مخلوق خدا کو غلام اور غلاموں کی زندگی کو اپنی خواہشات کا کھلونا بنانا، ان کی عظمت و برتری کا نشان تھا، جس کو وہ کسی وقت

بھی مٹانا یا نیچا کرنا نہیں چاہتے تھے خواہ ان کی جان جاتی رہے۔

مقامی اور سماجی حالات اور ردعمل

ا۔ عرب میں بادشاہت نہیں تھی۔ ہر ایک قبیلہ آزاد ہوتا تھا۔ شیخ قبیلہ اندرونی نظام کا نگراں ہوتا تھا۔ مکہ میں اس نظام نے چھوٹے سے جمہوریہ کی صورت اختیار کرلی تھی۔ صدر جمہوریہ تو پھر بھی کوئی نہیں تھا، البتہ قبائل کی ایک مشترک جماعت (کونسل) تھی۔ اس نے شہری، سماجی اور انتظامی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر تقریباً ایک درجن شعبے (پورٹ فولیو) بنائے تھے اور ہر شعبہ کا سربراہ منتخب کردیا تھا۔ مثلاً مقدمات قتل کا ایک خاص شعبہ تھا۔ اس کے سربراہ ابوبکر صدیق تھے۔ شعبہ سفارت کے ذمہ دار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے۔ اسی طرح باقی شعبوں کے ذمہ دار علیحدہ علیحدہ تھے۔ ان میں سے صرف ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ تھے جو سب سے پہلے اسلام لاچکے تھے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کئی سال بعد مسلمان ہوئے۔ باقی شعبوں کے ذمہ دار یا مسلمان ہی نہیں ہوئے یا اگر مسلمان ہوئے تو بہت آخر میں۔ اس مشترک جماعت کے اجلاس ہوا کرتے تھے۔ اس مقام کا نام "دارالندوہ" تھا۔

جہاں یہ اجلاس ہوا کرتے تھے، کوئی غیر معمولی معاملہ ہوتا تو اراکین کے علاوہ بھی نمایاں افراد کو خاص طور پر مدعو کرلیا جاتا تھا۔

(۲) حرب بن امیہ، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، عتبہ ربیعہ، ابولہب، ابوجہل، اُمیہ بن خلف، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط، نضر بن حارث، اسود بن عبدیغوث۔ بڑے بڑے دولتمند تھے۔ یہ تاجر بھی تھے صاحب جائیداد بھی، سودی کاروبار بھی بڑے پیمانہ پر کرتے تھے اور ان تمام خصوصیتوں کے مالک تھے جو سرمایہ داروں میں ہوا کرتی ہیں مثلاً ابولہب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا بھی تھا اور ہمیشہ مخالفت میں پیش پیش رہا، اس کا سودی لین دین وسیع پیمانے پر تھا اور اس کے حرص و طمع کی یہ حالت تھی کہ اس نے خانہ کعبہ کے خزانہ سے سونے کا ہرن چوری کرکے بیچ ڈالا تھا۔ یہ ہرن بہت عرصہ سے محفوظ چلا آتا تھا۔ [1]

عاص بن وائل بہت بڑا دولتمند قبیلہ کا مشہور سردار تھا مگر حضرت خباب رضی اللہ عنہ سے اس پر جھگڑا ہوا کہ انہوں نے لوہے کی کوئی چیز بنا کر اس کو دی تھی وہ اس کی اجرت مانگتے تھے اور یہ جان چراتا تھا۔ [2] اور یاد ہوگا یہی عاص بن وائل تھا جس نے یمن کے ایک تاجر کو مار پیٹ کر بھگادیا تھا، جب اس نے اپنے دام مانگے جس سے تمام مکہ والوں کی بدنامی ہوئی اور جس کی بنا پر وہ انجمن بنائی گئی تھی جس کا تذکرہ پہلے گزر چکا

---

[1] معارف ابن قتیبہ

[2] بخاری شریف ص ۳۰۴،

ہے۔ [3]

قرآن شریف نے کسی کا نام نہیں لیا مگر اس کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج اور معاشرہ کا اونچا طبقہ جو مکہ پر چھایا ہوا تھا جو اس لحاظ سے خوش نصیب مانا جاتا تھا کہ ان کے یہاں دولت کے انبار بھی ہوتے تھے اور فرماں بردار اولاد کی بھی کمی نہیں ہوتی تھی، اس کے اخلاق اور اوصاف یہ تھے:

(الف) اپنی اس خوش نصیبی پر کہ وہ صاحب مال اور صاحب اولاد ہیں ان کو گھمنڈ اور غرور ہوتا تھا۔

(ب) جو ان سے کم ہوتے تھے ان کو حقیر سمجھتے اور طرح طرح کے طعنے دیتے تھے۔

(ج) اپنے اثر ورسوخ اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے جھوٹی قسم کھانے سے ان کو عار نہ آتی تھی بلکہ بڑھ بڑھ کر قسمیں کھاتے، دوسروں کو لڑانے اور اپنے مخالفوں کو زک پہنچانے کے لئے بے دھڑک چغلیاں اور طرح طرح کا شرارت آمیز پروپیگنڈہ کرتے تھے۔ [1]

(د) کمزوروں پر ظلم کرنا، ان کی عادت تھی۔

(ہ) نرم مزاجی اور اخلاق سے ناآشنا تھے۔ نیک کام نہ خود کرتے نہ دوسروں کو کرنے دیتے۔

(و) غریبوں کی امداد کا کوئی موقع ہوتا تو اس میں روڑے اٹکاتے نہ خود خرچ کرتے نہ دوسروں کو خرچ کرنے دیتے۔

(ز) اخلاق سے ناآشنا سخت دل، خشک مزاج طبعیت کے روکھے۔ [2]

(ح) رات دن تجوری بھرنے کی کوشش میں مصروف رہتے۔ اس تصور سے ناآشنا تھے کہ یہ دولت ختم ہونے والی بھی ہے۔ [3]

(ط) خدا سے بے تعلق، خدا پرستی سے بے گانہ، کج بحث، زبان زوری سے اپنے عیبوں کو چھپانے والے۔ [4]

یہی لوگ تھے جو پورے مکہ پر چھائے ہوئے تھے اور چونکہ مکہ ہر لحاظ سے پورے عرب کا مرکز تھا تو ان کے اثرات پورے عرب پر غالب تھے۔

ایک شخص جس نے بچپن، جوانی اور ادھیڑ عمر کا ایک حصہ شہر کی گھلی ملی زندگی میں اس طرح گذارا ہو کہ وہ لوگوں کی آنکھ کا تارا بنا رہا ہو۔ اس کی زندگی میں خاص طرح کی تبدیلی آئے اس کے کچھ ساتھی

---

[3] زیر عنوان کمزوروں کی امداد عدل وانصاف اور جذبہ اصلاح۔

[1] القلم آیت ۸ تا ۱۵

[2] ایضاً

[3] سورہ ۱۰۴ ہمزہ آیت ۲

[4] سورہ ۷۴ مدثر آیت ۱۶ تا ۲۵ و آیت ۴۵ و ۴۶ و سورہ ۸۳ المطففین آیت ۲ و ۳ و آیت ۱۲ و ۱۳ سورہ ۹۶ العلق آیت ۶ و ۷

ہو جائیں۔ ان میں وہ بھی ہوں جو شہری زندگی میں اونچا درجہ رکھتے ہوں ❺۔ کچھ مالدار گھرانوں کے نوجوان ہوں ❻ اور یہ سب ایک خاص قسم کی انقلاب انگیز زندگی بنانے لگیں۔ مان لیجئے یہ کسی کو اپنی طرف نہیں بلاتے مگر کیا خود ان کا عمل اور غیر معمولی انداز لوگوں کو متوجہ نہیں کرے گا۔ خصوصاً وہ بڑے لوگ جو اپنے اقتدار کو سنبھالنے کے لئے ہر خطرہ کے موقع پر خوردبین سے کام لیتے ہیں۔ کیا وہ ان کے طرز زندگی سے ہراساں اور چوکنے نہیں ہونگے اور کیا یہ بات ان کو سراسیمہ اور پریشان نہ کردے گی کہ یہ جماعت جس طرح شرک اور بت پرستی کے خلاف توحید کی قائل اور خدا پرستی کی عاشق ہے وہ سرمایہ دارانہ نظام حیات سے بھی اتنی ہی متنفر ہے اور جذبات نفرت کی پرورش کر رہی ہے۔

رد عمل:

یہ قدرتی بات تھی کہ سرداران قریش نے جیسے ہی اس چھوٹی سی جماعت کے انداز سے خطرات کو بھانپا۔ مخالفت شروع کردی۔ مگر جس طرح دعوت عام نہیں تھی مخالفت بھی عام نہیں تھی۔ نجی مجلسوں میں تبصرے ہوتے۔ بیشک پھیلنے والے اثرات کو زائل کیا جاتا اور مخالفانہ رائے پختہ کی جاتی تھی۔ مگر گفتگو اور تبادلہ خیالات کے ذریعہ مثلاً: سب سے پہلے قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت تھی جو ہر ایک صاحب ذوق کو متاثر کر دیتی تھی اور جب کوئی صاحب فکر معنی اور مقصد پر غور کرتا تو حیران رہ جاتا اور بسا اوقات وارفتہ ہو جاتا تھا۔ یہ وارفتگی گرویدگی کی حد تک پہنچتی تھی جو اس کو سب سے چھڑا کر حضرت محمد ﷺ سے وابستہ کر دیتی تھی۔ جو حضرات اب تک مسلمان ہو چکے تھے اگرچہ ان کی تعداد تھوڑی تھی مگر وہ قرآن پاک کی اس تاثیر کی بہترین مثال اور نمونہ تھے۔ قرآن پاک کی اس تاثیر کو معاذ اللہ جادو کہا جاتا تھا۔ کہ یہ منتر ہے جو کسی سے محمد ﷺ کو ہاتھ لگ گیا ہے وہ اس منتر سے متاثر کرتا رہتا ہے۔ ❶

ان تمام آیتوں اور سورتوں میں جن عقائد اور نظریات کی تلقین ہے جب ان پر بحث ہوتی تو بڑے لوگوں کا چلتا ہوا جواب یہ ہوتا تھا: پرانے زمانہ کی دقیانوسی باتیں ہیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب یہ باتیں نہیں چل سکتیں۔ ❷

جب خدا پرستی اور توحید کا ذکر ہوتا تو جواب دیا جاتا: اپنے باپ دادوں کے مذہب سے ہٹ کر گمراہ

---

❺ جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

❻ جیسے حضرت عثمان بن عفان، عبدالرحمن بن عوف، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم

❶ سورہ ۷۴ مدثر آیت ۲۴ تنبیہ: سورہ مدثر اور سورہ قلم کی تمام آیتیں اگرچہ ایک ہی دفعہ میں نازل نہیں ہوئیں کچھ پہلے نازل ہوئیں کچھ تھوڑے وقفہ کے بعد۔ مگر بہرحال تمام آیتیں نبوت کے ابتدائی دور میں ہی نازل ہوئیں۔

❷ سورہ ۶۸ قلم آیت ۱۵

ہو رہے ہیں۔ [3]

جب ان کی شب و روز کی عبادت اور غیر معمولی شب بیداری کا تذکرہ ہوتا تو رؤساء قریش کی مجلسوں میں تبصرہ یہ کیا جاتا: دیوانے ہو گئے ہیں۔

لیکن ظاہر ہے اس طرح کے جوابات وقتی طور پر کام کر سکتے ہیں۔ واقعی اور حقیقی اثرات کو زائل اور سوال کرنے والوں کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ تو اب ان لوگوں نے یہ چاہا کہ اس سے پہلے محمد ﷺ کے اثرات متعدی ہوں، ان سے کوئی سمجھوتہ ہو جائے چنانچہ سرداران قریش کا ایک وفد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

ارکان وفد پر ایک نظر ڈال لیجئے:

(۱) ولید بن مغیرہ، مکہ کا رئیس اعظم جو دولت مندی اور خوش حالی کی تمام عظمتیں اپنے اندر رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو وحید کہا جاتا تھا۔

(۲) ابو جہل، سب سے زیادہ ہوشیار اور چالاک سردار۔

(۳) اسود بن عبد یغوث، مکہ کا بہت بڑا تاجر اور رئیس۔

(۴) اخنس بن شریق، طائف کا سب سے بڑا سردار اور رئیس۔

وفد نے آپ کے سامنے تین صورتیں پیش کیں:

- اگر دماغی خلش ہے تو اجازت دیجئے ہم بہترین علاج کا انتظام کریں۔
- اگر عیش و عشرت مقصود ہے تو ہم دولت اور حسن دونوں فراہم کر سکتے ہیں۔
- اگر اقتدار مطلوب ہے تو مکہ کے اقتدار کی باگ ڈور آپ کے حوالے کرتے ہیں۔ مگر آپ اپنے انداز کو ہلکا کیجئے۔ آپ کے نظریات جو سننے میں آرہے ہیں نہایت سخت ہیں۔ وہ ہیجان برپا کر دیں گے۔

مگر وحی الٰہی نے اسی طرح کی پیش کشوں کی شدت سے تردید کردی ا۔

تبلیغ کا آغاز

سب سے پہلے اپنا خاندان

حضرت محمد ﷺ کو جب حکم ہوا "قُمْ فَاَنْذِرْ" [1] اٹھو اور لوگوں کو آگاہ کرو (کہ ان کے موجودہ

---

[3] ایضاً آیت

[1] سورہ مدثر کی آیت ۱۱ و من خلقت وحیداً کے تحت حضرات مفسرین نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

عمل اور کردار کا مستقبل کیا ہو گا) تو آپ نے انداز اور تبلیغ کا سلسلہ اپنے خاندان سے شروع کیا۔ خدا کا حکم بھی یہی تھا۔ ❷

آپ نے کھانے کا انتظام کیا اور ان رشتہ داروں کو دعوت دی جو آپ کے پر دادا (دوسری پشت کے دادا) ہاشم کی اولاد تھے۔ ان میں وہ بھی تھا جس کا نام عبدالعزیٰ تھا۔ اور ابو لہب کی کنیت سے مشہور تھا❶۔ یہ آنحضرت ﷺ کے والد ماجد کا سب سے بڑا بھائی تھا۔ عمر، سرمایہ اور دولت کے لحاظ سے خاندان میں سب سے اونچا تھا۔ عبدالعزیٰ سمیت تقریباً چالیس آدمی اس دعوت میں آئے۔ کھانا کھایا، پھر آنحضرت ﷺ نے کچھ فرمانا شروع کیا ابھی آپ نے بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ عبدالعزیٰ نے پکار کر کہا:

لهدما سحركم صاحبكم ❷ (یہ جادو بہت ہی عجیب ہے جو تمہارے دوست نے تم پر کیا ہے)

جادو کا نام سن کر کون ٹھہر سکتا تھا۔ مجمع منتشر ہو گیا۔

ابو لہب کی یہ حرکت بہت ہی ہمت شکن تھی۔ مگر اس کے مقابلہ پر تھی جس کی ہمت نے ٹوٹنا نہیں سیکھا تھا۔ وہ نئے حوصلہ سے اٹھا۔ کچھ وقفہ کے بعد دوبارہ دعوت کی اور اس مرتبہ حلقہ وسیع کر دیا۔ پہلے ہاشم کی اولاد کو دعوت دی تھی اس مرتبہ ہاشم کے والد عبد مناف کی اولاد کو دعوت دی۔ اور ابو لہب کی پہلی حرکت کا رد عمل یہ ہوا کہ سب ہی آ گئے اور آخر تک جمے رہے۔ آپ نے بھی اپنی بات پوری فرما دی۔ آپ نے فرمایا:

”میں وہ پیغام پہنچا رہا ہوں کہ عرب کے کسی جواں ہمت نے یہ پیغام نہیں پہنچایا تھا۔ یہ دنیا اور آخرت کی کامیابی کا پیغام ہے۔ امتہ عرب اس پیغام سے دنیا میں بھی سربلند ہو گی اور آخرت کی کامیابیاں بھی اس کو نصیب ہو نگی ❸۔ یہ پیغام عمل کا پیغام ہے انسان کا عمل ہی اس کو کامیاب کر سکتا ہے۔ ایک کا عمل دوسرے کو کامیاب نہیں کر سکتا۔

اے معشر قریش! اپنے آپ کو جس درجہ پر رکھنا چاہتے ہو تو اس کی قیمت خود ادا کرو۔ عذاب الٰہی سے بچنا چاہتے ہو تو نجات کا سودا تم خود کرو۔

اے آل عبد مناف! خدا کے مقابلہ میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا جب تک تم خود عمل نہ

---

❷ سورہ مدثر ۷۴ آیت ۲

❶ سورہ شعراء ۲۶ آیت ۲۱۴ لہب کے معنٰی آگ کی لپٹ کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کا رنگ سفید سرخ تھا، چہرہ انگارے کی طرح دہکتا رہتا تھا اسی لئے یہ کنیت دی گئی۔ گویا وہ آگ کے انگارے اور لپٹ کی تصویر ہے۔

❷ البدایہ والنہایہ ص ۳۹ ج ۳ و مجمع البحار لفظ ھد

❸ ایضاً ص ۳۹ و ۴۰ ج ۳

کرو۔ میں تمہیں قانون قدرت کی گرفت سے نجات نہیں دلا سکتا۔

اے عباس ❹ بن عبد المطلب! خدا کے مقابلہ پر میں تمہارے کام نہیں آسکتا۔ اے رسول خدا کی پھوپھی "صفیہ!" میں اللہ کی گرفت سے تمہیں نہیں بچا سکتا۔ اے رسول کی بیٹی فاطمہ! میرے مال میں سے جو کچھ مانگنا چاہو مانگو میں دوں گا مگر خدا سے بے نیاز ہو کر میں تمہارے کچھ کام نہیں آسکتا۔ اللہ کے مقابلہ پر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ❶

تقریر بے حد موثر اور بلیغ تھی۔ سننے والوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا مگر دلوں کا پرانا مرض آسانی سے نکلنے والا نہیں تھا۔ یہاں بھی عبد العزیٰ ابو لہب نے اپنی عمر کی بڑائی اور رشتہ کی برتری سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس مجمع میں سب سے زیادہ سن رسیدہ ابو لہب تھا اور سب سے چھوٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ جن کی عمر تقریباً بارہ سال تھی۔ بیمار اور کمزور بھی تھے۔ پیٹ بڑھا ہوا، آنکھیں آتی ہوئیں۔ پنڈلیاں پتلی پتلی۔ کھڑا ہونا مشکل تھا۔

آنحضرت ﷺ نے تقریر کے بعد مجمع کی طرف سے جواب کا انتظار کیا تو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ (طفل بیمار) نے آپ کی تصدیق کی اور حمایت کا وعدہ کیا۔ آپ نے ان کی حوصلہ افزائی کے الفاظ کہے۔ ابو لہب کو موقع مل گیا۔ اس نے طنز کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ مجمع کا رخ بدل گیا۔ پھر منتشر ہو گیا۔ ❷

صفا کی اسٹیج سے اعلان حق

مکہ کی ایک پہاڑی کا نام "صفا" ہے اس پہاڑی کا وجود اب بھی باقی ہے۔ کعبہ شریف سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔ اب یہ پہاڑی شہر مکہ کی سطح کے برابر ہو گئی ہے مگر اس زمانہ میں یہ بلند تھی۔ خانہ کعبہ کا حرم ❸ (میدان) اس کے دامن میں تھا۔ عام طور پر قریش کی یہاں نشست رہتی تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ اس پہاڑی پر چڑھے اور قبائل قریش کو نام بنا پکارا۔ یا بنی فہر۔ یا بنی عدی وغیرہ وغیرہ۔

محمد۔ وہی محمد جن کا اثر و احترام یہ تھا اور قریش کے عوام و خواص اس درجہ گرویدہ تھے کہ آپ کو الصادق اور الامین کہہ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ انہیں الصادق اور الامین کی آواز کانوں میں پڑی تو لوگ

---

❹ عباس اگرچہ چچا تھے مگر ہم عمر اور ہم جولی تھے۔ تقریباً دو سال بڑے تھے

❶ بخاری شریف ص ۷۰۲

❷ البدایہ والنہایہ ص ۴۰ ج ۳

❸ چار دیواری اس زمانہ میں نہیں تھی۔ بیچ میں خانہ کعبہ تھا۔ اس کے چاروں طرف میدان تھا۔ میدان کے کنارے پر روساء مکہ و خدامان کعبہ کے مکانات تھے۔ میدان میں ان روساء کی نشستیں رہتی تھیں۔

پہاڑی کے دامن میں آکر جمع ہو گئے اور جو نہیں آسکتے تھے انہوں نے اپنا کوئی آدمی بھیج دیا۔

سب پہنچ گئے تو آپ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اگر میں یہ بتاؤں کہ یہ وادی جو اس پہاڑ کی آڑ میں ہے یہاں دشمن کی فوج پہنچ گئی ہے اور وہ عنقریب تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا آپ صاحبان میری بات سچ مانیں گے۔

سب نے جواب دیا: بیشک آپ کے متعلق ہمارا تجربہ یہی ہے کہ آپ سچ ہی بولتے ہیں [1]

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

عذاب خداوندی کا لشکر آنے والا ہے اس سے پہلے کہ عذاب کا یہ لشکر آئے میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔

آپ نے اسی موضوع پر تقریر فرمائی۔ بہت ممکن تھا لوگ اثر لیتے مگر خاندان ہاشم کا (وہی عمر رسیدہ عبدالعزیٰ ابولہب) بھڑکتا ہوا اٹھا اور یہ کہتا ہوا چل دیا:

"محمد! تیرے ہاتھ ٹوٹیں کیا اس لئے ہمیں یہاں جمع کیا ہے"۔ [2]

خاندان کا بڑا پورے خاندان کا سرپرست اور مربی مانا جاتا ہے اور قاعدہ عرب کے مطابق وہ ولی یعنی جواب دہ اور ذمہ دار بھی ہوا کرتا تھا۔ چھوٹوں کے حق میں اس کی بات مانی جاتی تھی۔ ابولہب کو یہ ولایت اور سرپرستی حاصل تھی کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کے والد ماجد کا بڑا بھائی تھا۔ اس کے علاوہ مکہ کا بااثر دولت مند تھا۔ مجمع نے جب اتنے بڑے آدمی کو خفا ہو کر جاتے ہوئے (واک آوٹ کرتے ہوئے) دیکھا تو مجمع بھی چلدیا۔ لیکن ذہنوں میں ایک سوال گھر کر چکا تھا (داعی حق کی یہی کامیابی تھی)۔

اتنا اشتعال (بوکھلاہٹ) کیوں؟

کوہ صفا سے جس نے پکارا وہ وہی محمد تھا جس کا نام لینا لوگ بے ادبی سمجھتے تھے۔ جس کو "الصادق" اور "الامین" کہا کرتے تھے۔ جس سے دعائیں کرایا کرتے تھے۔ برکتیں حاصل کیا کرتے تھے۔ جس نے کچھ عرصہ پہلے اس خوفناک ہنگامہ کو نہایت خوبصورتی سے ختم کیا تھا جو تعمیر کعبہ کے وقت حجر اسود کے سلسلہ میں سر اٹھا چکا تھا۔

کوہ صفا کی مختصر تقریر میں جن خرابیوں کی طرف آنحضرت ﷺ نے اشارہ کیا ان کا احساس خود قریش کو بھی تھا۔ انہی کمزوریوں اور خرابیوں کی اصلاح کے لئے چند سال پہلے وہ انجمن بنائی تھی اور وہ عہد نامہ طے کیا تھا جو حلف الفضول کے نام سے مشہور تھا۔

---

[1] ما جربنا علیک الا صدقاً بخاری شریف ص ۷۰۲

[2] بخاری شریف ص ۷۰۳

یہ ابولہب جو اس وقت سب سے پہلے مشتعل ہوا آنحضرت ﷺ کا وہی عم بزرگ ہے جو آنحضرت ﷺ کی ولادت پر اتنا خوش ہوا تھا کہ اپنی باندی ثوبیہ کو فوراً آزاد کر دیا۔ اسی ثوبیہ نے سب سے پہلے اس نونہال محمد ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔

پھر یہ خفگی اور اتنی بوکھلاہٹ کیوں؟

اس کا سبب وہ انقلاب تھا جس کی تصویر اس مختصر جماعت کے آئینہ کردار میں ان کو نظر آرہی تھی جو اس چند سال کے عرصہ میں (جو تربیت کیلئے مخصوص تھا) محمد ﷺ کے دامن میں تربیت پاکر تاریخ عالم کے پلیٹ فارم پر جلوہ گر ہو چکی تھی، جو ایک طرف شرک والحاد کے مقابلہ میں توحید۔ فسق وفجور کے مقابلہ میں مکارم اخلاق۔ حیوانیت اور بہیمیت کے مقابلہ میں انسانیت اور شرافت کی علمبردار تھی، تو دوسری جانب راتوں کو اٹھ اٹھ کر کلام الٰہی کی وہ آیتیں بھی گنگنایا کرتی تھی جو مفاد پرست، دولت وثروت اور ظالمانہ سرمایہ داری کے خلاف گرج رہی تھیں۔ جس کا کردار یہ تھا کہ اپنی دولت کو راہ خدا میں لٹا کر ان آیتوں کے مفہوم و مقصود کا وہ نقشہ پیش کر رہی تھی، جو ان دولت پرستوں کے لئے بہت ہی وحشتناک تھا ۔ جھنجلاہٹ اور اشتعال کا باعث یہ بھی تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو سمجھانے کی جتنی کوششیں کیں وہ ناکام ہو چکی تھیں۔

ابولہب جیسا سرمایہ پرست جو خزانہ کعبہ کے غزالہ زریں پر بھی ہاتھ مار دے، عاص بن وائل جیسا ذخیرہ اندوز جو مزدور کی مزدوری برسوں تک ٹلاتا رہے۔ ولید بن مغیرہ جیسا حریص جو سب سے بڑا دولت مند ہونے پر بھی صبر نہ کرے، اور اس کی طمع اور لالچ کا جہنم "هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ" (ق۔۳۰) پکارتا رہے۔ عتبہ بن ربیعہ اور مسعود ثقفی جیسے جاگیردار جن کی زندگی کا نصب العین ہی جاگیرداری اور زراندوزی ہو۔ ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط جیسے باغی اور طاغی بڑے بڑے کاروبار کے مالک جو مکہ اور مکہ سے گزر کر پورے عرب پر چھائے ہوئے ہوں سورہ ھمزہ میں انہی جیسوں کے لئے فرمایا گیا ہے:

> "جہنم کی ہلاکت اور بربادی ہر ایسے شخص کے لئے جو دوسروں کے عیب نکالے اور ان کو نظر حقارت سے دیکھتے ہوئے طعنے دے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مال بٹور رکھا ہے اور اس کو بار بار گنتا رہتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا (اس کی سرمایہ داری پائدار ہو گی)۔ ہر گز نہیں، بلاشبہ ایسا ہو گا کہ اس کو حطمہ میں ڈال دیا جائے گا۔ تم جانتے ہو حطمہ کیا ہے۔ وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کو جھانک [1] لیتی ہے۔ بلند اور دراز ستونوں کی طرح اس آگ کے شعلے ہونگے ان لوگوں کو ان آتشیں ستونوں

[1] ایمان ہو تو نہیں جلاتی کفر ہو تو جلا ڈالتی ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ

میں گھیر کر بند کر دیا جائے گا۔ (سورہ ھمزہ)

سورہ ھمزہ کو بار بار پڑھئے آپ کو سرمایہ داروں کے اس غیر معمولی اشتعال کا سبب معلوم ہو جائے گا ۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ابتدائی دور میں اسلام سے مشرف ہو گئے تھے۔ آپ کی مشہور روایت ہے [1] کہ آنحضرت ﷺ دیوار کعبہ کے سایہ میں تشریف فرما تھے۔ میں سامنے پہنچا تو آپ فرما رہے تھے "ھم الاخسرون و رب الکعبۃ یوم القیامۃ" رب کعبہ کی قسم قیامت کے روز یہی لوگ خسارہ میں ہونگے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے یہ الفاظ سنے تو میں چونک گیا۔ مجھے خیال ہوا کہیں میرے بارے میں بھی کوئی آیت نازل ہوئی ہے؟ میں نے عرض کیا:

یارسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان۔ یہ بدنصیب کون ہیں؟

فرمایا: جو سب سے زیادہ دولت مند ہیں۔ صرف وہ مستثنیٰ ہیں جو آگے پیچھے دائیں بائیں سب طرف خرچ کرتے رہیں۔

تعلیمات کا دوسرا رخ

پڑھنا، لکھنا، تہذیب، تمدن

۱۔ تخلیق نواز اور انقلاب انگیز تعلیمات کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ مشہور مثل "کلام الملوک ملوک الکلام" کی وجد آفرین مثال بھی آپ کے سامنے آجائے گی۔

وحی کا آغاز لفظ "اِقْرَاْ" سے ہوا۔ اور اس اہمیت کے ساتھ کہ نام رب بھی بعد میں لایا گیا۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ "پڑھ اپنے رب کے نام سے" پھر پروردگار (رب) کی تین صفتیں بیان کی گئیں خَلَقَ، الْاَكْرَمُ، عَلَّمَ زیادہ زور عَلَّمَ پر دیا گیا (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ) تعلیم دی قلم کے ذریعہ۔ سکھایا انسان کو وہ جو نہیں جانتا تھا۔

کیا اس اسلوب کلام سے ہمیں یہ سبق [2] نہیں ملتا کہ جو شخص اس وحی پر ایمان لائے اس کا پہلا فرض

---

[1] ترمذی شریف ص ۸۷ج او مسلم شریف ص ۳۲۰ ج او غیرہما

[2] جس طرح یہ سبق ملتا ہے کہ معلم حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ انسان کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو وہ نہیں جانتا۔ وہ جس طرح قلم کے ذریعہ سکھاتا ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ امی محض محمد ﷺ کو بلا کسی واسطہ کے علم الاولین والآخرین سے نواز دے۔ علق (خون بستہ) یعنی لہو کی پھٹکی۔ اس کو علم سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ خون کی پھٹکی کے لئے علم کا تصور بھی بے محل ہے۔ لیکن خدا قادر پروردگار عالم اس علق سے انسان کو پیدا کرتا ہے اور علم بے پایاں کی دولت سے نوازتا ہے۔ وہی رب ذوالجلال محمد ﷺ جیسے امی کو جوہر علم سے آراستہ کر رہا ہے۔ بلاشبہ کسی امی کو نہیں کہا جاسکتا کہ پڑھ۔ پڑھنے کا حکم امی کے حق میں تکلیف

قرأت اور تعلیم ہے ❶۔ اور تعلیم بھی وہ نہیں جو ماں باپ بچوں کو زبانی دے دیتے ہیں بلکہ تعلیم ایسی جس میں پڑھنا بھی ہو اور قلم سے لکھنا بھی۔

۲۔ کچھ توقف کے بعد دوبارہ سلسلہ وحی شروع ہوا تو اس کا پہلا لفظ تھا یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ (اے لحاف میں لپٹنے والے)

اس المدثر کو چھ کاموں کی ہدایت کی گئی۔(۱) دعوت و تبلیغ قُمْ فَاَنْذِرْ (۲) تعظیم رب (عبادت) وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۳) ظاہر کی پاکی اور صفائی وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (۴) باطن کی پاکی وصفائی وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (۵) بے لوث خدمت لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۶) رضاء مولیٰ کو نصب العین بنا کر اس پر جم جانا۔ صبر واستقامت سے کام لینا۔ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (المدثر ۴۔۷)

لفظ المدثر ❷ سے خطاب اور اس کے بعد یہ احکام کیا ان کا اشارہ یہ نہیں ہے کہ خدا پرستی اور تلاش حق، ہمدوش تہذیب و تمدن ہونی چاہئے۔

مالا یطاق ہے۔ مگر رب محمد کا حکم محمد کے لئے تکلیف مالا یطاق نہیں ہے کیونکہ جو حکم کر رہا ہے وہ پہلے ہی محمد ﷺ کو وہ جوہر عطا کر چکا ہے جس نے محمد ﷺ کو خطاب اقرأ کا اہل اور محل بنا دیا۔(واللہ اعلم بالصواب)

❶ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے یہ موضوع بہت دلچسپ ہے کہ وہ تحقیق کرے کہ اس وقت تعلیم کے بارے میں اقوام عالم کی حالت کیا تھی اور ان کا ذوق تعلیم کہاں تک سر دپڑ چکا تھا۔ مغربی یورپ، انگلینڈ، جرمنی وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ وہاں تو انسان ابھی پہاڑ کی گھاٹی اور پھونس کی جھونپڑی سے بھی نہیں نکلا تھا۔ رات کو ایک ہی جھونپڑی میں اپنے مویشی کے ساتھ بند ہوتا تھا۔ مشرقی یورپ جہاں "رومن" کا اقبال چمک رہا تھا وہاں بھی علم اور تعلیم کی کچھ دولت تھی تو صرف کلیسا کے تاریک کناروں میں چھپی ہوئی۔ کلیسا سے باہر یا دولت علم سے آشنا ہی نہ تھے یا تعلیم ان کے لئے ممنوع تھی اور کلیسا کے علماء بھی صرف نفع اندوزی کی حد تک علم کے قدردان تھے۔ اگر نفع کسی کتاب کی فروخت سے ہوتا یا چمڑے پر لکھی ہوئی کتاب کے حروف مٹا کر چمڑہ فروخت کر دینے میں نفع ہوتا تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ (موسیولیبان)

ہندوستان کا حال معلوم ہے کہ یہاں صرف براہمہ ہند علم کے مالک سمجھے جاتے تھے اور غیر برہمن میں سے آدھی سے زیادہ مخلوق شودر تھی، وہ علم حاصل تو کیا کر سکتی اگر علم کی بھنک بھی کان میں پڑ جاتی تو کان میں سیسہ پگھلا دیا جاتا۔(منوسمرتی)

ایران اور فارس میں عیش پرستی علم پر غالب تھی اور چین و افریقہ کا ماضی ان کے موجودہ حال سے معلوم ہو رہا ہے۔ امریکہ و کناڈا، آسٹریلیا، ربع مسکون سے خارج تھا تو انسانی دنیا سے بھی خارج تھا۔

❷ المدثر دثار سے ماخوذ ہے۔ دثار کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے لحاف فرمایا ہے کیونکہ دثار اس کپڑے کو بھی کہا جاتا ہے جس سے گرمائی حاصل کی جائے (مجمع البحار)۔ لیکن عرف میں دثار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو اس کپڑے کے اوپر پہنا جائے جو بدن سے متصل رہتا ہے۔ جو کپڑا بدن سے لگا رہتا ہے اس کو شعار کہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے حضرات انصار کے متعلق فرمایا تھا "انتم شعار والناس دثار" یعنی تم میرا وہ لباس ہو کہ اگر تم الگ ہو جاؤ تو بدن ننگا ہو جائے اور دوسرے لوگ اوپر کا آرائشی کپڑا ہیں۔ وہ اگر الگ ہو جائیں تو بدن برہنہ نہیں ہوگا۔ مختصر یہ کہ دثار میں صرف ستر پوشی نہیں ہوتی بلکہ اس سے ایسی آرائش ہوتی ہے جو تہذیب کے تقاضے کو پورا کرے جیسے ہندوستان میں شیروانی یا اچکن اور عرب کے پرانے قاعدہ کے مطابق چادر اور دور حاضر میں عبا۔ پس لفظ المدثر اور اس کے بعد کے الفاظ ثیابك فطھر یہ تصور پیدا کر رہے ہیں کہ داعی الی اللہ کو پورے لباس سے آراستہ ہونا چاہئے اور لباس بھی ایسا ہو جو پاک صاف ہو۔ یعنی اسلام جب رہبانیت یا سادھو پنے

دلیل صداقت ❶

آنحضرت ﷺ کی صداقت کی بہت سی دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔ مستقل کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ احادیث اور تاریخی روایات کے علاوہ خود قرآن حکیم نے بہت سی دلیلوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہاں صرف دو دلیلیں پیش کی جارہی ہیں۔ ہر ایک انصاف پسند کے لئے یہ دو دلیلیں کافی ہیں۔

پہلی دلیل:

خود آپ کی زندگی (صلوات اللہ علیہ وسلامہ ابداً دائماً) آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سامنے بھی آپ کی سابقہ زندگی تھی۔ اسی زندگی کے معیار پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے غار حرا کے واقعہ کو پرکھا اور غیر اختیاری طور پر آپ کی نبوت کی معترف ہو گئیں۔ اور جب آپ نے پوری قوم کے سامنے دعوت پیش کی تو وحی خداوندی نے ہدایت کی کہ آپ اپنی قوم سے یہ کہیں کہ یہ دعوت تو میں آپ کو پیش کر رہا ہوں۔ لیکن

"واقعہ یہ ہے کہ میں اس سے پہلے تم لوگوں کے بیچ میں اپنی پوری عمر بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے"۔ (سورہ یونس ۱۰ آیت ۱۶)

تشریح: وحی الٰہی کی تلقین یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اپنی صداقت کے ثبوت کے لئے لوگوں سے کہیں کہ ساری باتیں چھوڑ دو۔ صرف اسی بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی ہوں، جس کے حالات و کردار کی تمہیں خبر نہ ہو۔ مین تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی۔ بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بات بھی سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی۔ تم نے نہ صرف صادق اور امین کہا بلکہ صادق اور

کو پسند نہیں کرتا تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ اس کا داعی برہنہ یا صرف ستر پوش (لنگوٹی کسنے والا) نیم برہنہ ہو۔ برہنگی یا نیم برہنگی دونوں حرام ہیں۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ پورا لباس اسی وقت ہو سکتا ہے جب تمدن اس حد تک پہنچا ہوا ہو کہ کپڑا تیار ہو سکتے وہ سل سکے وغیرہ وغیرہ۔ پس اس بات سے انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ کلام اللہ شریف کے اس اسلوب خصوصاً ان الفاظ سے جیسے تہذیب و تمدن کی قدر افزائی ہوئی ہے ایسے ہی صنعت و حرفت، تبادلہ، تجارت وغیرہ ان تمام عوامل کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ جو کسی انسان کے "المدثر" لحاف پوش، یا مہذب لباس پوش ہونے کے لئے ضروری ہوں۔ اور جب ستر پوشی فرض ہے تو لباس و پوشاک کا تیار کرنا اور اس کی تیاری کے جملہ ذرائع مہیا کرنا بھی مسلمانوں کے حق میں اجتماعی فریضہ ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

❶ سیرۃ کی عام کتابوں میں یہ عنوان نہیں ہوتا مگر کتاب اللہ نے آغاز قرآن میں جب نوع انسان کو عبادت کا حکم دیا تو ساتھ ساتھ صداقت کتاب اللہ کی دلیل بھی ایسی پیش کی جس کے ساتھ رسول خدا کی صداقت بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے سورہ بقرہ، رکوع ۳

امین میر القلب کر دیا۔ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں، تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان [1] باندھنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں کہ مجھ پر اس کا کلام [2] نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم سمجھ نہیں سکتے؟

دوسری دلیل خود قرآن شریف (کلام اللہ)

سچے آدمی کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل خود اس کی زندگی ہے اور اپنی زندگی کو دلیل صداقت کے طور پر وہی پیش کرتا ہے جو فی الواقع سچا ہو اور اپنی سچائی پر اس کو پورا یقین ہو، جس کے عمل نے کبھی ضمیر سے بغاوت نہ کی ہو، اور جس کا ضمیر اپنے کردار عمل سے ہمیشہ مطمئن رہا ہو۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب، لیکن آفتاب دلیل انہیں کے لئے بن سکتا ہے جو آفتاب کو دیکھ رہے ہیں۔ جنہوں نے آفتاب نہیں دیکھا انہیں تو کسی اور ہی شاہد کی ضرورت ہو گی۔ قرآن حکیم (کلام اللہ) کہتا ہے: وہ شاہد میں ہوں۔ خود اپنی صداقت کی بھی دلیل ہوں اور صداقت محمد ﷺ کی دلیل بھی میں ہی ہوں۔

وہ عرب جن کو مطمئن کر کے تمام دنیا کے لئے داعی بنانا تھا۔ کلام الٰہی کا خطاب ان سے ہے۔

”تم اہل لسان ہو، اپنی زبان کے عاشق ہو، ایسے عاشق کہ شعر و سخن ہر ایک کی گھٹی میں پڑا ہے۔ شعر و سخن کی یہی گرم بازاری ہے کہ قومی میلوں اور تہواروں کے موقع پر خصوصاً زمانہ حج میں جب عرب کے چنیدہ دماغ منیٰ میں جمع ہوتے ہیں تو کئی کئی روز تک مشاعروں کی محفلیں گرم رکھتے ہو۔ ان میں بڑی شان سے مقابلہ کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ پھر جو قصیدے سب سے اونچے مانے جاتے ہیں ان کی یہاں تک قدر کرتے ہو کہ خانہ کعبہ میں جہاں تمہارے بہت سے معبود رہتے ہیں اس قصیدہ کو بھی ایک معبود بنا کر آویزاں کرتے ہو اور تمہارے ذوق و شوق کا عالم یہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ماتھا رگڑتے ہو

---

[1] تمام علماء اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اس کے اخلاق اور خصائل کے ابھرنے اور پنپنے کا اصل زمانہ ہوتا ہے۔ پس اگر ایک شخص چالیس برس تک صادق و امین رہا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب اور مفتری بن جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ اس خدا پر بہتان باندھنے لگے جس کو وہ اپنا خالق و مالک جانتا ہے۔ جس کی عظمت کا معترف ہے جس کے قہر و غضب سے وہ خود بھی ڈرتا ہے اور لوگوں کو بھی ڈراتا رہا ہے جس کی عبادت میں شب و روز مشغول رہتا ہے جس کا ذکر ہر وقت اس کی زبان پر رہتا ہے اور ہر وقت وہ اپنی کوتاہیوں کی معافی اسی رب سے مانگتا رہتا ہے جیسا کہ احادیث میں ہے کہ ایک ایک مجلس میں ستر ستر بار الفاظ استغفار زبان مبارک پر آجاتے تھے پھر یہی خدا پرستی اور خدا ترسی کی لگن ہے، جس کی وجہ سے اس کی قوم اس سے ناراض ہو رہی ہے اور وہ قوم کی نگاہوں میں معتوب ہو رہا ہے۔ کیا یہ شخص جھوٹا ہو سکتا ہے؟

[2] جب کہ کلام بھی ایسا ہو کہ اس کا کوئی فقرہ بھی خدا کے ذکر سے خالی نہ ہو۔ کہیں اس کے قہر و غضب کا ذکر ہو، کہیں لطف و کرم کا، کہیں اس کے ہمہ گیر علم کو بیان کر کے بتایا گیا ہو کہ انسان جو بھی کرتا ہے اللہ اس کو دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے۔ انسان کو اپنے ہر فعل اور ہر ایک قول کا جواب دینا ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ

،ان کو سجدہ کرتے ہو اور صرف قصیدے ہی کو نہیں بلکہ شاعر کو بھی غیر معمولی طاقت کا انسان سمجھنے لگتے ہو کہ اس کے ساتھ جن رہتا ہے۔ جو ایسا غیر معمولی شعر اس کو سکھا دیتا ہے۔ اب دیکھو "محمد" ﷺ بھی تمہارے سامنے ہیں، جنہوں نے کبھی کسی استاد کے سامنے زانو تلمذ طے نہیں کیا۔ کبھی کسی کی شاگردی نہیں کی۔ کبھی کسی مکتب مے ں نہیں پڑھا، کبھی کوئی شعر نہیں کہا، کبھی شعر و سخن کی مجلس میں شرکت نہیں کی۔ تم نے اس کو صادق اور امین تو کہا مگر نہ کبھی شاعر کہا نہ کبھی خطباء اور مقررین میں ان کو شمار کیا۔ اس محمد ﷺ کی زبان سے ایک کلام تمہارے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔ محمد کہتے ہیں کہ یہ کلام میرا نہیں خدا کا کلام ہے جو میرے اوپر نازل ہوتا ہے جیسا نازل ہوتا ہے بجنسہ اور بعینہ آپ کو سنا دیتا ہوں۔ پس

"اگر تمہیں اس کلام کی سچائی میں شک ہے جو ہم نے (اللہ تعالیٰ) اپنے بندے محمد ﷺ پر نازل کیا ہے تو اس کا فیصلہ بہت آسان ہے۔ اگر یہ محض انسانی دماغ کی بناوٹ ہے تو تم بھی انسان ہو۔ زیادہ نہیں۔ اس جیسی صرف ایک ہی سورت بنالاؤ۔ (اگر تمہارا عقیدہ ہے کہ جنات شعراء کے مددگار ہوا کرتے ہیں تو تم ایسا کرو کہ) اللہ کے سوا جن (طاقتوں) کو تم نے اپنا حمایتی سمجھ رکھا ہے، ان سب کو بھی اپنی مدد کے لئے بلالو۔ اگر تم سچے ہو تو ایسا ضرور کرلو۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ کے عذاب سے ڈرو جو (لکڑی کی جگہ) انسان اور پتھر کے ایندھن سے سلگتی ہے اور منکرین حق کے لئے تیار کی جاچکی ہے۔" (سورہ بقرہ ۲ آیات ۲۳)

کلام اللہ کی شوکت و قوت اور اپنی صداقت کا یقین حیرت انگیز ہے۔ ایک شخص جس کے ساتھ صرف چند افراد ہیں، جن کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ وہ نہ صرف قریش کو نہ صرف اہل مکہ کو بلکہ ہر ایک عربی بولنے والے بلکہ پوری دنیا میں جو بھی شک وشبہ کرے خواہ وہ کوئی ہو، ان سب کو چیلنج کر رہا ہے۔ چیلنج معمولی نہیں ہے، ایسا سخت اور تلخ چیلنج جو معمولی سے معمولی انسان کی غیرت کو بھی اس درجہ مشتعل کردے کہ وہ اپنے تمام ذرائع اور وسائل کو کام میں لاکر چیلنج کا جواب دینے کیلئے بوکھلا جائے۔ مضمون دوبارہ ملاحظہ فرمایئے:

"اگر تم اس چیلنج کو قبول نہیں کرسکتے اور اس جیسی کوئی ایک سورت نہیں لاسکتے تو یقین کرلو کہ تم باطل پر ہو۔ تم حق کا مقابلہ کر رہے ہو۔ تم عذاب الٰہی کے مستحق ہو تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا، جس کا ایندھن تم جیسے انسان اور پتھر ہونگے" (بقرہ۔ ۲۴،۲۳)

قرآن حکیم کی ایک سورت ۱۰۸ سورہ کوثر بھی ہے جس میں صرف تین آیتیں (جملے) ہیں جن کے کل الفاظ (کلمات) اٹھارہ ہیں۔

چیلنج کا خلاصہ یہ ہے کہ حق و باطل اور سچائی اور بناوٹ کا فیصلہ اس پر ہے کہ تم صرف ایسا کلام پیش

کردو جو ۱۸ لفظوں پر مشتمل ہو۔ مگر وہ اپنے ظاہری اور معنوی کمالات میں اس جیسا ہو۔ تمام دنیا کے ادیبوں کی مجلسیں اور شعر و سخن کے کمالات کا فیصلہ کرنے والے جج موجود ہیں۔ کسی بھی عدالت، کسی بھی ادبی مجلس میں موازنہ کے لئے پیش کردو۔ اگر تمہارے حق میں فیصلہ ہو جائے تو مان لیا جائے گا کہ یہ کلام، اللہ کا کلام نہیں ہے محمد کی من گھڑت ہے (معاذ اللہ)۔

پھر یہ چیلنج صرف ایک مرتبہ اتفاقی طور پر نہیں بلکہ مختلف عنوانوں سے بار بار دہرایا گیا اور اسی قوت کے ساتھ دہرایا گیا مثلاً:

(۱) سورہ ہود مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔ اس کی آیت ۱۳ جو اس سلسلہ کی سب سے پہلی آیت ہے اس کا ترجمہ یہ ہے۔

"کیا لوگ ایسا کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے یہ قرآن اپنے جی سے گھڑ کر خدا پر بہتان باندھا ہے۔ آپ کہہ دیجئے اگر تم اپنی اس بات میں سچے ہو تو اس طرح کی دس سورتیں گھڑی ہوئی بنا کر پیش کردو اور اللہ کے سوا جس کسی کو اپنی مدد کے لئے پکار سکتے ہو اس کو پکار لو۔"

پھر دو آیتوں کے بعد آیت ۱۶ کا ترجمہ یہ ہے:

"یہ لوگ (جو صرف دنیاوی مفاد اور آسائش کے لئے حق سے اعراض کرتے ہیں اور اس کلام کو اللہ کا کلام نہیں مانتے) یہی وہ ہیں جن کے لئے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہ ہو گا۔ "

(۲) سورہ ۱۰ یونس بھی مکہ میں نازل ہوئی۔ اس کی آیت ۳۸ میں بھی اس چیلنج کو دہرایا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ کے نام پر یہ بہتان باندھا ہے۔ تم کہہ دو اگر تم اس قول میں سچے ہو تو قرآن کی مانند ایک سورت بنا کر پیش کردو۔ اور خدا کے سوا جن جن ہستیوں کو اپنی مدد کے لئے بلا سکتے ہو (تمہیں پوری اجازت ہے) بلا لو" (آیت ۳۸)

(۳) پہلے دس سورتوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس مرتبہ صرف ایک سورت کا۔ پھر سورہ ۵۲ طور میں "سورہ" کا لفظ بھی نہیں بلکہ حدیث (کلام، بات) کا لفظ آیا ہے:

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ الخ آیت ۳۴ اس طرح کا کوئی کلام لے آئیں اگر سچے ہیں۔

(۴) سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۸ میں یہ اعلان کیا گیا:

"اگر تمام انسان اور جن اکٹھے ہو کر چاہیں کہ اس قرآن کے مانند کوئی کلام پیش کردیں تو کبھی بھی پیش نہیں کر سکیں گے۔ اگرچہ ان میں سے ایک دوسرے کا مددگار ہی کیوں نہ ہو۔"

(۵) یہ آیتیں وہ ہیں جن میں یہ چیلنج صراحت کے ساتھ کیا گیا:

"اس جیسا قرآن پیش کردیں" (۱۷/ ۸۸)

"دس سورتیں بنالائیں" (۱۱/ ۱۳)

"ایک سورت بنا لائیں" (۱۰ / ۳۸)

"ایک سورت بنا لائیں" (۲ / ۲۳)

"اس طرح کا کوئی کلام لے آئیں" (۵۲/ ۳۴)

ان آیتوں کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں جن میں بطور اشارہ وکنایہ اس چیلنج کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس چیلنج کے مخاطب عرب کے وہی فصحاء اور بلغاء ہیں جن کو اپنی ادبیت اور فصاحت وبلاغت پر ناز تھا، جو اپنے زمانہ میں بھی عربی ادب کے استاد مانے جاتے تھے اور آج بھی استاد مانے جاتے ہیں۔ کیا قرآن پاک اور قرآن پاک کے پیش کرنے والے محمد ﷺ کی صداقت کے لئے یہ آفتاب جیسی کھلی ہوئی دلیل کافی نہیں ہے کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا جس میں اکثریت قرآن اور اسلام کے مخالفین کی ہے چودہ سو برسوں سے اس چیلنج کو سن رہی ہے۔ مگر اس کو منظور کرنے سے آج بیسویں صدی عیسوی میں بھی اسی طرح عاجز ہے جیسے ساتویں صدی عیسوی میں عاجز تھی جب یہ قرآن نازل ہورہا تھا۔

قریش جو اس کے مخاطب اول تھے ان سے یہ نہ ہوسکا کہ ۱۸ لفظ کا کوئی مرتب کلام اس چیلنج کے جواب میں پیش کرسکیں۔ اس کے سوا جو کچھ تدبیریں وہ کرسکتے تھے وہ سب کرلیں۔ مثلاً منصوبہ بند طریقے سے ممانعت کردی کہ کوئی قرآن نہ سنے اور جب محمد ﷺ نے بازاروں، میلوں اور پبلک مقامات پر کھڑے ہوکر سنانا شروع کیا تو منصوبہ یہ تھا کہ اتنا شور مچایا جائے کہ محمد ﷺ کی آواز کسی کے کان میں نہ پڑسکے۔ [1]

اگر کوئی اجنبی شخص اس شور وغل پر اعتراض کرنے لگے تو کبھی کہہ دیا جائے معاذ اللہ مجنون ہوگیا ہے۔ کبھی یہ کہہ دیا جائے کہ یہ جادوگر ہے۔ یہ منتر پڑھتا ہے تو ماں بیٹے سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ بیوی اپنے شوہر سے اور بھائی بھائی سے جدا ہوجاتا ہے۔ [2]

یہ ابتدائی تدبیریں تھیں۔ پھر جو کچھ کیا گیا، اسلام لانے والوں کو طرح طرح ستایا گیا۔ پھر ان کا بائیکاٹ کیا گیا۔ ان کو ترک وطن پر مجبور کیا گیا اور جب وطن ترک کرچکے تو مدینہ پر بار بار حملے کرکے ان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب کچھ کیا گیا مگر یہ نہ ہوسکا کہ قرآن حکیم کے چیلنج کا جواب دے دیں اور ایک سورت اس کے مقابلہ میں پیش کرکے صداقت قرآن اور صداقت محمد کی تردید

[1] حم سجدہ آیت ۲۶

[2] سورہ ۵۱ الذاریات آیت ۵۲، سورہ ۵۲ الطور آیت ۲۹ وغیر ذٰلک

کردیں۔

یہ صداقت کی دوسری دلیل تھی جو آنحضرت ﷺ نے پیش کی اور یہ دلیل جس طرح آنحضرت ﷺ کے ورود مسعود میں برہان قاطع اور حجۃ کاملہ تھی۔ آج چودہ سو برس کے بعد ایسی ہی درخشاں اور تاباں دلیل ہے جو پوری دنیا کو للکار رہی ہے

"قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ﴿۸۸﴾ (بنی اسرائیل۔۸۸) [1]

ضمیر سے بغاوت کی یہ بدترین مثال تاریخ نے فراموش نہیں کی کہ قریش کے یہی سرغنہ ابوجہل، اخنس بن شریق اور ابوسفیان جو دوسروں کو قرآن شریف سننے سے منع کرتے تھے راتوں کو چھپ چھپ کر خود قرآن شریف سنا کرتے تھے۔ رات کے آخری حصہ میں جب رسول خدا ﷺ بھینی بھینی آواز سے قرآن شریف پڑھتے تھے تو قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت صداء پرسوز میں عجیب کیفیت پیدا کر دیتی تھی۔ جو ایک دفعہ سن لیتا وہ بار بار سننے کے لئے بے چین رہتا۔ ان سرداروں کو کسی طرح سننے کا اتفاق ہو گیا تو پھر جب موقع ملتا خلوت کدہ کے آستانہ مبارک پر پہنچ جاتے اور کان لگائے سنتے رہتے۔ کبھی آپس میں مڈبھیڑ بھی ہو جاتی تو ہر ایک دوسرے کو ملامت کرتا۔ مگر یہ ایک ایسا جرم تھا جس سے باز رہنا مشکل تھا۔ البتہ نوجوانوں کو منع کرتے ہیں۔ سب کا اتفاق تھا کہ اگر وہ گرویدہ ہو گئے تو ہماری طرح اپنے ضمیر سے بغاوت نہیں کر سکیں گے۔ [2]

محمد ﷺ کی حیثیت

فرائض اور خصوصیات

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے "محمد" ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ﴿۴۶﴾

(سورہ احزاب۔ ۴۵،۴۶)

اے نبی ہم نے تم کو بھیجا ہے اس شان سے کہ آپ

---

[1] اگر تمام انسان اور سارے جن اس پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا قرآن پیش کر دیں تو وہ اس جیسا قرآن پیش نہیں کر سکیں گے۔ خواہ وہ اس میں ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کریں۔

[2] سیرۃ ابن ہشام ص ۱۹۳ ج ۱، البدایہ والنہایہ ص ۶۴ ج ۳، الاصابہ ص ۲۳۱ ج ۱، ذکر اخنس بن شریق

۱۔ شہادت دینے والے ہیں

۲۔ بشارت دینے والے ہیں

۳۔ آگاہ کرنے والے ہیں

۴۔ خدا کی طرف بلانے والے ہیں

۵۔ خدا کی طرف سے دعوت دینے کے مجاز ہیں

۶۔ چراغ ہیں روشنی دینے والے۔

یہ معجزانہ بلاغت ہے کہ خطاب ایسے الفاظ سے کیا گیا جس سے یہ بنیادی حیثیت پہلے ظاہر ہو گئی کہ آپ خدا کے بھیجے ہوئے نبی ہیں۔ اس کے بعد مندرجہ بالا چھ خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں۔

پہلی خصوصیت اور نبی اور فلسفی کا فرق:

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آپ حق بات کو اس یقین اور ایسے وثوق اور بھروسے سے بیان کرتے ہیں جیسے کوئی آنکھوں دیکھی چیز کی شہادت دیتا ہے۔

یہ فرق ہے نبی اور فلسفی میں۔ فلسفی کے پاس قیاس، تخمینے اور تجربے ہوتے ہیں۔ تجربوں کی بنیاد اگرچہ بسا اوقات مشاہدہ پر ہوتی ہے مگر انسان کا مشاہدہ بھی بسا اوقات غلطی کرتا ہے۔

ہزاروں برس تک دنیا کے فلسفی جن میں سقراط، ارسطو اور افلاطون جیسے ماہر بھی داخل ہیں جو فلاسفہ کے امام مانے جاتے ہیں۔ یہی یقین کرتے رہے کہ چاند اور سورج آسمانوں میں گڑے ہوئے ہیں۔ آسمان زمین کو گھیرے ہوئے ہیں اور وہ زمین کے گرد گھوم رہے ہیں۔ زمین اپنی جگہ ساکن ہے یہ نہ حرکت کرتی ہے نہ کر سکتی ہے۔ یہ سب کچھ وہ اپنے مشاہدہ کی بنا پر کہتے رہے۔ ان کی عظیم الشان رصد گاہیں اسی یقین کی تصدیق کرتی رہیں اور اپنے اس یقین کی بناء پر انہوں نے نجوم، جوتش وغیرہ بہت سے فن ایجاد کئے اور یقین کرتے رہے کہ یہ تمام فنون اور ان کی یہ تمام تحقیقات صحیح اور درست ہیں، ان میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ [1] مگر آج سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ یہ جو کچھ تھا فریب نظر تھا۔ آج کی دنیا میں اس سے بڑا احمق اور جاہل کوئی نہیں جو آسمان کو گھومتا ہوا مانے اور چاند سورج کو اس میں جڑا ہوا سمجھے۔

ان فلاسفہ کو پورا یقین تھا کہ ہماری زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ فوراً ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ ان کے فلسفی ضابطہ کا فیصلہ یہی تھا کہ حرکت اور اس کے اثرات کا کوئی اپنا وجود ہی نہیں ہے۔ لہذا ان کے بقاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری آواز اور ہمارے الفاظ زبان کی حرکت کا اثر ہے جو ساتھ ساتھ ختم ہوتا رہتا

---

[1] ان کے اس یقین میں بسا اوقات جارحیت ہوتی تھی۔ وہ اپنے مخالف کو سخت سزا کا مستحق سمجھتے تھے۔ انہیں کے پیش رو وہ تھے جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نذر آتش کرنے کے لئے جہنم تیار کیا تھا۔

ہے۔ لیکن آج مشاہدہ یہ ہے کہ جو لفظ زبان سے نکلتا ہے باقی رہتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جو الفاظ انسانوں کی زبان سے بولے گئے وہ سب فضا میں موجود ہیں۔

بہر حال سابق فلاسفہ نے جو باتیں صرف ذہانت سے معلوم کی ہیں اور موجودہ فلسفی جن باتوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں ان تمام تحقیقات اور مشاہدات کے باوجود یہ سب قدیم اور جدید فلاسفہ اور ماہرین سائنس یہی سمجھتے رہے اور یہی سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہماری تحقیق ہے وہ حرف آخر نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی جدید تحقیق اس تحقیق کو غلط قرار دے دے۔ لہذا یہ یقین کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہی حرف آخر ہے اور وہی حق ہے اس کے سوا باطل ہے یہ یقین فلسفی کو میسر نہیں آتا۔ اس کو خود اپنی تحقیق کے اندر شک رہتا ہے۔ اس بناء پر وہ اطمینان سے محروم رہتا ہے۔ اور جب اطمینان کی دولت خود اس کے پاس نہیں ہوتی تو وہ کسی دوسرے کو یہ دولت کہاں سے دے سکتا ہے؟ اور جب اس کو اپنی تحقیق پر مکمل اطمینان اور یقین نہیں ہوتا تو اس کے لئے فدا ہو جانے اور قربان ہونے کا جذبہ بھی اس کے اندر نہیں ہوتا۔ لہذا عمل کے لحاظ سے وہ عموماً کوتاہ رہتا ہے۔

مادہ کی طرح روح اور خدا سے تعلق رکھنے والے مسائل (مثلاً خالق کائنات کی ذات و صفات، اس سے انسان کا تعلق، حیات بعد الممات، عمل اور پاداش عمل جیسے مسائل) میں بھی فلسفی کا فیصلہ دوٹوک نہیں ہوتا۔ اس کا ترقی پذیر دماغ جس چیز کو آج روشنی سمجھتا ہے وہی چیز اگلے روز اس کو تاریک نظر آتی ہے اور سکون و اطمینان کے بجائے اس کا دماغ نئے خلجان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے پیروکار جو بصیرت سے محروم اور اندھی تقلید کے عادی ہوں فلسفی کے کسی نظریہ کے معتقد ہو جائیں، مگر ان کی یہ تقلید بھی شک و شبہ کی گرد سے پاک نہیں ہو سکتی۔ اور یہی سبب ہوتا ہے کہ اس کے مخالف اور متضاد نظریہ کو بھی[1] حق سمجھنے لگتے ہیں۔ قرآن حکیم میں بار بار کہا گیا ہے کہ ان عقل پرستوں کے پاس جو کچھ ہے وہ "ظن" ہے جو شک و شبہ اور خلجان کے گرد و غبار سے پاک اور صاف نہیں۔ جہاں حق کی ضرورت ہو وہاں ظن کام نہیں دے سکتا۔[2]

مکڑی کا جالا کرم شب تاب کو الجھا تو سکتا ہے اس کو منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ قطب مینار کی بلندی تک وہی رسی پہنچا سکتی ہے جو نہایت مضبوط ہو۔ نبی کے پاس حق اور یقین کی یہی مضبوط رسی ہوتی ہے جو اس

---

[1] برادران وطن کے دھرم کا مدار وحی پر نہیں ہے کیونکہ وہ نبوت کو نہیں مانتے ان کے دھرم کا مدار فلسفہ پر ہے وہ اپنے رشیوں اور منیوں کو فلسفی ہی مانتے ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ کسی ایک عقیدہ اور نظریہ پر ان کو یقین نہیں ہوتا وہ ہر ایک عقیدہ کو صحیح ماننے لگتے ہیں۔ وہ اس کو وسعت نظر اور فراخی ظرف سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا سبب گم گشتگی نظر اور فقدان یقین ہے۔

[2] سورۃ النجم ۲۸۔

کو اس کا رب اور معبود عطا کرتا ہے۔ ❸ اور اس کو یقین ہوتا ہے کہ یہ رسی خود اس کے رب کی عطا کردہ ہے ۔وہ اپنی جان قربان کر سکتا ہے مگر اس رسی کو نہیں چھوڑ سکتا۔

اس یقین کا ثمرہ وہ غیر معمولی اعتماد اور توکل ہوتا ہے جو نبی کو اپنے رب پر ہوتا ہے۔ جو بڑی سے بڑی جابر و ظالم طاقت کے مقابلہ میں بھی اس کو پہاڑ کی چٹان بنائے رکھتا ہے اور سخت سے سخت خطرہ کے موقع پر بھی اس کا تصور یہ ہوتا ہے۔

"ہم خدا پر اعتماد اور بھروسہ کیوں نہ کریں جن کا(فضل و کرم یہ ہے کہ روحانی اور مادی زندگی کے) تمام راستوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی۔ بلاشبہ ہمیں یہ کرنا ہے کہ ہم ان تمام اذیتوں کے مقابلہ پر استقلال اور ضبط و تحمل سے کام لیں جو تم ہمیں پہنچا رہے ہو اور اللہ ہی ہے جس پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے"۔(سورہ ابراہیم۔۱۱)

مختصر یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شاہد ہیں یعنی جو کچھ بتاتے ہیں وہ ایسے یقین کے ساتھ جو مشاہدہ سے بھی بڑھا ہوا ہوتا ہے، جس کی پشت پر حق و صداقت کی سرفروشانہ اور فداکارانہ پختگی ہوتی ہے۔

دوسری خصوصیت:

یہ کہ جو لوگ اس حق و صداقت کو قبول کر لیتے ہیں ان کو پہلی بشارت ❶ یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے سچائی کا راستہ پالیا اور خدا پرستی کے جس صراط مستقیم کی تلاش میں وہ سرگرداں تھے وہ صراط مستقیم ان کو مل گیا۔ وہ تشنہ کام، جو تلاش حق میں سالہا سال سے سرگرداں رہے ان کیلئے اس سے زیادہ بشارت کیا ہو سکتی ہے کہ وہ گوہر مراد ان کے دامن میں آگیا جس کے لئے وہ بے چین تھے اور جس کی جستجو میں وہ اپنی عمر کھپا رہے تھے۔ دوسری بشارت یہ ہے کہ اس کے بہترین فوائد اور نتائج ان کو موجودہ زندگی میں بھی میسر آئیں گے اور اس عالم میں بھی میسر آئیں گے جہاں حق و باطل کا فیصلہ ہوگا۔ جہاں کی زندگی حقیقی زندگی ہے اور جہاں کی کامیابی ابدی کامیابی ہے۔

تیسری خصوصیت:

یہ کہ جو لوگ سچائی کے سامنے گردن نہ جھکائیں جو اس سے منہ موڑیں ان کو آگاہ کردیں کہ وہ

---

❸ سورہ بقرہ آیت ۲۵۶ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى

❶ ایک سبق: نبی اور نہ صرف نبی بلکہ ہر ایک داعی حق کا یہ کام ہے کہ وہ پر امید رہے اور جس کو وہ دعوت دے تو پہلے اس دعوت کے فائدہ بخش اور روشن پہلو اس کے سامنے رکھے۔

موجودہ اور آخرت کی زندگی کی کامیابیوں سے منہ موڑ رہے ہیں۔ اس کے بدترین نتائج اس زندگی میں بھی ان کے سامنے آئیں گے اور اس زندگی میں بھی جو حقیقی زندگی ہے۔ آپ کی حیثیت یہ ہے کہ آپ نذیر ہیں (آگاہ کرنے والے)

چوتھی خصوصیت:

یہ کہ آپ داعی الی اللہ ہیں۔

پانچویں خصوصیت:

یہ ہے کہ آپ محض فطری خیر اندیشی اور خیر سگالی کی بنا پر دعوت نہیں دیتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس جلیل اور عظیم خدمت کے لئے مامور ہیں۔

چھٹی خصوصیت:

وہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی کا لب لباب ہے۔ آپ کی تمام سوانح حیات ان دو لفظوں میں سموئی ہوئی ہے کہ آپ سراج منیر ہیں، یعنی نوع انسان کی محفل میں رونق افروز ہیں۔ مگر اس طرح کہ سراسر سوزو گداز ہیں اور یہ سوزو گداز ہی وہ نور ہے، جو دوسروں کو روشن کر رہا ہے۔

اس چھٹی خصوصیت کا مشاہدہ کرانے کے لئے حیات مقدسہ کی مختصر سوانح آئندہ صفحات میں پیش کی جارہی ہے۔(واللہ الموفق وھوالمعین)

شمع سوزاں اور سراج منیر کو گل کرنے کی کوشش

وہی محمد ﷺ، سرداران قریش جس کو الصادق اور الامین کہا کرتے تھے اس کی مقدس تعلیم کو جب انہوں نے اپنے مفادات کے لئے خطرہ عظیم اور برق خرمن سوز سمجھا تو اب رات دن ان کی کوشش یہ تھی کہ اس آواز کو دبائیں اور اس شمع کو گل کردیں۔ چنانچہ باپ دادا کے مذہب قدیم کے نام پر عوام میں اشتعال پیدا کردیا۔ جس پر وہ آنحضرت ﷺ اور گنے چنے مٹھی بھر مسلمانوں کے درپے ہوگئے۔ اس کے علاوہ خود ان کی سرگرمیاں نئے نئے ستم ایجاد کرنے میں مصروف رہنے لگیں۔ خانہ کعبہ کا حرم محترم جہاں خود ان کے عقیدے کے بموجب کسی بھی جاندار کو ستانا گناہ تھا، محمد رسول اللہ ﷺ وہاں اپنے رب کی عبادت کرتے تو ستائے جاتے اور طرح طرح سے ستائے جاتے تھے۔ ایک دفعہ ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا: اگر میں نے دیکھ لیا کہ حرم کعبہ میں محمد اپنا چہرہ زمین پر رکھے ہوئے ہیں تو میں اسکی گردن اپنے

پیر سے روند دونگا[1]۔ ابوجہل نے تو ایسا نہیں کیا لیکن اس کا دوست عقبہ بن ابی معیط اس سے بھی زیادہ حرکت کر گزرا۔

آنحضرت ﷺ حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے عقبہ بن ابی معیط نے چادر گردن میں ڈالدی اور اتنی زور سے اس کو اینٹھا کہ محبوب خدا ﷺ کا سانس گھٹ گیا آنکھیں باہر کو آنے لگیں۔ اتفاق سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہاں پہنچ گئے۔ عقبہ کو دھکیل کر پیچھے کیا چادر گردن مبارک سے ڈھیلی کی اور ان دشمنان حق سے کہا:

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ (المومن۔۲۸)

"کیا تم ایک آدمی کو اس پر قتل کر رہے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے وہ روشن دلیلیں لایا ہے جن کا تم انکار نہیں کر سکتے۔[1]"

خانہ کعبہ کے قریب اکثر سرداران قریش کی نشست رہتی تھی۔ ایک روز آنحضرت ﷺ نماز میں مصروف تھے، ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا: فلاں محلہ میں اونٹنی ذبح ہوئی ہے ایسا کرو کہ اس کا بچہ دان[2] اٹھالاؤ اور محمد کے سر پر رکھ دو۔ یہی بدبخت عقبہ بن ابی معیط کھڑا ہو گیا۔ اس محلہ میں گیا۔ بچہ دان اٹھوا کر لایا اور جب آپ سر بسجود تھے پورا ملغوبا سر مبارک پر ڈالدیا۔ آنحضرت ﷺ کو حرکت کرنی مشکل ہو گئی (یا بارگاہ خداوندی میں مظلومانہ التجا کے لئے قصداً حرکت نہیں کی) مگر یہ بدبخت اپنی اس بدمستی پر خوش تھے اور قہقہے مارتے ہوئے ایک دوسرے پر ڈھلک رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی چھوٹی صاحبزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خبر ہوئی وہ دوڑی ہوئی آئیں اور گندگی کے اس بوجھ کو سر مبارک سے ہٹایا۔[3]

جب حرم پاک میں رہنماؤں اور سرداروں کی یہ حرکتیں تھیں تو مکہ کے عوام، مکہ کی گلیوں، کوچوں میں جو کچھ کر گزرتے کم تھا؟ چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ اوپر سے کوڑا کرکٹ جسد اطہر پر ڈالا گیا اور ایک پڑوسی

---

[1] بخاری شریف ص ۷۴۰ الاطئن عنقہ ۱۲

[1] بخاری شریف ص ۱۱۷

[2] سلاجزور سلا بچہ دان (بخاری شریف وغیرہ)

[3] بخاری شریف ص ۷۴۳ آنحضرت ﷺ کو جو تکلیف پہنچائی جاتی تھی آپ اس کا انتقام تو کیا لیتے کبھی بددعا بھی نہیں کرتے تھے۔ البتہ حقوق اللہ کی توہین کی جاتی تھی تو آپ بے چین ہو جاتے تھے اور اس وقت بددعا کے الفاظ بھی زبان مبارک پر آجاتے تھے۔ یہاں اس وقت جو کچھ کیا گیا اس میں اول حرم کعبہ کی توہین تھی جو خود عقیدہ قریش کے بموجب بھی حق اللہ کی توہین تھی، دوم یہ کہ بارگاہ خدا میں سجدہ ریزی کی توہین تھی جس کو ہر ایک سلیم الفطرت انسان کی فطرت حق اللہ کی توہین سمجھتی ہے۔ چنانچہ اس موقع پر ان سرداران قریش کے حق میں آپ کی زبان سے بددعائیہ کلمات نکلے اور وہ اس طرح پورے ہوئے کہ یہ سب سردار جنگ بدر میں مارے گئے۔ (بخاری شریف ص ۳۷)

عورت کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ وہ آپ کے راستے میں کانٹے بچھادیا کرتی تھی۔ [4]

اس قسم کی حرکتیں خدا جانے کتنی ہوئیں اور لطف یہ ہے کہ یہ حرکتیں اصل پروگرام سے زائد تھیں۔

منصوبہ بند کوششیں

ابھی آنحضرت ﷺ نے دعوت نہیں دی تھی۔ آپ خاموشی سے ذکر و فکر اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی تربیت میں مصروف تھے۔ اس وقت بھی قریش کے تاڑنے والوں نے یہ کوشش کی تھی کہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھے اور محمد رسول اللہ ﷺ سے کسی طرح کی مفاہمت ہو جائے۔ مگر ان کی یہ کوششیں ناکام رہی تھیں۔ لیکن جب آنحضرت ﷺ نے پورے قریش بلکہ پورے عرب کو مخاطب کر کے تبلیغ شروع کی تو مخالفانہ کوششوں کا بھی نیا دور شروع ہوا۔

قریش کے لئے یہ سوال بہت اہم اور بہت پیچیدہ تھا کہ جس کا وہ احترام کرتے رہے تھے اور جس کو الصادق اور الامین کہا کرتے تھے اب اس کی تردید کس طرح کریں اور عوام کو کس طرح مطمئن کر کے الصادق اور الامین کے خلاف مشتعل کریں۔ حج کا زمانہ قریب آیا تو یہ سوال بہت اہم ہو گیا، کیونکہ یہ یقین تھا کہ محمد ﷺ اس اجتماع عظیم سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے قبائل مکہ کے ذمہ داروں کا اجتماع کیا گیا۔ بحث و مباحثہ کے بعد طے کیا گیا کہ پہلے محمد ﷺ سے الگ گفتگو کر لی جائے۔ ولید بن مغیرہ [1] کو گفتگو کے لئے منتخب کیا گیا۔ ولید بن مغیرہ مکہ کا سب سے بڑا دولتمند تھا۔ بہترین خطیب، بلند پایہ شاعر، جہاں دیدہ، عمر رسیدہ، تجربہ کار اور ایسا سلیقہ مند کہ شاہان ایران، افریقہ اور شام کے درباروں میں جاتا رہتا تھا اور وہاں اس کی عزت کی جاتی تھی۔

ولید آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گفتگو کی، آنحضرت ﷺ نے اپنے مقصد کی وضاحت کی اور چند آیتیں قرآن پاک کی پڑھ کر سنائیں۔

ولید آیتیں سُن کر ہکابکا رہ گیا۔ آنحضرت ﷺ کو تبلیغ سے منع تو کیا کرتا، خود گم ہو گیا۔ خاموشی سے مجلس سے اٹھا اور جب مجلس قریش میں واپس پہنچا تو حالت عجیب تھی۔ لوگوں کو خیال ہوا ولید بہک گیا ۔ محمد کا ہو گیا مگر ولید باہمہ عقل اور دانش حیران تھا کہ جو کلام سنا ہے اس کے بارے میں اور خود محمد "رسول اللہ ﷺ" کے بارے میں کیا فیصلہ کرے۔ پورے غور و فکر اور موازنہ کے بعد ولید نے ارکان مجلس سے کہا:

---

[4] یہ ابولہب کی بیوی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چچی بھی ہوتی تھی اور اس نے آپ کو بچپن میں گود کھلایا بھی تھا۔ (طبقات ابن سعد ص ۱۳۴ ج ۱)

[1] ولید بن مغیرہ کا آسان تعارف اب یہ ہے کہ اسلام کے مشہور اور کامیاب ترین جرنیل حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس کے نامور فرزند تھے جو اس واقعہ سے تقریباً پندرہ سال بعد حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

محمد کو کاذب نہیں کہہ سکتے، اس کو کاہن بھی نہیں کہہ سکتے۔ شعر و سخن کا میں ماہر ہوں اس کا کلام شعر بھی نہیں ہے۔ کاہنوں کی تک بندیوں کو بھی میں جانتا ہوں۔ محمد جو کلام پیش کرتے ہیں وہ ان سب سے بہت بلند ہے، اس کا کوئی جواب نہیں۔ اس کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ مجھ جیسا پختہ اور ٹھوس آدمی بھی چکرا گیا۔

اصل سوال کے متعلق ولید نے رائے دی کہ محمد ﷺ کی شائستہ اور شیریں گفتگو اور اس کلام کی غیر معمولی تاثیر کا توڑ یہی ہو سکتا ہے کہ پوری قوت سے پروپیگنڈہ کرو کہ

(۱) محمد ﷺ جادوگر ہے۔ وہ ایسے منتر پڑھتا ہے کہ گھر گھر میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ لہذا اس کی بات نہ سنو۔

(۲) وہ دین سے پھر گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم سب، تمہارے باپ دادا، اور تمہارے وہ دیوتا جن کی پوجا کرتے ہو، یہ سب دوزخ کا ایندھن ہیں۔

(۳) تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ محمد ﷺ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

ولید کی رائے سے سب نے اتفاق کیا۔ اور صرف طے ہی نہیں کیا بلکہ اس شد و مد سے عمل بھی شروع کر دیا کہ ابھی قبائل کے لوگ حج کے لئے روانہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ محمد ﷺ کی بے دینی کا چرچا ان کی گلی کوچوں تک پہنچ گیا اور نہ صرف محمد ﷺ بلکہ آپ کے خاندان ”آل ہاشم“ کے متعلق بھی نفرت کی لہر ان تمام قبائل میں دوڑ گئی جو حج کیلئے آنے والے تھے۔ ابولہب کے متعلق طے کیا گیا کہ وہ محمد ﷺ کی نگرانی رکھیں گے اور جہاں وہ تقریر کرنا چاہیں یا لوگوں سے گفتگو کریں وہ ان کو منتشر کر دیں۔

”ابولہب“ آنحضرت ﷺ کا سب سے بڑا چچا (تایا) تھا۔ مالدار اور باوجاہت بھی تھا۔ عرب کے قاعدے کے مطابق خاندان کا بڑا شخص خاندان کے ہر فرد کا ولی مانا جاتا تھا اور اس کو حق ہوتا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے کے متعلق کوئی اعلان کر دے۔ قصاص وغیرہ کے قضیوں میں ایسے ولی کے قول کی خاص اہمیت ہوتی تھی۔ اسی غرض سے اس کو اس خدمت کے لئے مقرر کیا گیا تھا کہ خاندان کے سب سے بڑے شخص کی حیثیت سے لوگوں کو بتائے کہ محمد ﷺ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ اپنے خاندانی بزرگوں کو جہنمی بتاتا ہے اور دیوتاؤں کی توہین کرتا ہے۔ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ خاندان کے سب سے بڑے شخص کے قول سے زیادہ کس کی بات معتبر ہو سکتی ہے۔

حج کے موقع پر انتظام کے متعدد شعبے خصوصاً سقایہ یعنی حاجیوں کیلئے پانی کا انتظام (جو سرزمین حجاز خصوصاً مکہ میں سب سے سخت کام تھا) آل ہاشم کے سپرد ہوتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ابولہب کے علاوہ آپ کا پورا خاندان اگرچہ مسلمان نہیں ہوا تھا مگر آپ کا حامی تھا۔ خواجہ ابوطالب ان میں پیش پیش تھے۔ سرداران قریش کے پروپیگنڈے کے باعث جو نفرت خاندان ہاشم سے عرب میں پھیل گئی تھی، خواجہ ابو

طالب کو اس کا اندازہ تھا۔ انہیں خطرہ ہوا کہ حج کے موقع پر یہ نفرت بغاوت کی شکل اختیار کر لے گی اور وہ ان خدمات سے محروم ہو جائیں گے جو حج کے موقع پر ان کے سپرد ہوتی تھیں۔ قبائلی رقابت اس فتنہ کو اور ہوا دے سکتی تھی۔

لہذا خواجہ ابو طالب [1] نے تقریباً سو شعر کا طویل قصیدہ لکھا۔ جس میں خانہ کعبہ، حرم شریف کی عظمت و حرمت، اس کے واجب الاحترام ہونے کے متعلق مسلمہ روایات، پھر خاندان ہاشم کی عظیم الشان خدمات کا تذکرہ کیا۔ اس قصیدہ میں آنحضرت ﷺ کی سیرت پر بھی روشنی ڈالی کہ ان کے اخلاق واوصاف کیا ہیں اور قریش کس طرح ان کی تعظیم کرتے رہے ہیں۔ اسی قصیدہ کا وہ مشہور شعر ہے جو نعت شریف کے موقع پر عام طور سے پڑھا جاتا ہے۔

وابیض [2] یستسقی الغمام بوجهه

ثمال الیتامی عصمة للا رامل

آنحضرت ﷺ کے محامد بیان کرنے کے بعد یہ بھی واضح کیا کہ اگرچہ وہ ایک نئے مذہب کی دعوت دے رہے ہیں مگر ابناء ہاشم جو حجاج کی خدمت کرتے ہیں وہ ان کے مذہب کے حامی نہیں ہیں۔ وہ بدستور اپنے قدیم مذہب پر قائم ہیں اور ان کے عقائد وہی ہیں جو سرداران قریش اور عام عرب کے عقائد ہیں۔ وہ اسی طرح دیوتاؤں کو مانتے ہیں اور ان کی پوجا کرتے ہیں۔ بایں ہمہ ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا کہ ”محمد“ کو مخالفین کے حوالے کر دیں۔ خاندان ابو طالب اپنی جانیں قربان کر دیگا مگر اپنی موجودگی میں محمد ﷺ کا بال بیکا نہیں ہونے دے گا۔

عرب شعر کے دلدادہ ہوتے تھے۔ شاعروں کے قصیدے جیسے ہی پڑھتے جاتے تھے، بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ جاتے تھے اور پھر جگہ جگہ وہ نقل کئے جاتے تھے۔ اس وقت شعراء کے قصائد کو وہی طاقت حاصل تھی جو دور حاضر میں کسی مضبوط پریس کو حاصل ہے۔ چنانچہ خواجہ ابو طالب کا یہ قصیدہ تمام قبائل میں پھیل گیا اور اس طرح وہ فتنہ فرو ہوا جو بنو ہاشم کے خلاف کھڑا کیا جا رہا تھا۔ مگر آنحضرت ﷺ کی دعوت کے متعلق اس کی وہی قوت باقی رہی بلکہ خواجہ ابو طالب کے قصیدے نے اور تائید کر دی کہ محمد ﷺ نئے مذہب کے داعی ہیں۔ چنانچہ خواجہ ابو طالب اور ان کے ساتھیوں کو تو اپنی خدمات کی انجام دہی

---

[1] ابن ہشام نے اس پورے قصیدہ کو نقل کیا ہے اور اس کی وجہ تصنیف یہی بیان کی ہے جو اوپر گزری۔ ص ۱۶۶ تا ص ۱۷۱، ج ۱

[2] یعنی محمد ﷺ کی ایک تعریف یہ ہے کہ ایسا روشن چہرہ جس کا واسطہ دیکر بادل سے بارش مانگی جاتی ہے (یہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ بارش نہیں ہوئی تھی تو قریش نے آپ سے دعا کرائی تھی اور بارش ہو گئی تھی) یتیموں کی پناہ ہیں، بے سہارا بیوہ عورتوں کی عصمتوں کے محافظ۔

میں کوئی نئی دشواری پیش نہیں آئی مگر آنحضرت ﷺ کا تعاقب پوری طرح کیا گیا۔ آنحضرت ﷺ جہاں تشریف لے جاتے عرب کا گوراچٹا[3] ایک باوجاہت سردار (ابولہب) ان کے پیچھے ہوتا، جو لوگوں کو ڈانٹتا رہتا کہ ان کی بات نہ سنو، یہ پاگل ہوگئے ہیں[1] (معاذ اللہ)

ھڑبونگ اور انتشار:

ابولہب کا یہ طریقہ انفرادی نہیں رہا بلکہ اجتماعی بن گیا۔ اور یہ طے کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ جہاں بھی تقریر کریں یا قرآن پاک کی آیتیں سنائیں اتنا شور مچاؤ کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ اور محمد ﷺ زچ ہو کر رہ جائیں[2]۔ قریش مکہ کی شرارت پسندی کو داد دینی چاہئے کہ کئی سال تک یہ پروگرام چلاتے رہے۔

ناکہ بندی:

ابوذر رضی اللہ عنہ قبیلہ غفار کے نمایاں شخص تھے۔ دل میں صداقت کی تڑپ رکھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے دعویٰ نبوت کا چرچا آپ تک پہنچا۔ حقیقت معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چھوٹے بھائی (انیس) سے کہا: مکہ معظمہ جاؤ اور تحقیق کر کے آؤ۔ انیس مکہ آئے، ملے جلے اور واپس جا کر رپورٹ دی۔ ایک صاحب ہیں اچھی باتیں بتاتے ہیں بری باتوں سے روکتے ہیں۔

ابوذر اس دوحرفی رپورٹ سے مطمئن نہیں ہوئے۔ خود سفر کا ارادہ کر لیا اور فوراً ہی تیار ہو کر چل دیئے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ مکہ میں آئے لیکن تحقیق کس سے کریں؟ جہاں نام لینا بھی مصیبت کا سر لینا تھا۔ لوگ مارنے اور پیٹنے کو تیار ہو جاتے تھے، وہاں راستہ کون بتاتا اور تعارف کون کراتا۔ کئی دن اس شش و پنج میں گذر گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو دیکھا کرتے تھے ایک روز ان کو دیکھ کر ٹھٹکے اتہ پتہ اور مکہ آنے کا سبب معلوم کیا اور جب مقصد معلوم ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے ساتھ چلو۔ مگر اس طرح چلو کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میرے ساتھ چل رہے ہو۔ میں کوئی اندیشہ محسوس کروں گا تو چپل ٹھیک کرنے کے بہانے دیوار سے لگ کر کھڑا ہو جاؤں گا تم آگے چلتے رہنا۔ غرض حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی رازداری سے کام لیا، تب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ منزل مقصود پر پہنچ سکے۔

---

[3] ابولہب کا رنگ سفید، سرخی رخساروں میں گھپی ہوئی، اس کے رخساروں کو شعلوں سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کا لقب ابولہب رکھا گیا تھا یعنی شعلوں والا۔

[1] طبقات ابن سعد ص ۱۴۵ ج ا وغیرہ

[2] قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (حم سجدہ۔ ۲۶)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی نظر روئے انور پر پڑی دل نے تصدیق کی کہ گوہر مراد حاصل ہو گیا۔ آپ نے اسلام کا پیغام معلوم کیا اور بقول ابو ذر رضی اللہ عنہ وہیں کے وہیں ❸ (فوراً) مسلمان ہو گئے۔

زدو کوب اور مشق ستم:

ایمان کا نور تھا یا جرأت وہمت کا فولاد جو ابو ذر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا۔ واپس ہو کر حرم کعبہ میں پہنچے۔ قریش کے کئی سردار حرم میں موجود تھے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی نظر ان فرعون منش سرداروں پر پڑی تو جوش آ گیا۔ ایسی سیدھی راہ اور ایسی سچی بات۔ اور ان لوگوں نے اس کے ناکے بند کر رکھے ہیں اور یہ "محمد" مجسم صداقت وہدایت ان کا کوئی نام تک زبان پر نہیں لا سکتا۔ اس تصور نے جذبہ کی قوت حاصل کی۔ چنانچہ آپ نے اُن روساء کو خطاب کر کے فرمایا: یامعشر قریش۔ انی اشھدُ ان لاالٰہ الا اللہُ۔"

قریش کے سردار اس جرأت کو کب نظر انداز کر سکتے تھے، آواز دی: قوموا الیٰ ھذا الصابی۔ اٹھ کھڑے ہو اس بے دین کی طرف (مارو اس بے دین کو)۔ سب طرف سے لوگ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ پر ٹوٹ پڑے اور جاں بلب کر دیا۔ حضرت عباس جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے وہاں موجود تھے۔ انہیں خطرہ ہوا کہ ابو ذر رضی اللہ عنہ کی جان جاتی رہے گی وہ ان کے اوپر اوندھے پڑ گئے اور پکار کر کہا:

"یہ قبیلہ غفار کا آدمی ہے۔ اس کے قبیلہ والوں نے اگر تمہارا راستہ بند کر دیا تو بھوکے مر جاؤ گے۔ غلہ کا ایک دانہ تم تک نہ پہنچ سکے گا۔"

غلہ کا نام سن کر لوگوں نے ان کو چھوڑا۔

اگلے روز پھر یہی ہوا۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے اسلام کا نعرہ بلند کیا اور قریش کے نوجوانوں نے ان کو پیٹنا شروع کیا، تب بھی حضرت عباس ہی کسی طرح وہاں پہنچ گئے اور یہی کہہ کر ان کو بچایا۔ ❶

اسطرح کے واقعات اسلام لانے والوں کے ساتھ مسلسل ہوتے رہتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کئی بار اس طرح تختہ مشق بن چکے تھے مگر مارنے والوں میں کوئی بچانے والا بھی کھڑا ہو جاتا تھا جس سے جان بچ جاتی تھی۔ لیکن ایسا بھی ہوا کہ کوئی بچانے والا نہیں پہنچ سکا تو جان بھی جاتی رہی۔

حارث بن ابی ہالہ۔ جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لڑکے اور آنحضرت ﷺ کے پروردہ تھے، ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کو چھڑانے آئے۔ لوگوں نے آپ کو تو چھوڑ دیا مگر ان کو اتنا مارا کہ شہید ہو گئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے حرم مکہ کی وہ زمین رنگین ہوئی جہاں اللہ کے بندے طواف کیا کرتے ہیں۔ ❷

---

❸ اسلمت مکانی بخاری شریف ص ۴۹۹

❶ بخاری شریف ص ۴۹۹،

❷ اول من قتل فی سبیل اللہ تحت الرکن الیمانی الاصابہ (ص ۳۰۶ ج ۱)

حضرت عمار رضی اللہ عنہ: مشہور صحابی ہیں ان کے والد کا نام یاسر اور والدہ کا نام سمیہ رضی اللہ عنہا تھا۔ ابو جہل نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے اندام نہانی میں برچھی ماری وہ غریب شہید ہو گئیں۔ یہ پہلی خاتون تھیں جو راہ خدا میں شہید ہوئیں۔ رضی اللہ عنہا[1]

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اتنا مارتے کہ بے ہوش ہو جاتے تھے، مگر زندگی تھی باقی رہ گئے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ: امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ جب ٹھیک دوپہر ہو جاتا تو ان کو تپتے ہوئے بالو پر لٹایا جاتا اور پتھر ان کے سینہ پر رکھ دیا جاتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں۔ اور ان سے کہا جاتا کہ اسلام سے باز آئیں، مگر ان کی زبان سے "احد" ہی نکلتا یعنی معبود ایک ہی ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔
جب دھوپ میں تیزی نہ رہتی تو گلے میں رسی بندھوا کر لڑکوں کے حوالے کر دیا جاتا کہ مکہ کے اُس سرے سے اس سرے تک گھسیٹتے پھریں۔

حضرت ابو فکیھ رضی اللہ عنہ۔ صفوان بن امیہ کے غلام تھے۔ صفوان ان کو بھی یہی سزا دلواتا تھا کہ ان کو گھسیٹتے ہوئے تپتے ہوئے ریت پر ڈال دیا جاتا اور سینہ پر پتھر رکھ دیا جاتا۔ ایک روز اتنا بھاری پتھر سینہ پر رکھ دیا گیا کہ ان کی زبان نکل آئی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ: جو تیسرے خلیفہ ہوئے، بہت اونچے خاندان کے باحیثیت رئیس تھے۔ جب مسلمان ہوئے تو دوسروں نے نہیں خود ان کے چچا نے ان کو رسی سے باندھ کر مارا۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ: اسلام لائے تو ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیتے تھے۔

حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ: مسلمان ہوئے تو ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں۔ ایک روز دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا دیا گیا۔ ایک شخص چھاتی پر پیر رکھ کر کھڑا ہو گیا کہ کروٹ نہ لے سکیں۔ یہاں تک کہ کوئلے خون اور چربی سے تر ہو کر ٹھنڈے ہو گئے۔ مدتوں کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور پیٹھ کھول کر دکھائی جو برص کے داغ کی طرح بالکل سفید تھی۔[2]

الغرض اس طرح کے مظلوموں کی فہرست بہت طویل ہے اور مظالم کی داستان اس سے بھی زیادہ طویل۔ مقصد یہ ہے کہ اس طرح کے مظالم جو سوچے سمجھے منصوبے کے بموجب قریش کی طرف سے کئے جا رہے تھے انہوں نے مکہ کی پوری فضا کو اس درجہ دہشت زدہ اور مرعوب کر دیا تھا کہ کھلے بدوں اعلان

---

[1] اول شہیدۃ فی الاسلام۔ الاستیعاب ص ۶۳۵

[2] یہ تمام واقعات ان حضرات کے حالات میں الاستیعاب اور الاصابہ وغیرہ میں درج ہیں۔

حق تو در کنار لوگوں کو آنحضرت ﷺ کا نام نامی زبان پر لانے کی ہی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ بعض روایتوں کے بموجب ایک ماہ تک حرم شریف میں پڑے رہے۔ صرف زمزم پر گزارا رہا۔ مگر آنحضرت ﷺ تک نہ پہنچ سکے۔ کسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اندازہ ہوا تو بڑی راز داری کے ساتھ وہ آنحضرت ﷺ کے پاس لے گئے۔ (جس کی تفصیل اوپر گزری ہے)

اس طرح کے بے پناہ مظالم نے آنحضرت ﷺ کو مجبور کر دیا کہ کسی خفیہ مقام پر قیام فرمائیں۔ چنانچہ اک مدت تک دار بنی ارقم میں آپ اور آپ کے ساتھی جن کی تعداد تیس کے قریب تھی پناہ گزیں رہے۔ نہایت عجیب بات یہ ہے کہ ان تمام مظالم کے مقابلہ میں رحمۃ اللعالمین کی زبان مبارک اگر متحرک ہوتی تو صرف دعائے خیر کیلیئے۔ یہی حضرت خباب رضی اللہ عنہ جن کو انگاروں پر لٹایا گیا تھا انہوں نے ایک روز درخواست کی کہ رسول خدا ﷺ ان ظالموں کے لئے بد دعا فرمادیں۔ آنحضرت ﷺ خباب رضی اللہ عنہ کے الفاظ سنے سیدھے بیٹھ گئے۔ روئے انور سرخ ہو گیا فرمایا: پہلی امتوں میں یہاں تک ظلم ہوئے ہیں کہ لوہے کے کنگھے سے ہڈیوں اور پٹھوں تک گوشت کھرچ دیا جاتا تھا۔ کسی داعی حق کے سر پر آرہ رکھ کر بیچ سے چیر دیا گیا، مگر ان حضرات کے پائے استقلال میں جنبش نہیں آئی۔ پھر فرمایا: یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو مکمل فرمائے گا۔ یہاں تک ایک مسافر تنہا صفا یمن سے حضر موت تک پہنچ جایا کرے گا، راستہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہیں ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بھیڑیئے کا خطرہ ہو گا جو اس کے گلہ پر حملہ کر سکے گا۔ [1]

مقصد:

حضرت عمار رضی اللہ عنہ ان کے والد اور والدہ تینوں کو طرح طرح ستایا جارہا تھا۔ آنحضرت ﷺ اس طرف سے گذرے۔ ان کو مبتلا عذاب دیکھ کر فرمایا: صبراً یا آل یاسر ان موعد کم الجنۃ۔ [2] آل یاسر! صبر کرو تم سے جنت کا وعدہ ہے۔ یعنی اس انقلابی پارٹی کی پہلی شرط یہ تھی کہ اس کے مجاہدین کی نظر صرف آخرت پر ہو گی۔ ان کی ہر قربانی اللہ کے لئے ہو گی۔ غلبہ اور اقتدار حاصل ہونے کے بعد یقیناً دنیاوی مفادات بھی حاصل ہونگے۔ مگر وہ اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام مانا جائیگا مجاہد کا نصب العین نہیں ہو گا۔ قرآن حکیم نے اعلان فرمادیا ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ [3] یہ عالم

---

[1] بخاری شریف ص ۵۴۳

[2] الاستیعاب ص ۶۳۲ نمبر ۲۷۹۳۔۲۔

[3] سورہ قصص ۲۸ آیت ۸۳

آخرت ہم انہیں لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔ اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کے لئے ہوتا ہے۔

ہجرت حبشہ

قریش اور ترقی پذیر قبائل عرب کے پاس نہ فوج تھی نہ پولیس۔ البتہ معاہدات کا سلسلہ ایسا تھا جو فوج اور پولیس کا کام دیتا تھا۔

معاہدہ ایک حصار ہوتا تھا جو جان کا بھی محافظ ہوتا تھا اور مال کا بھی۔ اور ان معاہدات کے ذریعے طاقت کا بھی توازن قائم رہتا تھا۔ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو اسی چیز نے بچایا تھا کہ قبیلہ غفار (جس سے قریش کا معاہدہ تھا) اگر بگڑ گیا تو قریش کا اس طرف سے گزرنا اور غلہ برآمد کرنا ناممکن ہو جائیگا۔ ابو بکر صدیق، عبد الرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہم) خود اپنے طور پر مختلف قبائل سے معاہدے کئے ہوئے تھے۔ ابتداء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست کسی قبیلہ سے معاہدہ کئے ہوئے نہیں تھے۔ مگر ان کی حفاظت کی ذمہ داری خواجہ ابو طالب نے لے رکھی تھی۔ خواجہ ابو طالب دوسرے قبائل سے معاہدے کئے ہوئے تھے، اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح خواجہ ابی طالب کی پناہ میں تھے اور خواجہ ابو طالب آپ کی پناہ کے ذمہ دار تھے اسی طرح وہ تمام قبائل بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے ذمہ دار تھے جو ابو طالب سے معاہدہ کئے ہوئے تھے۔ مگر اسلام سے مشرف ہونے والوں میں بڑی تعداد وہ تھی جن کے کسی سے خود اپنے معاہدے نہیں تھے کیونکہ وہ اپنے قبیلوں کے شیوخ اور سربراہ نہیں تھے، سربراہ دوسرے تھے یہ ان کے تابع تھے۔ شیوخ اور سربراہوں کے معاہدات کے باعث یہ فائدہ تو تھا کہ غیر قبیلہ کے لوگ ان کو مظالم کا نشانہ نہیں بناسکتے تھے۔ مگر خود قبیلہ کے لوگوں کی مخالفت سوہان روح تھی۔ یہ مسلمان ہوگئے تھے مگر جس مقصد سے مسلمان ہوئے تھے وہ حاصل نہیں تھا۔ یعنی یہ لوگ خدا واحد کی عبادت نہیں کرسکتے تھے۔ چھپ کر قرآن شریف پڑھتے۔ اگر راز فاش ہو جاتا تو طرح طرح کے ظلم سہنے پڑتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اذیتیں اور تکلیفیں سہ رہے تھے۔ مگر آپ کو اپنی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ البتہ ان ساتھیوں کی اذیت کا احساس آپ کو بے چین رکھتا تھا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ حبش کا بادشاہ نیک نفس عیسائی ہے۔ اس کی مملکت میں لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ لہٰذا آپ نے مشورہ دیا کہ جو جاسکتے ہوں وہ حبش چلے جائیں۔

اس مشورہ پر عمل ہوا۔ پہلے پندرہ صحابہ کا قافلہ روانہ ہوا۔ گیارہ مرد تھے اور چار عورتیں۔ یہ قافلہ ساحل سمندر پر پہنچا۔ ایک جہاز روانہ ہونے والا تھا، اس میں نہایت سستے محصول پر جگہ مل گئی قریش کو اس قافلہ کی روانگی کا علم ہوا تو ایک جماعت ان کو پکڑنے کے لئے دوڑادی، مگر جب وہ ساحل سمندر پر پہنچی تو جہاز روانہ ہو چکا تھا۔

ان حضرات کو وہاں اطمینان میسر آیا تو پھر اور مسلمانوں نے بھی یہ راستہ اختیار کیا۔ مکہ معظمہ سے خفیہ طور سے اکا دکا روانہ ہو کر پہلے ساحل پر جمع ہو گئے اور وہاں سے حبش روانہ ہو گئے۔ اس دوسرے قافلہ میں تقریباً ستر افراد تھے۔

قریش کے لئے یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ اتنے مسلمان وہاں جمع ہو گئے۔ انہوں نے بہت کچھ ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ بادشاہ حبش کے پاس سفارت بھیجی کہ یہ لوگ بھاگ کر چلے آئے ہیں ان کو حوالہ کر دیا جائے۔ بادشاہ نے مسلمانوں کو طلب کر کے ان کا مقصد معلوم کیا۔

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی وہ تمام مورخین نے نقل کی ہے اس کا اردو پیرہن یہ ہے:

بادشاہ علیجاہ!

یہ درست ہے کہ ہماری قوم بت پرست ہے، جاہل ہے، اس کو حلال حرام کی تمیز نہیں، مردار کھا جاتی ہے، بدکاریاں کرتی ہے ہمسایوں کو ستاتی ہے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا ہے، لڑکیوں کو زندہ در گور کر دیا جاتا ہے۔ جو برائی ہو سکتی ہے وہ سب ہمارے معاشرہ (سماج) میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا، ہم میں ایک شخص پیدا ہوا۔ عمر کے چالیس سال اس نے ہمارے بیچ میں رہ کر اس طرح گزارے کہ پوری قوم اس کی شرافت کی قائل ہو گئی۔ اسکی صداقت اور سچائی سے یہاں تک متاثر ہوئی کہ اس کو الصادق اور الامین کہنے لگی۔ اس نے بتایا کہ خدا نے اس کو نبی بنا کر بھیجا ہے اور خدا کا حکم یہ ہے کہ صرف خدا واحد کی عبادت کرو، بت پرستی چھوڑ دو، کمزوروں کی مدد کرو، غریبوں پر رحم کرو، ایک دوسرے سے محبت کرو، آپس میں شفقت اور مہربانی سے کام لو، سچائی اختیار کرو، بری باتیں چھوڑ دو، نیک اور دیانتدار بن جاؤ۔

اے بادشاہ! ہمیں یہ باتیں اچھی معلوم ہوئیں ہم نے اس کا دامن سنبھال لیا ہے اور اس کے کہنے پر عمل شروع کر دیا ہے۔

سفارت قریش کے ارکان نے یہ دیکھا کہ بادشاہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر سے متاثر ہو رہا ہے تو انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے متعلق ان کا عقیدہ معلوم کیجئے۔ یہ کچھ اور کہتے ہیں اور عیسائیوں کی تردید کرتے ہیں۔

بادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے متعلق ان کا عقیدہ معلوم کیا تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورہ مریم کا دوسرا پورا رکوع پڑھ کر سنا دیا، جس میں حضرت مریم علیہا السلام کی پاکدامنی بیان کر کے بتایا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے معجزے عطا فرمائے تھے۔ اور پہلا معجزہ یہ تھا کہ انہوں نے گھوارے ہی میں بولنا شروع کر دیا تھا۔

بادشاہ قرآن پاک کی آیتوں اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر سے یہاں تک متاثر ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ پادریوں کو خطاب کر کے کہا کہ میرا یقین ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت اس سے ایک تنکہ کی برابر بھی زیادہ نہیں ہے جو انہوں نے قرآن شریف کے حوالہ سے بیان کی ہے۔ پھر قریش کے سفیروں سے کہہ دیا کہ یہ لوگ آپ کے غلام نہیں ہیں، آپ کے مقروض نہیں ہیں، پھر ان کو آپ کے حوالے کیوں کیا جائے۔ مسلمانوں سے کہا کہ وہ اس کی مملکت میں اطمینان سے رہیں۔ [1]

مسلمان وہاں پر رہے۔ ایک مرتبہ ایک غنیم کا حملہ ہوا تو مسلمانوں نے شاہی فوج کی مدد بھی کی۔ [2]

قریش کا تاثر:

قریش کو اس سفارت کی ناکامی کا علم ہوا تو مسلمانوں کے خلاف ان کا غیض و غضب اور بڑھ گیا اور خواجہ ابو طالب اور آل ہاشم پر پورا زور ڈالنا شروع کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری سے دست کش ہو جائیں۔ چنانچہ روساء قریش کا ایک وفد خواجہ ابو طالب کے پاس پہنچا اور بہت زور ڈالا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کر دیں، ورنہ ان کو ہمارے حوالہ کر دیں۔ مجبور ہو کر ابو طالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی۔ آپ نے فرمایا:

> "چچا جان! آپ کی شفقت و محبت کا شکریہ! آپ یقیناً معذور ہیں۔ آپ میری امداد سے دست کش ہو جایئے۔ مگر مجھے میرے رب نے جس مقام پر کھڑا کر دیا ہے میں اس سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹ سکتا۔"

خواجہ ابو طالب نے یہ پختگی دیکھی تو قریش کو جواب دیدیا کہ وہ محمد کی حمایت نہیں چھوڑ سکتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دی کہ وہ اپنا کام کرتے رہیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لئے یہ نئی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ ایک سو کے قریب مسلمان حبشہ چلے گئے تو اب صرف تیس چالیس مسلمان رہ گئے جن کے لئے مکہ کی غضبناک فضا میں زندگی اور بھی دوبھر ہو گئی تھی۔ ان میں کافی تعداد غلاموں کی تھی۔ اگرچہ ان میں سے زیادہ تر کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خرید کر آزاد کر دیا تھا، لیکن آزادی کے بعد بھی وہ بے پناہ تھے۔ مسلمان ان کی پناہ ہو سکتے تھے مگر وہ خود چھپ چھپ کر زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا:

---

[1] یہ بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی روز اسکے انتقال کی خبر دیدی اور غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔

[2] المسبوط للسرخی ص ۹۸ ج ۱۰ باب نکاح اہل الحرب و دخول التجار الیہم بامان۔

مسلمانوں کی تعداد سو سے زیادہ ہو گئی تھی۔ ان میں طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور شیر خدا حضرت علی رضی اللہ عنہم جیسے جنگجو بہادر بھی تھے، جنہوں نے مستقبل میں عظیم الشان کارنامے انجام دیئے اور غزوات میں بہادری کے بے نظیر جوہر دکھائے۔ مگر یہ حضرات اس وقت ایسے نہیں تھے جن کی مکہ میں دھاک ہو اور جن سے پورا شہر مرعوب رہتا ہو۔ یہ بات صرف دو[1] کو حاصل تھی: عمر بن الخطاب اور ان کے ماموں ابو جہل بن ہشام کو۔ مگر یہ دونوں اسلام کے مقابلہ میں بہت سخت تھے۔ آنحضرت ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے کہ خداوندا ان دونوں میں جو تجھے زیادہ محبوب ہو اس سے اسلام کو تقویت فرما۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ جرأت ہی تھی کہ ایک روز طے کر لیا کہ محمد ﷺ کا قصہ تمام کر کے اس خلفشار کا خاتمہ کر دوں جس سے قریش کی زندگی تلخ ہو گئی ہے اور آئے دن ایک ہنگامہ برپا رہتا ہے۔

عمر بن الخطاب نے تلوار ہاتھ میں لے لی اور محمد ﷺ کی تلاش میں نکلے۔ راستہ میں ایک صاحب نعیم[2] بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے آپ کو دیکھا۔ تیور چڑھے ہوئے تھے دریافت کیا: ابن الخطاب کیا ارادہ ہے؟

عمر بن الخطاب: اُس فتنہ کو ختم کرنے جارہا ہوں جو محمد نے برپا کر دیا ہے (ﷺ)

نعیم بن عبد اللہ: خاندان ہاشم اور جو ان کے حلیف ہیں ان سے کیسے نمٹو گے؟ اور دیکھو ابن الخطاب! محمد کو ختم کرنے سے پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید بن زید مسلمان ہو چکے ہیں۔

عمر رضی اللہ عنہ ان طعن آمیز، اشتعال انگیز فقروں کو کب برداشت کر سکتے تھے وہ فوراً پلٹے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تلاش چھوڑ کر بہن کے مکان پر پہنچ گئے۔ وہاں حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ قرآن شریف پڑھا رہے تھے۔ جیسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دروازے پر پہنچ کر آواز دی، ہمشیرہ صاحبہ نے حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو اندر کر دیا مگر تلاوت کی کچھ بھنک عمر کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ عمر جیسے ہی مکان میں داخل ہوئے پوچھا: تم کیا پڑھ رہے تھے؟ بہن بہنوئی نے بات کو چھپانا چاہا۔ کچھ خاموش رہے تو عمر رضی اللہ عنہ نے اسی تیزی میں کہا: میں نے سنا ہے تم بے دین ہو گئے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی پر ہاتھ اٹھایا۔ بہن اپنے شوہر کو بچانے کے لئے آگے بڑھیں تو ان کے سر پر بھی اتنی زور سے مارا کہ خون بہنے لگا۔ اب بہن کو جوش آگیا۔ فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ جو چاہو کر لو۔ ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور ہم قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔

بہن کے سر سے خون بہتا ہوا دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ پسیجے۔ غصہ ٹھنڈا ہوا تو فرمایا: مجھے دکھاؤ کیا

---

[1] نام دونوں کا عمر، ایک عمر بن الخطاب دوسرے عمر بن ہشام جو ابو الحکم کی کنیت سے مشہور تھا پھر ابو جہل کے نام سے مشہور ہوا۔

[2] نعیم بن عبد اللہ النحام، مسلمان ہو چکے تھے۔ مگر اپنے اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا۔ النحام، نحمہ سے ماخوذ ہے نحمہ کے معنٰی ہیں آہٹ یا کھنکار کی آواز۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا تھا: سمعت نحستہ فی الجنۃ میں نے جنت میں ان کا نحمہ سنا ہے۔ اسی بشارت کی بنا پر ان کا خطاب نحام ہو گیا۔ (سیرت حلبیہ ص۳۴۹ ج۱)

پڑھ رہے تھے۔

بہن نے فرمایا: تم دیکھنا چاہتے ہو تو پہلے غسل کرو۔ تم کافر ہو، ناپاک ہو، قرآن کو نہیں چھو سکتے۔

اب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا غصہ ختم ہو چکا تھا اور اصل حقیقت معلوم کرنے کا شوق اتنا بڑھ چکا تھا کہ بہن کے توہین آمیز کلام کو برداشت کیا اور غسل کر کے کلام اللہ کے اوراق پڑھنے شروع کئے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱﴾ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۚ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲﴾ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۳﴾ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ مَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۴﴾ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۵﴾ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ یُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ ؕ وَ هُوَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۶﴾ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِیْرٌ ﴿۷﴾ (سورہ حدید ۱ تا ۷)

ترجمہ: آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے (کہ وہ ہر ایک نقص سے مبرا ہے)۔ وہ زبردست حکمت والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے۔ (مستحق بادشاہت وہی ہے) وہی زندگی بخشتا ہے۔ اور موت دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ پہلے ہے۔ وہی پیچھے۔ وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی (باطن)۔ اور وہ ہر چیز کا پورا علم رکھنے والا ہے۔ وہ ایسا ہے کہ اس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ روز (دور) میں۔ پھر وہ عرش پر رونق افروز ہوا (پوری کائنات کو اپنے اقتدار میں لے لیا)۔ ہر چیز کا اس کو علم ہے۔ وہ جانتا ہے ہر اس چیز کو جو زمین کے اندر داخل ہوتی ہے اور جو زمین سے نکلتی ہے۔ جو آسمان سے اترتی ہے جو آسمان پر چڑھتی ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے تمام اعمال دیکھتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے اور تمام باتوں کا مرجع وہی اللہ کی ذات ہے۔ وہ ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔ وہ دل کی باتوں کو پوری طرح جانتا ہے۔ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ اور اس مال میں سے خرچ کرو جس پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔ پس جو لوگ تم میں سے ایمان لے آئیں اور مال خرچ کریں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

اوپر کی آیتوں میں اللہ کی ذات اور صفات کا ذکر ہے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان فرمایا کرتے تھے: میں یہ آیتیں پڑھ رہا تھا اور جب اللہ کا نام آتا تھا دل کانپ جاتا تھا یہاں تک کہ جب ساتویں آیت پر پہنچا "ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر" تو بے اختیار زبان سے نکلا "اشھد ان لا الہ الاّ اللہ و اشھد ان محمدا رسول اللہ"

حضرت خباب رضی اللہ عنہ جن کو اندر چھپا دیا گیا تھا انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے کلمہ شہادت

سنا تو خوش ہوتے ہوئے باہر آئے اور فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ بشارت ہو۔ آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی تھی کہ خداوند!! ابوجہل اور عمر میں سے جو تجھے زیادہ محبوب ہو اس سے اسلام کی تقویت فرما۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ بشارت سن کر فوراً ہی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آنحضرت ﷺ دار بنی ارقم میں کوہ صفا کے دامن میں پناہ گزین تھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور کچھ اور صاحبان حاضر خدمت تھے۔ ان صاحبان نے عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا، تلوار ہاتھ میں لئے آرہے ہیں، کچھ خیال پیدا ہوا مگر یہ بھی سوچ لیا کہ بھرپور جواب دیا جائے گا۔ لیکن عمر رضی اللہ عنہ پہنچے تو انداز دوسرا تھا ۔ آگے بڑھے تو رحمت عالم ﷺ نے کھڑے ہو کر استقبال کیا اور چادر یا کرتے کا کنارہ پکڑ کر فرمایا: عمر کیسے آئے۔ پھر فرمایا: عمر باز نہ آؤ گے۔ کیا خدا کے قہر[1] کا انتظار کر رہے ہو۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ: حضرت باز آ چکا ہوں۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کی اتنی مسرت ہوئی کہ خود آنحضرت ﷺ نے بھی زور سے تکبیر کہی اور آپ کے ساتھیوں نے بھی زور سے تکبیر کہی۔ یہاں تک کہ یہ دامن کوہ نعرہ تکبیر سے گونج اٹھا۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہو جانے سے اسلام کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اب تک یہ موقع نہیں ملتا تھا کہ مسلمان حرم کعبہ میں نماز پڑھ سکیں۔ مگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو پہلے سرداران قریش میں سے ہر ایک کی ڈوڑھی پر پہنچ کر ہر ایک کو آگاہ کیا کہ عمر مسلمان ہو گیا ہے۔ اس کے بعد تمام مسلمانوں کو ساتھ لے کر حرم شریف میں داخل ہوئے اور کھلے بندوں نماز پڑھی۔ لیکن قریش نے سب کی پوری طرح تواضع کی۔ خصوصاً حضرت عمر فاروق ہر ایک کا نشانہ بنے۔[3]

کافی مار پیٹ کے بعد کسی طرح یہ ہنگامہ ختم ہوا۔ مگر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہو جانا ایسا حادثہ نہیں تھا جس پر قریش آسانی سے صبر کر لیتے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی دوبھر کر دی۔ حتیٰ کہ وہ بھی مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ لیکن عرب کے مشہور اور باہیبت قبیلہ بنی سہم سے ان کا معاہدہ تھا یہ معاہدہ اس وقت کام آیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے "عمر فاروق رضی اللہ عنہ مکان میں چھپے ہوئے تھے۔ باہر میدان میں اتنا ہجوم تھا کہ پوری وادی آدمیوں سے پٹی ہوئی تھی، اور یہ شور تھا کہ عمر بے دین ہو گیا ہے۔ میں مکان کی چھت پر کھڑا ہوا یہ ہنگامہ دیکھ رہا تھا۔ میں پریشان تھا کہ کیا ہو گا۔ دفعۃً

---

1. البدایہ والنہایہ ص ۸۱ ج ۳
2. ماخوذ از البدایۃ والنہایہ ص ۷۹ تا ص ۸۲ ج ۳۔ السیرۃ الحلبیہ ص ۳۴۹ تا ص ۳۵۴ و تاریخ الخلفاء
3. ماخوذ از تاریخ الخلفاء جلال الدین السیوطی والبدایہ والنہایہ ص ۷۲ تا ۷۹ ج ۳ والسیرۃ الحلبیہ ص ۳۴۹ تا ص ۳۸۲ ج ۱

ایک صاحب نمودار ہوئے۔ ریشمی کفوں دار قمیض پہنے ہوئے۔ اس کے اوپر ریشمی قبا اور شیوخ عرب کے قاعدے کے بموجب ایک بڑھیا چادر اوڑھے ہوئے وہ اندر مکان میں پہنچے۔ والد صاحب سے دریافت کیا۔ کیا واقعہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ جرم یہ ہے کہ مسلمان ہو گیا ہوں ۔ اس سردار نے کہا: ہر گز نہیں۔ یہ کچھ نہیں کر سکتے۔ میں آپ کو پناہ دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر یہ سردار باہر آیا اور اعلان کر دیا کہ عمر کو میں نے پناہ دیدی ہے۔"

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جیسے ہی اس سردار نے یہ اعلان کیا وہ تمام مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا: یہ صاحب کون ہیں۔ جواب دیا قبیلہ بنی سہم کا شیخ و رئیس عاص بن وائل سہمی۔ ❶

بااین ہمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے مسلمانوں کی ڈھارس بندھی اور بقول حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وہ قوت حاصل ہوئی جو پہلے نہیں تھی۔ ❷ ہم کھلے بندوں حرم کعبہ میں پہنچے، طواف کیا، نماز پڑھی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا اسلام کی فتح تھی۔ ان کی ہجرت نصرت اور ان کی حکومت رحمت۔ ❸

شعب ابی طالب میں پناہ

قریش کی طرف سے قومی بائیکاٹ

پے درپے ناکامیوں نے قریش کو اور زیادہ مشتعل کر دیا۔ کھلم کھلا قتل کرنے میں قبائلی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ تھا۔ لیکن خفیہ طور پر قتل کرنے میں پہلے ثبوت کی ضرورت تھی، جس کا مہیا کرنا بنو ہاشم کے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ خفیہ طور پر جان جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان لینے کی سازش ہونے لگی۔ خواجہ ابو طالب کے چوکنے دماغ نے اس کو بھانپا۔ انہیں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہی نہیں بلکہ خاندان ہاشم کے اور لوگوں کے متعلق بھی خطرہ ہوا۔ مثلاً خواجہ ابو طالب کے بڑے صاحبزادے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اگرچہ ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے لیکن چھوٹے صاحبزادے حضرت علی رضی اللہ عنہ یہیں تھے جو ہر دم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ خواجہ ابو طالب نے خاندان کے لوگوں سے مشورہ کیا اور یہ طے کیا کہ شہر کے خطرناک ماحول سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پناہ لی جائے۔

پہاڑیوں کے بیچ میں ایک مقام "خیف بنی کنانہ" تھا۔ یہ بنو ہاشم کا موروثی رقبہ تھا۔ طے یہ ہوا کہ وہاں

---

❶ بخاری شریف ص ۵۴۵

❷ بخاری شریف ص ۵۲۰

❸ البدایہ والنہایہ ص ۷۹ ج ۳

جا کر قیام کیا جائے۔ چنانچہ پورا خاندان (جس کے بہت سے افراد ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے) اس مقام پر چلا گیا، جس کا دوسرا نام شعب ابی طالب تھا۔ صرف ابو لہب اور اس کا گھرانا مکہ میں رہ گیا جو اپنے خاندان کے خلاف قریش کا سرگرم حامی تھا۔ ابو طالب یہاں پہنچ کر بھی اپنے بھتیجے کی نگرانی راتوں کیا کرتے تھے۔ ان کے سونے کی جگہ بھی بدلتے رہتے تھے۔ قریش کے سرداروں نے اس کا جواب یہ دیا کہ تمام مخالف گروپوں کو ملا کر ان سب کا مقاطعہ کر دیا، جو خواجہ ابوطالب کے ساتھ اس گھاٹی میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ قریش کے ساتھ قبیلہ بنی کنانہ بھی اس معاہدہ میں شریک ہوا[1] ۔ مقاطعہ صرف رشتے ناتے کا نہیں تھا بلکہ کھانے پینے کی چیزیں بھی بند کر دیں۔ ایک عہد نامہ لکھا گیا کہ ان کے ساتھ نہ نکاح بیاہ کیا جائیگا نہ خرید وفروخت۔ اور کوشش کی جائے گی کہ مکہ سے باہر بھی کہیں سے یہ لوگ کچھ نہ خرید سکیں۔ بیوپاریوں کو آمادہ کیا گیا کہ مکہ کے راستوں کی نگرانی رکھیں اور باہر سے آنے والی جنس کو مکہ میں پہنچنے سے پہلے ہی خرید لیا کریں۔

سرداران قریش کے اس معاہدہ پر دستخط ہوئے اور یہ عہدنامہ قومی حفاظت خانہ (خانہ کعبہ کے خزانہ) میں محفوظ کر دیا گیا۔[2]

نبوت کے ساتویں سال۔ محرم کی پہلی تاریخ سے یہ مقاطعہ شروع ہوا تھا۔[3] جو تقریباً تین سال تک رہا۔ اس عرصہ میں درختوں کے پتے اور جڑیں کھا کر زندگی گزارنی پڑی۔ بچے بلبلاتے تھے مگر ان کو دودھ میسر نہیں آتا تھا۔ بکریاں ختم ہو گئی تھیں اور پے در پے فاقوں سے ماؤں کے دودھ خشک ہو گئے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے رفقاء اگرچہ بنو ہاشم نہیں تھے مگر وہ ان کے ساتھ تھے تو مقاطعہ ان سے بھی اتنا ہی سخت تھا۔[1]

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا چمڑا ہاتھ آ گیا۔ میں نے اس کو پانی سے دھویا پھر آگ پر بھونا اور پانی ملا کر کھایا۔[2]

مکہ میں جو رشتہ دار تھے ان میں وہ بھی تھے جن کو اس حالت پر ترس آتا تھا۔ مگر پابندیاں ایسی سخت تھیں کہ کوئی کچھ امداد نہیں کر سکتا تھا۔

اس معاہدہ کی کوئی مدت نہیں تھی۔ اس کی انتہا یہ تھی کہ محمد ﷺ کو قتل کے لئے حوالہ کر دیں

---

[1] بخاری شریف ص ۴۳۰

[2] البدایہ والنہایہ بحوالہ موسیٰ بن عقبہ عن الزہری ص ۸۴ ج ۳

[3] ابن سعد ص ۱۴۰ ج ۱

[1] سیرۃ ابن اسحاق بحوالہ ازالۃ الخفاء ص ۱۰ ج ۲

[2] روض الانف بحوالہ سیرۃ النبی ج ۱

❸ـ

تین سال پورے ہونے لگے تو یک طرفہ متواتر ظلم و ستم کچھ اہل قرابت کے دلوں میں نرمی پیدا کی اور یہ بحث شروع ہوئی کہ معاہدہ کی پابندی کب تک کی جائے۔ لیکن پلہ ان کا بھاری تھا جن کے سینوں میں دلوں کی جگہ پتھر بھرے ہوئے تھے۔ دفعۃً ایک قدرتی حل سامنے آگیا۔

آنحضرت ﷺ نے چچا ابو طالب کو خبر دی کہ کیڑوں نے معاہدہ کے تمام حرف چاٹ لئے ہیں۔ صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے۔ خواجہ ابو طالب نے یہ الہامی خبر سنی تو قریش کے سرداروں کے پاس پہنچے کہ آج ہمارا تمہارا معاملہ طے ہے۔ محمد نے یہ خبر دی ہے اگر یہ خبر جھوٹی ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں اور اگر سچی ہے تو جب معاہدہ ہی نہیں رہا تو اس کی پابندی کیسی۔

سرداران قریش نے یہ فیصلہ منظور کیا۔ ان کو یقین تھا کہ جیت ہماری ہوگی۔ مگر جب خزانہ کھول کر دستاویز نکالی گئی تو دیکھا "الصادق الامین" کی خبر حرف بحرف صحیح ہے۔ سنگدلوں کے پیشواؤں نے پھر بھی یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ یہ محمد کا جادو ہے (ﷺ)۔ مگر اب وہ اپنے اصرار میں کامیاب نہ ہو سکے اور مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ معاہدہ ختم ہو گیا۔ اس قدرتی کرشمہ کے بعد ایسی فضا ہوگئی کہ بنو ہاشم شعب سے نکل کر مکہ میں آگئے۔ ❹

ایسے سخت امتحان میں روحانی ترقی کہاں تک ہو سکتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ چنانچہ اسی زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو معراج کا شرف عظیم حاصل ہوا۔ معراج میں پنج وقتہ نمازیں فرض ہوئیں۔ نماز کے آخر میں التحیات پڑھی جاتی ہے جس میں نہ صرف آنحضرت ﷺ اور ان بزرگوں پر جو اس امتحان میں کامیاب ہوئے تھے بلکہ ان کے طفیل میں تمام عباد صالحین پر سلام بھیجا جاتا۔ السلام علینا وعلیٰ عباد اللہ الصالحین

پناہ کی دیواریں منہدم

قریش کا مقاطعہ جو بعثت مبارکہ کے ساتویں سال شروع ہوا تھا تین سال بعد (سہ ۱۰ بعثت مبارکہ میں) ختم ہوا۔ چند ماہ بعد رمضان کا مہینہ آیا۔ اس مہینہ میں چند روز کے فرق سے خواجہ ابو طالب اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوگئی۔ سیدہ خدیجہ وہ خاتون تھیں جو سب سے پہلے ایمان لائیں اور ابو طالب وہ شیخ قبیلہ تھے جو آخر تک ایمان نہیں لائے اور یہ اعلان کرتے ہوئے مرے کہ میں نے اپنے باپ دادا کا مذہب نہیں چھوڑا۔ مگر آنحضرت ﷺ کے دونوں جاں نثار تھے۔

پناہ کی یہ دونوں دیواریں منہدم ہو گئیں، تو اب دشمنوں کا راستہ صاف تھا۔ عقبہ بن ابی معیط اور

---

❸ موسیٰ بن عقبہ بحوالہ زہری۔ البدایہ والنہایہ ص۸۴ ج۳

❹ البدایہ والنہایہ ص۹۶ ج۳

ابولہب جو بدترین موذی دشمن تھے اور دونوں پڑوسی تھے۔[1] ان کا طریقہ یہ تھا کہ راستہ میں کانٹے بچھوادیتے۔ دروازہ میں غلاظت کا بھرا ہوا ٹوکرا ڈالوا دیتے تھے۔ ان کے چھوٹے ان سے بھی آگے تھے۔ وہ کاشانہ نبوی میں گھس کر برتنوں کو خراب کرتے۔ پکتی ہوئی ہنڈیا کو اوندھی کر دیتے یا اس میں پلیدی ڈال دیتے تھے۔[2]

خدا جانے کتنی مرتبہ ایسا ہوا کہ آنحضرت ﷺ باہر سے تشریف لائے۔ سر مبارک اور کپڑے گرد و غبار اور پلیدی سے آلودہ۔ صاحبزادیاں یہ حالت دیکھ کر دلگیر ہو رہی ہیں، کپڑے دھو رہی ہیں، سر مبارک صاف کر رہی ہیں۔ زبان سے بد دعا دیتی ہیں تو ارشاد ہوتا ہے: لاتبکی یابنیة فان الله مانع اباك[3] (بیٹی دلگیر نہ ہو اللہ تمہارے باپ کا محافظ ہے)

پناہ کی تلاش:

نبی کا بھروسہ خدا پر ہوتا ہے۔ اور شروع میں جب یہ حکم نازل ہوا تھا کہ "اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوت اسلام دو"[4] تو ساتھ ہی حضرت حق جل مجدہ نے یہ ہدایت بھی فرمائی تھی۔

"بھروسہ کر خدا قادر و رحیم پر جو تم کو دیکھتا رہتا ہے جب تم کھڑے ہوتے ہو اور نمازیوں کے ساتھ تمہاری نشست و برخاست کو وہ دیکھتا رہتا ہے"۔[5]

مگر چونکہ نبی کی زندگی کا ہر ورق امت کے لئے سبق ہوتا ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ پر مکمل اور کامل بھروسہ کے باوجود ظاہری ذرائع اور اسباب سے دامن نہیں جھٹکتا۔ کیونکہ اگر سلسلہ اسباب کو چھوڑ دیا جائے تو اس عالم اسباب کا نظام ہی درہم برہم ہو جائے۔ بہر حال جب خواجہ ابو طالب کی وفات کے بعد قریش کو موقع مل گیا کہ جو کچھ وہ اب تک نہیں کر سکتے تھے اس کو کر گزریں تو آپکو بھی ایسے ذریعہ کی تلاش ہوئی جو قانون عرب کے بموجب آپ کے لئے پناہ بن سکے۔

مگر مٹھی بھر مسلمانوں یا آل ہاشم کے علاوہ مکہ کا بچہ بچہ دشمن تھا اور کوئی ہمدرد بھی تھا تو کس کی ہمت تھی کہ قریش کے مقابلہ میں ڈھال بن سکے۔ لہذا آپ نے مکہ سے باہر نظر دوڑائی۔

طائف کا سفر

---

[1] ابن سعد ص ۱۳۴ ج ۱،
[2] البدایہ والنہایہ ص ۱۲۲ ج ۲
[3] ایضاً
[4] سورہ شعراء آیت ۲۱۴
[5] سورہ شعراء، آیت ۲۱۷ و ۲۱۹

طائف:

مکہ سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر ایک سرسبز پہاڑ ہے۔ نہایت زرخیز۔ وہاں بڑے بڑے باغات اب بھی ہیں اور اس وقت بھی تھے۔ مکہ کے رئیسوں کی وہاں کوٹھیاں تھیں۔ قبیلہ ثقیف کا وہاں تسلط تھا۔ وہ عرب کا طاقتور قبیلہ مانا جاتا تھا۔ قریش بھی اس کا لوہا مانتے تھے۔ اس قبیلہ سے ان کی رشتہ داریاں بھی تھیں۔

روساءِ طائف اور ان کے اجواب:

تین بھائی عبدیالیل، مسعود، اور حبیب یہاں کے رئیس اعظم اور قبیلہ ثقیف کے سردار تھے۔ آنحضرت ﷺ کی نظر ان پر پڑی کہ اگر وہ پناہ میں لے لیں تو آپ کو فریضہ تبلیغ کی ادائیگی میں آسانی ہو۔ چنانچہ آپ رمضان گزرنے کے بعد ماہ شوال میں طائف تشریف لے گئے [1]۔ دس روز وہاں قیام فرمایا۔ [2] عوام وخواص اور ہر ایک کے سامنے دعوت اسلام پیش کی۔ روساء اور معززین کے مکانوں پر پہنچ کر گفتگو کی۔ [3] ان تینوں بھائیوں سے بھی ملاقات کی۔ اپنا مقصد واضح کیا۔ مگر کسی ایک نے بھی انسانیت سے جواب نہیں دیا۔

ایک نے کہا اگر خدا نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے تو وہ خانہ کعبہ کے کپڑے کھسوٹ رہا ہے (اس کی عزت پامال کر رہا ہے)۔

دوسرے نے کہا۔ اللہ کو آپ کے سوا کوئی اور نہیں ملا تھا جس کو رسول بنا کر بھیجتا۔

تیسرے نے کہا: واللہ میں تم سے بات نہیں کروں گا۔ کیونکہ جیسا تمہارا دعویٰ ہے اگر واقعی تم خدا کے رسول ہو تو رسول کی شان یہ نہیں ہے کہ اس سے بحث کی جائے اور اگر تم خدا پر جھوٹ باندھ رہے ہو تو میری شان یہ نہیں ہے کہ میں جھوٹے سے بات کروں۔ [4]

ان لوگوں کے بھونڈے جواب سن کر آپ نے فرمایا کہ اتنی مہربانی کرو کہ میرے آنے کی خبر کسی کو نہ دو۔ آپ کو خیال ہوا کہ مکہ والوں کو میرے آنے اور ان کے جوابوں کی خبر ہو گی تو وہ اپنی حرکتوں میں اور دلیر ہو جائیں گے۔ مگر ان بدنصیبوں نے اس فرمائش کی تعمیل اس طرح کی کہ طائف کے آوارہ گردوں کو اشارہ کر دیا۔ وہ آپ کے پیچھے پڑ گئے اور گستاخیاں کرنے لگے۔ اور جب کسی طرح ان سے جان چھڑا کر آگے بڑھے تو طائف کے لوگوں نے جو دونوں طرف صف بنائے کھڑے تھے ذات اقدس پر دونوں

---

[1] یہ سفر غالباً پاپیادہ ہوا۔ کسی سواری کا کوئی تذکرہ روایتوں میں نہیں ملتا۔ محمد میاں

[2] ابن سعد ص ۱۴۲ ج ۱

[3] ایضاً

[4] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۵ ج ۳

طرف سے پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ سنگ باری سے پنڈلیاں مجروح ہو گئیں۔ گھٹنے چور ہو گئے، بدن مبارک کہ لہولہان ہو گیا۔ ایک جاں نثار حضرت زید بن حارثہ ساتھ تھے۔ وہ کبھی آگے کبھی پیچھے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر تنہا کیا کر سکتے تھے۔ پتھروں سے ان کا سر بھی پھٹ گیا۔[1] بالآخر کسی طرح آبادی سے باہر نکلے تو بیہوش ہو کر گر پڑے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اٹھایا۔ قریب ہی کچھ پانی تھا۔ وہاں لے گئے تاکہ خون کے دھبے دھوویں۔ نعل مبارک اتارنے چاہے تو خون سے اس طرح جم گئے تھے کہ اتارنا مشکل پڑا۔ طبیعت سنبھلی تو قریب کے ایک باغ میں تشریف لے گئے۔ ایک درخت کے سایہ میں تشریف فرما ہوئے اور اپنے معبود کی بارگاہ میں مشغول دعا ہو گئے۔[2]

بارگاہ رب العزت میں عجز و انکسار

پتھر برسانے والوں کے حق میں خیر اندیشی اور ہمدردی

اہل طائف کی وحشیانہ حرکتوں سے مجروح و مضروب محمد رسول اللہ ﷺ انگور کی ٹہنی کے سایہ میں نڈھال بیٹھے ہیں۔ دل میں درد ہے، زخموں میں ٹیس، مگر پیشانی بارگاہ رب العزت میں جھکی ہوئی ہے اور زبان مبارک مصروف دعا ہے[3] (ترجمہ یہ ہے)

"میرے اللہ میں تجھ ہی سے اپنی بے بسی کا شکوہ کرتا ہوں۔ میں لوگوں میں ذلیل ہو رہا ہوں۔ اس کا شکوہ تجھ ہی سے کرتا ہوں۔ اے سارے مہربانوں میں سب سے زیادہ مہربان۔

ان کا رب (نگران و مددگار) تو ہی ہے جو دنیا میں کمزور سمجھے جاتے ہیں، جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا، جن کے پاس وسیلے اور ذریعے نہیں ہوتے اور ہاں میرا رب تو ہی ہے۔ اے میرے پروردگار تو مجھے کن کے حوالے کر رہا ہے، ان کے جو مجھ سے دور ہیں! جو مجھ سے بات بھی کرتے ہیں تو منہ بگاڑ کر، یا ان کو جو میرے دشمن ہیں۔ کیا تو نے میرے معاملہ کا مالک ان کو بنا دیا ہے؟

اے اللہ! اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے، خداوندا اگر مجھ پر تیرا اعتاب نہیں ہے تو مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں ہے۔ خداوندا تیری عافیت کا دامن بہت وسیع ہے، میری سمائی تیری عافیت کی گود ہی میں ہے۔

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۱۴۲ ج ۱

[2] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۲ ج ۳،

[3] غور کیجئے کیا ایسا شخص (معاذ اللہ) کاذب یا ساحر یا شاعر ہو سکتا ہے؟

تیرے چہرہ کا وہ نور۔ جس سے اندھیریاں روشنی بن جاتی ہیں جس کے ادنیٰ جلوے سے دنیا اور آخرت کے بگڑے ہوئے کام سنور جاتے ہیں، میں اسی نور کی پناہ لیتا ہوں۔

میں پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ مجھ پر تیرا غضب پڑے یا عتاب نازل ہو۔ تجھ ہی کو منانا ہے اور اس وقت تک منانا ہے جب تک تو راضی نہ ہو۔ اے اللہ مجھ میں نہ طاقت ہے نہ زور ہے۔ جو کچھ طاقت ہے تیرا ہی صدقہ ہے۔ جو کچھ قوت ہے وہ تیری ہی عطا ہے۔ میری کوئی تدبیر کارگر نہیں کارساز تو ہی ہے بگڑی کو بنانے والا تو ہی ہے۔"

یہاں سے اٹھے دل غمگین تھا، حسرت و افسوس کے دھوئیں سے دم گھٹ رہا تھا۔ سر جھکائے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے۔ کچھ دھیان پلٹا تو دیکھا پہاڑی سامنے ہے جس کو قرن الثعالب یا قرن المنازل کہتے ہیں۔ آپ یہاں ٹھٹکے۔ اوپر نظر اٹھی تو دیکھا ایک بادل آپ پر چھایا ہوا ہے۔ بادل پر نظر ڈالی تو دیکھا حضرت جبرائیل امین جلوہ افروز ہیں اور فرما رہے ہیں :

اللہ تعالیٰ نے سن لیا، دیکھ لیا، تم نے جو کچھ کہا جو لوگوں نے جواب دیا، جس طرح تم کو واپس کیا اور جو سلوک تمہارے ساتھ کیا وہ بھی دیکھ لیا۔ اب یہ پہاڑوں کے فرشتے (ملک الجبال) موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھیجا ہے۔ اب حکم کیجئے یہ تعمیل کرینگے۔

پھر ملک الجبال سامنے آیا۔ سلام عرض کیا پھر کہا :

یا محمد تمہاری قوم کی تمام باتیں خدا نے سنیں، دیکھیں، اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے آپ جو چاہیں حکم کریں میں تعمیل کروں گا۔ آپ حکم دیں مکہ کے دونوں طرف جو پہاڑ ہیں ان کو ملا کر ان تمام گستاخ بے ادب لوگوں کو پیس ڈالوں۔

ایک آزمائش وہ تھی کہ اہل طائف ہر طرف سے پتھر برسا رہے تھے۔ دوسری آزمائش یہ ہے کہ جبرائیل امین اور ملک الجبال ان سب کو پیس ڈالنے کی فرمائش کے منتظر ہیں۔ وہ امتحان تھا صبر وضبط، تحمل اور استقلال کا۔ یہ امتحان ہے وسعت ظرف، فراخی حوصلہ اور دعویٰ رحم و کرم کا۔

جس خدا نے آپ کو اس امتحان میں ثابت قدم رکھا۔ اس نے آپ کو اس امتحان میں بھی کامیاب فرمایا۔

فرشتے کی درخواست سن کر دل مبارک بیتاب ہو گیا۔ یہ خدا کی مخلوق جو نبی کی کھیتی ہے برباد کر دی جائے؟

آپ نے فرشتوں کو جواب دیا:

ارجوان یخرج اللہ من اصلابھم من یعبد اللہ ولا یشرك به شیئاً ★

اگر یہ بدنصیب راہ راست پر نہ آئیں تو ان کی نسل سے میں ناامید نہیں ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ ان کی نسل میں وہ ہوں گے جو خدا واحد کی عبادت کرینگے اور شرک سے باز رہیں گے۔ ❶

باغ کے مالک اور ان کا غلام:

یہ باغ عتبہ ❷ اور شیبہ بن ربیعہ کا تھا جو مکہ کے مشہور رئیس تھے۔ یہ دونوں بھائی باغ میں موجود تھے۔ انہیں غیرت آئی کہ شہر کے ایک شخص کے ساتھ طائف والوں نے یہ سلوک کیا۔ مگر یہ ہمت پھر بھی نہیں ہوئی کہ آنحضرت ﷺ سے آکر بات کرتے۔ انگوروں کے خوشے تھالی میں رکھ کر غلام کو دیئے کہ وہ ان مظلوم مہمانوں کے پاس لیجائے جو سایہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

غلام کا نام عداس تھا، مذہباً عیسائی تھا۔ وہ آپ کے پاس انگور لے کر آیا۔ آپ نے انگوروں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو زبان مبارک پر آیا: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

عداس الرحمن الرحیم سن کر چونکا، کہنے لگا: یہاں کے آدمی تو الرحمن الرحیم نہیں کہتے۔ ❸

آپ نے فرمایا: تم کہاں کے ہو۔ عداس نے جواب دیا: میرا آبائی وطن "نینویٰ" تھا۔

آنحضرت ﷺ: وہی نینویٰ جو میرے بھائی یونس (علیہ السلام) کا وطن تھا۔

عداس: آپ حضرت یونس علیہ السلام کو کیسے جانتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے جواب دیا: میرے اور ان کے درمیان نبوت کا رشتہ ہے وہ بھی اللہ کے نبی تھے۔ میں بھی اسی خدا کا بھیجا ہوا نبی ہوں۔

عداس یہ سن کر تڑپ گیا۔ آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پیر چومنے لگا۔ عتبہ اور شیبہ نے دور سے دیکھا تو کہنے لگے اس کو تو محمد نے بگاڑ دیا۔

جب عداس واپس پہنچا تو دونوں بھائیوں نے غلام سے پوچھا: تم یہ کیا حرکت کر رہے تھے۔

★ بخاری شریف ص ۴۵۸ مسلم شریف ص ۱۰۹ ج ۱

❶ حضرت نوح علیہ السلام کو اس کی توقع نہیں تھی آپ نے بارگاہ رب العزت میں یہ عرض کیا تھا انك ان تذرھم یضلوا عبادك ولا یلدوا الا فاجراً کفاراً۔ (سورہ نوح۔۲۷ "اگر ان کو مہلت رہی تو یہ بندگان خدا کو گمراہ ہی کرینگے۔ اور صرف انہیں کو جنم دینگے جو بدکار اور بدترین کافر ہونگے")

❷ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نانا، حضرت ابوسفیان کے خسر تھے، غزوہ بدر میں سب سے پہلے یہ دونوں بھائی اور عتبہ کا لڑکا ولید بن عتبہ ہی حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ تفصیل سلسلہ غزوات میں ملاحظہ فرمایئے۔

❸ ملاحظہ فرمائے سورہ ۲۵ الفرقان کی آیت ۶۰ جب ان مشرکین مکہ سے کہا جاتا ہے کہ سجدہ کرو رحمن کو تو وہ (انجان بن کر کہتے ہیں) رحمن کون ؟۔

عداس: یہ نبی ہیں ان سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ انہوں نے مجھے دو باتیں بتائیں جو نبی ہی بتا سکتا ہے۔
دونوں رئیس: اس کی باتوں میں نہ آؤ۔ اپنے مذہب پر رہو۔ تمہارا مذہب اس کے دین سے بہت اچھا ہے۔ [1]

مطعم بن عدی کی قدر دانی:

طائف میں یہ سب کچھ ہوا۔ مگر وہ سوال پھر بھی رہ گیا، جس کے لئے آپ نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ آپ نے مکہ پہنچنے سے پہلے یکے بعد دیگرے روساءمکہ اخنس بن شریق اور سہیل بن عمرو کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ حمایت کا وعدہ کر لیں مگر دونوں نے انکار کر دیا کہ وہ قریش کے حلیف ہیں۔ وہ قریش کے خلاف کسی کو پناہ نہیں دے سکتے۔ پھر آپ نے اس کے پاس پیغام بھیجا جس کے لئے یہ شرف مقدر تھا۔
یہ رئیس مکہ مطعم بن عدی تھا۔ اس نے حمایت کا وعدہ بھی کیا اور یہ فرمائش بھی کی کہ آپ اس کے یہاں تشریف لائیں۔
آنحضرت ﷺ مطعم کے یہاں تشریف لے گئے۔ رات ان کے یہاں گزاری۔ صبح ہوئی تو مطعم نے خود ہتھیار سجائے۔ اس کے چھ سات لڑکے تھے سب کو مسلح کیا۔ پھر آنحضرت ﷺ کو لے کر چلا۔ حرم کعبہ میں پہنچا۔ آنحضرت ﷺ سے کہا آپ طواف کریں۔ آنحضرت ﷺ نے طواف کیا۔ مطعم اور بیٹے حفاظت کرتے رہے۔ جب طواف سے فارغ ہوئے تو مطعم نے اعلان کر دیا کہ "محمد ﷺ میری پناہ میں ہیں۔"
ابو سفیان، مطعم بن عدی کے پاس آیا دریافت کیا: تم نے محمد کو اپنی پناہ میں لیا ہے یا ان کا مذہب قبول کر لیا ہے۔ مطعم نے جواب دیا میں نے مذہب نہیں بدلا صرف محمد کو پناہ دی ہے۔ ابو سفیان نے کہا: تب آپ کے اعلان کا احترام کیا جائے گا۔ [2]

---

[1] البدایہ والنہایہ ص۱۳۶ ج۳
[2] البدایہ والنہایہ ص۱۳۷ ج۳

یثرب۔ مدینۃ النبی

(۱)

مکہ معظمہ سے شمال کی جانب تقریباً دو سو میل (سوا تین سو کلو میٹر) کے فاصلہ پر ایک زرخیز علاقہ میں آبادیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ان میں سب سے بڑی آبادی [1] کا نام یثرب [2] ہے۔ اس کے دو طرف دو سنگلاخ ہیں ان کو لابتین [3] کہا جاتا ہے اور حرتین بھی کہلاتے ہیں۔

جانب مشرق میں تقریباً آٹھ میل تک چھوٹی چھوٹی آبادیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے ان کو عوالی کہا جاتا ہے۔ موضع قبا اسی طرف ہے [4] دوسری جانب بھی اسی طرح کی آبادیاں ہیں۔ ان کو اسافل کہا جاتا ہے۔ [5]

یثرب کے نشیبی حصہ میں برسات میں پانی بھر جاتا ہے جس کی وجہ سے یہاں کی آب و ہوا مرطوب رہتی ہے۔ یہاں کا بخار "حمیٰ یثرب" پورے عرب میں مشہور ہے۔ یثرب نام میں آب و ہوا کی خرابی کو بھی دخل ہے۔ (کیونکہ ثرب جو یثرب کا ماخذ ہے۔ ملامت کرنے کے معنی میں آتا ہے) اس پورے علاقے میں کاشت ہوتی ہے مگر خاص پیداوار کھجور ہے۔ کھجوروں کے بڑے بڑے باغات ہیں۔ یہاں کے کھجور دور

---

[1] وكانت يثرب ام قرى المدينة وهى مابين طرف قناة الى طرف الجرف ومابين المال الذى يقال له البرنى الى زبالة (وفاءالوفاء ص ۷ ج ۱)

[2] آنحضرت ﷺ نے یہاں قیام فرمایا تو اس کا نام مدینۃ النبی ہو گیا (ﷺ)۔ کثرت استعمال نے مدینۃ النبی کو مختصر کر کے صرف مدینہ کر دیا۔ مگر عاشقان رسول نے محبوب رب العالمین ﷺ کے شہر کے بہت سے نام رکھ ڈالے۔ طابہ، طیبہ، محبوبہ، مبارکہ، عاصمہ، مرزوقہ، قاصمہ، اکالۃ البلدان۔ غرض اس طرح نوے (۹۰) سے زیادہ نام ہو گئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: وفاالوفاء ج ۱

[3] لابہ اور حرہ کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں یعنی ایسا سنگلاخ جس کے پتھر اس طرح کے کالے ہوں جیسے کوئی پرانا پتھر مسلسل کالی چھڑنے سے کالا ہو جاتا ہے۔ (مجمع البحار و قاموس) یہ کئی میل تک چلے گئے ہیں۔ ان پر نہ کاشت ہو سکتی ہے نہ ان پر آبادی ہے۔ فوج بھی ان پر نہیں گزر سکتی۔ یہ دو طرف حفاظت کی قدرتی دیواریں ہیں۔

[4] مجمع البحار و معجم البلدان

[5] معجم البلدان

دور جاتے ہیں۔

(۲)

کم و بیش ایک ہزار سال ❶ پہلے یمن سے اجڑ کر دو بھائی سر زمین حجاز میں داخل ہوئے اور یہاں آکر آباد ہو گئے۔ ان میں سے ایک کا نام "اوس" تھا دوسرے کا نام "خزرج" باپ کا نام حارثہ ماں کا نام قیلہ۔ اس لئے اوس اور خزرج کی اولاد کو بنو قیلہ بھی کہتے ہیں۔ ❷

اب (یعنی آنحضرت ﷺ کے دور مسعود میں) اوس اور خزرج دو قبیلے ہیں جن کی بہت سی شاخیں (بطن) الگ الگ نام سے مشہور ہیں (بنو نجار، بنو ساعدہ، بنو عمرو بن عوف وغیرہ) اس طرح یہ دو قبیلے بہت سے بطنوں میں بٹ گئے۔

یثرب کی آبادی تقریباً چھ ہزار ہے ❸۔ اور اتنی ہی آبادی عوالی اور اسافل کی ہے۔ ان سب کا ایک "دیوتا" ہے۔ "المناۃ الطاغیہ"۔

مشلل، مکہ اور یثرب کے بیچ میں ایک مقام ہے ❹ وہاں اس کا مندر ہے۔ یہ سب المناۃ الطاغیہ کے بھگت ہیں ❺ ۔ مگر اصل تیرتھ کعبہ ہے۔ وہاں ہر سال حج کو جاتے ہیں اور ان بتوں کی بھی پوجا کرتے ہیں۔ جو قریش نے کعبہ میں رکھ رکھے ہیں۔ قریش ان کے مہنت ہیں اور یہ سب ان کے ہم مذہب اور ان کے تابع ہیں۔ ان سب کی نسل بھی ایک ہی ہے کیونکہ یہ بھی حضرت اسماعیل اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مورث اعلیٰ ❻ مانتے ہیں اور اس بنا پر رشتہ داریاں بھی ہیں۔ یہ سب کاشتکار اور زمیندار ہیں۔ عموماً ناخواندہ، جاہل، کسی وقت یہ اس پورے علاقہ کے فرماں روا تھے۔ اس زمانہ کے قلعوں کے اونچے اونچے آثار (کھنڈر) اس وقت بھی موجود ہیں ان کو "اطام یثرب" ❼ کہا جاتا ہے۔

---

❶ سیل عرم سے تباہ ہو کر یا بقول ابن ہشام سیل عرم سے کچھ پہلے اس سیل کے متعلق پیشن گوئی سن کر۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۷ ج ۱

❷ معجم البلدان و فتح الباری وغیرہ

❸ ہجرت کے چوتھے سال غزوہ احزاب میں تین ہزار مسلمانوں نے شرکت کی جبکہ ان میں کئی سو مہاجرین بھی شامل تھے۔ اس سے یہاں کی آبادی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

❹ قدید کے قریب، والقدید اسم موضع قریب بمکہ معجم البلدان

❺ بخاری شریف ص ۲۲۲ و ص ۲۴۱ وغیرہ

❻ احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بخاری شریف ص ۴۹۷ باب نسبۃ الیمن الی اسماعیل علیہ السلام اور قریش سے ان کی رشتہ داری تھی۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اگرچہ ماہرین انساب کا خیال یہ بھی ہے کہ قحطان جو اہل یمن کا مورث اعلیٰ ہے وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اوس اور خزرج بنو اسماعیل یعنی عرب مستعربہ نہیں تھے بلکہ عرب عاربہ تھے۔

❼ مورخین نے بیان کیا کہ یہ قلعے زیادہ تر یہود نے بنائے تھے جب وہ تنہا اس علاقہ میں صاحب اقتدار تھے۔ اوس اور خزرج یہودیوں کے دور اقتدار میں یہاں آئے۔ پہلے یہ صرف دو بھائی تھے پھر ان کی اولاد نے ترقی کی۔ یہود کو حسد ہوا۔ انہوں نے ان کو ختم کر دینا چاہا مگر نتیجہ الٹا نکلا۔ مقابلہ ہوا تو یہود کا اقتدار ختم ہو گیا اور اوس و خزرج کے قبائل اس علاقہ کے حکمراں بن

محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو اس کا نام مدینۃ النبی رکھ دیا گیا۔ پھر کثرت استعمال کے باعث صرف مدینہ (ادام اللہ شرفھا) کہا جانے لگا۔

(۳)

اس علاقہ میں دوسری نسل ❶ بنو اسرائیل ❷ کی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں۔ اور یہودی

گئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو وفاء الوفاء ص ۱۲۵ تا ص ۱۳۴ ج ۱ و معجم البلدان (کچھ تفصیل بعد کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیے۔)

❶ یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بھائی حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے فرزند رشید حضرت یعقوب علیہ السلام تھے ان کو اسرائیل بھی کہا جاتا تھا۔ ان کی اولاد کو بنو اسرائیل کہتے ہیں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام شام میں رہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر میں اقتدار حاصل ہوا تھا تو حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے لڑکے مصر چلے گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک ان کی تعداد کئی لاکھ ہو گئی تھی لیکن اب اقتدار کے بجائے طوق غلامی ان کی گردن میں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر مصر نکلے۔ اول یہ پوری قوم تیہ میں رہی۔ پھر ان کا مرکز شام ہو گیا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں اور مقدمہ سیرۃ مبارکہ۔

❷ مدینہ میں بنو اسرائیل کی آمد اور ان کا اقتدار: ایک روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کے مقابلہ میں کامیابی بخشی اور تیہ میں جا کر مقیم ہوئے تو انہوں نے دوسرے علاقوں میں مجاہدین بھیجنے شروع کئے جو بزور شمشیر اپنے دین کی اشاعت کرتے تھے اور جو ان کے مذہب میں داخل نہ ہوتا اس کو قتل کر دیتے تھے۔ ان مجاہدین کی ایک فوج یثرب بھیجی۔ ایک روایت یہ ہے کہ اہل روم کے حملہ کے وقت کچھ لوگ شام سے یہاں چلے آئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ بخت نصر نے جب یروشلم کو تباہ کیا تب یہ لوگ یثرب آئے۔ بہر حال روایتیں اگرچہ متعدد ہیں مگر علماء تاریخ نے ان کو متضاد قرار نہیں دیا کیونکہ ان سب روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے جانشین کے زمانہ سے ان کی آمد شروع ہوئی اس کے بعد مختلف اوقات میں آمد ہوتی رہی۔ ان سیاسی محرکات اور اسباب کے علاوہ ایک مذہبی محرک بھی بیان کیا گیا ہے کہ کچھ باخدا علماء یہود کو جب توریت کے اشارات سے معلوم ہوا کہ نبی آخر الزماں کا ظہور مدینہ میں ہو گا تو وہ یثرب منتقل ہو گئے کہ اگر ان کو نبی آخر الزماں کی زیارت نہ ہو سکے تو کم از کم ان کی اولاد اس سعادت و شرف سے مشرف ہو سکے گی۔ آنحضرت ﷺ کے ظہور سے پہلے بنو قریظہ یہی کہا کرتے تھے کہ ان کے بزرگ انہیں پیشن گوئیوں کی بنا پر یہاں آ کر قیام پذیر ہوئے تھے۔

عروج: بنو اسرائیل (یہود) نے یہاں کافی ترقی کی۔ اس پورے علاقہ پر وہ چھا گئے۔ حکومت بھی تھی اور دولت بھی اور نسلیں بڑھیں تو بیس اکیس قبیلے ان کے ہو گئے اور شام تک انہیں کی بستیوں کی کثرت ہو گئی۔ وادی قری، تیاء خیبر ان کے اہم اور خاص مرکز تھے۔ اوس اور خزرج یہاں آباد ہوئے تو ان سے معاہدہ کر کے اور ان کے حلیف بن کر آباد ہوئے۔

زوال: یہودیوں میں ایک راجہ (ملک) ہوا جس کا نام فطیون تھا یہ نہایت عیاش اور بدکار تھا۔ اس نے یہ حکم دیا کہ ہر ایک دلہن اس کے عشرت کدہ میں خراج عیش دے۔ یہود نے اس کو گوارا کر لیا مگر جب اوس اور خزرج کی نوبت آئی تو انہوں نے سرتابی کی۔ اس زمانہ میں قبیلہ خزرج کا ایک سردار مالک بن عجلان تھا اس کی بہن کی شادی ہوئی تو وہ عین شادی کے دن گھر سے نکلی اور اپنے بھائی مالک بن عجلان کے سامنے سے بے پردہ گزری۔ مالک کو غیرت آئی وہ اٹھ کر گھر میں آیا اور بہن کو سخت ملامت کی۔ بہن نے کہا ہاں لیکن کل کو جو کچھ ہو گا وہ اس سے بھی سخت ہو گا۔ دوسرے دن جب حسب دستور مالک کی بہن دلہن بن کر فطیون کی خلوت گاہ میں گئی تو مالک بھی زنانہ کپڑے پہن کر سہیلیوں کے ساتھ اندر چلا گیا اور فطیون کو قتل کر کے شام بھاگ گیا۔ یہاں غسانیوں کی حکومت تھی اور ابو جبلہ حکمراں تھا اس کو یہ تکلیف دہ حالات معلوم ہوئے تو وہ لشکر لیکر آیا

کہلاتے ہیں۔ یثرب (مدینہ) کے اطراف میں تین تین چار چار میل کے فاصلہ پر ان کے قبیلے آباد ہیں۔ ان میں سے مشہور یہ تین ہیں: بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ یہ سب خوش حال ہیں۔ ان کی آبادیاں قلعہ نما ہیں۔ شاداب باغات میں گھری ہوئیں ہر طرح سے محفوظ۔ باغات کے علاوہ ان کے تجارتی سلسلے بھی ہیں اور ان کا سودی کاروبار بھی بہت پھیلا ہوا ہے۔ اپنی اپنی حیثیت میں یہ سب قبیلے آزاد ہیں۔ ان کی مجموعی آبادی بھی یثرب کی آبادی کے لگ بھگ ہے۔ ان کے یہاں تعلیم کا انتظام بھی ہے۔ ایک تعلیمی ادارہ "بیت المدارس" کے نام سے قائم ہے جس میں توریت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یثرب کے عام باشندے ان کی تعلیمی برتری سے متاثر ہیں۔ یہاں تک کہ بعض خوش عقیدہ اپنے ہونہار بچوں کو یہود کے حوالے کر دیتے ہیں کہ علمی شائستگی حاصل کر سکیں۔

اوس اور خزرج کبھی بھائی برادر کی طرح رہے ہونگے، مگر اب وہ جنگجو حریف ہیں۔ اور تقریباً سوا سو برس سے برابر لڑائی کا سلسلہ جاری ہے۔ حال ہی میں نہایت خونریز لڑائی ہوئی جو "حرب بعاث" کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار کام آچکے ہیں۔

یہودی ان لڑائیوں میں شریک نہیں ہوتے البتہ ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں۔ پھر ان کی بدحالی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سودی قرض دیکر ان کی بہت سی جائیدادیں قبضہ میں لے چکے ہیں۔

یثرب کے دو لیڈر:

اوس اور خزرج کے بڑے لوگوں میں اب صرف دو باقی رہ گئے تھے۔ عبد اللہ بن اُبَیّ بن سلول۔ قبیلہ خزرج کا رئیس اور لیڈر اور ابو عامر بن صیفی بن نعمان۔ قبیلہ اوس کا رئیس و امیر۔ [1]

یثرب میں آنے والے نبی کا چرچا

توریت کی پیشن گوئیوں کے موجب یہودی ایک آنے والے نبی کے منتظر تھے وہ اس کی علامتیں بھی بیان کیا کرتے تھے۔ ان یہودیوں میں کچھ خاندان وہ بھی تھے جن کے مورث اور اجداد اسی امید پر

اور اوس اور خزرج کو انعامات دیئے اور ایک عام دعوت کر کے روساء یہود کو مدعو کیا اور ان کو قتل کرا دیا۔ اب یہود کا زور ٹوٹ گیا۔ اوس اور خزرج نے قوت حاصل کر لی۔ مگر پھر ان دونوں قبیلوں میں جنگ شروع ہوئی جو سو سال سے زیادہ رہی۔ یہود نے ان کو لڑانے میں بھی اپنی تمام چالبازیاں ختم کر دیں اور ان کو سودی رقم دیکر ننگا بھی کر دیا۔ یہی حالت تھی جب آنحضرت ﷺ کا ظہور ہوا (معجم البلدان ابن ہشام)

[1] وفاء الوفاء ص ۱۵۵ ج ۱

یہاں آکر آباد ہوئے تھے کہ نبی آخر الزماں کا ظہور اس سرزمین میں ہوگا۔ مگر وہ تعصب، گروہ پرستی اور صرف اپنے گروہ کو سب سے اونچا اور خدا کا محبوب سمجھنے کا غلط عقیدہ جو ان کے ذہنوں میں رچا ہوا تھا اور ایک جذبہ بن گیا تھا اس نے اس خوش آئند تصور کو اور اس تمنا کو یقین کا درجہ دے دیا تھا کہ آنے والا نبی انہیں کے گروہ میں سے ہوگا۔ [1] اس سلسلہ میں بہت سی روایتیں بھی گھڑلی تھیں۔ [2] وہ سمجھتے تھے کہ جیسے ہی وہ نبی ظاہر ہوگا ان کا اقبال نقطہ عروج پر پہنچ جائے گا۔ چنانچہ مشرکین یعنی اوس اور خزرج سے کسی بات پر بحث ہوتی یا کسی موقع پر مشرکین کے سامنے زچ ہونا پڑتا تو یہی روایتیں اور پیشن گوئیاں بیان کرکے ان کو مرعوب کیا کرتے تھے کہ "مستقبل کی سربلندی ہمارے لئے ہے"۔ مشرکین اگرچہ ان کے ہم عقیدہ نہیں تھے مگر چونکہ جاہل تھے وہ متاثر ہوجاتے تھے۔ اس طرح ان کے کان آنے والے نبی کے تذکرہ سے ناآشنا نہیں رہے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہی آشنائی ان کے لئے مشعل راہ بنی۔ [3]

یثرب میں آنحضرت ﷺ کا ذکر خیر

اوس اور خزرج کی طویل جنگ نے ایک فریق کو اتنا دبایا کہ اس نے کسی بڑے طاقتور قبیلہ کی مدد حاصل کرنی ضروری سمجھی۔ چنانچہ اس فریق کا ایک وفد زمانہ حج میں مکہ پہنچا اور اس نے قریش کو اپنا مددگار اور حلیف بنانا چاہا۔ یہ وفد اس مقصد میں تو کامیاب نہیں ہوا مگر یہ سعادت اس کو ضرور حاصل ہوگئی کہ اس کے ایک رکن (ایاس بن معاذ) داعی حق کی صداء حق کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ باقاعدہ مسلمان تو نہیں ہوئے مگر دعوت حق کے اثر سے اپنا دامن جھٹک بھی نہیں سکے۔ یہ وفد واپس یثرب پہنچا تو روئیداد سفر میں لامحالہ اس دعوت کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ ایاس اگرچہ آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے انتقال کرگئے، مگر ان کے خاندان والوں کا یقین یہ تھا کہ ان کی وفات اسلام پر ہوئی ہے کیونکہ وفات کے وقت ان کی زبان پر لاالہ الااللہ اور سبحان اللہ الحمد للہ اور اللہ اکبر کے کلمات جاری تھے۔ [4]

---

[1] ان کی یہ دلیل ایک حد تک معقول تھی کہ صدہا سال سے نبوت انہیں کے گروہ میں چلی آرہی ہے یہاں تک کہ جتنے انبیاء علیہم السلام کے نام ان کو معلوم تھے وہ سب اسرائیلی تھے۔ قرآن حکیم نے پوری اہمیت کے ساتھ یہود کے قومی جرائم شمار کراکر اس دلیل کی تردید کی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ یہ درست ہے کہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے تمام طبقات پر فضیلت دی تھی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے ان قومی جرائم نے ان کو اس فضیلت سے محروم کردیا۔ سورہ نساء آیات ۴۴ و ۴۶ و ۵۱ تا ۵۴ و آیات ۱۵۳ تا ۱۶۱ وغیرہ

[2] دیکھو آیت ۱۵۳ سورہ آل عمران

[3] دیکھو آیت ۸۸ سورہ بقرہ

[4] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۵۸ ج ۱

یثرب میں اسلام

اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن عبد القیس مدینہ کے عمائدین میں سے تھے۔ یہ مکہ کے رئیس اعظم عتبہ بن ربیعہ کے پاس مدد حاصل کرنے کیلئے پہنچے۔ عتبہ نے کہا ہم خود عجیب پریشانی میں مبتلا ہیں۔ ہمارے یہاں ایک شخص پیدا ہو گیا ہے، توحید کا قائل ہے، ہمارے دیوتاؤں کی تردید کرتا ہے۔ نمازیں بہت پڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ اس نے ہمارے سارے نظام کو درہم برہم کر رکھا ہے۔ ہمیں خود اپنے سے فرصت نہیں، ہم کسی کی مدد کیا کر سکتے ہیں۔

عتبہ کے اس شکوہ نے نفرت کے بجائے ان دونوں کے دلوں میں محمد ﷺ سے ملاقات کی امنگ پیدا کر دی۔ یہ عتبہ سے رخصت ہوئے۔ ناکہ بندی کی وجہ سے پہنچنا مشکل تھا مگر ان دونوں نے کوشش کی اور کسی طرح آنحضرت ﷺ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ خدمت میں حاضر ہوئے، گفتگو کی، کلام پاک کی آیتیں سنیں، دعوت اسلام کو سمجھا، دماغ صاف تھا، دل صاف تھا، طبیعت حق کی طرف مائل تھی۔ اللہ کے کلام نے اثر کیا اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ مدینہ واپس پہنچے تو حضرت اسعد رضی اللہ عنہ نے اپنے دوست ابو الہیثم بن تیہان سے اپنے مسلمان ہونے کا ماجرا سنایا۔ وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ ان دونوں کے متعلق یہ بھی روایت ہے کہ یہ پہلے ہی سے شرک سے بیزار اور توحید کی طرف مائل تھے۔ [2]

دو بزرگ اور تھے: رافع بن مالک ازرقی اور معاذ بن عفراء، یہ حج یا عمرہ کے لئے مکہ معظمہ آئے۔ اور کسی طرح آنحضرت ﷺ سے تبادلہ خیالات کا موقع مل گیا۔ یہ دونوں بھی اسلام سے مشرف ہو گئے۔ [3]

یثرب کی پہلی جماعت جس نے دعوت اسلام قبول کی

اہل طائف نے جس سعادت کی قدر نہیں کی، اہل یثرب کی خوش نصیبی نے اس کا استقبال کیا۔ طائف سے واپس ہو کر مطعم بن عدی کی پناہ میں آنحضرت ﷺ مکہ معظمہ پہنچے تو حج کہ مہینے شروع ہو چکے تھے۔ مراسم حج ادا کرنے کے دن آئے تو آنحضرت ﷺ نے اپنے دستور کے بموجب قبائل کے کیمپوں اور زائرین کی مجلسوں میں پہنچ کر تبلیغ شروع کی۔ جس سرگرمی سے آپ تبلیغ کرتے تو قریش کا تعاقب اتنا ہی شدید ہوتا تھا۔ خصوصاً ابولہب کی سرگرمی نے دیوانگی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن قدرت کی کار فرمائیوں کا وہ مقابلہ نہ کر سکا۔ اسی گرما گرمی میں کچھ پاک نفوس ایسے بھی نکل آئے جنہوں نے متاع جان اس دعوت کے نذر کر دی۔

یہ یثرب کے چھ یا آٹھ آدمی تھے جو حج کے لئے آئے تھے۔ اور اب مراسم حج کے بموجب ایک جگہ

---

[2] طبقات ابن سعد جلد اول ص ۱۴۶

[3] طبقات ابن سعد جلد اول ص ۱۴۶

سروں کے بال منڈوار ہے تھے۔ آنحضرت ﷺ وہاں پہنچے، کچھ موقع مناسب معلوم ہوا آپ نے اپنی دعوت پیش کرنی شروع کر دی۔ کلام اللہ شریف کی آیتیں تلاوت کیں، سننے والوں کی پاک روحیں متوجہ ہوئیں، ان کے آپس میں کچھ باتیں اشاروں میں ہوئیں:

”یہودی جس نبی کی خبر دیا کرتے تھے معلوم ہوتا ہے یہ وہی نبی ہیں۔ بیشک یہ کلام سچا اور اور یہ دعوت برحق ہے۔ اب ہمیں ہمت کر کے پہل کر دینی چاہئے کہیں ایسا نہ ہو یہودی سبقت کر جائیں اور اقبال مندی کا جو تاج ہمارے سروں کو بوسہ دینے کو تیار ہے، وہ یہودیوں کو میسر آجائے“

اس طرح کی کچھ باتیں ہوئیں۔ پھر سب نے اپنی گردنیں قبول دعوت کے لئے خم کر دیں۔ ان حضرات نے کلمہ شہادت پڑھ لیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میری زندگی کا مقصد اسی دعوت کی اشاعت ہے۔ مکہ کی زمین میرے لئے تنگ ہو گئی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے میں آپ کے ساتھ یثرب چلوں اور یثرب کو دعوت و تبلیغ کا مرکز بنالوں؟ ان حضرات نے عرض کیا: ہم بسرو چشم تیار ہیں، مگر فی الحال آپ کا تشریف لے چلنا مصلحت کے خلاف ہے۔ ہمارے یہاں ابھی ایک سال پہلے بعاث کا نہایت سخت معرکہ ہو چکا ہے، جس کے زخم اب تک ہرے ہیں۔ جذبات برانگیختہ ہیں اور دماغوں میں نفرت بھری ہوئی ہے۔ اس حالت میں آپ کی دعوت صدا بصحرا ہو گی۔ کیونکہ اس وقت دونوں کا جمع ہونا ناممکن ہے۔ آپ کسی بھی فریق سے رابطہ پیدا کریں گے تو دوسرا فریق دشمن بن جائے گا۔ آپ ہمیں موقع دیں۔ ہم یثرب پہنچ کر جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں۔ خدا کرے کوئی اصلاح کی صورت پیدا ہو اور فضا ہموار ہو جائے تو آپ کا تشریف لے چلنا مفید ہو گا۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ سال اسی مقام پر حاضر ہونگے اور امید ہے کہ اس وقت تک ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ آپ کو یثرب آنے کی دعوت دے سکیں۔

بات معقول اور ہمدردانہ تھی، آنحضرت ﷺ نے منظور فرمالی۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں [1]:

(۱) رافع بن مالک (۲) عبادہ بن الصامت (۳) ابو عبد الرحمن یزید بن ثعلبہ (۴) عویم بن ساعدہ (۵) عوف بن حارث بن عفراء (۶) قطبہ بن عامر بن حدیدہ (۷) عتبہ بن عامر بن نابی (۸) جابر بن عبد اللہ بن رئاب۔ (رضی اللہ عنہم)

بیعت عقبہ اولیٰ

وعدہ پورا کرنے کی بہترین مثال ان چھ حضرات نے اپنے عمل سے پیش کی جو گزشتہ سال دائرہ

---

[1] (الف) ابن سعد نے چند روایتیں پیش کی ہیں اور ہر روایت میں کچھ نام شمار کرائے ہیں ہم نے مکرر نام حذف کر دیئے ہیں۔ ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد ص ۱۴۵ تا ص ۱۴۷ ج ۱ (الجزء الاول من کتاب الطبقات فی السیرۃ الشریفہ النبویہ القسم الاول) (ب) ان حضرات میں سے دو بزرگوں کا تعلق اوس سے ہے: ابو عبد الرحمن، یزید بن ثعلبہ اور عویم بن ساعدہ.... (رضی اللہ عنہم) اور باقی چھ حضرات خزرجی ہیں۔ (ج) چھ یا آٹھ کی تعداد میں اگرچہ اختلاف ہے مگر اس پر اتفاق ہے کہ ان سب حضرات نے جو اس وقت بیعت ہوئے تھے راہ خدا میں قتل ہو کر درجہ شہادت حاصل کیا۔ (الاستیعاب ص ۱۷۹ تذکرہ رافع بن مالک)

اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ باہمی نفرت اور بغض وعداوت کے دہکتے ہوئے ماحول میں ان حضرات نے ایسے سلیقہ سے کام کیا کہ معرکہ بعاث کے اشتعال انگیز تذکرہ کے بجائے ہر ایک گھر میں اسلام اور پیغمبر اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ اور جب حج کا زمانہ آیا تو بارہ افراد نے اپنے آپ کو محمد رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا۔ مگر یہ پیشی نہایت رازداری کے ساتھ ہوئی۔

مکہ معظمہ سے چند میل کے فاصلہ پر منیٰ کا میدان ہے جہاں ۱۰ ذی الحجہ سے ۱۳ ذی الحجہ تک زائرین بیت اللہ کا اجتماع ہوا کرتا ہے۔ اس وسیع میدان میں وہ جگہ بھی ہے جس کو عقبہ کہتے ہیں، جو شہر مکہ سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ہے [1] اسی کے قریب ایک گھاٹی میں یہ حضرات جمع ہوتے ہیں۔ چاندنی رات ہے، نور کی چادر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی نورانی فضا میں محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے ہیں جو سراسر نور ہیں ۔ آپ خداء واحد کی پرستش کی دعوت دیتے ہیں سننے والوں کی دلوں کی گہرائیوں سے آمنّا کی صدا بلند ہوتی ہے۔ پھر ان سب سے چھ باتوں کا عہد لیا جاتا ہے:

۱۔ ہم صرف خداءِ واحد کی عبادت کیا کریں گے۔ کسی کو اس کا شریک نہیں مانیں گے۔
۲۔ چوری نہیں کرینگے۔
۳۔ زنا نہیں کریں گے۔
۴۔ اولاد کو قتل نہیں کرینگے۔
۵۔ کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے (جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے)۔
۶۔ آپ جس اچھی بات کا حکم فرمائیں گے ہم اس کی تعمیل کرینگے۔ (نافرمانی نہیں کرینگے) [2]

یہ معاہدہ عمل کرنے کے لئے تھا۔ عمل کرنے کے لئے معلم اور مربی کی ضرورت تھی۔ ان لوگوں نے معلم کی درخواست کی۔ آنحضرت ﷺ نے ایک باعمل معلم کو ان کے ساتھ کر دیا۔ یہ سیدنا حضرت مصعب بن عمیر ہیں۔ دولت مند گھرانے کے چشم و چراغ۔ نازو نعم میں پلے۔ جب گھوڑے پر سوار ہو کر چلا کرتے تھے تو آگے پیچھے ہٹو بچو کہتے ہوئے غلام دوڑا کرتے تھے۔ بدن پر سیکڑوں درہم سے کم کا لباس نہیں ہوتا تھا، جو طرح طرح کے عطر سے معطر ہوتا تھا مگر جب دولت اسلام سے مالامال ہوئے تو دولت دنیا ان کی نظر میں گرد بن گئی۔ روح نے وہ لذت پائی کہ سازوسامان بار لگنے لگا۔ اب معلم خیر کا لباس ایک کمبل تھا۔

مدینہ پہنچ کر حضرت اسعد بن زرارہ کے یہاں ان کا قیام ہوا۔ اس وقت تک جتنا قرآن نازل ہو چکا

---

[1] معجم البلدان
[2] بخاری شریف ص ۵۵۰

تھا وہ لوگوں کو یاد کراتے، سمجھاتے، اس پر عمل کراتے۔ لوگ ان کو مقری[1] کہا کرتے تھے۔

نیا دار ہجرت:

اب تک حبش دار ہجرت تھا۔ اس بیعت کے بعد ایک دار ہجرت کا اضافہ ہو گیا۔ مکہ کو خیر باد کہنے والے اب یثرب آنے لگے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ارادہ ہجرت:

ماہ شوال ختم ہو رہا تھا۔ ذی قعدہ[2] شروع تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ اجازت لینے کے لئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا: کچھ توقف کیجئے ۔امید یہ ہے کہ مجھے بھی ہجرت کی اجازت مل جائے گی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ ارشاد سنا تو تعجب ہوا[3] مکرر دریافت کیا۔ کیا آپ کو یہ توقع ہے میرے ماں باپ آپ پر قربان؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہاں، امید تو یہی ہے ۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے اس سے زیادہ مسرت کی بات کیا ہو سکتی تھی کہ شرف رفاقت حاصل ہو۔ آپ نے اس وقت ارادہ ملتوی کر دیا اور اپنے آقا کے ساتھ سفر کرنے کی تیاری شروع کر دی ۔ فوراً دو عمدہ سانڈنیاں خرید لیں۔[4] اور اس خیال سے کہ نہ معلوم کس وقت حکم ہو جائے ۔ ان سانڈنیوں کو چرواہے کے حوالے نہیں کیا بلکہ گھر پر کھڑا رکھا اور بازار سے چارہ خرید کر کھلاتے رہے۔ اس انتظار میں چار ماہ گزر گئے۔ اس اثناء میں بیعت عقبہ ثانیہ بھی ہوئی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دو سانڈنیاں ہی نہیں خریدیں بلکہ سفر کا نقشہ ذہن میں جما کر ضرورت کی تمام چیزیں فراہم کر لیں۔ حتیٰ کہ سفر میں ایک تحریر لکھنے کی ضرورت پیش آئی تو تحریر کا تمام سامان ساتھ تھا۔ ٹھنڈے پانی کا اور نہ صرف پانی بلکہ آنحضرت ﷺ کو پانی پلانے کے برتن کا بھی یہ انتظام تھا کہ اس کے منہ پر کپڑا باندھا رہتا تھا۔ جیسا کہ سراقہ جعشم کے واقعہ میں آئندہ معلوم ہو گا۔ (انشاء اللہ)

بیعت عقبہ دوم

---

[1] ابن سعد واستیعاب وغیرہ

[2] بخاری شریف وغیرہ کی روایتوں میں یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چار ماہ تک ان سانڈنیوں کو گھر پر رکھ کر چارہ کھلاتے رہے جن کو آپ نے سفر ہجرت کے لئے خریدا تھا۔ سفر ہجرت ربیع الاول کے آغاز میں ہوا تو ان سانڈنیوں کو شوال کے آخر یا ذیقعدہ کے شروع میں خریدا ہو گا۔

[3] ابھی تک بیعت عقبہ ثانیہ نہیں ہوئی تھی جس میں آنحضرت ﷺ کی ہجرت کی گفتگو ہوئی اور حضرات انصار سے عہد لیا گیا۔

[4] بخاری شریف ص ۵۵۳

پچھلے سال چھ مسلمانوں کی کوشش سے یثرب کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا تھا۔ اس سال حضرت مصعب بن عمیر مقری رضی اللہ عنہ کی رہنمائی میں بارہ حضرات نے کوشش کی تو نہ صرف یثرب بلکہ یثرب سے باہر موضع قبا تک اسلام پہنچ گیا۔

اسلام کیا تھا؟ صرف کلمہ توحید پڑھ لینا؟ بیشک قانونی اور فقہی نقطہ نظر سے کسی کو مسلمان قرار دینے کے لئے یہی کافی ہے۔ لیکن سیدنا مصعب بن عمیر جس کا درس دے رہے تھے وہ قانونی نمائش سے بہت بلند تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا مکتب، مکتب عشق تھا۔ یہاں ایثار اور فدائیت کا درس دیا جاتا تھا۔ مشائخ طریقت کے یہاں درجہ فنا آخری منزل ہے یہ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی خانقاہ کا پہلا سبق ہوتا تھا۔

قرآن حکیم نے مومن کی شان یہ بتائی ہے: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ۔۱۶۵) [1]
اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا یؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین [2]

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی دعوت کی خصوصیت یہ تھی کہ جیسے ہی زبان پر کلمہ توحید جاری ہوتا، دل کے خلوت کدہ میں عشق و محبت کی شمع روشن ہو جاتی جو نہ صرف ظلمت دور کرتی بلکہ انانیت کو بھی فنا کر دیتی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یثرب میں تشریف لانے کی دعوت دینا صرف ایک معزز مہمان کو بلانا نہیں تھا بلکہ ایک ہیبت انگیز اور حد سے زیادہ پر خطر اقدام تھا۔ آپ کو تشریف لانے کی دعوت دینا ایک عظیم ترین انقلاب کو دعوت دینا تھا۔ یعنی ایسی حاکمیت کو تسلیم کرنا تھا جس کے مقابلہ میں ہر ایک حاکمیت ختم ہو رہی تھی۔ اوس اور خزرج کے روسا اور شیوخ خصوصاً عبداللہ بن ابی بن سلول رئیس خزرج اور ابو عامر بن صیفی بن نعمان رئیس اوس، جو نہ صرف حاکمیت بلکہ ملوکیت اور بادشاہت کے خواب دیکھ رہے تھے، آپ کا مدینہ تشریف لے آنا ان سب کے لئے پیغام ناکامی تھا، جو ان سب کے لئے مایوس کن تھا، جو ان کی حاکمیت تسلیم کرانے کے لئے ایسے سرگرم اور پرجوش تھے کہ عبداللہ بن ابی بن سلول کے لئے شاہانہ تاج کی تیاری کی فرمائش بھی دے چکے تھے۔ دوسری طرف آپ کی تشریف آوری قریش کی ناکامی تھی اور تشریف آوری کی دعوت دینا قریش جیسی جماعت کے مقابلہ پر سینہ سپر ہونا تھا، جس کی عظمت کی چھاپ ہر ایک عربی بولنے والے کے دل پر تھی اور جس کی ناکامی پورے عرب کی ناکامی تھی۔ اس کے علاوہ اقتصادی مسائل بھی نہایت اہم تھے۔ مثلاً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار جو اہل و عیال کو ساتھ لے کر آئیں گے ان کی ضروریات زندگی کس طرح فراہم ہوں گی۔

---

[1] جو ایمان لائے وہ بہت مضبوط ہوتے ہیں اللہ کی محبت میں

[2] کوئی مومن کہلانے کے لائق نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کو باپ اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

یہ تمام مسائل تھے۔ جو ایمان لانے والے تھے وہ دانشمند تھے۔ ان تمام باتوں کو سمجھتے تھے، مگر ان کے ایمان کی حرارت اس طرح کے تمام خطرات کے لئے برق خرمن سوز تھی:

عشق چوں خام ست باشد بستہ ناموس و ننگ
پختہ مغزان جنوں را کے حیا زنجیر پا ست
با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش ست
ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش

یہ نو مسلم تھے ان کا اسلام نیا تھا۔ مگر یہ نیا اسلام سراسر عشق تھا، جس نے محبوب کے لئے ہر ایک قربانی اور ایثار کو محبوب بنادیا تھا:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

حج کا زمانہ آیا۔ اوس اور خزرج کے تقریباً پانچ سو افراد حج کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ اہل ایمان بھی اس عزم کے ساتھ روانہ ہوئے کہ محبوب رب العالمین کو دعوت دیں کہ وہ مکہ کی خشک پہاڑیوں کو خیر باد کہیں اور یثرب کے سبزہ زار کو ایمان کا کشت زار بنائیں۔ لیکن یثرب کے سربراہ جو قریش کے ہم مشرب و ہم نوا تھے اس جرائت کیلئے تیار نہیں تھے جس میں قریش سے براہ راست تصادم تھا لہذا ان فداکاروں نے اپنے منصوبہ کو پوشیدہ رکھا۔ ان کی تعداد تہتر تھی۔ [1] ان میں دو عورتیں تھیں تیس نوجوان باقی ادھیڑ عمر

۔

مکہ پہنچ کر بھی اس منصوبہ کو راز ہی رکھا اور رازداری کے ساتھ ہی تاریخ، وقت اور مقام طے کیا گیا

۔

۱۱ ذی الحجہ [2] کی رات چاند آدھی مسافت طے کرچکا لوگ سو گئے تو طے کردہ خفیہ قرار داد کے بموجب اسلام کے یہ جاں نثار فرداً فرداً روانہ ہوئے۔ [3] اور اسی گھاٹی میں پہنچے جہاں گزشتہ سال بیعت ہوئی تھی۔ سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ وہاں رونق افروز ہو چکے تھے۔
یہ بھی خواجہ ابو طالب کی طرح آنحضرت ﷺ کے سچے بہی خواہ، محافظ اور جان چھڑکنے والے

[1] ابن ہشام ص ۲۶۶ ج ۱ ابن اسحاق نے ان کے نام بھی شمار کرائے ہیں ص ۲۷۳ تا ص ۲۷۹ ج ۱

[2] وسط ایام التشریق لیلۃ النفر الاول اذا ھدأت الرجل (ابن سعد ص ۱۴۹ ج ۱) فتسلل تسلل القطا مستخفین (ابن ہشام ص ۲۶۶ ج ۱)

[3] سب سے پہلے رافع بن مالک زرقی رضی اللہ عنہ باریاب ہوئے۔ ابن سعد ص ۱۴۹ ج ۱

مددگار تھے اور اگرچہ عمر میں صرف دو سال بڑے تھے مگر خود کو اپنے عزیز بھتیجے کا سرپرست سمجھتے تھے [1] اور تجارتی کاروبار کے باعث باہر آنا جانا رہتا تھا تو قبائل سے واقف تھے، شیوخ قبائل سے تعلقات تھے ان کو جانتے پہچانتے تھے۔ اس تعارف کے ساتھ خوبی یہ تھی کہ بات کرنے کا بھی اچھا سلیقہ تھا۔ چنانچہ جب آنے والے آگئے تو سلسلہ کلام آپ نے ہی شروع کیا:

آپ جس ارادہ سے آئے ہیں یقین ہے کہ اس کی ذمہ داری کا بھی آپ صاحبان نے بخوبی اندازہ کرلیا ہو گا۔ محمد کی حمایت پورے عرب کی مخالفت ہے۔ محمد اپنے خاندان کے سب سے زیادہ باعزت رکن ہیں۔ خاندان کا ہر فرد ان کی حفاظت کے لئے سر بکف رہتا ہے جو ان کے ہم نوا ہو گئے ہیں وہ ہم نوائی کی وجہ سے اور جو ان کے ہم نوا نہیں ہوئے ہیں وہ خاندانی حمایت، قرابت اور خود ان کے اخلاق و کردار کی وجہ سے ان کے جاں نثار ہیں۔ محمد کی حفاظت سے ہم نہ اکتائے ہیں نہ تھکے ہیں۔ محمد نے خود ہی آپ کی دعوت منظور کی ہے اور وہ ہم سے الگ ہو کر آپ کے یہاں جانا چاہتے ہیں۔

آپ پوری طرح غور کرلیں، اپنی طاقت اور ہمت کا موازنہ کرلیں۔ پورے عرب کی متحدہ طاقت سے آپ کو مقابلہ کرنا ہو گا۔ سارا عرب ایک کمان سے آپ پر پتھر برسائے گا۔ کیا آپ میں مقابلہ کی طاقت ہے؟ آپ صاحبان کو لڑائیوں کا تجربہ ہے؟ کیا آپ لوگ نامعلوم مدت تک پامردی اور استقلال سے پورے عرب کے مقابلے میں ثابت قدم رہ سکیں گے؟ صاف بات اچھی ہوتی ہے پوری طرح سوچ لو جدا ہونے سے پہلے پختہ فیصلہ کرلو۔ بعد کی شرمندگی سے اس وقت کی صاف بات ہزار درجہ بہتر ہے۔ [2]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی بات ختم ہوئی تو حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ [3] نے مجمع کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا: آپ نے جو فرمایا ہم پہلے سے ہی سمجھے ہوئے ہیں۔ ہم وفاداری، سچائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں اپنی جانیں قربان کردینے کا عزم مصمم لے کر یہاں آئے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں حضرت والا (جن کے لئے سر ہتھیلی پر رکھ کر ہم یہاں آئے ہیں) وہ خود فرمائیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

---

[1] تعمیر کعبہ کے وقت جب پتھر ڈھو رہے تھے تو آپ نے اسی بزرگانہ شفقت کی وجہ سے بھتیجے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائش کی تھی کہ لنگی کھول کر مونڈھے پر رکھ لیں تاکہ پتھر کی رگڑ نہ لگے۔

[2] ابن سعد ص ۱۴۹ ج ۱

[3] یہ سب سے زیادہ سن رسیدہ اور اپنی جماعت کے سردار تھے۔ سیدنا و کبیرنا (کعب بن مالک رضی اللہ عنہ) (سیرۃ ابن ہشام ص ۲۶۴ ج ۱) مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری سے ایک ماہ پہلے وفات پا چکے تھے (فتح الباری)

لطیفہ: جب یہ حضرت (براء بن معرور رضی اللہ عنہ) یثرب سے روانہ ہوئے تو راستہ میں سوال یہ پیدا ہوا کہ نماز کس رخ پر پڑھنی چاہئے۔ شام کا رخ کرکے یا کعبہ کا رخ کرکے۔ سب کی رائے ہوئی کہ شام کی طرف۔ مگر حضرت براء رضی اللہ عنہ نے طے کیا کہ وہ کعبہ کی طرف نماز پڑھا کرینگے۔ راستہ بھر یہی رہا کہ ساتھی شام کی طرف نماز پڑھتے رہے اور یہ کعبہ کی طرف۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے استفسار کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کی طرف نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ (سیرۃ ابن ہشام ۲۶۴-۲۶۵ ج ۱)

آنحضرت ﷺ نے کلام پاک کی چند آیتیں تلاوت فرمائیں، پھر فرمایا: میں

(الف) اپنے رب (پروردگار) کے لئے یہ چاہتا ہوں کہ صرف اُسی "وحدہ لاشریك لہ" کی عبادت کرو۔ اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔

(ب) اپنی ذات اور اپنے صحابہ (ساتھیوں) کے لئے یہ چاہتا ہوں کہ ہمیں رہنے کو جگہ دو، ہماری مدد کرو اور جس طرح تم اپنی جانوں کی حفاظت کرتے ہو ہماری بھی حفاظت کرو۔

ایک روایت میں ہے کہ جس طرح اپنے بچوں اور عورتوں کی حفاظت کرتے ہو ہماری حفاظت کرو۔
مجمع نے دریافت کیا: ہمیں کیا ملے گا، [1] فرمایا: "جنت" [2]
اس کے بعد جوابی تقریریں شروع ہوئیں۔

(۱) سید القوم حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے دست مبارک پر اپنا ہاتھ رکھا اور عرض کیا: یقیناً ہم اسی طرح حفاظت کرینگے۔ ہم کسی کے مقابلہ سے جان چرانے والے نہیں ہیں۔ (ہم ابناء الحروب ہیں) لڑائیوں کی گود میں پلے ہیں۔ آباؤاجداد سے یہی ترکہ میں ملا ہے۔

(۲) عباس بن عبادہ بن نضالہ انصاری رضی اللہ عنہ مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

حضرات! آپ سمجھتے ہیں کیا ہو رہا ہے۔ ہم عہد کر رہے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی حمایت میں پوری دنیا کا مقابلہ کرینگے۔ ہر ایک گورے اور کالے کے مقابلے میں سینہ سپر ہونگے، جانیں قربان کرینگے۔ مال لٹائیں گے۔ ہمارے سردار مارے جائیں گے، کیا ہم تیار ہیں؟ اگر ایسا نہ کر سکیں تو کل کے بجائے آج الگ ہو جائیں۔ آج دامن بچا لینا کل کی رسوائی سے بہت بہتر ہے۔

(۳) حضرت ابو الہیثم تیہان: یارسول اللہ! گستاخی معاف۔ ایک بات واضح کرنی ہے: یہودیوں اور دوسرے قبائل سے ہمارے تعلقات ہیں۔ یہ تعلقات اب باقی نہیں رہیں گے۔ مگر ایسا تو نہ ہو گا کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب فرمادے آپ ہمیں چھوڑ کر اپنے لوگوں میں چلے جائیں۔

آنحضرت ﷺ نے یہ الفاظ سنے تو مسکراتے ہوئے فرمایا:

یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کا خون میرا خون، آپ کی ناکامی میری ناکامی، میں آپ کا آپ میرے، جن سے تمہاری جنگ ان سے میری جنگ، جن سے تمہاری صلح ان سے میری صلح۔

اس کے بعد سلسلہ بیعت شروع ہوا۔ حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے بیعت کی۔ [1]

---

[1] مسند امام احمد ص ۴۶۰ ج ۳ و سیرۃ ابن ہشام ص ۲۶۶ ج ۱

[2] کسی دنیاوی ترقی یا برتری کا وعدہ نہیں ہے جو کچھ ہو آخرت کے لئے ہو۔ صرف اسی کا وعدہ ہے اور یہی نصب العین ہے۔ محمد میاں عفی عنہ

[1] ابن اسحاق کا بیان ہے کہ بنو نجار کا دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے حضرت اسعد بن زرارہ نے بیعت کی اور بنو عبد الاشہل کہتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت ابو الہیثم بن تیہان نے بیعت کی۔ مگر ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ حضرات بہت پہلے مسلمان

بیعت میں اسی عہد کو دہرایا گیا❷ وپہلی بیعت (عقبہ اولیٰ) کی بیعت کے وقت کیا گیا تھا کہ (۱) خداواحد کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرینگے (۲) اللہ کا کسی کو شریک نہیں گردانیں گے (۳) چوری نہیں کرینگے (۴) زنا نہیں کرینگے (۵) اپنی اولاد کو قتل نہیں کرینگے (۶) کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے، جس اچھی بات کا حکم کیا جائے گا تعمیل کرینگے (نافرمانی نہیں کرینگے)۔

اس کے علاوہ یہ بھی عہد لیا گیا:

(۷) کسی کو ناحق قتل❸ نہیں کرینگے (۸) لوٹ نہیں ڈالیں گے❹ (۹) ہر موقع پر حق بات کہیں گے، کسی کی مذمت و ملامت کا خوف ہمیں کبھی بھی حق بات کہنے سے نہیں روک سکے گا۔ (۱۰) جب رسول اللہ ﷺ یثرب تشریف لے آئیں گے تو اپنی اولاد اور خود اپنی جانوں کی طرح ان کی حفاظت کرینگے۔❶ ان سب باتوں کا بدلہ جنت ہو گا۔❷

ہو چکے تھے اس وقت ان حضرات نے مکرر بیعت کی۔ نئے بیعت کرنے والوں میں اس وقت حضرت براء ہی تھے رضی اللہ عنہم، واللہ اعلم بالصواب۔

❷ سورہ ممتحنہ میں آنحضرت ﷺ کی فرمائش کی گئی ہے کہ جو عورتیں ہجرت کر کے آئیں ان سے آپ بیعت لیجئے۔ اس بیعت میں انہیں چھ چیزوں کا تذکرہ ہے۔ اس مناسبت سے اس بیعت کو بیعت نساء کہتے ہیں۔ مردوں سے اس موقع پر انہیں باتوں کا عہد کرایا گیا۔ اس کے بعد بہت سے موقع آئے ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے خاص اس موقع کے لحاظ سے صحابہ کرامؓ سے بیعت لی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ اس پر بیعت لی اور عہد کرایا کہ کسی سے کوئی سوال نہیں کرینگے۔ ایک مرتبہ اس پر بیعت لی کہ ہر ایک کے حق میں خیر خواہی کرینگے۔ (بخاری شریف ص ۱۳) یا مثلاً حدیبیہ کے موقع پر بیعت لی گئی، جس کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے کہ مر جائیں گے مگر میدان سے نہیں ہٹیں گے۔

❸ ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق ولا ننتہب ولا نعصی۔ بخاری شریف ص ۵۵۰۔ ۵۵۱

❹ یاد رکھئے غنیمت کو لوٹ نہیں کہا جا سکتا۔ لوٹ کو آنحضرت ﷺ نے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے۔ جس طرح مثلہ (ناک کان کاٹ ڈالنے) سے منع فرمایا ایسے ہی (لنھبہ) لوٹ سے منع فرمایا: اس پر بیعت لی کہ لوٹ نہیں ڈالیں گے۔ (بخاری شریف ص ۳۳۶) لوٹ ڈالنے والے کے متعلق فرمایا: لیس منا سیکا (ابوداؤد شریف) گویا وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ لوٹ کا مقصد ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ خوف خدا اجتماعی نظم یا امانت اور دیانت کا کوئی ضابطہ لوٹ میں نہیں ہوتا۔ غنیمت میں یہ تمام باتیں شرط ہوتی ہیں۔ غنیمت میں جو کچھ لیا جاتا ہے وہ پوری احتیاط اور دیانتداری کے ساتھ جمع کرایا جاتا ہے۔ ایک شخص میدان جنگ میں مارا گیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ھوفی النار (یہ دوزخ میں گیا)۔ صحابہؓ کو تعجب ہوا۔ سامان کی تلاشی لی تو ایک عبا (اچکن) برآمد ہوئی جو مال غنیمت میں سے بلا اجازت اس شخص نے رکھ لی تھی۔ (بخاری شریف ص ۴۳۲) انتہا یہ کہ جوتہ کے تسمہ کے متعلق بھی یہی ارشاد ہوا شراك وشراكين من نار (بخاری شریف ص ۶۰۸) غنیمت کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ غنیمت کے مال کو سرکاری طور پر ضبط کر لینے کا نام غنیمت ہے۔ کچھ ناآشنا ادب مصنف جو بظاہر اپنا درجہ حضرات صحابہؓ سے کم رکھنا نہیں چاہتے وہ غنیمت کے لئے بلا تکلف لوٹ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ معاذ اللہ

❶ بیہقی بحوالہ البدایہ والنہایہ ص ۱۶۳

❷ بخاری شریف ص ۵۵۱

بارہ نقیب:

آنحضرت ﷺ نے اس جماعت میں بارہ نقیب منتخب فرمائے تا کہ حالات [3] کی نگرانی رکھیں۔ ان کے نام خود انصار نے پیش کئے تھے۔ ان میں سے نو خزرج کے تھے اور تین اوس کے۔ بروایت ابن اسحاق [4] ان کے نام یہ ہیں:

ابو امامہ، اسعد بن زرارہ، سعد بن ربیع، عبد اللہ بن رواحہ، رافع بن مالک، براء بن معرور، عبد اللہ بن عمرو حرام، عبادہ بن صامت، سعد بن عبادہ، منذر بن عمرو بن خنیس، اسید بن حضیر، سعد بن خیثمہ، رفاعہ بن عبد المنذر (رضوان اللہ علیہم اجمعین)

جلسہ ختم ہوا۔ سب حضرات اپنی اپنی قیام گاہوں پر خاموشی سے واپس ہوگئے۔ طے یہ ہوا کہ صبح سویرے الگ الگ اپنی اپنی قیام گاہ سے مدینہ روانہ ہو جائیں گے۔

حضرات نقباء کا تعارف اور مختصر حالات

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ:

کنیت ابو امامہ۔ یہ سب سے کم عمر تھے مگر اسلام میں سب سے مقدم، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ سب سے پہلے یثرب میں اسلام کا تعارف انہیں کے ذریعے ہوا۔ پھر ہر بیعت کے موقع پر حاضر اور ہر بیعت میں شریک رہے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مبلغ اور معلم بن کر آئے تو انہیں کے یہاں قیام رہا۔ دعوت و تبلیغ میں ان کے شریک رہے۔ نماز جمعہ کا سلسلہ بھی آپ ہی نے شروع کیا۔ مگر عمر نے وفا نہیں کی۔ ابھی مسجد نبوی کی تعمیر ہو رہی تھی کہ وفات ہوگئی۔ آنحضرت ﷺ بار بار مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے۔ علاج میں بھی شریک مشورہ رہے۔ آنحضرت ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد مدینہ میں سب سے پہلے انہیں کی وفات ہوئی۔ خود آنحضرت ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ یہ سب سے پہلی نماز جنازہ تھی جو پڑھائی گئی۔ (الاستیعاب و اصابہ) یہودیوں نے طعنہ دیا کہ محمد اپنے ساتھی کو بچا نہ سکے تو اور کیا کر سکیں گے۔ (مسند احمد)

حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ:

---

[3] لیکونوا نقباء علی قومهم بما فیهم (ابن ہشام ص ۲۶۷ ج ۱)

[4] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۶۷ ج ۱ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے ایک قصیدہ میں ان سب ناموں کو جمع کر دیا ہے (ص ۲۶۸ ج ۱ ابن ہشام)

آنحضرت ﷺ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ مہاجر سے مواخاۃ (برادرانہ رشتہ قائم فرمایا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے مہاجر بھائی سے کہا کہ میں انصار میں سب سے زیادہ خوش حال اور صاحب جائیداد ہوں۔ آدھی جائیداد آپ کی ہے اور میری دو بیویاں ہیں ان میں سے جس کو آپ مناسب سمجھیں مجھے بتادیں، میں طلاق دیدوں گا آپ نکاح کرلینا۔ عبدالرحمن نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ آپ کے اہل اور مال میں برکت دے۔ مجھے تو (زیادہ چلنے والا) بازار بتادیجے۔ میدان احد میں معرکہ ٹھنڈا ہوا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سعد بن ربیع کو تلاش کرو۔ یہ میدان میں پڑے ہوئے تھے۔ بارہ زخم جسم مبارک پر تھے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جو تلاش کرنے گئے تھے ان سے کہا کہ آقا دوجہاں سے میرا اسلام عرض کردینا اور مسلمانوں کو یہ پیغام پہنچادینا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ رہ گیا اور سرتاج دوعالم شہید ہوگئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی کوئی معذرت قابل قبول نہیں ہوگی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کی صاحبزادی آئیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر بچھادی۔ اس پر ان کو بٹھایا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا یہ ان کی صاحبزادی ہیں جو مجھ سے بھی بہتر تھے اور تم سے بھی۔ وہ آنحضرت ﷺ کے سامنے راہ خدا میں قربان ہوگئے اور میں بھی زندہ ہوں اور تم بھی زندہ ہو (الاصابہ)

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ:

شاعر تھے۔ ان کے ترانے بڑے شوق سے سنے جاتے تھے اور پڑھے جاتے تھے۔ خود آنحضرت ﷺ کو بھی دلچسپی ہوتی تھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب آنحضرت ﷺ حسب معاہدہ عمرہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے تو مکہ میں آنحضرت ﷺ کے آگے آگے یہ ترانہ پڑھتے جارہے تھے:

خلوابنی الکفار عن سبیلہ   الیوم نضربکم علی تنزیلہ
ضرباً یزیل الھام عن مقیلہ   ویذھل الخلیل عن خلیلہ

ترانہ کا مفہوم یہ ہے کہ "کافر بچو! راستہ سے ہٹ جاؤ، آج ہم بزور شمشیر اپنے آقا کو یہاں اتاریں گے، ہماری شمشیر زنی ایسی ہوگی جو کھوپڑیوں کو گردنوں سے اڑادے گی اور دوست کو دوست سے جدا کردیگی"۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت مقداد بن الاسود سے رشتہ اخوت قائم کیا تھا۔ وہ بھی ایسے ہی جوشیلے تھے۔ جاں باز عبداللہ بن رواحہ نے غزوہ موتہ میں جام شہادت نوش کیا۔ رضی اللہ عنہ۔

حضرت رافع بن مالک رضی اللہ عنہ:

مدینہ کے سب سے پہلے مسلمان ہونے والے ہیں۔ پہلی بیعت میں بھی شریک تھے جس میں چھ یا آٹھ آدمیوں نے بیعت کی تھی، پھر بارہ اور ستر میں بھی شریک تھے۔ جتنا قرآن اس وقت تک نازل ہوا تھا سب حفظ کر لیا تھا۔ غزوہ احد میں درجہ شہادت حاصل کیا۔ (استیعاب واصابہ)

حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ:

جب یہ قافلہ مکہ جارہا تھا تو راستہ میں اور ساتھیوں نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی مگر انہوں نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی۔ آنحضرت ﷺ ابھی ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لائے تھے کہ ان کی وفات ہوگئی مگر وفات کے وقت وصیت کر دی کہ ترکہ کا ایک ثلث آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے صاحب خیر ہیں جنہوں نے تہائی ترکہ کی وصیت کی۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ:

غزوہ بدر میں شریک نہیں ہو سکے، بہت صدمہ ہوا، غزوہ احد ہوا تو تمنا پوری ہوئی۔ بیٹے کو بٹھا کر رات ہی کو سمجھا دیا۔ مجھے امید ہے کہ میں کل کو سب سے پہلے جان فدا کروں گا۔ آنحضرت ﷺ کے بعد مجھے سب سے زیادہ تم محبوب ہو۔ تم سب سے پہلے میرا قرض ادا کرنا اور اپنی بہنوں کا خیال رکھنا بہنیں سات تھیں۔ جابر ان کے سعادت مند صاحبزادے تھے۔ یہودی کا قرض تھا۔ خیال تھا کہ باغ کے پھل سے قرض ادا نہیں ہو سکے گا، لہٰذا کچھ اب وصول کر لے کچھ بعد میں۔ مگر یہودی راضی نہیں ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے سفارش کی تب بھی راضی نہیں ہوا۔ آنحضرت ﷺ باغ میں تشریف لے گئے ٹوٹے ہوئے کھجوروں کے ڈھیر پڑے تھے، ان سب کے پاس پہنچ کر ملاحظہ فرمایا: پھر حکم دیا کہ تمام قرض ادا کردو۔ یہ آنحضرت ﷺ کی برکت تھی کہ تمام قرض ادا کر دیا۔ اور کھجوروں کے ڈھیر جوں کے توں باقی رہ گئے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ:

آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے برادرانہ رشتہ قائم فرمایا۔ تمام معرکوں میں شریک رہے۔ سنہ ۴۵ھ میں وفات ہوئی۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ:

قبیلہ خزرج کے سردار، رئیس گھرانے کے چشم و چراغ بہت بڑے حوصلہ مند سخی، باپ دادا بھی ایسے ہی رئیس اور سخی تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے گھر کو بیت جود فرمایا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو انہوں نے بیعت نہیں کی مگر کوئی مخالفت بھی نہیں کی بلکہ وطن چھوڑ کر شام چلے گئے۔ حوران میں قیام کیا وفات دفعۃً ہوگئی، غسل خانہ میں مردہ پائے گئے۔ یہ سنہ ۱۱ھ کا واقعہ ہے یا ۱۴ھ یا ۱۵ھ کا (علیٰ اختلاف الاقوال) الاستیعاب

حضرت منذر بن عمرو بن خنیس رضی اللہ عنہ:

آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے برادرانہ رشتہ قائم فرمایا۔ بیر معونہ کے حادثہ میں شہید ہونے والے ستر حضرات جو اس موقع پر شہید کئے گئے وہ انہیں کی قیادت میں سفر کر رہے تھے (الاستیعاب و بخاری وغیرہ) یہ سب حضرات خزرجی تھے قبیلہ اوس کے یہ تین حضرات تھے مندرجہ ذیل

حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ:

قبیلہ اوس کے سردار بہت بڑے سخی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ۲۰ھ یا ۲۱ھ میں وفات ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے وصی تھے۔ چار ہزار دینار قرض چھوڑا، جس کو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے باغ کی آمدنی سے ادا کیا۔ (الاستیعاب) غزوہ بدر میں مشیر خاص تھے۔

حضرت سعد بن حیثمہ رضی اللہ عنہ:

جب آنحضرت ﷺ کا قباء میں قیام تھا تو عام نشست ان کے یہاں ہوئی تھی۔ جو حضرات مہاجرین تن تنہا آئے تھے وہ بھی انہیں کے یہاں ٹھرتے تھے۔ جب غزوہ بدر کے موقع پر آنحضرت ﷺ روانہ ہونے لگے تو باپ (خثیمہ) اور بیٹے سعد نے طے کیا کہ ہم میں سے ایک مکان پر رہے ایک ساتھ جائے، پھر باپ بیٹے میں بحث ہوئی کہ کون ساتھ جائے۔ بحث ختم کرنے کے لئے قرعہ ڈالا تو قرعہ میں بیٹے (حضرت سعد رضی اللہ عنہ) کا نام نکلا۔ باپ نے بیٹے سے اپیل کی کہ اپنا حق مجھے دیدیں اور مجھے جانے دیں تو بیٹے نے کہا کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں آپ کے لئے اپنا حق بخوشی چھوڑ دیتا مگر یہ راہ خدا میں قربان ہونے اور رضا مولیٰ حاصل کرنے کا معاملہ ہے اس میں تو میں اپنا حق نہیں چھوڑ سکتا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ گئے اور جام شہادت نوش جان کیا۔ (رضوان اللہ علیہم اجمعین)

حضرت رفاعہ بن عبد المنذر رضی اللہ عنہ:

ابولبابہ کنیت، یہ کنیت ہی سے مشہور ہیں ۔غزوہ بدر اور غزوہ سویق کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ تشریف لے گئے تو انہیں کو مدینہ کا ناظم امور (والی) بنا گئے۔ غزوہ خندق کے بعد بنو قریظہ کا مسئلہ پیش ہوا۔ جنہوں نے غزوہ خندق کے وقت غداری کی تھی۔ بنو قریظہ منتظر تھے کہ ان کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائیگا۔ ابولبابہ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا تو انہوں نے گردن کی طرف اشارہ کیا کہ سب غداروں کو قتل کیا جائے گا۔ پھر احساس ہوا کہ میں نے راز فاش کر دیا تو مسجد شریف میں آکر اپنے آپ کو کھمبے سے باندھ دیا اور کھانا پینا سب بند۔ نماز کے وقت ان کی صاحبزادی آکر ان کو کھول دیتی تھیں تو نماز میں شریک ہو جاتے تھے ۔ چھ روز تک اور بعض روایتوں کے بموجب چودہ پندرہ دنوں تک اسی طرح بندھے رہے۔ پھر سورہ توبہ نازل ہوئی، آپ کو بشارت دی گئی اور کھولنے کا ارادہ کیا گیا۔ آپ نے منع کر دیا کہ میں قسم کھا چکا ہوں کہ جب تک آنحضرت ﷺ خود نہ کھولیں گے میں نہیں کھولوں گا ۔ چنانچہ خود سرور کائنات ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ان کو کھولا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کی وفات ہوئی۔ بغیر کھائے پیئے بندھے رہنے کا اثر ظاہری جسم پر یہ پڑا کہ قوت سماعت ختم ہو گئی تھی۔ (الاستیعاب)

قریش کا تعاقب:

یہ اجلاس جو پہاڑ کی گھاٹی میں ریت کے فرش پر چاند کی چاندنی میں کیا گیا تھا بہت ہی خفیہ تھا۔ جانے والے بھی ایک ایک کر کے گئے تھے۔ اسی طرح نہایت خاموشی سے واپس ہوئے۔ لیکن پچھتر آدمیوں کی نقل و حرکت چھپنے والی نہیں تھی۔ لوگوں نے بھانپا، کچھ بھنک قریش کے کانوں میں بھی پڑی۔ فوراً دوڑے اور جیسے ہی صبح ہوئی تحقیقات شروع کر دی۔ اہل مدینہ کے خیموں میں پہنچے اور کہا :

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ اس لئے آئے ہیں اور کوئی ایسا معاہدہ کر چکے ہیں کہ اس صابی (آنحضرت ﷺ) کو اپنے ساتھ لے جائیں گے اور ہمارے مقابلہ پر محاذ قائم کرینگے۔ ہم آگاہ کئے دیتے ہیں محمد کو لے جانا ہمارے لئے چیلنج ہو گا۔ طاقت آزمائی ہو تو ایسا کر لو۔"

رؤسا مدینہ عبداللہ بن ابی بن سلول وغیرہ سے قریش کے تعلقات تھے انہیں سے تعارف تھا۔ انہیں سے تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا گیا اور انہیں سے یہ باتیں کہی گئیں۔ ان میں سے کوئی بھی اس بیعت میں شریک نہیں ہوا تھا نہ ان کو خبر تھی، انہوں نے قسمیں کھا کھا کر انکار کیا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول نے کہا: میری قوم اگر ایسا کرتی تو وہ یقیناً مجھ سے مشورہ کرتی ورنہ کم از کم خبر ضرور دیتی۔ یہ ممکن نہیں میری اطلاع کے بغیر کوئی ایسا عمل ہو جائے۔ یہ انکار کرنے والے سچے تھے لیکن بیعت کرنے والوں کو فکر تھی کہ ان سے دریافت کیا گیا تو کیا جواب دینگے ۔ وہ خاموش تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ دفعتہً حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی نظر ایک قریشی رئیس زادے حارث بن ہشام مخزومی کی نئی جوتیوں پر پڑ

گئی جو قیمتی اور خوبصورت تھیں۔ انہیں مذاق کرنے اور لوگوں کی توجہ ہٹانے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے عبداللہ بن ابی بن سلول کو مخاطب کر کے کہا: دیکھئے جوتیاں ایسی ہونی چاہئیں۔ آپ رئیس مدینہ اور قوم کے سردار ہیں۔ آپ بھی ایسی ہی جوتیاں پہنا کیجئے۔ اس مزاحیہ فقرہ کو حارث نے طنز سمجھا۔ اس نے دونوں جوتیاں نکال کر کعب رضی اللہ عنہ کی طرف پھینک دیں۔ لو تم پہنو ضرور پہنو خدا کی قسم ضرور پہنو۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی نے دیکھا کہ حارث کو ناگواری ہوئی تو اس نے مجھے ڈانٹا: تم نے خواہ مخواہ ان کو ناراض کر دیا۔ ان کی جوتیاں واپس کر دو۔ میں نے کہا یہ دے چکے ہیں اب میں واپس نہیں کروں گا اور دل میں سوچا یہ فال نیک ہے عنقریب وہ وقت آئے گا کہ میں ان تکلفات کو ان لوگوں سے ختم کر دوں گا۔

بہر حال اس طنز اور مذاق میں اصل بات رل گئی ہماری جان بچ گئی۔ ہم سے کسی نے نہیں پوچھا۔ جب یہ لوگ ہمارے خیموں سے باہر نکل گئے تو طے شدہ پروگرام کے بموجب بیعت کرنے والے حضرات نے کھسکنا شروع کیا۔ قریش کو پھر احساس ہوا۔ وہ پھر دوڑے۔ مگر ہم سب نکل چکے تھے۔ دو آدمی کسی طرح باقی رہ گئے تھے ان کو راستہ میں پکڑ لیا۔ یہ قبیلہ خزرج کے رئیس سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھے اور اسی قبیلہ کے دوسرے صاحب منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ۔ یہ دونوں نقیب بھی منتخب ہوئے تھے۔ حضرت منذر رضی اللہ عنہ پھر بھی کسی طرح بچ کر نکل آئے لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نہ نکل سکے۔ اونٹ کے کجاوہ میں سے چمڑہ کا تسمہ نکال کر ان کی مشکیں کس دیں ان کے سر پر بڑے بال تھے۔ مارتے پیٹتے اور ان کے بڑے بال کھینچتے ہوئے مکہ میں لے گئے۔ وہاں لوگوں نے بہت ذلیل کیا، مارا پیٹا، کسی نے منہ پر بھی تھوک دیا۔

انہیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص آیا، بظاہر نہایت سنجیدہ نیک خصلت، شریف صورت تھا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ مجھ پر رحم کرے گا اور میری جان چھڑا دے گا۔ مگر

"بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلاد بھی"

میرے پاس پہنچا تو اس نے رحم کے بجائے بڑے زور سے کھینچ کر طمانچہ مارا۔ تب میں نے سوچا کہ ان انسان نما وحشیوں میں کم از کم مسلمانوں کے حق میں شرافت کا نام ونشان نہیں رہا۔ ایک اور شخص جو غالباً یہ حرکتیں دیکھتے دیکھتے تھک گیا تھا، اس نے کہا کیا مکہ میں تمہارا کوئی حلیف نہیں ہے۔ تب مجھے خیال آیا میں نے کہا: میرے بہت سے حلیف ہیں۔ جبیر بن مطعم بن عدی سے میرے تجارتی تعلقات بھی ہیں۔ حارث بن حرب بن امیہ سے بھی میرے تعلقات گہرے ہیں۔ آپ کی عنایت ہو گی ان میں سے کسی کو خبر کر دو۔ یہ شخص گیا حرم کعبہ کے قریب ان سے ملاقات ہو گئی۔ ان کو میرا نام بتایا یہ دونوں آئے اور ان

ظالموں سے مجھے نجات دلائی۔ ❶

مکہ معظمہ میں اصول کار (پروگرام) ہاتھ نہیں اٹھا سکتے

تیرہ سال مکہ معظمہ میں گزرے۔ اس طویل مدت میں پروگرام یہ تھا:

۱۔ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ ❷	ہاتھ روکو
۲۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ	نماز قائم کرو (اللہ سے تعلق مضبوط کرو)
۳۔ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ❸	زکوٰۃ ادا کرو۔
۴۔ وَ اَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا ❹	اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دیتے رہو

مگر اس موقع پر جب بیعت اس پر بھی لی گئی کہ حضرات انصار جس طرح اپنی جانوں اور اپنی اولاد کی حفاظت کرتے ہیں آنحضرت ﷺ کی بھی حفاظت کریںگے تو امام المغازی ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ یہ اس طرف اشارہ تھا کہ ہاتھ روکنے کا پروگرام آئندہ نہیں رہے گا۔ بلکہ ہاتھ اٹھانے کی بھی اجازت ہوگی ❺ ۔ چنانچہ جب بیعت ہو چکی تو ایک منچلے بہادر حضرت عباس بن عبادہ بن فضلہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ اگر اجازت ہو تو ہم صبح ہی کو ان لوگوں کو تلوار کے ہاتھ دکھادیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ابھی مجھے اس کا حکم نہیں ملا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ہجرت مدینہ کی اجازت

فتنہ کفر سے بچنے اور اپنے ایمان کو محفوظ رکھنے کی خاطر کسی امن کی جگہ جاکر پناہ لینے کا سلسلہ پہلے سے جاری تھا، اسی غرض سے ایک جماعت حبشہ گئی تھی اور حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ، حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن جحش بن رئاب رضی اللہ عنہ وغیرہم کو جب معلوم ہوا کہ یثرب میں ان کو امن مل سکتا

---

❶ طبقات ابن سعد ص ۱۵۰ ج ۱، یہ تفصیل امام المغازی ابن اسحاق کی روایت سے ماخوذ ہے۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۲۷۰ ج ۱۔

❷ سورہ نساء آیت ۷۷

❸ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ مکہ معظمہ میں زکوٰۃ اور قرض حسن کا فرق محض مصرف کے لحاظ سے تھا یعنی غریبوں مسکینوں کو جو کچھ دیا جاتا وہ زکوٰۃ اور غلاموں کو خرید کر رہا کرنا یا دوسرے ملی اور اجتماعی کاموں میں خرچ کو قرآن حکیم میں قرض سے تعبیر فرمایا گیا۔ حاصل یہ کہ جو کچھ ہو خرچ کر ڈالو اور جو کچھ خرچ کروگے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس سے بہتر ملے گا۔ (واللہ علم بالصواب)

❹ سورہ المزمل آیت ۲۰

❺ سورہ حج اگرچہ مدنی ہے مگر ماہرین قرآن کی ایک جماعت کی تحقیق یہ ہے کہ اذن قتال کی آیت ۳۹ (اذن للذین یقاتلون۔ تا آخر) مکہ معظمہ ہی میں نازل ہو چکی تھی یعنی الفاظ بیعت میں جس کی طرف اشارہ تھا اس کے متعلق صریح حکم بھی مکہ معظمہ ہی میں نازل ہو چکا تھا۔ البتہ ابھی عمل کا حکم نہیں ہوا تھا۔ عمل کا حکم جب ہوا جب مدینہ منورہ میں طاقت مجمع ہو گئی اور محاذ قائم ہو گیا۔ واللہ اعلم بالصواب (ماخوذ از سیرۃ ابن ہشام ص ۲۸۰ ج ۱)

ہے تو وہ بیعت عقبہ سے پہلے ہی یثرب چلے آئے تھے۔ ❶

پھر جب مدینہ کے چند افراد کو آنحضرت ﷺ نے اسلام کی دعوت دی تو آپ نے اس خواہش کا بھی اظہار فرمایا تھا کہ آنحضرت ﷺ بہ نفس نفیس ان کے ساتھ چلیں۔ مگر مدینہ کی فضا خانہ جنگی کے باعث خراب تھی تو ان حضرات نے اس وقت تعمیل فرمائش سے معذرت کر دی تھی۔ لیکن سب باتیں اس وقت تک اس بناء پر تھیں کہ وہاں امن مل جانے کی توقع تھی۔ لیکن جس مقصد عظیم کے لئے آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی تھی اس کو سامنے رکھ کر کس مقام کو مرکز بنایا جائے جو ضرورت کے وقت ایک مضبوط محاذ بھی ثابت ہوسکے یہ اب تک طے نہیں ہوا تھا۔ اسی اثناء میں ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تین ❷ مقامات بتائے گئے ہیں ان میں سے کسی کو منتخب کر لو۔ مدینہ، بحرین، یا قنسرین۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مکہ سے ہجرت کرکے ایک ایسے مقام پر جارہا ہوں جہاں کھجور کے باغات ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ مقام یمامہ ہو گا یا ہجر۔ ❸ لیکن جس طرح اہل مدینہ نے اسلام کا استقبال کیا اس نے طے کر دیا کہ یہ مرکز وہ ارض پاک ہے جس کو یثرب کہا جاتا تھا۔ جس نے بعد میں مدینۃ النبی کا غیر فانی اسم گرامی اختیار کیا۔

انتہا یہ کہ مقام عقبہ پر جو آخری بیعت ہوئی اس میں باقاعدہ وعدہ ہو گیا کہ حضرات مہاجرین وہاں پہنچیں گے اور اہل مدینہ ان کا انتظام کرینگے۔ چنانچہ اس کے بعد نہ صرف یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اجازت دیدی بلکہ ایک اصول طے ہو گیا کہ جو دائرہ اسلام میں داخل ہو اس پر لازم ہے کہ وہ مدینہ منورہ کو اپنا قیام گاہ بنائے۔ ❹

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ روئے انور ﷺ کے عاشق، جاں نثار اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام۔ یہ ان دونوں سے جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ مگر اسی اصول کی پابندی نے ان کو ہجرت پر مجبور کیا۔ ❶ چنانچہ بیعت عقبہ کے بعد ہجرت کرنے والوں میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے اسماء گرامی سب سے پہلے ہیں۔ ان کے بعد سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیس نفر کے قافلہ کے ساتھ تشریف

❶ سیرۃ ابن حشام ص ۳۸۱، ج ۱، فتح الباری ص ۱۸۰، ج ۷
❷ ترمذی شریف و فتح الباری ص ۱۸۱، ج ۷
❸ بخاری شریف ص ۵۵۱
❹ قرآن حکیم نے سچا مومن اسی کو قرار دیا جو ہجرت کر کے آئے یا ہجرت کرنے والوں کے لئے قیام کا انتظام کرے اور راہ خدا میں جان اور مال سے جہاد کرے۔ (سورہ انفال کی آخری آیت)
❶ فتح الباری ص ۲۰۸ ج ۷

لائے اور قبا میں رفاعہ بن عبد المنذر کے یہاں فروکش ہوئے۔[2] پھر رفتہ رفتہ جس کو موقع ملا وہ مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچتا رہا۔

شوق استقبال :

حضرات انصار نے اس دعوت پر ہی اکتفا نہیں کی جو بیعت عقبہ کے سلسلہ میں دے چکے تھے۔ بلکہ بیعت کے بعد جب مدینہ واپس آ گئے تو یہاں سے چند حضرات مکہ تشریف لے گئے اور حضرات مہاجرین کے ساتھ واپس ہوئے ان کو مہاجر انصاری کہا جاتا ہے۔[3]

آنحضرت ﷺ کو دعا کی تلقین اور ہجرت کا اشارہ

سورہ اسراء کی چند آیتیں یہ ہیں:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾ وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾

ترجمہ: اے رسول نماز قائم کر سورج ڈھلنے[4] کے وقت سے لے کر رات کے اندھیرے کے وقت تک (ظہر، عصر، مغرب، عشاء کے وقتوں میں) اور نماز فجر میں خاص اہتمام سے قرآن پڑھو۔ بلاشبہ صبح کے وقت تلاوت قرآن ایک ایسی تلاوت ہے جس میں حاضری زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے۔[5]

اور اے نبی رات کا کچھ حصہ (یعنی پچھلا حصہ) شب بیداری میں بسر کر یہ تیرے لئے ایک مزید عمل ہے۔ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے ایسے مقام پر پہنچا دے جو نہایت پسندیدہ مقام ہو (جس کی تعریف کی جاتی ہے) اور تیری دعا یہ ہونی چاہئے کہ اے پروردگار (مجھے جہاں کہیں پہنچا تو) سچائی کے ساتھ پہنچا اور (جہاں کہیں سے نکال تو) سچائی کے ساتھ نکال۔ اور مجھے اپنے حضور سے قوت عطا فرما۔ ایسی قوت کہ ہر حال میں مدد گاری کرنے والی ہو۔ (آیات ۷۸ تا ۸۰ سورہ ۱۷ اسراء)

تشریحات: (ا) سورہ اسراء جس کا آغاز معراج کے واقعہ سے ہوا۔ اسی کے نویں رکوع کی یہ آیات ہیں

---

[2] ایضاً ص ۲۰۹ ج ۷

[3] ان حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں: حضرت ذکوان بن عبد قیس، حضرت عقبہ بن وہب بن کلدہ، حضرت عباس بن عبادہ بن فضلہ، حضرت زیاد بن لبید رضی اللہ عنہم (ابن سعد ص ۱۵۲ ج ۱)

[4] آفتاب پرستوں کی عبادت طلوع آفتاب کے وقت ہوتی ہے اور توحید پرستوں کی عبادت اس سے پہلے ہوتی ہے یا اس وقت جب ان معبودان باطل کا زوال ہوتا ہے۔

[5] رات اور دن کے کارپرداز فرشتے اس وقت جمع ہوتے ہیں (بخاری شریف ص ۶۸۶ و ۰۹)

جن میں اس دعا کی تلقین ہوئی ہے۔ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ جہاں سے نکالنا ہو سچائی کے ساتھ نکال اور جہاں پہنچنا ہو سچائی کے ساتھ پہنچا جن میں بقول ابن عباس (رضی اللہ عنہ) ہجرت [1] کا ایماء ہے۔

(۲) معراج شریف ابتلاء اور آزمائش کے اس نازک دور میں ہوئی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے حامی اور مددگار یعنی بنو ہاشم شعب ابی طالب میں پناہ گزیں اور محصور تھے اور اہل مکہ اور بالفاظ دیگر پوری دنیا آپ سے بائیکاٹ کئے ہوئے تھے۔ اسی شب میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔ جن کی طرف ان آیتوں میں اشارہ ہے۔ ان کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم اور عمل متواتر سے فرمائی۔

شعب ابی طالب میں محصور ہونے کا دورہ اور اس کے بعد کے سال وہ تھے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کی مظلومیت، لاچارگی اور بے مائگی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں کون امید کر سکتا تھا کہ انہیں مظلومیتوں سے فتح اور کامرانی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن وحی الٰہی نے صرف فتح و کامرانی ہی کی بشارت نہیں دی کیونکہ فتح و کامرانی کی عظمت کوئی غیر معمولی عظمت نہیں تھی بلکہ ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوع انسان کے لئے عظمت اور ارتفاع کی سب سے آخری منزل ہے۔ عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (بنی اسرائیل۔۷۹)

فضل و کمال کا ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیت خلائق کی عالمگیر اور دائمی عظمت حاصل ہو جائے۔ کوئی عہد ہو، کوئی ملک ہو، کوئی نسل ہو لیکن کروڑوں دلوں میں اس کی ستائش ہو گی۔ ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہو گی۔ محمود یعنی سرتاسر محمود ہستی ہو جائے گی:

ماشئت قل فیه فانت مصدق فالحب یقضی والمحاسن تشهد

"جو تعریف تم کرنا چاہو کر لو، تمہاری تعریف درست اور تم راست گو ہو گے، محبت کا یہی تقاضا ہے اور محاسن و کمالات اس کی شہادت دیتے ہیں"

یہ مقام انسانی عظمت کی انتہا ہے اس سے زیادہ اونچی جگہ اولاد آدم کو نہیں مل سکتی، اس سے زیادہ انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی سعی اور ہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اڑ سکتی ہے لیکن یہ بات نہیں پا سکتی کہ روحوں کی ستائش اور دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے، خالق کائنات اس کی مدح کرے اور وہ کائنات انسانی کی اس وقت مدد کرے جس وقت ہر ایک نفس خواہ وہ نفس عوام ہو یا نفس خواص، کسی ولی مقرب کا نفس ہو یا کسی اوالعزم نبی مرسل کا نفس "نفسی نفسی" پکار رہا ہو۔

(۳) جس اولوالعزم نبی اور رسول کے بلند ترین درجات کا زینہ معراج تھا اور سطح اعلیٰ مقام محمود۔ اسی کی حیات مقدسہ کا اہم واقعہ ہجرت ہے۔

---

[1] ترمذی شریف کتاب التفسیر ص ۱۴۲ ج ۲

یہ ترک وطن معاذ اللہ جان بچانے کے لئے نہیں تھا بلکہ اس جہاد عظیم کے لئے تھا جس کا ثمرہ مقام محمود ہے۔

یعنی رحمت کاملہ اور امن عالم کی وہ مقدس دعوت جس کا نام اسلام ہے، جس کے مبلغین اور داعیان کرام کی تربیت تیرہ سال تک مکہ کی سنگلاخ امتحان گاہ میں ہوتی رہی، اب وقت آیا ہے کہ اس کو وقف عام کیا جائے اور ایک شہر یا ایک علاقہ یا ملک کی تنگنائی سے نکال کر پورے عالم کو اس سے آشنا کیا جائے، اور وہ تمام مشقتیں برداشت کی جائیں اور تمام مصیبتیں جھیلی جائیں۔ جن کی نذر پیش کرنا ایسی غیر معمولی عظیم الشان دعوت کے لئے ضروری ہے، جس کی بنا پر رہتی دنیا تک آنحضرت ﷺ کی تعریف ہوتی رہے اور قیامت کو مقام محمود کا شرف اعظم حاصل ہو۔

یہ ترک وطن اسی جہاد عظیم کے لئے تھا۔ اسی لئے یہ ایک ایسا شرف تھا کہ اگر اللہ رب العالمین کو منظور نہ ہوتا کہ یہ شرف عطا کیا جائے تو محبوب رب العالمین) ﷺ (مکی یا ہاشمی اور قریشی ہونے کے بجائے حضرات انصار میں سے ہوتے۔ [1]

اسی ہجرت نے اس موقف کی بنیاد رکھی جہاں سے رحمۃ اللعالمین ﷺ اعلان فرمایا:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۨ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

(سورہ اعراف آیت ۱۵۸)

(اے افراد نسل انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کہ آسمانوں اور زمین کی ساری بادشاہت اسی کی ہے۔)

مسجد جو اسلامی تعلیمات کے بموجب حیات اجتماعی کی علامت بلکہ شرط اول ہے، اس ہجرت کے بعد ہی وہ پہلا دن میسر آیا جس میں تاسیس مساجد کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ [2] اسی پہلے دن کو اسلام کی نشات اجتماعی کا پہلا دن مانا گیا جس سے اسلامی سنہ (سنہ ہجری) کا آغاز کیا گیا۔ [3]

مخالفین کا منصوبہ

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا [1] وَّ اَكِيْدُ كَيْدًا فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا

---

[1] لولا الهجرة لكنت امرأ من الانصار (بخاری شریف ص ۵۳۳)

[2] قال الله تعالیٰ: لمسجد اسس على التقوىٰ من اول يوم قال السهيلى من اول يوم حل النبى صلى الله عليه وسلم بدار الهجرة (تفسیر مظہری)

[3] بخاری شریف ص ۵۶۰ حدیث سہل رضی اللہ عنہ

[1] قال ابن عباس هذا وعيد من الله عزوجل وقد اخذهم الله يوم بدر (تفسیر مظہری)

(سورہ طارق۔۱۵تا۱۷)

"وہ ایک منصوبہ بنارہے ہیں اور میں ایک منصوبہ بنارہا ہوں سوڈھیل دیجئے منکروں کو تھوڑے دن ڈھیل دیجئے۔ ❷"

وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ ؕ وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ

(سورہ الانفال ۳۰)

"اور (اے نبی) وہ وقت یاد کرو جب مکہ میں کافر تیرے خلاف اپنی چھپی تدبیروں میں لگے تھے کہ تجھے باندھ کر ڈال دیں۔ ❸ یا قتل یا جلاوطن کر دیں اور وہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی مخفی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔"

وَاِنْ کَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَکَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْکَ مِنْھَا وَاِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَکَ اِلَّا قَلِیْلًا سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِیْلًا

(سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۶، ۷۷)

اور انہوں نے اس میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی کہ تجھے اس سرزمین (ملک عرب) سے عاجز کرکے نکال دیں اور اگر ایسا کر بیٹھے تو (یاد رکھیں) تیرے (نکالے جانے کے پیچھے) مہلت نہ پاتے مگر بہت تھوڑی، (وہ سب تباہ کر دیئے جاتے) ہم تجھ سے پہلے جو پیغمبر بھیج چکے ہیں، ان سب کے معاملہ میں ہمارا قاعدہ یہی رہا ہے اور ہمارے ٹھہرائے قاعدے کو تو بدلتا ہوا نہ پائے گا۔"

تشریح: جس قوم نے اپنا نصب العین یہ بنا رکھا تھا کہ اسلام کا نام و نشان مٹاڈالے اس کی ناکامی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی تھی کہ جس کو وہ مٹانا چاہتی تھی وہ بڑھ رہا تھا، پھیل رہا تھا، اس کی حفاظت اور ترقی کے مرکز قائم ہو رہے تھے۔

عرب سے باہر افریقہ میں (مملکت حبش میں) مسلمانوں کی ایک جماعت پہنچی ہوئی تھی وہ ایک مرجع اور ایک مرکز بن گئی تھی۔ قریش کا نمائندہ وفد جو اس کو اکھاڑنے کے لئے گیا تھا وہ ناکام ہو چکا تھا۔ اب تازہ ناکامی یہ تھی کہ یثرب میں اور خاص ان میں جو نہ صرف قریش کے ہم عقیدہ اور پیرو تھے بلکہ ان میں قریش کی رشتہ داری اور قرابت بھی تھی ❶ اسلام کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنے

---

❷ البتہ وہ لگے ہیں ایک داؤ کرنے میں اور میں لگا ہوں ایک داؤ کرنے میں۔ سوڈھیل دے منکروں کو۔ ڈھیل دے ان کو (صبر کر) (حضرت شاہ عبد القادرؒ)

❸ تجھ کو بٹھادیں (حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ)

❶ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور ان کے تقریباً تیس ساتھی یمن سے بذریعہ جہاز روانہ ہوئے کہ خدمت مبارک میں حاضر ہو کر اسلام قبول کریں۔ مگر باد مخالف نے جہاز کو بندرگاہ حجاز کے بجائے افریقہ کی بندرگاہ پر پہنچادیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ

کے عزم اور حوصلہ کے ساتھ فداکاروں کی ایک جماعت منظم ہو چکی تھی۔ وہ سخت جان جو دس بارہ سال تک مکہ میں ہر طرح کی مصیبتیں جھیل کر اور امتحان و آزمائش کی بھٹی میں تپ کر کندن ہو چکے تھے وہ مکہ سے نکل نکل کر یثرب پہنچ رہے تھے، اور اس طرح ایک محاذ مضبوط ہو رہا تھا۔ اس پر قریش کے رہنما جتنے بھی خوف زدہ ہوں جتنے بھی چراغ پا ہوں کم تھا۔ کیونکہ زندگی اور موت کا سوال جو پہلے چلمن کے پیچھے سے جھانک رہا تھا اب بے نقاب ہو کر سامنے آچکا تھا۔ لہٰذا ضروری تھا کہ قریش کے تمام سردار سر جوڑ کر بیٹھیں اور پوری سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کریں۔ چنانچہ مکہ کے تاریخی پنچائت گھر یا کونسل ہاؤس (دارالندوہ) میں خاص اجلاس طلب کیا گیا۔ ارکان ندوہ کے علاوہ دوسرے ہمنوار ہنماؤں کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ ایجنڈا (غور طلب اور فیصلہ طلب مسئلہ) یہی تھا کہ اسلام اور اس کے داعی کا قصہ کس طرح ختم کیا جائے۔

ربیع الاول کے پہلے ہفتہ میں یہ اجتماع ہوا اور پوری سنجیدگی سے مسئلہ پر غور کیا گیا۔ چند تجویزیں پیش کی گئیں:

(۱) محمد [2] ﷺ کو بیڑیاں پہنا کر لوہے کی سلاخوں کے پیچھے باندھ کر ڈالدو [3]۔ نجد کا ایک شخص جو وہاں وقت پر پہنچ گیا تھا اس نے کہا: اس سے محمد ﷺ کی مقبولیت بڑھے گی۔ لوگوں کی ہمدردیاں زیادہ ہو نگی اور بہت ممکن ہے اس کے ساتھی کسی طرح اس کو چھڑا کر لے جائیں، اس سے قریش کی بدنامی اور ہوا خیزی ہو گی۔

(۲) محمد ﷺ کو وطن سے نکال دو۔ [4] تمہیں چھٹی مل جائے گی۔ تم اپنا نظام قائم کر سکو گے اور موجودہ انتشار ختم ہو جائے گا۔

نجدی شیخ: بہت غلط رائے ہے، وہ ہوشیار ہے اور اس کے کلام میں ایسی طاقت ہے کہ جہاں جائے گا اپنا جتھا بنالے گا۔ تمہارے لئے عذاب بن جائے گا۔

مسلمانوں کی ایک جماعت حبش میں موجود ہے تو اس کے پاس پہنچے اور اسلام قبول کر کے اس کے ساتھ رہنے لگے اور فتح خیبر کے موقع پر سہ ۷ھ میں وہ سید الانبیاء ﷺ کی بارگاہ اقدس میں باریاب ہوئے۔ (بخاری شریف ص ۵۴۷ وغیرہ)

[2] پیش کرنے والا: رئیس قریش ابوالبختری ' مقتول غزوہ بدر

[3] لِيُثْبِتُوكَ (الانفال۔۳۰)

[4] أَوْ يُخْرِجُوكَ (الانفال۔۳۰) نیز آخری آیت وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ۔ (بنی اسرائیل۔۷۶) پورا ترجمہ اوپر گزر چکا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجویز بھی کافی اہمیت اختیار کر چکی تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کو پریشان اور عاجز کر کے سرزمین عرب سے ہی نکال دیں۔ بظاہر اس پر عمل اس لئے نہیں ہوا کہ اس میں یہ خطرہ محسوس کیا گیا کہ یہ جہاں پہنچ جائیں گے وہاں اپنا مرکز قائم کر کے حملہ کر دیں گے اور قریش کو تباہ کر دینگے۔ مگر ارشاد ربانی کا تقاضا ہے کہ حضرت حق جل مجدہ اس قوم عرب یا قبیلہ کو برباد کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے یہ تجویز منظور کی گئی کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو سنت اللہ یہ ہے کہ وہ قوم برباد ہو جاتی ہے جو اپنے نبی کو جلاوطن کر دے۔

(۳) ابو جہل: میری تو قطعی رائے یہ ہے کہ محمد کا کام تمام کر دیا جائے۔ باقی یہ خطرہ کہ اس کے ولی (بنو ہاشم) انتقام لیں گے اور اس طرح قبائلی جنگ بھڑک اٹھے گی تو اس سے نجات کی صورت یہ ہے کہ کسی ایک قبیلہ کے آدمی قتل نہ کریں بلکہ ہر ایک قبیلہ سے آدمی منتخب کئے جائیں، یہ سب مل کر حملہ کریں اس صورت میں خون کی ذمہ داری سب پر ہو گی۔ بنو ہاشم اس اجتماعی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ لا محالہ دیت اور خون بہا طے ہو گا جس کو ہم لا محالہ سب مل کر ادا کرینگے۔

تمام اراکین نے ابو جہل کی تجویز سے اتفاق کیا اور اس کی تیاری شروع کر دی۔ ❶

مُخْرَجَ صِدْقٍ (مکہ سے ہجرت) اور امداد خداوندی

اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ (بنی اسرائیل آیت ۸۰)

"اے رب جہاں سے تو مجھ کو نکالے تو سچائی کے ساتھ نکال"

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (توبہ آیت ۴۰)

"اگر تم مدد نہ کرو گے رسول کی تو اللہ نے اس کی مدد کی ہے جب نکالا اس کو کافروں نے"

گرمیوں کا موسم، ستمبر کی ۱۳ تاریخ، ربیع الاول کی یکم ❷، پیر کا دن، مکہ والے گرمیوں میں مکان سے باہر ڈیوڑھیوں کے سامنے راستہ کے کنارے پر چارپائیاں بچھا لیتے ہیں اور آدھی رات تک گپ شپ کرتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا معمول یہ ہے کہ تہائی رات تک نماز عشاء سے فارغ ہو جاتے ہیں پھر کچھ سورتوں کی تلاوت فرماتے ہوئے باوضو بستر پر اور عموماً کھری چارپائی پر آرام فرماتے ہیں اس وقت کچھ آنکھ لگ جاتی ہے۔ صحن میں آپ تنہا ہی ہوتے ہیں یا آپ کی زوجہ مطہرہ۔

لیکن آج خلاف معمول آرام نہیں فرما رہے اور آج آپ تنہا بھی نہیں ہیں آپ کے چچازاد بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ جن کی عمر تقریباً بائیس سال ہے وہ بھی حاضر ہیں اور کچھ باتیں ہو رہی ہیں جیسے حساب سمجھا رہے ہیں۔

دوسری طرف عجیب بات یہ ہے کہ مکان سے باہر کچھ آدمی آ رہے ہیں، تلواریں ان کے ہاتھ میں

---

❶ البدایہ والنہایہ ص ۱۷۵ و ۱۷۶ ج ۳ وغیرہا۔ من کتب السیر

❷ جو حضرات سفر ہجرت کے رفقاء یا اس سفر کے مددگار تھے انہوں نے تاریخ یا دن نہیں بیان کیا دوسرے حضرات نے بیان کیا ہے۔ چونکہ ڈائری یا روزنامچہ کا رواج نہیں تھا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تقویمات (جنتریوں) میں اختلاف رہتا تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر تاریخوں کے بیان میں اختلاف ہو گیا۔ ہم نے تقویم ہجری عیسوی مرتبہ ابو النصر محمد خالدی صاحب ایم اے (عثمانیہ) کے لحاظ سے یہ تاریخ اور دن مقرر کیا ہے (واللہ علم بالصواب)

ہیں۔ یہ نہایت خاموشی سے آتے ہیں اور دروازے کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ دس بارہ آدمی آ گئے ہیں ان میں ابو جہل بھی ہے ابو لہب بھی۔ اور عقبہ بن ابی معیط اور امیہ بن خلف بھی۔ ان میں سے کوئی اٹھتا ہے اور کواڑوں کی دراز سے اندر جھانکتا ہے۔

اب آدھی رات گذر چکی ہے۔ آخری پہر شروع ہو گیا پورے مکہ پر سناٹا چھا گیا۔ یہ کافر جو باہر آ گئے تھے غالباً کھڑے کھڑے تھک گئے۔ اس لئے قطار لگا کر دروازہ کے سامنے بیٹھ گئے ہیں۔ دفعۃً آنحضرت ﷺ اٹھتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر لٹاتے ہیں اپنی چادر ان کے اوپر ڈال دیتے ہیں پھر دروازہ سے باہر تشریف لاتے ہیں۔ سورہ یٰسین تلاوت فرما رہے ہیں اور جب کافروں کے برابر پہنچتے ہیں تو یہ آیت زبان مبارک پر ہے:

وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ

(یٰسین۔ ۹)

ترجمہ: "کر دی ہم نے ان کے آگے دیوار اور ان کے پیچھے دیوار، پھر اوپر سے ڈھانک دیا۔ سو ان کو نظر نہیں آتا۔"

اب نہیں کہا جا سکتا کہ ان کافروں کو نیند آ گئی تھی یا جیسا کہ آیت کا مفہوم ہے ان کی آنکھوں کے سامنے دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ لیکن جو اطمینان آنحضرت ﷺ کو ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے قدرت نے کوئی دیوار کھڑی کر دی ہے جس کو آپ محسوس فرما رہے ہیں (ﷺ)۔ اطمینان کی بھی انتہا ہوئی کہ آپ یونہی نہیں گذر جاتے بلکہ دست مبارک میں مٹی [1] لیتے ہیں اور ہر ایک کے سر پر مٹی رکھتے ہوئے تشریف لے جاتے ہیں۔ یہ نبی کا اعتماد، وثوق اور یقین ہے خدا پر اور خدا کے کلام پاک پر۔

خدا پر بھروسہ اور اطمینان کی دوسری مثال یہ نوجوان علی رضی اللہ عنہ پیش کر رہے ہیں کہ وہ بستر پر آرام سے لیٹے ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ آج کی شب، شب مقتل ہے۔ دشمن اسی لئے اکٹھے ہو رہے ہیں کہ اس بستر والے کو ذبح کریں، آرام گاہ کو ذبح خانہ بنائیں۔ بستر والا نہ ہو تو جو بستر پر ہو گا وہ ذبح ہو گا۔ مگر یا تو اللہ کی حفاظت پر اطمینان کامل ہے یا دیدار محبوب کے شوق مضطر نے موت کو بھی محبوب بنا دیا ہے۔

اگر مشاہدہ دوست از پس مرگ است　　　حیات خضر و مسیحا نصیب دشمن باد

یہی تسکین بخش اطمینان ہے کہ جیسے ہی لیٹتے ہیں سو جاتے ہیں۔ خدا جانے کتنی دیر تک یہ دشمن جو تلواریں لئے بیٹھے تھے غافل بیٹھے رہے۔ انہیں ایک شخص نے آخر چونکایا جس نے خبر دی کہ جس کو تم قتل کرنے آئے تھے وہ نکل گیا اور تمہاری غفلت کی انتہا ہے کہ خاک تمہارے سروں پر ہے اور تمہیں خبر نہیں

---

[1] ابن سعد و ابن ہشام (وغیرہ)

۔اب یہ گھبرا کر اٹھے، سروں پر ہاتھ پھیرے تو خاک آلود تھے۔یقین ہو گیا کہ یہ شخص سچ کہتا ہے۔دروازہ دیکھا تو وہ بھی کھلا ہوا تھا۔

کسی کے مکان میں گھسنا بہت معیوب تھا، مگر یہ لوگ ضابطہ اخلاق سے دامن جھاڑ کر خاص منصوبہ کے تحت آئے تھے اور اب ناکامی کی جھونجل بھی تھی۔غصہ اور جوش میں اندر گھس گئے، دیکھا کہ ایک سن رسیدہ (محمد ﷺ فداہ روحی) کی جگہ خواجہ ابو طالب کا سب سے چھوٹا لڑکا علی بستر پر دراز خراٹے لے رہا ہے۔

حواس باختہ دشمنوں نے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔پوچھا محمد ﷺ کہاں ہے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: مجھے کیا خبر؟ جواب صحیح تھا، انہیں خبر نہیں تھی بہت پوچھ گچھ کی ڈرایا دھمکایا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کچھ نہیں بتا سکے۔

یہاں سے دوڑتے ہوئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مکان پر گئے۔ایک لڑکی (بڑی صاحبزادی حضرت اسماء) سامنے آئی۔پوچھا تمہارے باپ کہاں ہیں؟ مجھے خبر نہیں۔لڑکی نے جواب دیا۔ابو جہل نے اس معصومہ کے اتنی زور سے طمانچہ مارا کہ کان کی بالی گر گئی۔[1]

جب ان بد بختوں کو یقین ہو گیا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا تو اس کی تلاش میں دوڑے۔مکہ کی گلی گلی چھان ماری اور جب کہیں پتہ نہ چلا تو فوراً منادی کرادی کہ جو محمد اور اس کے ساتھی کو زندہ گرفتار کرکے لائے یا ان کا سر لائے اس کو (ایک دیت کے بموجب) سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے [2]۔سو اونٹ کا انعام معمولی نہیں تھا۔انعام کے شوق میں بہت سے من چلے دوڑے مگر کامیابی کسی کو بھی نہیں ہوئی۔کیونکہ رب محمد اپنے محمد کی مدد کر رہا تھا۔(ﷺ) یہی تو ہے ارشاد خداوندی فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ (التوبہ۔۴۰) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس کی (آنحضرت ﷺ کی مدد کی) اور وہ جو دعا بتائی گئی تھی جس کا ایک جز تھا" وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا"(بنی اسرائیل۔۸۰)"اور مجھے اپنے حضور سے قوت عطا فرما ایسی قوت جو ہر حال میں میری مددگار ہو" تو اس اطمینان سے زیادہ جس سے پوری طرح مسلح ہو کر آنحضرت ﷺ بستر سے اٹھے اور روانہ ہوئے تھے، سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا[3] کیا ہو سکتا ہے۔

صادق و امین کی امانت داری:

---

[1] ابن سعد و ابن ہشام وغیرہ

[2] بخاری شریف ص ۵۵۴

[3] ایسی قوت جو ہر حال میں مددگار ہو

دشمنوں نے اگرچہ یہ خطاب [1] اب چھوڑ دیا تھا [2] مگر آپ کی صداقت و امانت ان دشمنوں کی خاطر نہیں تھی۔ بلکہ اس لئے تھی کہ آپ کی فطرت مبارکہ کا جوہر تھی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو سمجھا رہے تھے وہ ان امانتوں کا حساب ہی تھا جو انہیں دشمنوں کی آپ کے پاس تھیں، جو اب منصوبہ قتل ناحق کو کامیاب بنانے کے درپے تھے۔ آپ نے اس خطرناک اور ہیبت ناک فضا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اسی لئے چھوڑا تھا کہ جن کی امانتیں ہیں ان کو واپس کرکے اور پوری طرح حساب سمجھا کر تشریف لائیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تین دن بعد روانہ ہوئے جب امانتیں ادا کر چکے اور حساب سمجھا چکے۔

غار ثور میں قیام اور ضروری انتظامات

ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (التوبہ۔۴۰)

"صرف دو تھے دو میں سے ایک اللہ کے رسول تھے۔ جب کہ یہ دونوں غار میں تھے اور اللہ کے رسول اپنے صاحب (ساتھی) سے کہہ رہے تھے غمگین نہ ہو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

انبیاء علیہم السلام خدا پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ اعلیٰ درجہ کے متوکل بلکہ آداب توکل کے معلم اور متوکلین کے امام و پیشوا ہوتے ہیں۔ اس غیر معمولی توکل اور اعتماد کے نتیجہ میں غیبی تائید اور نصرت خداوندی کی وہ غیر معمولی صورتیں بھی پیش آتی رہتی ہیں جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں جن کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود وہ ظاہری اور مادی اسباب کو نظر انداز نہیں کرتے کیونکہ وہ صرف خانقاہ نشین درویش نہیں ہوتے، ان کی زندگی صرف ان کے لئے نہیں ہوتی وہ نوع انسان کے معلم ہوتے ہیں اور ان کی زندگی پوری نوع انسان کے لئے سبق ہوتی ہے۔ مکان سے نکلتے وقت قدرت نے خاص طرح کی مدد

---

[1] آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ عجیب بات ہے اللہ تعالیٰ نے میرے نام کو سب و شتم سے بچالیا۔ ان کو میرا نام لینا گوارا نہیں ہوتا یہ مذمم کو برا بھلا کہتے ہیں حالانکہ میں محمد ہوں میرا نام مذمم نہیں۔ (بخاری شریف ص ۵۰۱)

[2] یہ خطاب استعمال نہیں کرتے تھے مگر آپ کی صداقت اور امانت سے انکار نہیں تھا۔ مانتے تھے، جانتے تھے، پہچانتے تھے کہ آپ صادق و امین ہیں۔ اسی پر تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ (مومنون۔۶۹) کیا ان لوگوں نے اپنے رسول کو پہنچانا نہیں ہے کہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اصل مرض کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَادًا (البقرہ۔۱۶۵) (معبودان باطل) کی محبت ان لوگوں سے یہ حرکتیں کراتی تھی وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ (بقرہ۔۱۶۵) کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو مانتے ہیں جن کو انہوں نے خدا کا شریک ٹھہرا رکھا ہے اور ان سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی خدا سے کرنی چاہئے اور جو ایمان والے ہیں وہ بہت سخت ہوتے ہیں اللہ کی محبت میں۔ حب أنداد یعنی معبودان باطل کی محبت اور خدا کی محبت میں یہ فرق ہوتا ہے کہ اللہ سے محبت کرنے والا ہٹ دھرمی نہیں کر سکتا کیونکہ اللہ کا حکم ہے کہ ہر موقع پر عدل و انصاف سے کام لو، حق کی شہادت دینے والے رہو، كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ (نساء۔۱۳۵) اور معبودان باطل کا کوئی حکم ہی نہیں اگر ہے تو باطل پرستی لہذا وہ جو کچھ کر بیٹھے کم ہے۔

کی، مگر آپ نے اور آپ کے رفیق خاص نے روپوش رہنے اور خفیہ روانگی کا جو نظام قائم کیا تھا وہ امت کے لئے بہترین سبق ہے۔ اس کی تفصیل خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔

دارالندوہ کا وہ اجلاس جس میں آپ کے متعلق غیر معمولی تجویز منظور کی گئی اور مشترکہ طور پر شہید کرنے کا منصوبہ طے کیا گیا۔ وہ غالباً صبح کے وقت ہوا۔ اس کی اطلاع بطور تائید غیبی آنحضرت ﷺ کو فوراً ہی ہو گئی [1] اور فوراً ہی آپ نے روانگی کی تیاری شروع کر دی۔

سیدہ [2] عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ روزانہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لایا کرتے تھے مگر صبح یا شام کو۔ ایک روز ہم نے دیکھا کہ ٹھیک دوپہر کے وقت تشریف لا رہے ہیں۔ سر مبارک پر کپڑا اڈالے ہوئے ہیں چہرہ مبارک کو بھی کچھ کپڑے سے چھپائے ہوئے ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خبر دی گئی فوراً حاضر ہوئے۔ یارسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان یہ ناوقت تشریف آوری کیسی؟

ارشاد ہوا: کچھ بات کرنی ہے تنہائی ہونی چاہئے۔ کوئی غیر آدمی ہو تو اسے ہٹادو۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ: غیر کوئی نہیں دو لڑکیاں ہیں ایک آپ کی خادمہ عائشہ دوسری اس کی بہن اسماء۔

فرمایا تمہیں معلوم ہے؟ مجھے ہجرت کی اجازت [3] مل گئی ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ: یہ خادم ساتھ رہے گا۔ [4] آپ پر میرے ماں باپ قربان یارسول اللہ۔

آنحضرت ﷺ: بہت اچھا۔

یہ اجازت ایسی بشارت تھی کہ فرط مسرت سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا کہ خوشی میں آنسو آجاتے ہیں۔

پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: دو سانڈنیاں [1] تیار ہیں ان میں سے ایک منظور فرمایئے۔

---

[1] ابن سعد کی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ منصوبہ طے کر کے لوگ منتشر ہو گئے (اجلاس ختم ہو گیا) جبرئیل علیہ اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے یہ خبر سنائی اور کہا کہ آج کی شب اپنے اس بستر پر آرام نہ فرمائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر صدیقؓ کے یہاں پہنچے ص ۱۵۳ ج ۱ اس تفصیل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اجلاس صبح کے وقت ہوا۔

[2] بخاری شریف ص ۵۵۲ تا ۵۵۴

[3] یعنی آج یہ سفر اس لئے نہیں ہے کہ دشمنوں نے قتل کا منصوبہ بنا رکھا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اب تک ہجرت کی اجازت نہیں تھی آج مل گئی ہے۔ اور اگر دارالندوہ کا اجلاس رات کے وقت ہوا تھا تو اگرچہ اس کی اطلاع آنحضرت ﷺ کو فوراً مل گئی تھی مگر دوپہر تک آپ نے روانگی کا قصد اس لئے نہیں کیا کہ اب تک ہجرت کی اجزات نہیں ملی تھی۔ اب جیسے ہی اجازت ملی آپ نے تیاری شروع کر دی۔ واللہ اعلم بالصواب

[4] یہ ہے عشق رسول۔ اہل وعیال، مال اور جدائید اد وغیرہ کا کوئی تصور سامنے نہیں تھا قلب مضطر کی تڑپ صرف یہ ہے :الصابة بابی انت یا رسول اللہ (بخاری شریف ص ۵۵۳) آپ کی رفاقت میرے باپ آپ پر قربان یارسول اللہ۔

آنحضرت ﷺ: ضرور مگر قیمت لینی ہوگی۔ ❷

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے بڑی تیزی سے سامان سفر کی تیاری شروع کر دی اور جلدی جلدی میں جو ناشتہ ❸ تیار ہو سکتا تھا وہ تیار کر لیا، پھر ہم نے چمڑے کے تھیلے میں ناشتہ بھر دیا۔ ایک مشکیزے میں پانی بھر دیا، لیکن تھیلے کا منہ بند کرنے کے لئے کپڑے کی ضرورت تھی اور مشکیزے میں بھی تسمہ نہیں تھا❹ جس سے اس کو اٹھایا جا سکے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی ہمشیرہ (حضرت اسماء رضی اللہ عنہا) نے فوراً اپنے نطاق ❺ کے دو حصے کر لئے ❻ ایک میں کھانے کا تھیلہ باندھ دیا، دوسرے میں مشکیزہ باندھ دیا تاکہ اس کو اٹھایا جا سکے۔

روانگی: آنحضرت ﷺ دولت کدہ سے روانہ ہو کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے۔ پھر یہ دونوں مکان کی پشت کی ❼ طرف سے کھڑکی سے نکل کر کوہ ثور کی طرف روانہ ہو گئے جو مکہ معظمہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے، اور جس کی چوٹی پر یہ غار ہے جس نے غار ثور کے نام سے غیر فانی شہرت حاصل کی۔

جب آپ روانہ ہوئے تو یہ دعا زبان مبارک پر تھی ❽:

"الحمدللہ الذی خلقنی ولم اک شیئاً اللّٰھم اعنّی علیٰ ھول الدنیا و بوائق الدھر ومصائب اللیالی والایام۔ اللّٰھم اصحبنی فی سفری واخلفنی فی اھلی و بارک لی فیما رزقتنی ولک فذللنی وعلی صالح خلقی فقومنی والیک رب فحببنی والی الناس فلاتکلنی۔ رب المستضعفین وانت ربی۔ اعوذ بوجھک الکریم الذی اشرقت لہ السمٰوٰت والارض وکشفت بہ الظلمات وصلح علیہ امرالاولین والاخرین ان تحل علیّ

---

❶ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چار ماہ پہلے یہ سانڈنیاں خرید چکے تھے اور اس خیال سے کہ نہ معلوم کس وقت حکم ہو جائے۔ ان اونٹنیوں کو چرواہے کے سپرد نہیں کیا تھا بلکہ گھر پر کھڑا کر کے ان کو چارہ کھلاتے رہے تھے۔

❷ واقدی کی روایت ہے کہ ان دونوں کی قیمت آٹھ سو درہم تھی۔ آنحضرت ﷺ نے جو سانڈنی منظور فرمائی وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قبیلہ بنی قشیر سے خریدی تھی۔ اس کا نام قصواء رکھا گیا۔ یہ آنحضرت ﷺ کی سواری میں آخر تک رہی اور آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بہت کم زندہ رہی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اس کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ (فتح الباری ص ۱۸۷ ج ۷)

❸ پراٹھے نہیں تھے صرف ابلا ہوا بھنا ہوا بکری کا گوشت تھا (فتح الباری بحوالہ واقدی ص ۱۸۸ ج ۷)

❹ لیس فیہا عصام (سیرۃ ابن ہشام ص ۲۹۲ ج ۱)

❺ نطاق خاص قسم کا تہہ بند ہوتا تھا اس کا عرض تقریباً ڈھائی میٹر (۹۰ انچ) ہوتا تھا۔ اس کو بیچ سے باندھ دیا جاتا۔ پھر اوپر کا حصہ نیچے لٹکا دیا جاتا جس سے یہ دہرا ہو جاتا تھا۔ (مجمع البحار و فتح الباری ص ۱۸۸ ج ۷)

❻ یہ ایثار عند اللہ مقبول ہوا۔ چنانچہ آپ کا خطاب ذات النطاقین ہو گیا۔ (بخاری شریف ص ۸۱۱)

❼ سیرۃ ابن ہشام ص ۲۹۱ ج ۱ البدایہ والنہایہ ص ۱۷۸ ج ۳

❽ ایضاً البدایہ والنہایہ ص ۱۷۸ ج ۳

غضبك وتزل بی سخطك۔ واعوذبك من زوال نعمتك وفجائة نقمتك وتحول عافيتك وجميع سخطك۔ لك العقبیٰ۔ عندی خیرما استطعت لاحول ولاقوۃ الابك"❶

سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ ساتھ ساتھ تھے مگر جذبہ بیتاب قابل دید تھا۔ کبھی آگے چلتے کبھی پیچھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا تو عرض کیا یارسول اللہ آگے چلتا ہوں کہ حضور کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ خیال آتا ہے کہ شاید پیچھے سے تعاقب کرنے والے پہنچ جائیں تو پیچھے ہو جاتا ہوں۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں اپنی جان کا خطرہ نہیں ہے۔ عرض کیا حضرت وہ تو قربان ہونے کے لئے ہی ہے۔ ❷

راستہ طے ہوا۔ غار کے کنارے پہنچے تو عرض کیا: حضرت ذرا توقف فرمائیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ غار کے اندر اترے، صاف کیا پھر آقا دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تشریف لائیے۔

ان کو کیا فکر جن کا ساتھی اللہ ہو:

سو اونٹ کا انعام جو قریش کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا معمولی نہیں تھا۔ مکہ والوں کی بہت سی ٹولیاں انعام کے شوق میں دوڑ پڑیں۔ کچھ ٹولیاں اس طرف بھی آئیں۔ ایک ٹولی غار کے قریب پہنچی تو وہاں سے کبوتر اڑے۔ ایک ٹولی جھاڑ کے قریب تک پہنچی، اس نے دیکھا کہ جھاڑ پر مکڑی کا جالا تنا ہوا ہے۔ وہ جالا دیکھ کر واپس ہو گئی۔ ❸

---

❶ ترجمہ: "اس خدا کی حمد جس نے مجھے پیدا کیا ورانحالیکہ میں کچھ بھی نہیں تھا (مجھے نیست سے ہست کیا) اے اللہ میری مدد فرما، دنیا کی دہشت، زمانہ کے ہلاکت انگیز واقعات، رات اور دنوں (گردش روز و شب) کی مصیبتوں کے مقابلہ پر اے اللہ تو میرا ساتھی بن، وہ میرے سفر میں اور میرا قائم مقام بن میرے اہل وعیال میں میرے بعد، (میری غیبوبت میں تو ان کا محافظ اور نگراں رہ) اور اے اللہ جو تو مجھ کو رزق دے اس میں برکت عطا فرما اور اے اللہ صرف اپنی ذات کے لئے ہی ایسا کر کہ مجھے اپنا مطیع اور اپنے سامنے عاجز بنا کسی اور کے سامنے مجھے عاجز اور ذلیل نہ کر۔ اے اللہ نہایت صالح اور مناسب اعمال پر میری تربیت فرما! افعال خیر کے بہترین سانچے میں مجھے ڈھال دے اور اے میرے رب صرف اپنی طرف کی محبت ہی میرے اندر بھر دے اور جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے اے اللہ مجھے تو ان کے حوالے مت کر۔ اے کمزوروں کے رب تو ہی میرا رب ہے۔ میں تیری اس باعزت ذات کی جس کی برکت سے آسمان اور زمین روشن ہیں اور جس سے تمام تاریکیاں فنا ہو جاتی ہیں اور جس کے فضل و کرم سے پہلے لوگوں اور بعد والوں کا سب کا معاملہ درست ہوا۔ پناہ لیتا ہوں اس سے کہ میرے اوپر تیرا غضب اور تیری ناراضگی نازل ہو۔ میں تیری پناہ لیتا ہوں اس سے کہ تیرا انعام مجھ کو نصیب نہ ہو یا اس سے کہ تیرا عتاب دفعۃً مجھ پر نازل ہو جائے اور پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ تیری معافی جو مجھے میسر ہے اس میں تبدیلی آجائے اور میں ایسی ہر چیز سے پناہ چاہتا ہوں جو تیری ناراضی کا سبب ہو انجام کار تیرے ہی لئے ہے۔ میں جہاں تک میرے امکان میں ہے خیر اور بھلائی ہی کی کوشش کرتا ہوں (مگر) تیرے بغیر نہ کوئی طاقت ہے نہ کوئی قوت ہے جو کچھ قوت وطاقت ہے وہ تجھ سے ہی ہے"۔

❷ دلائل النبوت للبیہقی بحوالہ فتح الباری ص۱۸۹ ج ۲

❸ طبقات ابن سعد جلد اول ص ۱۵۴

ایک ٹولی اوپر چڑھی اور غار کے کنارے کے اوپر سے اس طرح گزر گئی کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے پاؤں دیکھے۔ یہ ٹولی گزر چکی تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔

لوان احدھم نظرالیٰ قدمیہ لابصرنا

"اگر ان میں سے کوئی اپنے پیروں پر نظر ڈالتا تو ہمیں دیکھ لیتا"

یہ نبی کا اطمینان و اعتماد تھا کہ برجستہ جواب دیا۔

اسکت یا ابابکر اثنان اللہ ثالثھا [1]

"خاموش رہو ابو بکر ہم دو ہمارا تیسرا اللہ ہے۔"

وفی روایۃ ماظنك یا ابابکر باثنین اللہ، ثالثھا [2]

ایک روایت میں یہ ہے: ابو بکر! ان دو کے متعلق تم کیا گمان رکھتے ہو جن کا تیسرا اللہ ہے۔

سرور کائنات ﷺ کی یہ زحمت [3] سفر، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رفاقت اور رحمۃ اللعالمین ﷺ کا یہ اعتماد بارگاہ رب العزت میں قبول ہوا۔ چنانچہ سورہ توبہ کی اس آیت (مذکورہ عنوان) میں اس کا ذکر فرمایا گیا۔

سب کچھ قربان

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر۔۹)

(وہ مقدم رکھتے ہیں اپنے نفسوں پر باوجودیکہ خود انکو شدید حاجت اور سخت ضرورت ہوتی ہے)

یہ آیت اگرچہ ہجرت سے کئی سال بعد حضرات انصار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے بارے میں نازل ہوئی مگر اس کی عملی مثال حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پہلے ہی پیش کر چکے تھے۔ جب آپ نے سفر ہجرت کے وقت اپنی پوری پونجی ساتھ لے لی تھی۔ پانچ چھ ہزار آپ کے پاس نقد تھے۔ آپ روانہ ہوئے تو آپ نے سب رقم ساتھ لے لی اور اہل و عیال کو خدا کے نام پر چھوڑ دیا۔ آپ کے بچوں کا ایثار یہ تھا کہ اس کی نہ ان کو کوئی ناگواری ہوئی نہ تہی دستی سے پریشانی، گویا خود ان کی بھی یہی خواہش تھی۔ انتہا یہ کہ جب حضرب ابو بکر رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ کو خبر ہوئی کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ چلے گئے تو بچوں کے پاس آئے اور فرمایا: ابو بکر رضی اللہ عنہ تو چلے ہی گئے کچھ تمہارے لئے بھی چھوڑ گئے ہیں؟ میرا خیال یہ ہے کہ جو کچھ ان کے پاس تھا سب لے گئے۔ جان سے تو گئے ہی مال بھی لے گئے۔ تمہیں خالی چھوڑ گئے۔ تو بڑی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا

---

[1] بخاری شریف ص۵۵۸

[2] ایضاً ص۵۱۶ و فتح الباری

[3] یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ یہ سفر اور غار میں قیام ستمبر کے مہینہ میں ہوا جو سخت گرمی کا مہینہ ہوتا ہے۔

نے فوراً جواب دیا: نہیں دادا جی ہمارے لئے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ ابو قحافہ کچھ مطمئن نہیں ہوئے تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اس جگہ جہاں رقم رہا کرتی تھی کنکریاں تھیلی میں بھر کر رکھ دیں۔ دادا کی بصارت جاتی رہی تھی۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں اور تھیلی پر ہاتھ رکھ کر بتادیا کہ یہ رقم محفوظ ہے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ محض دادا کو مطمئن کرنے کے لئے کر دیا ورنہ واقعہ یہ تھا کہ جو کچھ تھا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہا سب لے آئے تھے۔ ہمیں خالی چھوڑ آئے تھے۔ [1]

حالات سے باخبر رہنے اور دوسری ضروریات کا انتظام

تین آدمیوں کے خاص خاص کام سپرد کئے گئے تھے۔ [2]

۱۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند عبد اللہ رضی اللہ عنہ [3] نوجوان تھے [4] مگر نہایت ہوشیار، بہت تیز، بات کو تاڑنے والے، پرکھنے والے۔ ان کے ذمہ یہ تھا کہ مخالفین کے اقدامات پر نظر رکھیں، حالات کا جائزہ لیتے رہیں۔

یہ دن بھر مکہ معظمہ میں کنسوئیں لیتے رہتے۔ دن چھپے اندھیرا ہو جاتا تو غار پر پہنچتے تھے۔ تمام روئیداد سنا دیتے۔ حالات سے باخبر کر دیتے۔ پھر آخر پہر میں مکہ معظمہ پہنچ جاتے گویا رات بھر یہیں رہے ہیں۔

۲۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ [5] غلام عامر بن فہیرہ جن کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کی اجازت نہیں دی تھی بلکہ روک لیا تھا۔ ان کے ذمہ یہ تھا کہ تازہ دودھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے رہیں۔ شام کو جب اندھیرا ہو جاتا یہ بکریاں غار پر لیجاتے دودھ دھتے پھر اس کو گرم کرتے اور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے آقا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ پھر بکریوں کو ہکا کر صبح سے پہلے تڑکے میں مکہ پہنچ جاتے۔

۳۔ اس زمانہ میں سڑکیں نہیں تھیں اس لئے راستوں اور خصوصاً پہاڑی راستوں سے واقف ہونا بھی ایک خاص فن تھا۔ اس کے ماہر کو "خریت" کہا کرتے تھے۔ قافلہ کے ساتھ خریت ضرور ہوتا تھا۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۲۹۳ ج ۱

[2] ماخوذ از بخاری شریف ص ۵۵۴

[3] ان کے حالات آئندہ آئیں گے زیر عنوان متعلقین کی آمد حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

[4] غلام شاب، ثقف لقن (بخاری شریف ص ۵۵۳)

[5] مگر آقاؤں کے آقا۔ بیر معونہ کے حادثہ میں ان کو شہید کر دیا گیا۔ قاتلوں کے سردار عامر بن طفیل نے لوگوں سے دریافت کیا یہ لاش کس کی ہے؟ میں نے دیکھا کہ اس کو اٹھا کر آسمان کی طرف لیجایا گیا۔ پھر احتیاط سے نیچے اتارا گیا اور رکھ دیا گیا۔ (بخاری شریف ص ۵۸۷)

اس کی معقول اجرت ہوتی تھی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قبیلہ بنی ویل کے ایک شخص کو جس کا نام عبد اللہ بن اریقد تھا (اور عبد اللہ بن اریقط بھی کہلاتا تھا) اس خدمت کے لئے طے کر لیا تھا۔

یہ مسلمان نہیں تھا بلکہ مشرکین مکہ کا ہم مسلک تھا۔ عاص بن وائل سہمی کے خاندان کا حلیف تھا۔ یہ تو نہیں معلوم کہ اجرت کیا طے ہوئی تھی البتہ ان دونوں بزرگوں کو اس پر پورا اطمینان تھا[1] یہاں تک کہ دونوں سانڈنیاں اس کے حوالے کر دی تھیں اور بتادیا تھا کہ تین رات گزرنے کے بعد وہ چوتھے دن صبح سویرے غار ثور میں پہنچ جائے۔

یہ خریت وعدہ کے مطابق ٹھیک وقت پر پہنچا اور یہ حضرات سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ خریت نے سیدھا راستہ چھوڑ کر ساحل سمندر کا راستہ اختیار کیا جو چکر کاٹ کر مدینہ پہنچتا تھا۔ ایک ہفتہ بعد ۱۲ ربیع الاول[2] کو پیر[3] کے دن یہ مقدس قافلہ منزل مقصود پر پہنچا۔

باہوش و باتدبیر رفاقت

غار ثور سے روانہ ہوئے تو تمام رات چلتے رہے۔ اگلے دن دوپہر کا وقت ہو گیا، دھوپ تیز ہو گئی۔ اس کھلے ہوئے لق ودق میدان میں پتھر کی چٹان کے نیچے کچھ سایہ تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو غنیمت سمجھا۔ میں چٹان پر پہنچا۔ آنحضرت ﷺ کو ساتھ لے گیا۔ میرے ساتھ ایک فروۃ چمڑے کا بستر تھا۔ میں نے اس کو سایہ میں بچھادیا اور اپنے آقا (آقاء دوجہاں) کو اس پر لٹادیا۔

پھر میں نے نظر دوڑائی تو ایک چرواہے کو دیکھا جو بکریوں کے چھوٹے سے گلہ کو ہکاتے ہوئے اس طرف لا رہا تھا۔ اور وہ بھی اس چٹان کے سایہ میں آرام کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا اور دریافت کیا یہ بکریاں کس کی ہیں؟ تمہارا کون مالک ہے؟ چرواہے نے ایک شخص کا نام لیا۔ جس کو میں جانتا تھا میں نے دریافت کیا کہ کیا کوئی بکری دودھ دیتی ہے اور کہا تم دودھ دے سکتے ہو؟ اس نے اقرار کیا۔ چنانچہ وہ ایک بکری پکڑ کر لے آیا۔ میں نے کہا پہلے تم بکری کے تھن پونچھ کر صاف کرو، پھر اپنے ہاتھ صاف کرو، پھر دودھ نکالو۔ اس نے میری فرمائش پر عمل کیا۔ اور تھوڑا سا دودھ دوھ کر مجھے دیا۔

میں نے آنحضرت ﷺ کے لئے ایک چھاگل میں پانی رکھ چھوڑا تھا اس کے منہ پر کپڑا باندھ رکھا تھا

---

[1] اطمینان کا سبب بظاہر یہ حلف ہی تھا۔ اس کی تفصیل مقدمہ میں ملاحظہ ہو۔ زیر عنوان معاہدات

[2] ابن سعد ابن ہشام وغیرہ

[3] عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: آنحضرت ﷺ کی ولادت پیر (دوشنبہ) کے روز ہوئی۔ پیر ہی کو نبوت عطا ہوئی، پیر کے دن ہی مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے اور پیر کے دن ہی مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے۔ (مسند احمد) ابن سعد اور ابن ہشام وغیرہ نے بھی پیر کا دن ہی بیان کیا ہے لیکن تقویم سنہ عیسوی وسنہ ہجری کے لحاظ سے یکم ربیع الاول پیر کے دن ہوتی ہے تو ۱۲ ربیع الاول کو پیر کا دن نہیں ہو تا بظاہر تقویمات کا فرق ہے۔

کہ گردوغبار نہ پڑے۔ میں نے دودھ میں اتنا پانی ڈالا کہ تلی تک تمام دودھ ٹھنڈا ہو گیا (دودھ کی لسی بنالی) پھر میں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے نوش فرمایا۔ میرا جی خوش ہو گیا۔ [1]

راستہ کی مختصر سرگزشت

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ۔۶۷) (اور اللہ آپ کی حفاظت کرے گا لوگوں سے)

آیت کا نزول اگرچہ بعد میں ہوا مگر حفاظت خداوندی کا عجیب وغریب ظہور اس سفر میں ہو چکا تھا۔ سراقہ بن مالک بن جعشم [2] کا واقعہ اس کی مثال ہے۔ یہ قبیلہ بنی مدلج کا ایک شیخ تھا۔ اعلانچی اس کے یہاں بھی پہنچے تھے اور یہ اعلان اس نے بھی سنا تھا جو قریش نے آنحضرت ﷺ اور آپ کے رفیق سفر کے گرفتار کرنے یا قتل کرنے والے کے متعلق کیا تھا۔ سراقہ بیان کرتے ہیں کہ میں قبیلہ میں ایک چوپال میں بیٹھا ہوا تھا کہ کچھ آدمیوں نے آکر کہا کہ سمندر کے کنارے جاتے ہوئے کچھ آدمیوں کی پرچھائیاں سی نظر آئی ہیں، ہمارا خیال ہے کہ محمد اور اس کے ساتھی ہیں۔ (ﷺ)

سراقہ کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں بھی یہی آیا کہ ان کا خیال صحیح ہے۔ مگر اس شوق میں کہ سارا انعام تنہا میں حاصل کرلوں میں نے ان کی بات ٹال دی۔ میں نے کہا کہ محمد یہاں کہاں؟ فلاں فلاں آدمی ہمارے سامنے سے گزرے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہونگے۔ خبر دینے والوں نے میری بات مان لی۔ کسی اور نے کچھ خیال نہیں کیا۔ میں تھوڑی دیر وہاں بیٹھا رہا پھر خاموشی سے اٹھا اپنے مکان میں گیا۔ باندی سے کہا میری گھوڑی ٹیلے کے پیچھے چر رہی ہے اس کو لے آ اور تیار کر دے۔ میں نے بھی ضروری سامان ٹھیک کرلیا۔ پھر میں نے نیزہ لیا اور اس خیال سے کہ لوگ نیزہ دیکھ نہ لیں، اسکی بھال ہاتھ میں لی اور پھولی زمین پر ڈال کر کھینچتا ہوا چلا اور مکان کی پشت کی طرف سے نکل کر گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ وہ کبھی دلکی اور کبھی پویا دوڑتی ہوئی مجھے لے چلی۔ یہاں تک کہ میں آنحضرت ﷺ کے قریب پہنچ گیا۔ اچانک گھوڑی کے ٹھوکر لگی اور میں زمین پر آرہا۔ میں فوراً اٹھا میرے ترکش میں فال معلوم کرنے والے تیر تھے۔ میں نے ان کو نکالا اور میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ میں ان کو نقصان پہنچاسکوں گا یا نہیں۔ اتفاق سے میری مرضی کے خلاف فال نکلی۔ مگر میں نے اس کا خیال نہیں کیا۔ میں نے فال کے فیصلہ سے بغاوت کی۔ پھر گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کو تیز دوڑادیا اور اتنے قریب پہنچ گیا کہ آنحضرت ﷺ کی تلاوت کی آواز میرے کانوں میں آنے لگی

۔

آنحضرت ﷺ تلاوت کلام اللہ میں مشغول تھے۔ آپ کسی اور طرف دھیان قطعاً نہیں دے رہے

---

[1] بخاری شریف ص ۵۵۶ و ص ۳۳۰ وغیرہ
[2] ماخوذ از بخاری شریف ص ۵۵۶

تھے۔ البتہ ابو بکر رضی اللہ عنہ دائیں بائیں سب طرف دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔

جب میں اتنے قریب پہنچ گیا تو دفعتہ میری گھوڑی کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے اور میں نیچے گر گیا۔ میں اٹھا میں نے گھوڑے کو اٹھایا اس کو ڈانٹا، اس کے پیر زمین سے بڑی مشکل سے نکلے۔ ساتھ ساتھ پیروں کی جگہ سے دھوئیں کی طرح غبار نکلا جو آسمان کی طرف چڑھ رہا تھا۔ اب میں نے پھر فال نکالی۔ اس مرتبہ بھی فال میری مرضی کے خلاف ہی نکلی۔ تو میں نے ہمت ہار دی، فال کی مخالفت نہیں کی اور میرے دل میں یہ بات جم گئی کہ محمد رسول اللہ (ﷺ) ضرور کامیاب ہونگے میں نے وہیں سے پکار کر کہا: میں آپ صاحبان سے امن چاہتا ہوں۔

یہ حضرات ٹھہرے۔ میں نے ان کے قریب جاکر قریش کی تمام باتیں جو اب تک کر چکے تھے اور جو وہ آئندہ کرنے والے تھے ان کو سنا دیں۔ میں نے آپ کی خدمت میں کچھ ناشتہ اور کچھ سامان پیش کرنا چاہا مگر میری پیش کش ان حضرات نے منظور نہیں فرمائی۔

میں نے یہ بھی [1] عرض کیا کہ میرے اونٹ آپ کو راستہ میں ملیں گے ان کے ساتھ چرواہے بھی ہیں۔ میں اپنا تیر دیئے دیتا ہوں یہ ان کو دکھا دیں اور جتنے دودھ کی ضرورت ہو آپ ان سے لے لیں۔ مگر ان حضرات نے میری کوئی پیش کش منظور نہیں فرمائی۔ صرف ایک فرمائش کی کہ کسی کو ہماری خبر نہ کرنا۔ میں نے وعدہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی کہ میرے لئے امن کا پروانہ لکھ دیں۔

آنحضرت ﷺ نے عامر بن فہیرہ کو حکم فرمایا انہوں نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر پروانہ امن لکھ کر سراقہ کو دے دیا۔ پھر یہ حضرات مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے اور سراقہ مکہ کی طرف واپس ہوا۔

سراقہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ راستہ میں جو ملتے رہے ان کو اطمینان دلا کر واپس کرتا رہا کہ میں دور تک دیکھ آیا ہوں اس طرف کوئی نہیں ہے۔ اس طرح بقول حضرت انس رضی اللہ عنہ سراقہ بن مالک بن جعشم کی مختصر روائداد یہ ہے کہ صبح کے وقت حملہ آور، شام کے وقت محافظ۔ [2]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے ملاقات اور پیش کش:

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا عجیب کرشمہ ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اپنا نطاق چاک کر کے اس میں ناشتہ دان اور مشکیزہ باندھا تھا۔ ان کے شوہر حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں خلعت پیش کیا۔ (جس کی تفصیل یہ ہے)

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ کچھ اور تاجر بسلسلہ تجارت شام گئے تھے وہاں سے واپس ہو رہے تھے کہ راستہ میں ان مقدس مہاجرین سے ملاقات ہو گئی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے سفید کپڑے کا

---

[1] بخاری شریف ۵۵۶

[2] بخاری شریف ص ۵۵۴ ،

جوڑا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا اور ایک جوڑا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پہنایا۔[1] ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس قافلہ میں حضرت عمر، حضرت طلحہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ واپسی کے وقت حضرت زبیر رضی اللہ عنہ آگے آگئے تھے جب مدینہ کے قریب پہنچے تو باقی حضرات سے ملاقات ہوئی۔ وہاں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی ان دونوں حضرات کی خدمت میں جوڑے پیش کئے۔

یثرب میں ورود مسعود

وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ (سورہ مومنون۔۲۹)

"کہو! اے میرے پروردگار مجھے برکت کے ساتھ اتار اور تو بہتر اتارنے والا ہے"

یا معشر العرب هذا جدکم الذی تنتظرون الله اکبر جاء محمد الله اکبر جاء محمد ﷺ

تذکرہ سیدنا نوح علیہ السلام کے ضمن میں اس دعا کی تلقین مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ آنحضرت ﷺ اس کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ آج آپ کے حق میں اس کی مقبولیت ظاہر ہو رہی ہے جبکہ معصوم بچیوں کے معصوم جزبات اس ترانہ سے آپ کا استقبال کر رہے ہیں:

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

" ثنیات[2] الوداع سے چودھویں کا چاند طلوع ہوا، ہم پر اللہ کا شکر واجب ہو گیا جب تک کوئی دعا کرنے والا دعا کرے (ہمیشہ ہمیشہ کے لئے)

مدینہ میں روانگی کی خبر:

ڈاک کا سلسلہ اس وقت نہیں تھا مگر آنے جانے والوں کے منہ زبانی خبریں پہنچ جاتی تھیں۔ مشتاقان دیدار کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا محبوب مکہ معظمہ سے نکل چکا ہے۔ اب انتظار کے دن اور گھڑیاں گنی جا رہی تھیں۔ طلوع آفتاب سے بہت پہلے، پو پھٹنے کے وقت لوگ اٹھتے اور مدینہ سے باہر حرہ[1] پہنچ کر آفتاب رسالت کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگتے۔ اسی انتظار میں دوپہر ہو جاتا۔ مسافروں کی آمد کا وقت ختم ہو جاتا تو مرجھائے دلوں کو بے تاب سینوں میں دبائے ہوئے واپس ہو جاتے۔ ایک روز اسی

---

[1] فتح الباری ص ۱۹۳ ج ۷

[2] ثنیہ: گھاٹی اور وداع کے معنٰی ہیں رخصت کرنا۔ چونکہ لمبا سفر کرنے والوں کو رخصت کرنے کے لئے اہل یثرب یہاں تک آیا کرتے تھے اس لئے یہ نام پڑ گیا (معجم البلدان)

[1] بخاری شریف ص ۵۵۵

پژمردگی اور افسردگی کے ساتھ واپس ہوئے تھے کہ ایک آواز نے عورتوں اور بچوں تک کو وارفتہ مسرت بنا دیا۔

یامعاشر[2] العرب هذا جدکم الذی تنتظرون

ایک یہودی اپنی کسی ضرورت سے ایک پرانے قلعہ کی اونچی اٹاری پر چڑھا تھا اس کی نظر چند سفید پوش سواروں پر پڑی جو اس طرف چلے آرہے تھے۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ انتظار کرنے والوں کی مراد پوری ہوگئی۔ یہ خود بے تاب نہیں تھا مگر انتظار کرنے والوں کی بیتابی کا اس پر یہ اثر تھا کہ خود قابو میں نہ رہا اور زور سے چیخ اٹھا۔

"اہل عرب ! یہ ٹھیک تمہارے وہی مہمان آگئے جن کا تمہیں انتظار ہے۔"

اہل قبا کی خوش نصیبی تھی کہ یہ آواز ان کے کانوں میں پڑی۔ اب کوئی کیا بتائے جاں بازوں، جاں نثاروں اور فداکاروں کا کیا حال تھا۔ وہ کس بے تابی سے دوڑے اور حرہ پہنچ کر کس طرح رحمتہ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر پا اپنی آنکھیں بچھائیں۔ نظر اشتیاق کو فرش راہ بنایا۔ قبیلہ بنی عمرو بن عوف جو اوس کا بطن تھا[3] یہاں آباد تھا۔ یہ خوش نصیب اسی قبیلہ[4] کے لوگ تھے جنہوں نے یہودی کی آواز سنی اور دوڑے۔ [5]

عرب کا دستور تھا کہ معزز مہمانوں کا استقبال ہتھیاروں سے آراستہ ہو کر کیا کرتے تھے۔ اس بے تابی میں انہوں نے اپنی اس آن کو نہیں چھوڑا پہلے ہتھیاروں کی طرف لپکے پھر استقبال کو دوڑے۔

حرہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دہنی طرف رخ کیا[6] اور پھر پورے مجمع کے ساتھ قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں رونق افروز ہوگئے۔ لوگ آنے شروع ہوئے وہ اپنے قاعدہ سے سلام کرتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے۔ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم خاموش تشریف فرما تھے۔ رفیق سفر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے تھے اور آنے والوں کا استقبال کر رہے تھے۔ جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے نہیں دیکھا تھا وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی کو سلام کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دھوپ آگئی تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سر مبارک پر اپنی چادر سے سایہ کر لیا، تب لوگ پہچان سکے کہ خادم کون ہے اور مخدوم کون۔ [1]

---

[2] اے اہل عرب یہ آگئے تمہارے آقا، جن کا تم انتظار کر رہے تھے۔

[3] فتح الباری ص ۱۹۴۔

[4] طبقات ابن سعد ص ۱۵۸ ج ۱۔

[5] فثار المسلمون الی السلاح۔ بخاری شریف ص ۵۵۲۔

[6] بخاری شریف ص ۵۵۵۔

[1] ایضاً ص ۵۵۵۔

آرام گاہ اور نشست گاہ :

کلثوم بن ھدم قبیلہ کے بڑے آدمی تھے، یہ شرف ان کو حاصل ہوا کہ آپ نے قیام [2] ان کے یہاں فرمایا۔

دوسرے صاحب سعد بن خثیمہ رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کا مکان خالی تھا۔ ان کے متعلقین نہیں تھے۔ مکہ سے جو صحابہ رضی اللہ عنہ اس طرح کے آتے تھے وہ بھی انہیں کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ اس لئے اس مکان کو بیعت العزاب [3] کہا جانے لگا۔ یہ مکان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست کے لئے طے کیا گیا [4]۔ تلقین و تذکیر بھی یہیں فرماتے تھے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سخ میں قیام فرمایا [5]۔ یہ پیر کا دن تھا [6] جس روز آفتاب رسالت مدینہ کے خط استواء پر پہنچا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امانتیں پہنچانے کے لئے مکہ معظمہ چھوڑا تھا، تین دن بعد وہ بھی تشریف لے آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیام کیا۔ [7]

حق پرستوں کا اعتراف حق

سرزمین یثرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا خطاب

حصین بن سلام ایک یہودی عالم تھے۔ مطالعہ نہایت وسیع، طبیعت انصاف پسند، اور اپنی قوم کے معزز سردار تھے۔ جو بشارتیں یہود کی کتاب میں پڑھی تھیں ان کی بنا پر آنے والے نبی کے منتظر تھے۔ یہ

---

[2] اکثر صحابہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مدینہ آچکے وہ بھی انہیں کے یہاں اترے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہ الجراح، حضرت مقداد بن اسود، حضرت خباب، حضرت سہیل، حضرت صفوان، حضرت عیاض، حضرت عبد اللہ بن مخرمہ، حضرت وہب بن سعد، حضرت معمر بن ابی سرح، حضرت عمیر بن عوف رضوان اللہ علیہم اجمعین اب تک انہیں کے مہمان تھے۔ (ابن سعد تذکرہ کلثوم بن ھدم) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے چند ماہ بعد ان کی وفات ہوگئی (رضی اللہ عنہ) محمد بن الحسن بن زبالہ نے اخبار المدینہ میں وثوق سے بیان کیا ہے کہ کلثوم بن ھدم اس وقت تک مشرک ہی تھے مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ (فتح الباری ص ۱۹۴ ج ۷ وفاء الوفاء ص ۱۴۷ ج ۱) اگر یہ صحیح ہے تو اس سے اہل مدینہ کی معاشرت کا پتہ چلتا ہے کہ مذہبوں کے فرق کے باوجود آپس میں تعاون مکمل تھا۔

[3] عزاب: عازب کی جمع ہے۔ اس شخص کو کہتے ہیں جس کے بیوی نہ ہو۔

[4] ابن سعد ص ۱۵۸ ج ۱ و ابن ہشام ص ۲۹۶ ج ۱

[5] خبیب بن یساف خزرجی یا خارجہ بن زید خزرجی کے یہاں۔ (ابن ہشام ص ۲۹۶ ج ۱)

[6] تاریخوں میں بہت اختلاف ہے۔ اگر مکہ معظمہ سے روانگی یکم ربیع الاول کو پیر کے دن ہوئی تھی جیسا کہ راقم الحروف نے لکھا ہے، تو اس پیر کو ربیع الاول کی پندرہ ہوگی۔ خبر المدینہ ابن زبیر نے ابن شہاب (زہری) سے یہی روایت نقل کی ہے کہ نصف ربیع الاول (۱۵ ربیع الاول) کو تشریف آوری ہوئی (فتح الباری ص ۱۹۴ ج ۷)

[7] ابن ہشام ص ۲۹۶ ج ۱

اپنے باغ میں کام کر رہے تھے کہ خبر سنی: اللہ کے نبی تشریف لے آئے۔ [1]

فوراً کام چھوڑ کر نبی کی زیارت کے لئے دوڑے۔ جیسے ہی چہرہ مبارک پر نظر پڑی دل نے شہادت دی۔

انہ لیس بوجہ کذاب "جھوٹے آدمی کا چہرہ تو نہیں ہے"

آپ فرماتے ہیں: کان اول شیء تکلم بہ ان قال یاایھا الناس افشوالسلام واطعمو الطعام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنۃ بسلام (ترمذی شریف ص ۷۱ ج ۲)

"سب سے پہلے جو بات آپ نے فرمائی وہ یہ تھی کہ اے لوگو سلام کا رواج عام کرو، (پھیلاؤ) کھانا کھلاؤ، اور اس وقت نماز پڑھو جب لوگ سو رہے ہوں۔ اطمینان سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔"

یہی حصین بن سلام ہیں جن کا اسلامی نام عبد اللہ بن سلام ہے۔ رضی اللہ عنہ۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت یوسف علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ [2]

قبا سے مدینہ منورہ

جمعہ [1] کے روز صبح سویرے مدینہ کے حضرات آراستہ ہوئے، تلواریں سجائیں اور آقاء دوجہان کو اپنے

---

[1] بخاری شریف کی روایت ص ۵۵۶ کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ قبا میں نہیں بلکہ مدینہ میں حاضر خدمت ہوئے جب آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے یہاں قیام فرمایا: مگر بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاد ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے کہ آپ قبا میں قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں تھے اس وقت عبد اللہ بن سلام حاضر ہوئے۔ (سیرۃ ابن ہشام ص ۱۰۳ ا ج) ا۔ اس لئے ہم نے اس واقعہ کو اس موقع پر ذکر کر دیا حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچنے پر دوسرا واقعہ ہوا۔ بخاری کے راوی صاحبان نے ان دونوں کو ایک ساتھ ذکر کیا تو اشتباہ ہو گیا کہ یہ واقعہ بھی حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں قیام کے دوران ہوا۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے ابن اسحاق کی روایت جو صرف ایک واسطہ سے ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام مسلمان ہو گئے تو انہوں نے چاہا کہ یہود کی افتراپردازی اور غلط بیانی کا تجربہ آنحضرت ﷺ کو کرا دیں۔ چنانچہ ابھی عبد اللہ بن سلام کے اسلام لانیکی شہرت نہیں ہوئی تھی کہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے اصرار پر آنحضرت ﷺ نے یہود کے نمائندگان کو بلا کر دریافت کیا کہ حصین بن سلام کیسے آدمی ہیں انہوں نے بہت تعریف کی اور کہا کہ سید بن سید اعلم بن اعلم اور ہم میں سب سے بہتر ہےں لیکن جیسے ہی ان یہودی علماء کو معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہو چکے تو فوراً پلٹ گئے اور اسی مجلس میں کہہ دیا کہ یہ بھی جھوٹے ان کے باپ بھی جھوٹے یہ بھی بدترین انسان ہیں اور ان کے باپ بھی بدترین انسان تھے۔ (ابن ہشام و بخاری شریف وغیرہ)

[2] الاصابہ

[1] مدت قیام میں اختلاف ہے۔ چار روز، چودہ روز، اٹھارہ روز اور ۲۴ روز تک کی روایتیں ہیں۔ لیکن اس پر اتفاق ہے کہ قبا سے روانگی جمعہ کے روز ہوئی اور تشریف آوری پیر کے روز ہوئی تھی۔ اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ قبا اور مدینہ دنون جگہ نزول اجلال ربیع الاول کے مہینہ میں ہوا تو بظاہر تاریخوں کا تعین اس طرح ہوتا ہے کہ دولت کدہ سے روانگی یکم ربیع الاول دوشنبہ

یہاں لانے کے لئے قبا پہنچ گئے۔

کچھ دن چڑھا تو تاجدار دوعالم اناقہ قصواء[2] پر سوار ہوئے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ساتھ[3] بٹھایا (ردیف بنایا) تقریباً پانچ[4] مسلح انصار کی دو صفیں دائیں بائیں ہو گئیں۔

راستہ پر زیارت کرنے والے مردوں کا اور کوٹھوں اور چھتوں پر خانہ نشین خواتین کا ہجوم تھا، جو مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ بھی دیدار کے لئے بیتاب تھے۔ لڑکے اور بچے جوش مسرت میں نعرہ لگا رہے تھے۔

اللہ اکبر جاء محمد اللہ اکبر جاء محمد[5]

یثرب اور اہل یثرب کے لئے اس سے زیادہ مسرت کا دن کونسا ہو سکتا ہے؟ آج آسمان نبوت کا آفتاب زمین یثرب پر اتر رہا ہے۔ آج وہ نبی رونق افروز ہو رہا ہے جس کی بشارتیں کتب سابقہ کے صفحات میں اور اہل کتاب کی زبانوں پر عرصہ سے تھیں۔ آج ہر طرف یہی صدا ہے یہی چرچا ہے، جاء نبی اللہ جاء نبی اللہ[6]، اللہ کے نبی آگئے اللہ کے نبی آگئے۔

قبیلۂ بنی سالم تک پہنچے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ آپ نے جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی[7]۔ نماز جمع کے بعد آپ سوار ہونے لگے تو قبیلہ والوں نے مہار تھام لی اور اصرار کیا کہ آپ یہیں قیام فرمائیں۔ اس کے بعد حضرات انصار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کا جو قبیلہ بھی آتا[8] رہا یہی اصرار کرتا رہا کہ غریب خانہ کو دولت خانہ بنائیے۔ مکان حاضر ہے، مال حاضر ہے، جان حاضر ہے۔ لیکن وہ رؤف رحیم جس کا دامن شفقت ہر ایک کے لئے پھیلا ہوا تھا، جس کو کسی کی دل شکنی گوارا نہیں تھی جس طرح اس کا پورا سفر غیبی اشاروں پر ہوا

کے روز غار ثور سے روانگی ۴ ربیع الاول پنج شنبہ، قبا میں تشریف آوری ۱۵ ربیع الاول پیر کے روز مدینہ منورہ میں تشریف آوری ۲۶ ربیع الاول یوم جمعہ، واللہ اعلم بالصواب

[2] یہ وہی ناقہ ہے جس پر آپ نے سفر ہجرت طے فرمایا تھا (ابن سعد)

[3] بخاری شریف ص۵۵۶ و ص۵۶۰

[4] فتح الباری ص۱۰۱ ج۷ بحوالہ تاریخ صغیر للبخاری والبدایہ والنہایہ ص۱۹۷ ج۳ بحوالہ مسند احمد

[5] البدایہ والنہایہ ص۱۹۷ ج۳

[6] بخاری شریف ص۵۵۶۔۵۶۰

[7] ابن سعد ص۱۶۰ ج۱ نے نمازیوں کی تعداد سو لکھی ہے۔ لیکن تاریخ بخاری اور مسند احمد کی روایتوں کے بموجب اگر استقبال کے لئے جانے والوں کی تعداد پانچ سو تھی تو ظاہر ہے نماز جمعہ میں یہ سب ہی شریک ہوئے ہونگے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[8] وفاء الوفا میں ان قبائل کی تفصیل ہے اور جو گفتگو ہوتی رہی وہ بھی نقل کی گئی ہے (ص۱۸۴ و۱۸۵ ج۱)

تھا۔[1] اس کے ارحم الرحمین رب نے یہاں بھی ایسی صورت کر دی کہ رحمتہ اللعالمین ﷺ کی طرف سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ آپ نے خود ہی ناقہ کی مہار چھوڑ دی اور اصرار کرنے والوں سے بھی یہی فرمایا کہ وہ مہار چھوڑ دیں۔ یہ ناقہ[2] مامور ہے جہاں بیٹھ جائے گی وہیں قیام ہو گا۔

ناقہ چلتی رہی یہاں تک کہ قبیلہ بنی نجار آ گیا۔ اس قبیلہ میں جب ناقہ اس جگہ پہنچی جہاں مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے تو ناقہ بیٹھ گئی۔ آپ نے فرمایا ھذا انشاء اللہ منزل[3] ۔ "یہیں انشاء اللہ قیام ہو گا۔ (مکان بنے گا)

ابھی آپ اترے نہیں تھے کہ ناقہ کھڑی ہو گئی۔ کچھ چلی۔ پھر آ کر اسی جگہ بیٹھ گئی اور اپنی گردن زمین پر پھیلا دی۔[4]

بنی نجار کو یہ سعادت میسر آئی تو بچہ بچہ کے دل کی کلی کھل گئی۔ لڑکیوں نے فوراً ایک شعر موزوں کر لیا۔

نحن جوار من بنی نجار   یاحبذا محمد من جار

"ہم بنی نجار کی لڑکیاں ہیں یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ محمد ﷺ ہمارے پڑوسی بنے۔ محمد کیسے اچھے پڑوسی ہیں۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ محمد ﷺ ہمارے پڑوسی ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ازراہ شفقت فرمایا: تمہیں مجھ سے محبت ہے؟"

---

[1] پہلے گزر چکا ہے کہ صحابہ کرام ہجرت کر رہے تھے مگر آنحضرت ﷺ کے حکم کے منتظر تھے اور جب من جانب اللہ اجازت ہو گئی تو آپ فوراً دوپہر ہی میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے اور فرمایا کہ مجھے اجازت ہو گئی ہے۔ فوراً ہی روانگی کا پروگرام بنا لیا اور پھر یہ سفر ہی نہیں بلکہ دار ہجرت کا تعین بھی الہام ربانی سے ہوا تھا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

[2] ابن سعد ص ۱۶۰ ج ا و فتح الباری ص ۱۹۶ ج ۷ علامہ شبلی کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی۔ آپ نے یہ واقعہ حذف کر دیا۔ میزبانی کے سلسلہ میں جو بحث ہوئی تھی صرف اس کا ذکر فرمایا کہ قرعہ ڈالا گیا اور آخر یہ دولت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی۔ اور حاشیہ میں فاقہ کے واقعہ کی تردید کرتے ہوئے مسلم شریف کی ایک حدیث سے استدلال کیا جس میں راوی نے بہت اختصار سے کام لیا ہے اور لطف یہ ہے کہ قرعہ اندازی کا تذکرہ فقدمنا المدینہ لیلاً، علامہ نے اس کو نظر انداز فرما دیا۔ علامہ نے مسلم شریف کے باب الہجرۃ کا حوالہ دیا ہے حالانکہ مسلم شریف میں بابا الہجرۃ کوئی نہیں۔ اس کا عنوان حدیث الہجرۃ ہے اور علماء محدثین کی اصطلاح میں اس کو حدیث الرجال بھی کہا جاتا ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے جلد ثانی کے آخر میں اس کو نقل کیا ہے۔ ص ۴۱۹ ج ۲ اور واقعہ یہ ہے کہ بسلسلہ قیام چند مرحلے پیش آئے تھے۔ مثلاً سب سے پہلے قبیلہ کا انتخاب، پھر قبیلہ میں وہ جگہ جہاں آنحضرت ﷺ مستقل قیام فرمائیں۔ جہاں مکان بنایا جائے یا مسجد بنائی جائے۔ پھر مکان بننے تک عارضی قیام، عارضی قیام کے بعد کھانے وغیرہ کا انتظام۔ اصطبل کا انتخاب جہاں سواری رکھی جائے۔ ان تمام مرحلوں پر بحث ہوئی اور ہر ایک جاں نثار نے سعادت حاصل کرنی چاہی۔ بحث کے بعد معاملہ طے ہوا کبھی قرعہ سے بھی، الہام ربانی سے، کبھی کسی اور صورت سے آئندہ سطور میں یہ تمام مراحل ترتیب وار بیان کئے گئے ہیں۔ وللہ الحمد

[3] بخاری شریف ص ۵۵۵

[4] ابن ہشام ۲۹۸ ج ا

سب نے یک زبان ہو کر کہا: ای واللہ یا رسول اللہ (ہاں خدا کی قسم یا رسول اللہ)
ارشاد ہوا: [1]

انا واللہ احبکم انا واللہ احبکم انا واللہ احبکم

"خدا کی قسم مجھے بھی تم سے محبت ہے خدا کی قسم مجھے بھی تم سے محبت ہے خدا کی قسم مجھے بھی تم سے محبت ہے۔"

اب قیام کا مسئلہ پیش ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہمارے رشتہ داروں [2] میں کسی کا مکان قریب ہے۔ یہ خوش نصیبی حضرت خالد بن زید [3] ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو میسر تھی۔ آپ فوراً بول اٹھے: انا یا نبی اللہ ھذہ داری وھذا بابی (میں حاضر ہوں یا رسول اللہ یہ میرا مکان ہے یہ میرا دروازہ ہے)

عجیب بات یہ ہے کہ حضرات انصار نے آپس میں قرعہ ڈالا کہ حضور ﷺ کا قیام کس کے یہاں ہو گا؟ اس میں بھی حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ ہی کا اسم گرامی بر آمد [4] ہوا تھا۔

قیام کا مسئلہ طے ہو گیا تو ارشاد ہوا:

فانطلق فھیئ لنا مقیلا [1] "تشریف لے جایئے ہمارے قیلولہ کا انتظام کیجئے۔"

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے اندر جا کر آرام فرمانے کا انتظام کیا پھر ان کو لے گئے اور آرام کرایا۔ [2]

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۲۰۰ ج ۳ بحوالہ بیہقی

[2] بخاری شریف ص ۵۵۶ چونکہ آنحضرت ﷺ کے دادا عبد المطلب کے ننھیالی رشتہ دار اسی قبیلہ کے تھے تو آپ نے یہ فرمایا: " ای بیوت اھلنا اقرب " ہمارے رشتہ داروں میں سے کس کا مکان قریب ہے۔ اس وقت آقا دوجہان کی زبان مبارک سے قرابت ورشتہ داری کا اظہار ان رشتہ داروں کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا جیسا کہ مسلم کی روایت میں ہے۔ آپ نے اس کا اظہار بھی فرمایا مگر یہ بھی صحیح نہیں کہ ناقہ کا واقعہ پیش نہیں آیا۔ اور آپ نے رشتہ داری کی بنیاد پر بنو نجار کو منتخب فرمایا۔ ورنہ پھر قرعہ اندازی کی بھی ضرورت نہیں تھی جس کو علامہ شبلی نے بہت اہمیت دی ہے۔

[3] اصل نام خالد، پسر زید، کنیت ابو ایوب، یہ اپنی اس کنیت ہی سے مشہور ہیں۔

[4] اصابہ ص ۹۰ ج ۲ بحوالہ احمد علامہ شبلی نے اس روایت کو لے کر ناقہ وغیرہ کے تمام واقعات کو حذف کر دیا جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ حالانکہ اس روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل حضرات انصار نے از خود کیا تھا۔ اور بہت ممکن ہے آنحضرت ﷺ کے یہاں رونق افروز ہونے سے پہلے کیا ہو، کیونکہ روایت میں مدینہ میں تشریف آوری کا ذکر ہے قبیلہ بنو نجار میں رونق افروز ہونے کا ذکر نہیں۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں روی احمد من طریق جبیر بن نضیر۔ عن ابی ایوب قال لما قدم النبی ﷺ المدینۃ اقترعت الانصار ایھم یؤویہ فقرعھم ابو ایوب۔ یعنی حضرات انصار نے خود قرعہ اندازی کی کہ آنحضرت ﷺ کو کون مکان دے گا (کس کے یہاں قیام ہو گا)۔ تو سب کے مقابلہ میں ابو ایوبؓ کا نام قرعہ میں بر آمد ہوا جو حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی موافقات صحابہ کی ایک مثال ہے۔ یعنی صحابہ کرامؓ نے بھی وہی فیصلہ کیا جو پہلے مشیت خداوندی طے کر چکی تھی۔ بعد کے الہام یا وحی نے اس کی توثیق کر دی۔ واللہ اعلم

[1] بخاری شریف ص ۵۵۶

[2] فتح الباری ص ۲۰۱

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ [3] ہمیشہ خوش ہوا کرتے تھے کہ سید عالم ﷺ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں جیسے ہی تشریف لے گئے سب سے پہلا ہدیہ میری والدہ کا تھا جو آپ نے خود بھی تناول فرمایا اور حاضرین کو بھی اس میں شریک کیا۔ میری والدہ نے روٹیوں پر گھی لگا کر دودھ میں چورا اور ایک بڑے بادیہ میں بھر کر میرے ہاتھ بھیجا۔ یہ میری سعادت تھی کہ سب سے پہلا یہ ہدیہ یہی پیش ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ میری والدہ نے یہ ہدیہ بھیجا ہے تو آپ نے دعا فرمائی: بارك الله فيك (اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے)۔ پھر حاضرین کو بلا کر سب کے ساتھ یہ ہدیہ تناول فرمایا اور ابھی میں دروازہ سے نکلا نہیں تھا کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے یہاں سے ثرید آگیا۔ آپ نے اُسے بھی منظور فرمایا۔ پھر اگرچہ آپ مہمان ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے تھے مگر روزانہ تین چار انصار کے یہاں سے نمبروار کھانے کا ہدیہ آتا رہتا تھا۔ [4] دستر خوان مبارک پر چار پانچ کھانے والے ضرور ہوتے تھے۔ کبھی پندرہ سولہ بھی ہو جاتے تھے [5]۔

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ خود بھی کھانا پکواتے، دستر خوان پر اگرچہ شریک طعام نہیں ہوتے تھے مگر جو کھانا آنحضرت ﷺ کے سامنے سے آتا تھا اس کو کھاتے اور خاص اس جگہ سے کھاتے جہاں آقا دو جہاں کی انگلیوں کے نشان معلوم ہوتے تھے۔ [6]

بالائی منزل میں قیام :

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے مکان کی دو منزلیں تھیں۔ آپ نے نیچے کی منزل آنحضرت ﷺ کے لئے خالی کر دی۔ خود اوپر چلے گئے۔ ایک روز اتفاق سے اوپر کی منزل میں پانی کا برتن (گھڑا یا مٹکا) ٹوٹ گیا ۔ابو ایوب رضی اللہ عنہ کو خدشہ ہوا کہ پانی نیچے ٹپکے گا اور تاجدار دو جہان ﷺ کو تکلیف ہو گی، گھر میں ایک لحاف

---

[3] یہ وہی زید بن ثابت ہیں جو آگے چل کر کاتب وحی اور جامع قرآن اور بہت بڑے فقیہ اور ماہر فرائض ہوئے۔ ایسے ذہین کہ سریانی زبان اور سریانی خط پندرہ روز میں لکھ لیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ والدہ محترمہ کا اسم گرامی نوار تھا دختر مالک یہ بھی نجاریہ تھیں (الاصابہ والاستعیاب)

[4] ابن سعد ۱۶۱ ج ۱ خصوصاً حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے یہاں سے تو روزانہ طشت بھر کر کھانا آتا تھا۔ وفاء الوفاء ص ۱۹۰ ج ۱

[5] ۲۔ ایضاً

[6] علامہ نووی ؒ نے اس حدیث سے چند مسئلے اخذ کئے ہیں: (۱) ہر موقع اور ہر جگہ پر برتن کا صاف کرنا مستحب نہیں بلکہ بچے ہوئے کھانے یا پینے والے برتن میں کچھ چھوڑ دینا مستحب ہے (۲) خصوصاً جب معلوم ہو کہ لوگ اس کو تبرک سمجھ کر کھائیں گے (۳) یا کھانا کم ہو اور دوسرے کھانے والے موجود ہوں (۴) یا جیسا کہ بعض جگہ ہوتا ہے کہ پورا کھانا مہمان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور اہل خانہ بعد میں بچا ہوا کھانا کھاتے ہیں۔ بظاہر حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کا یہی طریقہ تھا۔ (نووی علی مسلم ص ۱۸۳ ج ۱)

تھا فوراً اسی کو پانی پر ڈال دیا کہ پانی جذب ہو جائے نیچے نہ ٹپکے۔ ❶

ایک روز خیال آیا کہ سردار دوجہان ﷺ نیچے ہیں اور ہم اوپر، کیسی بے ادبی ہے ؟ فوراً ایک کنارے سمٹ گئے اور اسی طرح رات گزاردی۔ صبح کو آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ اوپر قیام فرمائیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: آنے جانے والوں کو اسی میں آسانی ہے، حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے دست بستہ عرض کیا:

لا اعلو سقیفۃً انت تحتھا ❷

"میں تو اس چھت پر چڑھ نہیں سکتا جس کے نیچے حضور والا ہوں۔"

رحمت عالم ﷺ نے درخواست منظور فرمائی اور اوپر منتقل ہو گئے۔ سات ماہ اسی مکان میں قیام رہا، جب مسجد اور حجرے تیار ہو گئے تب آپ وہاں تشریف لے گئے۔ (تفصیل آگے آتی ہے۔ انشاء اللہ)

قصواء کا قیام اور حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کا والہانہ جذبہ :

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ جو بیعت عقبہ اولیٰ میں شریک تھے اور تبلیغی کوششوں میں آنحضرت ﷺ کے فرستادہ معلم حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے شریک رہے تھے، ان کا مکان بہت وسیع تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا قیام انہیں کے یہاں رہا تھا۔ ان کے علاوہ اور حضرات بھی جو تشریف لاتے تھے ان کے یہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔

جب انہوں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کا قیام حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں طے ہو گیا ہے تو ناقہ کی مہار پکڑی اور اپنے یہاں لے گئے ❸۔ کہ یہ بھی ایک شرف اور جذبہ شوق کو تسکین دینے والی ایک سعادت تھی۔

متعلقین کی آمد :

مدینہ میں آکر آپ نے حضرت زید بن حارثہ اور حضرت ابورافع (رضی اللہ عنہم) ❶ کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم دیکر مکہ بھیجا کہ متعلقین کو لے آئیں۔ صاحبزادیوں میں حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ حبش میں تھیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو ان کے شوہر ابو العاص بن ربیع نے آنے نہیں دیا۔ بس

---

❶ وفاء الوفاء ص۱۸۸ سیرۃ ابن ہشام

❷ مسلم شریف ص۱۸۳ ج ۲

❸ طبقات ابن سعد ص۱۶۰ ج ۱

❶ آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے، قبطی تھے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا اور دو صاحبزادیاں ام کلثوم رضی اللہ عنہا اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا آئیں۔ ان کے علاوہ حضرت زید اپنی اہلیہ ام ایمن اور اپنے فرزند اسامہ رضی اللہ عنہ کو بھی ساتھ لے آئے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبد اللہ [2] کو بھی حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھیجا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے متعلقین کو وہ اپنے ساتھ لائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ان کے ساتھ آئیں۔ ان سب کو حارثہ [3] بن نعمان کے مکان میں ٹھہرایا گیا۔ [4]

نیا دور۔ غیر محدود میدان عمل

قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

(سورہ الاعراف آیت ۱۵۸)

"اے پیغمبر تم لوگوں سے کہو اے افراد نسل انسانی (اے بنی نوع انسان)! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ وہ خدا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کے لئے ہے۔"

---

[2] حضرت عبد اللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوتیلے اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے حقیقی (ماں شریک) بھائی تھے۔ غزوہ فتح مکہ اور غزوہ حنین میں شریک رہے۔ جب غزوہ حنین کے بعد طائف پر حملہ کیا گیا تو انکے ایک تیر لگا اسکا زخم اوپر سے مندمل ہو گیا۔ مگر اندر اندر پھوڑا بن گیا۔ تقریباً دو سال تک یہ پھوڑا رہا۔ آنحضرت ﷺ کی وفات سے تقریباً سات ماہ بعد شوال سنہ ۱۱ھ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں پھوڑے کے پھٹنے سے ان کی وفات ہو گئی۔ آنحضرت ﷺ کے کفن کے لئے ایک حلہ لایا گیا تھا یعنی یمن کی بنی ہوئی دھاریدار چادروں کا جوڑا۔ مگر آنحضرت ﷺ کا کفن سفید سوتی کپڑے کا بنایا گیا۔ یہ حلہ کام میں نہیں آیا تو حضرت عبد اللہ نے اپنے کفن کے لئے نو دینار میں خرید لیا تھا۔ لیکن وفات کے وقت وصیت کر دی کہ اس کا کفن نہ بنایا جائے کیونکہ اگر اس کپڑے کا کفن اچھا ہوتا تو آنحضرت ﷺ کا کفن اسی کا ہوتا۔ جب آنحضرت ﷺ کے لئے اس کو منتخب نہیں کیا گیا تو میں بھی اس کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا۔ یہ تھا نازک احساس عاشقان اتباع سنت کا۔ رضی اللہ عنہ (الاستیعاب)

[3] حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی تھے۔ کسی سائل کو دروازہ سے محروم نہیں جانے دیتے تھے اور جو کچھ دیتے وہ خود اپنے ہاتھ سے دیتے تھے۔ آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی تو جہاں ان کی نشست رہتی تھی وہاں سے دروازہ تک ایک رسی باندھ لی تھی۔ دروازہ میں کھجوروں کا ٹوکرا رکھا رہتا تھا، جب سائل آتا تو یہ رسی پکڑ کر دروازہ تک جاتے اور خود اپنے ہاتھ سے فقیر کو دیتے تھے۔ بچوں نے عرض کیا کہ یہ خدمت ہم انجام دے سکتے ہیں۔ فرمایا: آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: مناولة السکین تقی میتت سؤ (یعنی مسکین کو خود اپنے ہاتھ سے دینا بری موت سے محفوظ رکھتا ہے)۔ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل امین انسانی شکل میں نزول فرما ہوئے اور آنحضرت ﷺ کو کوئی پیغام پہنچایا: حاضرین کو نہ پیغام کی خبر ہوئی نہ حضرت جبرئیل کی تشریف آوری کی۔ مگر حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا: یہ صاحب کون تھے جو آپ سے گفتگو فرما رہے تھے۔ یہ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کی مخصوص فضیلت تھی کہ آپ نے حضرت جبرئیل کو دیکھ لیا۔ آنحضرت ﷺ کو تعجب ہوا اور ایک امتی کی اس فضیلت پر مسرت بھی ظاہر فرمائی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات ہوئی۔ رضی اللہ عنہ ۔الاستیعاب

[4] طبقات ابن سعد ص ۱۶۱ ج ۱

(۱)

وہ آفتاب جو مشرق مکہ سے طلوع ہوا تھا۔ جس کی کرنیں اب تک فاران کی چوٹیوں سے ٹکرا رہی تھیں، مدینہ کے خط استواء پر پہنچا تو وہ آفتاب نیم روز تھا۔ ویسے بھی دعوت تبلیغ کے دس سال پورے ہو چکے تھے [1] اور آنے والے سال بھی دس ہی تھے۔

(۲)

اس کا دائرہ عمل نوع انسان کے کسی خاص گروہ [2] ی اطبقہ تک تو کبھی محدود نہیں ہوا۔ البتہ ظاہری وسائل و ذرائع کی بنیاد پر اس کا مخاطب اب تک اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَهَا [3]۔ تھا اور اب اس کا موقف وہ ہے جو وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا [4] کا مطلع اور مظہر ہے۔

(۳)

سکندر اعظم جیسے فاتح عالم کی تاریخ کا پہلا باب یہ ہو گا کہ اس نے ایسی زبردست فوجی طاقت کس طرح فراہم کی جو فاتح عالم بن سکی۔ اس کی فوج کی خصوصیات کیا تھیں اور وہ خود کس درجہ کا صاحب شجاعت اور صاحب حوصلہ تھا۔ لیکن وہ فرد کامل جو پوری بنی نوع انسان کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا تھا اس کی تاریخ و سیرت کا پہلا باب یہ ہونا چاہئے کہ وہ کیا اصول تھے، کیا طریقہ کار تھا اور کون سے اخلاق تھے جو وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ [5] کی غرض وغایت کو پورا کر سکے۔ (آنے والے صفحات میں انہیں سوالات کے جوابات ہیں)۔

---

[1] نبوت کے ابتدائی تین سال میں دعوت اور تبلیغ کا حکم عام نہیں تھا (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)

[2] جیسا کہ بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کا دائرہ عمل گروہ بنی اسرائیل تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل ہی کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ (سورہ صف آیت ۵)

[3] سورہ الانعام۔ ۹۲ سورہ الشوریٰ ۷، اُمَّ الْقُرٰی مکہ۔ مَنْ حَوْلَهَا جو اس کے اطراف میں ہیں۔

[4] یعنی آپ کے مبعوث کرنے کا مقصد یہ ہے کہ پوری نوع انسان کو (وہ عرب ہوں یا عجم، کالے ہوں یا گورے) ان برکتوں کی بشارت سنا دو جو ایمان و عمل سے حاصل ہوتی ہیں اور انکار حق کے جو برے نتیجے ہوتے ہیں ان سے متنبہ اور آگاہ کر دو۔ (سورہ سبا آیت ۲۸)

[5] آپ کو یہ آخری پیغام دیکر نہیں بھیجا گیا مگر اس لئے کہ رحم کرنا تھا تمام جہانوں پر، پس آپ کی ذات سراسر رحمت کیونکہ جو پیغام آپ کے ذریعہ بھیجا گیا وہ سراسر رحمت ہے۔ (الانبیاء۔ ۱۱۷)

دعوت الی اللہ

داعی کے اوصاف وخصائل اور خصوصیات

(۱)

ارشاد ربانی ہے :

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا ﴿۴۵﴾ وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذۡنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیۡرًا ﴿۴۶﴾ وَ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ بِاَنَّ لَهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ فَضۡلًا کَبِیۡرًا ﴿۴۷﴾ وَ لَا تُطِعِ الۡکٰفِرِیۡنَ وَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَ دَعۡ اَذٰىهُمۡ وَ تَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰهِ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰهِ وَکِیۡلًا ﴿۴۸﴾ (سورہ احزاب۔۴۸،۴۵)

”اے نبی یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آپ کو (ان خصوصیتوں کے ساتھ مبعوث کیا ہے کہ) آپ شاہد ہیں (ایمان وعمل کے بہتر نتائج اور ان کی برکتوں کی) بشارت دینے والے، (انکار حق کے برے نتیجوں سے) آگاہ اور متنبہ کرنے والے اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف دعوت دینے والے اور (آپ ایک) چراغ ہیں نور پھیلانے والے (روشن کرنے والے) اور (اے نبی) اہل ایمان کو بشارت دیدے کہ ان کے لئے اللہ کی طرف سے بڑا فضل (اعزاز) ہے اور کہنا نہ مان منکروں اور منافقوں (دغابازوں) کا اور نظر انداز کردے ان کی ایذا رسانی کو اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ کافی کارساز ہے۔“

(۲)

توریت [1] میں آنحضرت ﷺ کے متعلق بشارت دی گئی تھی۔

یایھا النبی انا ارسلنٰک شاھداً و مبشراً ونذیراً، وحرزاً للامیین۔ انت عبدی و رسولی وسمیتك المتوکل لیس بغظ ولا غلیظ ولا صخاب فی الاسواق ولا یدفع بالسیئة السیئة ولکن یعفو ویغفر ولن یقبضه الله حتیٰ یقیم به الملة العوجاء۔ بان یقولوا لا اله الاالله و تفتح بھا اعین عمی و اٰذان صم وقلوبٌ غلف۔ (بخاری شریف ص ۲۸۵)

”اے نبی! یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آپ کو ان خصوصیتوں کے ساتھ مبعوث کیا ہے کہ آپ شاہد ہیں (ایمان وعمل کے بہتر نتائج اور ان کی برکتوں کی) بشارت دینے والے، (انکار حق کے برے نتیجوں سے) آگاہ اور متنبہ کرنے والے۔ پناہ اور محافظ ان کے جن کے یہاں پہلے کوئی نبی نہیں آیا تھا، تم میرے بندے

---

[1] حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ توریت کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ حضرت عطار بن یسار رضی اللہ عنہ نے ان سے دریافت کیا ”توریت میں آنحضرت ﷺ کا ذکر ہے یا نہیں“ اگر ہے تو آپ کے کیا اوصاف بیان کئے گئے ہیں؟“ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے توریت کے حوالہ سے یہ اوصاف بیان فرمائے۔ (بخاری ص ۲۸۵ باب کراہتہ الصخب فی الاسواق کتاب البیوع)

ہو۔ اور میرے رسول ہو میں نے تمہارا نام رکھا ہے المتوکل (اس متوکل کی شان یہ ہے) نہ بد خلق ہے، نہ سخت دل، نہ بازاروں میں شور و شغب کرنے والا، (یعنی نہ بازاری قسم کا غیر سنجیدہ)، برائی کا جواب برائی سے نہیں دیتا بلکہ در گزر کرتا ہے اور بخش دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس وقت تک (اس کی جان) قبض نہیں کریگا جب تک کہ اس کے ذریعہ اس ملت کو ٹھیک نہ کر دے، جس کو ٹیڑھا کر دیا گیا ہے۔ ٹھیک اس طرح کرے کہ وہ قائل ہو جائیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کلمہ سے ان کی اندھی آنکھیں، بہرے کان اور وہ دل جن پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں کھول دیئے جائیں۔"

مندرجہ بالا قرآن پاک کی آیت اور توریت کی بشارت میں آپ کی چند خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں۔

(ا) شاھدا:

گواہی دینے والا۔ شہادت [1] اور گواہی کا مدار مشاہدہ پر ہوتا ہے۔ یعنی قیاس اور گمان و تخمینہ کی بنا پر گواہی نہیں دی جاتی، بلکہ گواہی اس چیز کی دی جاتی ہے جو خود اپنی آنکھوں دیکھی ہو یا اپنے کانوں سے سنی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شاہد کو اس چیز کا یقین ہوتا ہے [2] جس کی وہ شہادت دے رہا ہے۔ اگر یقین نہ ہو محض گمان اور قیاس ہو تو شہادت دینا صحیح نہیں ہے۔ پس یہ لفظ شاہد ایک فلسفی اور نبی میں امتیاز پیدا کر دینے والا ہے۔

فلسفی کے پاس ایمان و یقین نہیں ہوتا۔ فلسفی کا سرمایہ محض فکر ہوتا ہے [3] (سوچ وچار، غور و خوص) یا تجربہ۔ [1] غور و خوص یا تجربہ سے جو نتیجہ بر آمد ہو، اس پر ایسا یقین نہیں ہوتا کہ وہ قسم [2] کھا سکے۔

نبی اس عالم کے فنا ہونے، قیامت اور محشر کے برپا ہونے پر قسم کھا سکتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہوتا

---

[1] الشهادة قول صادر عن علم حصل بمشاهدة بصيرة او بصر (المفردات فی غرائب القرآن للراغب رحمۃ اللہ)

[2] انما حقيقة الشهادة هو تيقن الشیء وتحققه من شهادة الشیء۔ اے حضورہ عینی شرح بخاری فی شرح کلمہ الاذان اشهد ان لا اله الا الله ص ۶۲۵ ج ۲)

[3] ۳۔ یونان اور ہندوستان کے فلاسفہ قدیم کے پاس محض فکر تھا۔ اسی فکر سے انہوں نے آسمانوں کی تحقیق کی ان میں تارے گڑے ہوئے سمجھے اور زمین کو ساکن اور آسمان کو متحرک مانا وغیرہ۔ آج ان سب باتوں کی تردید کی جارہی ہے حالانکہ یہی باتیں تھیں جن پر ایمان لانا فلاسفہ کے نزدیک ضروری تھا۔

[1] ماہرین سائنس کے پاس صرف تجربہ ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ بقول شاعر:

اے برادر بے نہایت در گہیست ہرچہ بروئے میرسی بروے ماست

[2] پس سائنس کی تمام تحقیقات ظنیات ہیں۔ خود ماہرین سائنس کو اعتراف ہوتا ہے کہ ان کی آج کی تحقیقات حرف آخر نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی نیا انکشاف اس تمام تحقیق کو فریب نظر قرار دیدے۔ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ (سورہ الانعام۔۱۱۶ و سورہ یونس آیت ۶۶)

ہے [3] کہ اس عالم کا آخری انجام قیامت ہے۔ فلسفی کے قیاس اور فکر میں اس عالم کا جو انجام بھی ہو اس پر قسم نہیں کھا سکتا کیونکہ اس کے پاس یقین کی مضبوطی اور ایمان کی روشنی نہیں ہے۔ اس کے پاس ظن، گمان ہے، تخمینہ اور اندازہ سے وہ یہی کہے گا۔ میری تحقیق یہ ہے ممکن ہے غلط ہو۔ چونکہ فلسفی نور یقین سے محروم ہوتا ہے تو وہ اپنے نظریہ کی دعوت بھی نہیں دیتا اور خود اس کا حوصلہ بھی پست رہتا ہے۔ نہ اس میں ذوق ایثار ہوتا ہے نہ شوق فدائیت، نہ جذبہ قربانی۔

اس کے برخلاف نبی جو کچھ کہتا ہے وہ شرح صدر [4] سے کہتا ہے، کیونکہ اس کے پاس یقین کا نور اور ایمان کی روشنی ہوتی ہے۔ وہ علم اور انکشاف کے اس دیدبان اور مینارہ پر ہوتا ہے، جہاں سے وہ غنیم کی فوجوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ جبکہ اہل شہر کو غنیم کا تصور بھی نہیں ہوتا اور فلسفی نے اگر کسی طرح اندازہ لگا لیا ہو کہ دشمن کی فوجیں قریب آگئی ہیں اور اس اندازہ کے عقلی دلائل بھی اس کے پاس ہوں تب بھی وہ اپنے اندر وہ جذبہ نہیں پاتا جو اس کو قربانی پر آمادہ کرے۔ نہ اس کے دل میں وہ دہشت ہوتی ہے جو اس کو بے چین اور مضطرب کر دے۔ کیونکہ اس کا یہ انداز تذبذب کی دلدل سے پاک اور آزاد نہیں ہوتا۔

جو شخص اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے کہ آگ کی خندق اس کے سامنے ہے اور وہ اس کے کنارے اس طرح کھڑا ہے کہ آگے قدم بڑھاتا ہے تو وہ ٹھیک خندق میں جاتا ہے۔ وہ صرف اپنے قدم کو آگے بڑھنے سے نہیں روکے گا۔ بلکہ وہ پوری قوت صرف کر دے گا کہ وہ اپنی جگہ جما رہے۔ اس کا قدم آگے نہ بڑھ سکے اور جس قوت سے وہ اپنے قدم کو آگے بڑھنے سے روکے گا اتنی ہی قوت سے وہ دوسروں سے بھی اصرار کرے گا کہ اس طرف نہ بڑھیں۔ اگر اس کو مزاحمت کرنی پڑے تو وہ مزاحمت میں بھی کمی نہیں کرے گا۔ یہاں تک کہ اگر اس مزاحمت میں اس کی جان بھی جاتی رہے تو وہ اس کو شہادت سمجھے گا کہ اس نے بے شمار مخلوق کے ساتھ خیر خواہی کی اور اپنی ایک جان دیکر بہت سی جانیں بچا دیں۔

یہ جذبہ، یہ جوش اور ولولہ فلسفی میں نہیں ہوتا۔ جبکہ نبی ہر آن اور ہر لحہ اس جذبہ سے سرشار رہتا

---

[3] اس کا مدار وحی پر ہوتا ہے یعنی اعلام خداوندی پر جو سراسر یقین ہوتا ہے کیونکہ خالق سے بڑھ کر اپنی مخلوق کا حال کسی کو نہیں معلوم ہو سکتا۔ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (سورہ الملک آیت ۱۴)

[4] اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ لَیُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِکَۃَ تَسْمِیَۃَ الْاُنْثٰی (النجم آیت ۲۳) وہ (فلسفی یا مشرکین) اپنے ظن کی اتباع کرتے ہیں اور ان خیالات کی جو ان کے نفس پیدا کرتے ہیں اور ان کو عقیدت کی حیثیت دیتے ہیں۔ نیز ارشاد ہے: اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (ایضاً آیت ۲۸) "وہ (فلسفی اور ماہرین سائنس اپنے فکر یا اپنے تجزیہ کی بنا پر۔ اور مشرکین اپنے دعوؤں کی چاہ اور ان عقائد اور خیالات کے بموجب جو خاندانوں میں پشتہا پشت سے چلے آرہے ہیں اور دلوں میں رچ گئے ہیں) ظن کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں اور جہاں حق کی غیر فانی سچائی اور اصل حقیقت کی ضرورت ہو وہاں یہ وہم و گمان کام نہیں آتا۔"

ہے۔ لفظ شاہد نے جس طرح محمد ﷺ کے یقین کامل [1] اور ایمان مکمل کی خبر دی اس نے یہ بھی بتادیا کہ داعی کے لئے لازم ہے کہ اس کے پاس وثوق کامل اور اعتماد ہو اور وہ متاع یقین کا سرمایہ دار ہو۔

(۲) مبشراً:

بشارت دینے والا۔ لفظ بشارت بشرہ سے ماخوذ ہے۔ کھال کے بیرونی اور ظاہری حصہ کو بشرہ کہتے ہیں۔ غیر معمولی خبر کا اثر بشرہ پر بھی پڑتا ہے۔ خوشی کی خبر سے بشرہ، کھل جاتا ہے اور رنج کی خبر سے ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ بسااوقات بشرہ کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔

(۳) نذیراً [2]

مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرنے والا۔ یہ دو لفظ دعوت کی اہمیت و عظمت کی طرف بھی اشارہ کررہے ہیں۔ یعنی اس کو مان لینا غیر معمولی خیر وبرکت کا ذریعہ ہو گا (جو بشارت عظیم ہے اہل ایمان کے لئے) اور انکار کرنا ایسا عمل ہو گا جس کا نتیجہ تباہ کن اور ہلاکت انگیز ہو گا۔ (یہ تنبیہ اور انذار واعلام ہے اہل کفر کے لئے)

(۴) داعیاً الی اللہ:

اللہ کی طرف بلانے والا۔ خدا کا نام لینے والے بہت ہیں۔ اسی طرح خدا کا نام لیکر تبلیغ کرنے والے بھی بہت ہیں۔

مگر کیا وہ واقعی خدا کی طرف بلاتے ہیں یا اپنے ذاتی نظریات وخیالات ک منشاء قدرت اور حکم خدا سمجھے ہوئے ہیں اور ان کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں۔ یا یہ صورت ہے کہ اپنی اغراض کی خاطر دعوت و تبلیغ کا بازار لگار کھاہے اور دین کے نام پر دنیا کمارہے ہیں۔ داعیاً الی اللہ کے بعد باذنہ کے لفظ نے وضاحت کردی کہ آپ جو پیغام یا تعلیم پیش کرتے ہیں وہ منجانب اللہ ہے اور اسکے حکم سے ہے۔ آپ کے ذاتی نظریات نہیں ہےں۔

---

[1] یہی یقین کامل اس شہادت کی بنیاد ہو گا جو انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں کے حق میں نافرمان قوموں کے بر خلاف اور محمد رسول اللہ ﷺ جملہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں جملہ اقوام عالم کے بر خلاف قیامت کے روز دینگے۔ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا۔ (سورہ ۴ نساء آیت ۴۰)

[2] النذر الانذار۔ اخبار فیہ تخویف کما ان التبشیر اخبار فیہ سرور (المفردات فی غریب القرآن)

(۵) باذنہٖ

کسی مملکت کا پیغام مملکت کی طرف سے نہیں مانا جاتا جب تک پیغام دینے والا مجاز نہ ہو۔ سفراء پہلے سند سفارت پیش کرتے ہیں اس کے بعد ان کو اجازت ہوتی ہے کہ اس مملکت میں سفارتی فرائض انجام دے سکیں۔ باذنہ کے لفظ نے ایک سند عطا فرمادی کہ آپ کو اللہ کی طرف سے مجاز کی حیثیت حاصل ہے گویا اس فرض اور اس خدمت کے لئے آپ لائسنس دار ہیں۔

(٦) سراجاً منیراً:

چراغ، روشنی بخشنے والا۔ کہتے ہیں کہ آفتاب سراسر آگ ہے اور چاند اگرچہ روشن ہے مگر اس کا نور اپنا نہیں۔ وہ آفتاب کی عکاسی کرتا ہے لیکن چراغ کی چند خصوصیتیں ایسی ہیں جو آفتاب میں ہیں نہ چاند میں
۔

سب سے پہلی خصوصیت وہ سوز و گداز ہے جو نہ آفتاب کو میسر ہے نہ چاند کو۔ دوسری خصوصیت یہ کہ چراغ شریک محفل ہوتا ہے جب کہ آفتاب اور چاند بزم انسان سے لاکھوں میل دور ہیں۔

تیسری خصوصیت فیض رسانی اور تکمیل تربیت ہے۔ آپ چراغ کی ٹمٹماتی بتی سے بے شمار چراغ جلاسکتے ہیں اور قندیل روشن کرسکتے ہیں، جبکہ آفتاب جہاں تاب نے آج تک کسی دوسرے کو آفتاب نہیں بنایا اور نہ چاند اپنے وجود سے کوئی دوسرا چاند بناسکا۔

(۴) چراغ کی حقیقت مٹی یا روئی کا وہ گالا ہے۔ جس سے اس کی بتی بنائی جاتی ہے۔ مٹی میں آگ نہیں لگتی روئی آگ پکڑتی ہے، مگر شعلہ نہیں بناسکتی۔ پس چراغ کی ہستی اور اس کی روشنی کا سرمایہ وہ تیل ہے جو چراغ روشن کرنے والا اس کے ظرف میں بھر دیتا ہے۔

یہ ہیں چراغ کی خصوصیتیں۔ ان خصوصیتوں کے ملاحظہ کے بعد آیت پر نظر ثانی فرمایئے۔ آیت میں داعیاً الی اللہ کے بعد سراجاً منیراً فرما کر اس حقیقت کو طشت از بام فرمادیا کہ

(الف) محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا سرمایہ وحی الٰہی کا وہ روغن ہے جو اس کے تن بدن سے پیوست ہے بلکہ وہ روغن کہ داعی کا تن بدن اس کی تراوٹ میں غرق ہے۔ اس کا نور تمام تر اسی کا فیض ہے۔[1]

(ب) داعی کی دعوت شاعرانہ تفریح نہیں بلکہ شعلہ ہے اس سوزش[2] کا جو اس کے بدن کو پگھلا رہی ہے۔ یہ سوزش، ہمدردی، نوع انسان کی سوزش ہے۔ انسان اپنے اعمال کے نتائج سے غافل ہے، یہ نبی

---

[1] وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم۔۴،۵) وقال رسول اللہ ﷺ انما انا قاسم واللہ یعطی

[2] لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ ۔ (شعراء۔۳)

ان کو دیکھ رہا ہے اور پگھل رہا ہے۔ [3]

(ج) اہل محفل مشغول ہیں مگر چراغ اپنا کام برابر کر رہا ہے۔ [4]

(د) سورج اور چاند روشنی بخشتے ہیں مگر ایثار اور قربانی کا سبق نہیں دیتے۔ یہ خصوصیت چراغ کی ہے کہ اس کی بتی جل کر فنا ہو رہی ہے اور ہر ایک داعی کو داعیانہ جہاد میں فنا ہونے کا سبق دے رہی ہے۔ یعنی داعی کی دعوت اس وقت نور بخش ہو سکتی ہے جبکہ خود داعی سوز و گداز بن جائے۔ اپنے تن بدن کو مقاصد دعوت کے لئے قربان کر دے۔ اور اس ایثار اور قربانی کو اپنے وجود کا مقصد اعظم اور اپنے ظہور کی آخری غرض و غایت بنا لے (حقیقت یہ ہے کہ محمد ﷺ کی پوری سیرت اسی لفظ سراجاً منیراً میں سموئی ہوئی ہے۔ آپ سیرت مقدسہ کا جتنا گہرا مطالعہ کریں گے آپ کا ضمیر اس کی شہادت دیتا رہے گا۔

(ہ) ارشاد ربانی ہے:

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (سورہ احزاب، ۴۰)

ترجمہ: "نہیں ہیں محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبین ہیں [5] (سب کے ختم پر ہیں)"

یعنی بقول حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اللہ کے رسول ہیں۔ اس حساب سے سب آپ کے بیٹے ہیں۔ (موضح القرآن) اگر آپ کے بعد کوئی اور نبی آتا تو نوع انسان کا یہ تعلق اس سے ہو جاتا۔ مگر چونکہ آپ خاتم الانبیاء ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آنے والا، تو آپ کا یہ تعلق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ اسی سورہ احزاب میں پہلے یہ ارشاد ہوا ہے:

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ وَ اَزْوَاجُہٗٓ اُمَّھٰتُھُمْ (ع ۱، آیت ۶)

ترجمہ: نبی سے لگاؤ ہے، ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے اور اس کی عورتیں ان کی (مومنین کی) مائیں ہیں۔

---

[3] حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ آپ وقت سے پہلے بوڑھے ہوگئے۔ فرمایا: مجھے سورہ ھود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔ (شمائل ترمذی ص ۴) ان سورتوں میں ان ناعاقبت اندیش انسانوں کے نتائج بد بیان کئے گئے ہیں جنہوں نے انبیاء کی دعوت سے گریز کر کے کفر کی راہ اختیار کی۔ ان نتائج کے صدمہ نے آپ کو بوڑھا بنا دیا۔

[4] یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ (مائدہ۔۱۰)

[5] خاتم کے معنی ہیں مہر، اسی لئے حضرت شاہ عبد القادر صاحبؒ نے ترجمہ کیا ہے: مہر سب نبیوں پر یعنی جس طرح مہر آخر میں ہوتی ہے اور مہر لگا دینے کے معنٰی ہوتے ہیں ختم کر دینا اور اس سلسلہ کو بند کر دینا، ایسے ہی آپ کے بعد نبی بنانے کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ کوئی نبی نہیں بنایا جائے گا۔ باقی عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری ہوگی تو آپ کی نبوت نئی نہیں ہوگی بلکہ آپ کی نبوت وہی ہوگی جو آپ کو آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے تقریباً چھ سو سال پہلے عطا ہوئی تھی۔ آپ کی نبوت وہی ہے۔ البتہ دور محمدی میں آپ تشریف لائیں گے تو شریعت محمدیہ پر عمل کریں گے کیونکہ اس دور کا تقاضا یہی ہے۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

تشریح: آیت کا اشارہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی شفقت باپ سے بھی زیادہ ہے۔ اسی لئے جب ازواج مطہرات کو امت کی مائیں قرار دیا گیا تو یہ نہیں فرمایا گیا کہ آپ امت کے باپ ہیں کیونکہ باپ کی شفقت رشتہ پدری میں محدود ہوتی ہے اور آنحضرت ﷺ کی شفقت ان حدود سے بہت بالا ہے۔ ہمارے الفاظ اس کی کوئی حد نہیں بیان کرسکتے۔ البتہ عمل سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمادیا کہ اگر کوئی مفلس مسلمان وفات پاجائے اور ترکہ کے بجائے اس کے ذمہ دار قرض ہو اور اس کے لاوارث بچے ہوں جن کا کوئی پرسان نہ ہو تو اس کا قرض آنحضرت ﷺ ادا فرمائیں گے اور اس کے بچوں کی ذمہ داری بھی آنحضرت ﷺ کے اوپر ہوگی۔ آپ ان کے مربی بھی ہونگے اور متکفل بھی ہوں گے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان ترکہ چھوڑ کر وفات پاتا ہے تو اس کا ترکہ اس کے وارثوں پر تقسیم ہوگا۔ (رشتہ کا باپ ترکہ میں حصہ دار ہوتا ہے) مگر آنحضرت ﷺ نے ترکہ میں سے کوئی حصہ نہیں لیا۔ البتہ لاوارث بچوں کی اور مرنے والے کے قرض کی ذمہ داری لے لی۔ (بخاری شریف وغیرہ) اس لئے کہ آپ کی شفقت، شفقت پدری کی حدود سے آگے بڑھی ہوئی تھی۔

ہدایات

وہ نبی جس کو ان خصوصیات کے ساتھ مبعوث کیا گیا تھا، اس آیت کے دوسرے حصہ میں اس کو چند ہدایات فرمائی گئی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

(ا) پہلی ہدایت :

اہل ایمان کو بشارت دیدیجئے کہ ان کے لئے اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل (اعزاز) ہے۔

تشریح: اس ہدایت میں (الف) جس طرح طریقہ دعوت و تبلیغ کی تلقین ہے کہ داعی الی اللہ کو تخویف و ترہیب (ڈرانے، دھمکانے اور مرعوب کرنے) کے بجائے ترغیب اور تشویش کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے یعنی خدا کے قہر و غضب کے تذکرہ سے پہلے ان نعمتوں اور ان فوائد کو ذہن نشین کرانا چاہئے جو دعوت کے قبول کرنے پر صاحب ایمان کو میسر آئیں گے۔

(ب) اور جس طرح حوصلہ افزائی ہے ان اہل ایمان کی جو دعوت قبول کر رہے ہیں۔

(ج) اسی طرح پیشن گوئی ہے ان امتحانات کی جو دعوت قبول کرنے والوں کے ہوا کرتے ہیں جن کی بنا پر اللہ کے یہاں ان کا اعزاز [1] ہوتا ہے۔ سورہ بقرہ آیت ۲۱۴ میں فرمایا گیا ہے۔ [2]

---

[1] یعنی جب فضل و اعزاز کی بشارت ہے تو لا محالہ ان امتحانات کی بھی پیشن گوئی ہے جن میں کامیاب ہونے پر فضل و اعزاز کا تمغہ ملتا ہے۔

"کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ (محض ایمان کا زبانی دعویٰ کر کے) تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تو تمہیں وہ آزمائشیں ہی نہیں آئی ہیں جو تم سے پہلے لوگوں کو پیش آچکی ہیں۔ ہر طرح کی سختیاں انہیں بھگتنی پڑیں۔ ہولناک مصائب سے ان کو جھنجھوڑا گیا، یہاں تک کہ اللہ کے رسول اور جو لوگ ایمان لائے تھے پکار اٹھے، اے نصرت خداوندی تیرا وقت کب آئے گا۔ (تب اچانک پردہ غیب چاک ہوا اور خداوند عالم کی نصرت یہ کہتی ہوئی نمودار ہو گئی) ہاں گھبراؤ نہیں خدا کی نصرت تم سے دور نہیں ہے۔

اس عام ضابطہ قدرت کے علاوہ خاص اس امت کو بھی آگاہ کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سورہ بقرہ کی آیات [3] ۱۵۴ تا ۱۵۷ جن کا ترجمہ یہ ہے:

"یاد رکھو یہ ضرور ہونا ہے کہ ہم تمہارا امتحان لیں۔ خطرات کا خوف، بھوک کی تکلیف، مال و جان کا نقصان، پیداوار کی تباہی، وہ آزمائشیں ہیں جو تمہیں ضرور پیش آئیں گی۔ پھر جو لوگ صبر کرنے والے ہیں انہیں (فتح و کامرانی) کی بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں جب کبھی کوئی مصیبت ان پر آتی ہے (تو بے قرار اور بدحواس ہونے کے بجائے ذکر الٰہی سے اپنی روح کو تقویت پہنچاتے ہیں اور ان کی زبان حال کی صدا یہ ہوتی ہے کہ) انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم اللہ کے ہیں (ہماری زندگی اور موت، رنج و غم، سود و زیان جو کچھ بھی ہے سب اللہ کے لئے ہے اور ہم سب کو بالآخر مرنا اور) اس کی طرف لوٹنا ہے۔ سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے الطاف و کرم ہیں جن پر ان کے رب کی رحمت اترتی ہے اور یہی ہیں جو اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ (سورہ بقرہ آیت ۱۵۴ تا ۱۵۷)

(۲) دوسری ہدایت:

اور کہنا نہ مان منکروں اور منافقوں کا۔

سورہ الدھر کی آیت ۲۴ میں یہ ارشاد ہے:

"آپ اپنے پروردگار کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہیئے۔"

ان (دشمنان دین) میں سے کسی گنہگار اور ناشکرے کا کہنا مانئے۔

بیشک داعی الی اللہ، اللہ کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہے گا۔ وہ غیر اللہ کے حکم کی تعمیل نہیں

---

[2] اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ (سورہ بقرہ۔ ۲۱۴)

[3] وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَىۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۙ قَالُوۡٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ (سورہ بقرہ۔ ۱۵۵ تا ۱۵۷)

کرے گا۔ ان سے قطع تعلق کریگا۔ مگر یہ قطع تعلق خاص رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہو گا۔ دل آزاری کے ساتھ نہیں ہو گا، کیونکہ جس رب کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہا ہے اس کا حکم یہ بھی ہے کہ

"یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو، اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ" (سورہ ۷۳ مزمل، آیت ۱۰)

(۳) تیسری ہدایت :

وَدَعْ أَذٰىهُمْ۔ (احزاب۔۴۸) نظر انداز کردے ان کی ایذارسانی کو یعنی معاف کرو، درگزر کرو، صبر و ضبط اور تحمل سے کام لو، داعی الی اللہ کی یہی شان ہے اور یہی اس کا فرض ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۸۵ میں فرمایا گیا ہے [1]

"یاد رکھو ایسا ہونا ضروری ہے کہ تم جان و مال کی آزمائشوں میں ڈالے جاؤ، یہ بھی ضرور ہونا چاہے کہ اہل کتاب اور مشرکین عرب سے تمہیں دکھ پہنچانے والی باتیں بہت کچھ سننی پڑیں، اگر تم نے صبر کیا (یعنی مصیبتوں میں ثابت قدم رہے) اور تقویٰ کا طریقہ اختیار کیا۔ (اللہ تعالیٰ کے احکام کی پوری تعمیل کی اور نافرمانی سے پوری احتیاط برتی) تو بلاشبہ یہ ہونگے بہت (بڑے حوصلہ) کے کام۔"

(۴) چوتھی ہدایت :

---

[1] حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت جس کو بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں ص ۶۵۶ اور باب کنیۃ المشرک میں ص ۹۱۶ پر تفصیل سے نقل کیا ہے۔ اس کے آخری الفاظ سے یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت تک تھا جب تک جہاد کی اجازت نہیں ہوئی تھی اس کے بعد یہ حکم نہیں رہا۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں یہ حکم ہمیشہ کے لئے ہے۔ چنانچہ سورہ توبہ میں جہاں یہ حکم ہے فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ (آیت ۵) "جب حرمت کے مہینے گذر جائیں تو جنگ کی حالت قائم ہو جائے گی اس وقت مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو" اس آیت کے بعد اگلی آیت یہ ہے۔ وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ آیت ۶ یعنی "اے نبی اگر مشرکوں میں سے کوئی آدمی آئے اور تم سے امان مانگے تو اسے ضرور امان دو یہاں تک کہ وہ (اچھی طرح) اللہ کا کلام سن لے، پھر اسے امن کے ساتھ اس کے ٹھکانے پر پہنچادو (اسلام قبول کرے یا نہ کرے)"

دراصل حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا تعلق پورے واقعہ سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب تک جہاد کی اجازت نہیں ہوئی تھی اور صرف صبر ہی کی ہدایت تھی تو اس وقت تک عبداللہ بن ابی بن سلول اور ان کی پارٹی کے آدمی کھلے بندوں آنحضرت ﷺ کی مخالفت کیا کرتے تھے، جو بسا اوقات توہین آمیز ہوتی تھی اور جب جہاد کی اجازت ہو گئی اور غزوہ بدر میں مسلمانوں کو فتح بھی حاصل ہو گئی تو ان لوگوں نے ظاہر داری کے لئے اسلام قبول کر لیا اور کھلم کھلا مخالفت کے بجائے درپردہ سازشیں شروع کر دیں۔

اللہ پر بھروسہ کر۔ یعنی جملہ ذرائع استعمال کرو۔ ذرائع کا مہیا کرنا بھی فرض ہے مگر بھروسہ ذرائع پر نہ ہو، بھروسہ خدا پر ہو کہ ہدایت بخشنا اس کا کام ہے، وہی جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔

اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ‌ۚ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ

(سورہ القصص آیت ۵۶)

"تم جس کو چاہو راہ راست پر نہیں لگا سکتے، اللہ جس کو چاہے راہ راست پر لگا دیتا ہے اور ہدایت پانے والوں کا پورا علم اسی کو ہے۔"

سیرۃ مبارکہ کا اہم اور اصل جز دعوت ہے۔ داعی کی حیثیت سے آپ کے اوصاف و خصائل سطور بالا میں بیان کئے گئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر دعوت کے آداب اور طریقہ کار بھی بیان کر دیا جائے۔ یہ بھی سیرت مبارکہ کا سب سے مقدم باب ہے۔ آئندہ سطور میں آداب اور طریقہ کار بیان کیا جا رہا ہے جو وحی الٰہی نے مقرر فرمایا ہے۔

آداب دعوت و طریقہ کار

(۱)

(الف) اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ‌ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ‌ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ‌ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۱۲۵﴾ وَاِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِهٖ‌ ؕ وَلَـئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَهُوَ خَيۡرٌ لِّلصّٰبِرِيۡنَ‏ ﴿۱۲۶﴾ وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ‌ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَلَا تَكُ فِىۡ ضَيۡقٍ مِّمَّا يَمۡكُرُوۡنَ‏ ﴿۱۲۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيۡنَ هُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ ﴿۱۲۸﴾ (النحل۔ ۱۲۵ تا ۱۲۸)

"اے نبی اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ اس طرح کہ حکمت اور دانشمندی کی باتیں بیان کرو اور اچھے طریقہ پر پند اور نصیحت کرو۔ اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو تو (وہ بھی) ایسے طریقہ پر کہ وہی طریقہ سب سے بہتر (اور زیادہ سے زیادہ حسن و خوبی) کا طریقہ ہو۔ تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کون راہ راست پر ہے اور مخالفوں کی سختی کے جواب میں اگر سختی کرو تو چاہیئے کہ ویسی ہی اور اتنی ہی کرو جیسی تمہاری ساتھ کی گئی اور اگر تم نے صبر کیا یعنی جھیل گئے اور سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کے لئے صبر ہی بہتر ہے۔ اے پیغمبر صبر کر اور تیرا صبر کرنا نہیں ہے مگر اللہ کی مدد سے۔ اور ان لوگوں کے حال پر غم نہ کھا، نہ ہی ان کی مخالفانہ تدبیروں سے دل تنگ ہو۔ یقیناً اللہ انہیں کا ساتھی ہے جو متقی ہیں اور نیک عملی میں سرگرم رہتے ہیں۔"

(ب) خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ (سورہ اعراف،۱۹۹،۲۰۰)

"درگزر اور معافی کا طریقہ اختیار کر، نیک کام کو کہہ اور کنارہ کر جاہلوں (نادانوں) سے اور اگر ابھار دے تجھ کو شیطان کی چھیڑ (یعنی اگر ایسا ہو کہ کسی بات پر جھونجل آجائے جو یقیناً شیطان کی حرکت ہو گی، داعی الی اللہ کو جھونجل نہ آنی چاہئے) تو فوراً اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ، اس کی پناہ پکڑو (جھونجل کو ختم کر دو) بلاشبہ اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔" (سورہ ۷ الاعراف، آیت ۱۹۹)

تشریح: ذہنی صلاحیت ہر ایک کی یکساں نہیں ہوتی۔ کوئی صاحب علم و دانش ہوتا ہے کوئی سادہ طبیعت اور کوئی کھود کرید اور بحث و مباحثہ کا شوقین ہوتا ہے۔ ان آیات کا اشارہ یہ ہے کہ داعی الی اللہ کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ مخاطب کی ذہنیت کو پرکھے، اگر وہ صاحب علم و دانش ہے تو اس کو عالمانہ اور دانش مندانہ دلائل (حکمت) سے سمجھائے۔ عوام کے لئے ہمدردانہ نصیحت اور وعظ و پند سے کام لے۔ اور بحث کے شوقین سے بحث بھی کر سکتا ہے مگر اس طرح کہ پہلے مخاطب کو سمجھے پھر وہ انداز اختیار کرے جو حق بات کے سمجھنے اور سمجھانے کا ہوتا ہے، جس سے مخاطب میں یقین پیدا ہو۔ اس کے دل کی گرہ کھلے، ایسی کوئی بات نہ ہو جس سے اس کا دل دکھے۔ اپنی حق پرستی کا زعم اور گھمنڈ اور اس کی باطل پرستی کی تحقیر و تذلیل کا انداز ہرگز نہ ہو۔ دل پر خوف خدا غالب رہے کہ دلوں کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔ گمراہ اور ہدایت یافتہ کو وہی خوب پہنچانتا ہے۔ اپنے انجام کی خبر کسی کو نہیں۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کس کا انجام کیا ہو گا۔ داعی الی اللہ کے لئے یہ بھی درست نہیں کہ وہ مخالف کی مخالفانہ حرکتوں سے دل تنگ ہو۔ اس کے مزاج میں جھونجل بھی نہ آنی چاہئے۔ اگر مخالف کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے تو اجازت ہے کہ اس کا جواب دے سکتے ہو مگر نپا تلا کہ اس میں داعی اور مبلغ کی طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو مگر صرف یہ اجازت ہے۔ داعی کی شان یہ نہیں کہ وہ بدلہ لے۔ اس کا کام ہے عفو و درگزر اور ضبط و تحمل، صبر، اس کا یہ صبر اللہ کے لئے ہے اور اللہ کی مدد سے ہے۔ لہٰذا داعی کا فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ اس کے ظرف میں وسعت، نگاہ میں بلندی عطا فرما کر اس کی مدد کرے۔ اس کو یقین رکھنا چاہئے کہ اگر وہ احتیاط اور تقویٰ سے کام لے رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے، اس کا حامی اور مددگار ہے۔

(۲)

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾ (آل عمران۔۱۸۶)

"ایسا ضرور ہونا ہے کہ تم جان و مال کی آزمائشوں میں ڈالے جاؤ۔ یہ بھی ضرور ہونا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے تمہیں دکھ پہنچانے والی باتیں بہت کچھ سننی پڑیں۔ اگر تم صبر

(ضبط و تحمل) سے کام لو اور پرہیز گاری کرو (تقوے سے کام لو) احکام حق کی نافرمانی سے بچو تو یہ ہیں ہمت کے کام۔"

داعی کے اوصاف و خصائل کے سلسلہ میں تیسری ہدایت گزر چکی ہے۔ وَدَعْ اَذٰىھُمْ۔ "نظر انداز کردے ان کی ایذا رسانی کو۔"

سوال یہ ہو سکتا ہے کہ نظر انداز کب تک کرتا رہے، اس کا جواب اس آیت سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کب تک کی کوئی حد ہی نہیں۔

چاہتے ہو کہ حق کا بول بالا ہو تو یہ تمنا آسان نہیں ہے۔ باطل تمہارے مقابلہ میں ضرور آئے گا۔ پوری قوت سے آئے گا، اور آتا رہے گا جب تک دنیا میں نور و ظلمت، اندھیری اور اجالا ہے، حق و باطل کی جنگ بھی جاری ہے اور پیروان دعوت حق کے لئے یہ امتحانات بھی باقی ہیں۔ داعی الی اللہ کی کامیابی یہی ہے کہ ان امتحانات میں وہ کامیاب ہو۔ ہدایت دینا اور بھٹکے ہوؤں کو راہ راست پر لانا خدا کا کام ہے۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو دعوت اور طریقہ دعوت

اہل کتاب:

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران۔۶۴)

"(اے نبی) تم اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے کہدو: اے اہل کتاب (اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑدو) اس بات (اصول) کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے دونوں کے لئے یکساں طور پر تسلیم شدہ ہے یعنی یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی کی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ ہم میں سے ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے گویا خدا کو چھوڑ کر اسے اپنا پروردگار بنالیا ہے۔"

وجہ اختلاف:

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِى الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ
اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۷﴾ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾ (سورہ ۲۲ الحج رکوع ۹)

"اے نبی ہم نے ہر امت کے لئے عبادت کا ایک طور طریقہ ٹھہرا دیا ہے۔ جس پر وہ چل رہی ہے۔ بس لوگوں کو اس معاملہ میں (یعنی اسلام کے طور طریق میں) تجھ سے جھگڑنے کی کوئی

وجہ نہیں، تو اپنے پروردگار کی طرف لوگوں کو دعوت دے (کہ اصل دین یہی ہے) یقیناً تو ہدایت کے سیدھے راستہ پر چل رہا ہے۔ اگر (اس پر بھی) لوگ تجھ سے جھگڑا کریں تو کہدے کہ اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ تم جن باتوں میں آپس میں اختلاف کر رہے ہو، قیامت کے دن وہ تمہارے درمیان فیصلہ کر کے حقیقت حال آشکارا کر دیگا۔"

تشریح: ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کا اسلوب اور طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ

(الف) ان باتوں کو مقدم رکھا جائے جن کو مخاطب بھی مانتے ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ ہونی چاہئے غیر اللہ کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرنا چاہئے کہ معلوم ہو کہ خدا کو چھوڑ کر ان کو معبود مان لیا ہے۔ اس کو اہل کتاب بھی مانتے ہیں لہذا پہلے اسی پر زور دیا جائے۔

(ب) یہ سمجھایا جائے کہ اللہ ایک ہے تو اس کا دین بھی ایک ہی ہے، اس کی بنیادی باتیں بھی ایک ہی ہیں، عبادت کا حکم ہمیشہ رہا، اختلاف اس کے طور و طریق میں ہوا۔ کیونکہ ہر ایک عہد اور ہر ایک دور اور ہر ایک قوم کی حالت یکساں نہیں تھی۔ جس کی جیسی حالت اور جیسی صلاحیت اور قابلیت تھی اس کے مطابق اس کو طور طریق دیا گیا جو ہر دور میں ترقی کرتا اور آگے بڑھتا رہا۔ بس یہ اختلاف فطری اور قدرتی تھا جو واقع ہوا۔

(ج) دعوت دینے والے کے دل میں دوسرے مذہب کے طریقوں کا یہ احترام ہو کہ وہ سمجھے کہ بنیادی طور پر وہ من جانب اللہ تھے تو اس سے اس کے انداز دعوت میں لامحالہ لچک ہو گی، دوسری طرف جن کو دعوت دی جارہی ہے ان کو بھی اس دعوت سے وحشت نہ ہو گی کیونکہ وہ سمجھے گا کہ یہ دعوت پہلی بنیادوں کو اکھاڑ نہیں رہی بلکہ ان کو اپنی جگہ تسلیم کرتے ہوئے تعمیر میں اضافہ کر رہی ہے۔

(د) ان حقیقتوں کو ذہن نشین کرانے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ مخاطب یہ اثر لیں گے کہ جب سابق امتوں میں ان کی صلاحیتوں کے بموجب عبادت کے قواعد و قوانین میں فرق ہوتا رہا ہے تو ترقی یافتہ حالات کے مطابق اگر کوئی طریقہ معین کیا گیا، جو مکمل اور آخری طریقہ ہے، تو وہ بھی قابل تسلیم ہونا چاہئے اس سے وحشت نہ کرنی چاہیئے۔

(ہ) پس تقاضا انصاف یہ ہے کہ سابق امتوں کے لوگ (اہل کتاب) اس دعوت کو اختلاف اور نزاع کا نشانہ نہ بنائیں بلکہ اس کو پرکھیں، حقیقت پسندی سے کام لیں اور صداقت کو تسلیم کریں۔

(و) لیکن اگر مخاطب لوگ تمام حقیقتوں کو پس پشت ڈال کر نزاع کرنا اور جھگڑنا ہی پسند کریں تو داعی الی اللہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ بھی ان کی طرح ضد، عناد اور نزاع میں پڑے بلکہ وہ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا

تَعْمَلُوْنَ (الحج۔۶۸)[1] کہہ کر الگ ہو جائے اور ان کا معاملہ خدا کے حوالے کر دے کہ قیامت کے دن وہی ان نزاعات کا فیصلہ کرے گا۔ واللہ اعلم

اھل شرک:

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۗ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۷﴾ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

(الانعام۔۱۰۶تا۱۰۸)

(اے نبی) تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر وحی کی گئی ہے، تم اس کی پیروی کرو کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف اسی کی ذات۔ اور کنارہ کرو مشرکین سے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو (وہ اس کی قدرت رکھتا ہے کہ انسان کو اس طرح بنا دیتا کہ سب ایک ہی راہ پر چلنے والے ہوتے اور) یہ لوگ شرک نہ کرتے (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ مشیت خداوندی کا یہی فیصلہ ہوا کہ ہر انسان) اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ رکھے۔ پس تمہارا کام یہی ہے کہ سچائی کی راہ دکھا دو۔ (انہیں جبراً اپنی راہ پر چلانا تمہارا کام نہیں ہے) ہم نے تمہیں نہ تو ان پر پاسبان بنایا ہے (کہ ان کی رائے اور عمل کی نگرانی کرو) اور نہ تمہارے حوالہ ان کی ذمہ داری ہے (کہ ان کے نہ ماننے کا کوئی الزام تم پر آئے)۔

اور (مسلمانو!) جو لوگ خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں تم ان کے معبودوں کے متعلق بدکلامی نہ کرو کہ پھر وہ بھی حد سے بڑھ کر بے سوچے سمجھے خدا کو برا بھلا کہنے لگیں۔ ہم نے اسی طرح ہر قوم کیلئے اس کے کاموں کو خوش نما بنا دیا (کہ ہر قوم اپنی راہ رکھتی ہے اور اپنی ہی راہ اسے اچھی دکھائی دیتی ہے) پھر آخر سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے۔ اس وقت وہ ان سب پر ان کے کاموں کی حقیقت کھول دے گا جو وہ (دنیا میں) کرتے رہے ہیں۔ "

تشریح: یعنی یہ تو حقیقت ہے کہ شرک ظلم عظیم ہے[1]۔ شرک کرنے ولا خدا پر ظلم نہیں کرتا بلکہ خود اپنے اوپر بہت بڑا ظلم کرتا ہے کہ اپنی عظمت اور اپنی خودداری کو خود ہی پامال کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بلندی پر ہو پھر خود اپنے کو پستی کے گڑھے میں گرا دے، جہاں اس کو مردار خور پرندے تکا

---

[1] تمہارے عمل کو جو تم کر رہے ہو خدا خوب جانتا ہے۔

[1] سورہ ۳۱ لقمان آیت ۱۳

بوٹی کر دیں یا ہواؤں کے جھونکوں کی لپیٹ میں آکر برباد ❷ ہو جائے۔ اس ظلم عظیم کا نتیجہ لامحالہ ہے کہ شرک کے لئے بخشش کی گنجائش نہیں ❸۔ اور مشرک کا جنت میں داخل ہونا ایسا ہی ہے جیسے اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا۔ ❹ لیکن ان تمام قباحتوں اور نفرت انگیز خرابیوں کے باوجود داعی الی اللہ کے انداز میں نفرت اور تحقیر و تذلیل کی جھلک نہ ہونی چاہئے۔ وہ جب دعوت دے تو اس کی نظر اس پر ہونی چاہئے کہ اس کائنات میں رنگ برنگی اس کے خالق اور پروردگار کی حکمت و قدرت کاملہ کا تقاضا ہے۔ اس چمن کی رونق ہی گلہاء رنگارنگ سے ہے۔ اور اس کی زیبائش نہیں نکھرتی جب تک اس میں خاردار درخت اور پودے نہ ہوں۔ پھر ظاہر ہے کہ پھول پھول ہے۔ کانٹا کانٹا ہے۔ پھول کا جو مقام ہے وہ کانٹے کو میسر نہیں ہو سکتا۔ مگر چمن کی کیاریوں میں جس طرح پھول کا پودا اپنی تازگی میں مست ہے۔ کانٹے کا جھاڑ بھی مگن ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سارا چمن اسی کا ہے اور اسی کیلئے ہے۔ اس جھاڑ سے اگر پوچھا جائے تو اسے اس کا احساس نہیں کہ وہ کانٹا ہے اور دنیا کی نگاہوں میں ذلیل ہے۔ اسے اگر اس کا احساس ہوتا تو وہ چمن کی کیاری کے پاس بھی نہ جاتا، بلکہ اس کی نظر میں کچھ اپنی خوبیاں ہیں۔ اس کو احساس ان خوبیوں کا ہے۔ اسی لئے وہ چمن کی کیاری میں پھوک کے پودے سے زیادہ سینہ زور ہے اور اپنی آن میں مست ہے۔ پس داعی الی اللہ کا فرض ہے کہ دعوت اور تبلیغ کے وقت وہ اس فلسفہ قدرت کو سامنے رکھے۔ اگر وہ کانٹے کی اصلاح چاہتا ہے تو اس کو خار ہونے کا طعن دیکر اصلاح نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کی اصلاح جب ہوگی جب اس ذہنیت کی اصلاح ہو کہ وہ کانٹا ہے مگر اپنے آپ کو پھول کا ہمدوش سمجھتا ہے بلکہ خیابان پر پھول سے زیادہ اپنا حق جتاتا ہے۔

آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو انسان کو بھی حیوانات کی طرح بنا دیتا کہ سب اپنی حالت میں ایک ہی طرح کے ہوتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں چاہا۔ اس نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر گروہ میں اپنی اپنی رائے اور اپنی اپنی پسند رکھتا ہے اور ہر گروہ کی نظر میں وہی کام اچھا ہے جو وہ کر رہا ہے۔ تمہاری نظر میں اس کی راہ کتنی ہی بری ہو، لیکن اسکی نظر میں وہ ایسی اچھی ہے جیسی تمہاری راہ تمہاری نظر میں۔ پس ضروری ہے کہ اس بارے میں برداشت اور رواداری سے کام لو۔ جو لوگ شرک و بت پرستی میں مبتلا ہیں تم انہیں دعوت حق دو مگر برا بھلا نہ کہو۔ اگر تم ان کے بتوں کو برا بھلا کہو گے تو وہ بھی خدا کو برا بھلا کہیں گے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم انہیں گالیاں دو گے وہ تمہیں گالیاں دینگے۔ طلب حق کی بات نہیں رہے گی۔ گالی گلوچ کی بات ہو جائے گی۔

---

❷ سورہ ۲۲ الحج آیت ۳۱

❸ سورہ ۴ نساء آیت ۱۱۵

❹ سورہ ۷ الاعراف آیت ۳۹

لامذہب کے منکر پرست اور خدا کے منکر (معاذ اللہ):

هُوَالَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰۤی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ لَىِٕنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

(سورہ یونس آیت ۲۲و۲۳)

"وہی ہے جس نے تمہارے لئے سطح زمین پر اور سمندر میں سیر وسیاحت کا سامان کر دیا ہے۔ پھر جب ایسا ہوتا ہے کہ تم جہازوں میں سوار ہوتے ہو اور جہاز موافق ہوا پاکر تم کو لے اڑتے ہیں مسافر خوش ہوتے ہیں (کیسی اچھی ہوا چل رہی ہے) پھر اچانک ہوائے تند کے جھونکے آپہنچتے ہیں اور ہر طرف سے موجیں اٹھ اٹھ کر گھیر لیتی ہیں اور مسافر خیال کرتے ہیں کہ بس اب ان میں گھر گئے (اور بچنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی) تو اس وقت انہیں (خدا یاد آتا ہے) وہ دل کے اخلاص کے ساتھ اسے پکارنے لگتے ہیں: اے خدا اگر اس مصیبت سے نجات دیدے تو ہم ضرور تیرے شکر گزار ہونگے پھر (دیکھو) جب اللہ انہیں نجات دے دیتا ہے تو اچانک اپنا عہد وپیان بھول جاتے ہیں اور ناحق ملک میں سرکشی اور فساد کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو! تمہاری سرکشی کا وبال خود تمہاری جانوں پر پڑنے والا ہے۔ یہ دنیا (چند روزہ) زندگی کے فائدے ہیں۔ اٹھالو پھر تمہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اُس وقت ہم تمہیں بتائیں گے کہ جو کچھ دنیا میں کرتے رہے، اس کی حقیقت کیا تھی۔"

تشریح: یہ ایک ایسی مثال ہے، اس طرح کی صورتیں انسان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ میں اکثر پیش آتی رہتی ہیں کہ تمام ذرائع اور وسائل ختم ہو جاتے ہیں کوئی سہارا باقی نہیں رہتا۔ فطرت انسان اس وقت بیدار ہوتی ہے۔ وہ لامحالہ ایک بن دیکھی ہستی کی طرف متوجہ ہوتی ہے جس کو وہ قادر، کارساز اور بگڑی کا بنانے والا سمجھتی ہے، وہی خدا ہے۔

قرآن شریف کا تقریباً ایک تہائی حصہ اس طرح کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے، جن میں خود انسان کے مشاہدات، تجربات اور خود اس کے وجدانی جذبات کو پیش کر کے خداوند عالم کے وجود اور اس کی صفات قدسیہ کو ثابت کیا گیا ہے اور داعی الی اللہ کے لئے ناقابل تردید دلائل کا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے۔ مثلاً بحری سفر ہی کی ایک مثال دوسرے عنوان سے سورہ بنی اسرائیل میں دی گئی ہے ترجمہ یہ ہے:

"اے لوگو! تمہارا رب وہ ہے جو تمہاری کار برآریوں کے لئے سمندر میں جہاز چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو، (بحری راستوں سے فائدے اٹھاؤ) بلاشبہ وہ تم پر بڑی ہی رحمت کرنے

والا ہے۔ اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم سمندر میں ہوتے ہو اور مصیبت آ لگتی ہے تو اس وقت وہ تمام ہستیاں تم سے کھو جاتی ہیں جنہیں تم پکارا کرتے ہو، صرف ایک اللہ ہی کی یاد باقی رہ جاتی ہے۔ پھر جب وہ تمہیں مصیبت سے نجات دے دیتا اور خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو اس سے گردن موڑ لیتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ پھر کیا تمہیں اس سے امن مل گیا ہے کہ وہ تمہیں خشکی کے کسی گوشے میں دھنسا دے۔ یا تم پر پتھر برسانے والی آندھیاں بھیج دے، اور تم اس حالت میں کسی کو اپنا مددگار نہ پاؤ، یا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ اللہ تمہیں دوبارہ ویسی ہی مصیبت میں ڈال دے اور ہوا کا ایک سخت طوفان بھیج دے اور تمہاری ناشکری کی پاداش میں تمہیں غرق کر دے، پھر کسی کو نہ پاؤ جو اس کے لئے ہم پر دعویٰ کرنے والا ہو۔ اور البتہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور خشکی اور تری دونوں کی قوتیں اس کے تابع کر دیں کہ اسے اٹھائے پھرتی ہیں۔ اور اچھی چیزیں اس کی روزی کے لئے مہیا کر دیں۔ نیز جو مخلوقات ہم نے پیدا کی ہے ان میں اکثر پر اُسے برتری دیدی، پوری برتری جیسی کہ ہونی چاہئے۔ (بنی اسرائیل آیت ۶۵ تا ۷۰)

طرز عمل

(الف) لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (سورہ ۲ بقرہ رکوع ۲۴ آیت ۲۵۶)

"نہیں کوئی زور (جبر و قہر یا زبردستی) دین کی بات میں ❶ کیونکہ دین کا مدار ❷ اس پر ہے کہ دل مان لے ❶ اور تسلیم کر لے ❷۔ جبر و قہر سے زبانی اقرار کرایا جا سکتا ہے۔ دل سے منوایا نہیں

---

❶ ترجمہ حضرت شاہ عبد القادر رحمتہ اللہ۔

❷ اذالاکراہ الزام الغیر فعلاً لایرضی بہ الفاعل وذا لایتصور الافی افعال الجوارح اما الایمان فھو عقد القلب وانقیادہ لایوجد بالاکراہ (تفسیر مظہری) وغیرہ۔

❶ ایک مسلمان اگر اسلام سے برگشتہ ہو کر معاذ اللہ کفر اختیار کرتا ہے تو اس کی وہ سزا ہے جو باغی کی ہوتی ہے یعنی وہ واجب القتل ہے۔ لیکن ایسا شخص جس سے جبراً قہراً اقرار کرالیا گیا وہ اگر اسلام سے منحرف ہوتا ہے تو کتب فقہ میں صراحت کر دی گئی ہے کہ اس کو قتل نہیں کیا جائیگا۔ بدایہ اخیرین میں ہے ولو اکرہ علی الاسلام حتی حکم بالاسلام ثم رجع لم یقتل (کتاب الاکراہ) یعنی اگر مجبور کر کے مسلمان بنالیا گیا یہاں تک کہ اسلام کے احکام اس پر جاری ہو گئے (مثلاً مسلمان رشتہ دار کا ترکہ اس کو مل گیا یا کسی مسلمان عورت سے اس کا نکاح کرا دیا گیا وغیرہ) پھر اس نے اسلام سے رجوع کر لیا اور عدالت میں بھی یہی بیان دے دیا کہ اس کو جبراً مسلمان بنایا گیا تھا تو مرتد کی سزا (قتل) اس کو نہیں دی جائے گی۔ شرح میر کبیر میں یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ اقرار المکرہ باطل سواء کان الاکراہ بالجبر او القتل (شرح میر کبیر ص ۲۷۳ ج ۴) یعنی جس سے زبردستی کچھ کہلوالیا گیا اس کا یہ اقرار باطل (قطعاً نا قابل اعتبار ہے) خواہ اس کو قید کی دھمکی دی گئی ہو یا قتل کی۔

جاسکتا۔ کوشش یہ کرو کہ دل کی آنکھیں کھلیں، گمراہی کو گمراہی اور ہدایت کو ہدایت سمجھنے لگے۔

(ب) اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾

(حم السجدہ. ۳۴)

"برائی کا جواب دو ایسی صورت میں کہ وہی صورت سب سے اچھی (اخلاقاً سب سے زیادہ موثر) ہو تو تم دیکھوگے کہ جس سے تمہاری دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائیگا جیسے مخلص دوست (سرگرم محبت)۔"

(ج) وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۲۶﴾

(نحل۔ آیت ۱۲۶)

"اور اگر مخالفوں کی سختی کے جواب میں سختی کرو تو چاہئے کہ ویسی ہی اور اتنی ہی کرو جیسی تمہارے ساتھ کی گئی۔ اور اگر تم نے صبر کیا (جھیل گئے اور سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا) تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کے لئے صبر ہی بہتر ہے۔

تشریح: (۱) قانون یہ ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (آیت ۴۰ سورہ ۴۲ شوریٰ)

"برائی کی سزا اسی جیسی برائی ہے۔"

(۲) داعی الی اللہ اگر اس ضابطہ پر عمل کرتے ہوئے سختی کے جواب میں بالکل اتنی ہی اور اس جیسی ہی سختی کرے تو اس کے جواز سے انکار نہیں ہے مگر اس سے برائی اور سختی کا سلسلہ ختم نہیں ہو گا۔ کیونکہ جواب میں جو چیز وجود میں آرہی ہے وہ بھی سختی اور برائی ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ابتداءً نہیں ہے جواباً ہے۔

(۳) جب کوئی شخص مقام دعوت اپنائے ہوئے ہے تو یہ ناپ تول اس کی شان کے شایان نہیں ہے۔ اس کی شایان شان یہ ہے کہ وہ ضبط و تحمل اور صبر سے کام لے اور جواب وہ دے جو اس کی شان کے لحاظ سے بہت ہی بہتر ہو۔

(۴) داعی الی اللہ کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ وہ ایسی صورت اختیار کرے اور اس کی کوشش کرے کہ برائی کا سلسلہ ختم ہو۔ جس کی شکل مثلاً یہ ہے کہ جو دشمن ہیں وہ سرگرم محبت دوست بن جائیں۔

(۵) یہ بات بہت اونچی ہے۔ ہر شخص اس درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس اونچے درجے کو وہی حاصل

---

❷ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ قبیلہ بنی سالم میں عوف کے ایک انصاری صاحب جن کا اسم گرامی حصین رضی اللہ عنہ تھا ان کے دو لڑکے مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ وہ لڑکوں کو مجبور کریں کہ وہ اسلام لے آئیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (تفسیر مظہری وغیرہ) دین کی بات میں زور زبردستی نہیں ۔

کر سکتا ہے جو بڑا صاحب نصب ہو۔ (آیت ۳۵، سورہ حم سجدہ)

بدی را بدی سہل باشد جزا اگر مردی احسن الیٰ من اسا

خلاصہ

(۱) داعی جس بات کی دعوت دے ضروری ہے کہ اس کے متعلق اس کو پورا یقین ہو، جیسے مشاہدہ کرنے والے کو اپنے مشاہدہ کا یقین ہوتا ہے اور وہ اس پر شاہد ہوتا ہے۔

(۲) ضروری ہے کہ داعی کی فطرت بااحساس ہو، ہمدرد اور غم خوار ہو۔ اس کے اندر شفقت ہو، درد ہو، سوز ہو، گداز ہو، وہ شمع یا چراغ کی طرح ہو۔

(۳) دعوت اس کے درد کا فغان ہو۔ اس کے سوز دروں کا شعلہ ہو۔

(۴) داعی مشفق طبیب کی طرح ہو اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ داعی اس شفقت اور اس ہمدردی اور خیر خواہی کا پیکر اور مجسمہ ہو جو شفقت و ہمدردی باپ کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔

(۵) باپ کی تمنائیں اچھی ہی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی اچھی تمناؤں کا خواب دیکھتا ہے تو اولاد کو بشارت بھی دیتا ہے کہ یہ کر لو گے تو اعلیٰ درجہ پالو گے۔ اور یہ بات بہت ہی درد اور دکھ کی ہوتی ہے کہ اولاد ناہنجار اور بدکار ہو، یہ اس کی بدکاری کو دیکھ کر گھٹے، رنجیدہ ہو اور اولاد کو اس کی بدکاری کے خطرناک نتائج پر بار بار آگاہ اور متنبہ کرے۔

پس باپ اپنی فطری تمناؤں کے لحاظ سے پہلے مبشر ہوتا ہے اور نذیر مجبوراً ہوتا ہے۔ یہی شان داعی کی بھی ہو گی۔ وہ پہلے مبشر ہو گا اور نذیر بدرجہ مجبوری ہو گا۔

(۶) دعوت کا انداز سنجیدہ اور دانش مندانہ ہو۔ وہ مخاطب کو جانچے، تولے، پرکھے پھر اس کی صلاحیت کے بموجب دعوت کا طرز اختیار کرے۔ اہل دانش سے دانش مندانہ، عوام سے ان کے حال کے بموجب وعظ و پند اور خیر خواہانہ نصیحت کا اسلوب اختیار کرے۔ اور جو بحث کے شوقین ہوں ان سے گفتگو مدلل ہو۔

(۷) مخاطب کے مذہب کے لحاظ سے بھی دعوت کا انداز جدا جدا ہو گا۔ اہل کتاب کو دعوت اور طرح دی جائے گی، مشرک کو اس کے بموجب اور منکرین خدا، عقل پرستوں سے افہام و تفہیم کا طرز و انداز جدا ہو گا۔ ❶

---

❶ نمبر ۶ و ۷ پر عمل جب ہی ہو سکے گا جب مخاطب کے مذہب سے واقفیت ہو۔ دعوت و تبلیغ کا نظام قائم کرنا اجتماعی فریضہ ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک داعی جملہ مذاہب سے واقف ہو۔ لیکن جس حلقہ کو دعوت کے لئے منتخب کیا جائے اس کے لئے داعی معین ہوں۔ اور وہ اس حلقہ کے مذہبی رجحانات ' معاشرتی رسومات و میلانات اور جذبات سے واقف ہوں۔

(۸) داعی کے مزاج میں ضبط و تحمل ہو۔ وہ گستاخیوں اور سختیوں کو برداشت کرے، کڑوی بات کا جواب میٹھے بول سے دے۔ مخالف کو موافق اور دشمن کو دوست بنائے۔

(۹) داعی الی اللہ کا تعلق اپنے رب سے (جس کی طرف وہ دعوت دے رہا ہے) مضبوط ہو۔ اس کا اعتماد اور بھروسہ خدا پر ہو۔ وہ دعوت کو اپنا ایک فریضہ سمجھے جس کی ادائیگی اس کے ذمہ ہے۔ نتیجہ خدا کے حوالے کر دے۔

"محمد رسول اللہ ﷺ داعی اعظم بلکہ تمام داعیان حق کے امام و مقتدا تھے قرآن پاک کی مندرجہ بالا آیتیں اور اس طرح کی بہت سی آیتیں شہادت دے رہی ہیں کہ داعی الی اللہ کے جملہ اوصاف و خصوصیات بدرجہ اتم و اکمل آنحضرت ﷺ کے اندر موجود تھے۔"

("کان خلقه القرآن" عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا)

بلکہ حق یہ ہے کہ آپ کی ذات باجود منبع اور مرکز تھی۔ اوصاف داعی اور خصوصیات دعوت اس سے اخذ کئے جاتے ہیں۔

حضرت حق جل مجدہ نے جب آپ کو تمام امتوں اور پوری کائنات انسانی کے لئے داعی بنایا تو ہر ایک فرقہ اور ہر ایک گروہ سے خطاب کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ قرآن حکیم ان سب کا مجموعہ ہے۔ چند مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔

دعوت الی اللہ کی دشوار گذار گھاٹی "جہاد فی سبیل اللہ"

یقیناً دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں کوئی جبر و قہر اور کوئی زبردستی نہ ہونی چاہئے۔ بے شک داعی حق کا کام صرف یہ ہے کہ دلوں کے دروازوں پر دستک دیدے۔ اگر کوئی نہیں کھولتا تو بلاشبہ اس کو حق نہیں کہ کسی دروازے کو زبردستی کھولے یا کسی دریچے کو توڑے۔

یہ بھی درست ہے کہ داعی الی اللہ کو صبر و تحمل اور مسلسل برداشت سے کام لینا چاہئے۔ لوہے کے کنگھے سے اس کا گوشت کھرچا جائے، اس کی بوٹیاں نوچی جائیں، اس کو کھولتے ہوئے کڑہائی میں ڈال دیا جائے۔ اس کے سر پر آرہ رکھ کر پورا بدن چیر کر دو ٹکڑے کر دیئے جائیں، تو اس کا کمال یہی ہے کہ وہ ضبط و تحمل، صبر اور برداشت سے کام لے، ظالم کے حق میں یہی دعا کرے، اللّٰهم اهد قومي فانهم لايعلمون (اے اللہ میری قوم کو سیدھا راستہ دکھا دے، وہ مجھے جانتے نہیں ہیں)۔ لیکن اگر شکل یہ ہو کہ مخلوق خدا ظلم کی چکی میں پیسی جا رہی ہو، رائے کی آزادی سلب کر لی گئی ہو، پیٹ کو اگرچہ آسودگی میسر ہو مگر ضمیر کی آزادی پر تالے پڑے ہوئے ہوں، طائر فکر کو آہنی قفس میں گھونٹ دیا گیا ہو، ایک شخص کا ضمیر ایک بات کو حق سمجھتا ہو، وہ مضطر اور بے

چین ہو کہ اس حق کو قبول کرلے، مگر اس کو مجبور کیا جارہا ہو کہ وہ اپنے ضمیر کے فیصلہ پر عمل نہ کرے، وہ حق کو حق نہ سمجھے بلکہ غلط اور باطل کو حق سمجھے۔ اگر وہ اپنے ضمیر کے فیصلہ پر عمل کرے اور باطل کے دائرے سے نکلنا چاہے تو پہلے اپنی جان سے ہاتھ دھولے، پہلے پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالے۔ پھر قدم بڑھانے کا ارادہ کرے۔

اگر صورت حال یہ ہو تو کیا داعی حق کا فرض اب بھی یہی ہو گا کہ وہ ظلم کے شعلوں کو بھڑکتا ہوا دیکھتا رہے۔ اور ان کو بجھانے کی کوشش نہ کرے۔ وہ مظلوموں کو جھلستا ہوا دیکھے اور ان کی آہیں سنے اور اپنی جگہ سمٹا ہوا بیٹھا رہے، ظالم کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر اس وحشت انگیز صورت حال کو ختم کرنے کے لئے داعی کے پاس کوئی چارہ کار نہیں ہے تو اس کی دعوت کا پروگرام ناقص ہے، ادھورا ہے، ناقابل قبول ہے۔

اگر داعی کی دعوت کا تعلق کسی خاص گروہ سے ہے اور اسی گروہ کے نجات دہندہ کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوا ہے تب بھی ممکن ہے کہ اس گروہ کے علاوہ باقی مخلوق سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو، کوئی ظالم ہو یا مظلوم، لیکن اگر داعی سارے جہان کا درد اپنے دل میں لے کر آیا ہے۔ اس کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا رشتہ پوری نوع انسان اور نوع انسان کے ہر طبقہ سے جڑا ہوا ہے، اس کا نصب العین یہ ہے کہ تمام دنیا جہان کیلئے رحمت ہو، ہر ایک کے درد کا درمان اور ہر ایک کے دکھ کا علاج ہو، تو لا محالہ اس کا فرض ہو گا کہ وہ ظالم کی اس چیرہ دستی کو ختم کرے اور مظلوموں کی آہ وبکا اور گریہ وزاری کو قلب مضطر کے کانوں سے سنے وہ ان کی فریاد رسی کے لئے اٹھے اور اس عزم کے ساتھ اٹھے کہ

یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن بر آید

یہی وہ جدوجہد ہے جو داعی پر بحیثیت داعی فرض ہے اور جس کو اسلام جہاد فی سبیل اللہ کہتا ہے

۔

تمام جہانوں کا رب اور ساری مخلوق کا پروردگار اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿٧٥﴾

(سورہ نساء آیت ۷۵)

"اور مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد ہیں، کتنی ہی عورتیں ہیں، کتنے ہی بچے ہیں (جو ظالموں کے ظلم سے عاجز آکر) فریاد کر رہے ہیں، خدایا ہمیں اس

بستی ❶ سے جہاں کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ لی ہے، نجات دلا۔ اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنادے اور کسی کو مددگاری کے لئے کھڑا کردے۔"

یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ کیا اس کو دعوت الی اللہ کا ایک نہایت ضروری شعبہ نہیں کہا جائیگا۔ اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ دعوت الی اللہ بے دست و پا رہے گی، جب تک اس میں قوت مقابلہ نہ ہو جو ظالم کے ہاتھ روک سکے اور مظلوموں کو نجات دلانے کے لئے اقدام بھی کرسکے۔

یہ جہاد کب تک رہے گا؟ رب العالمین نے اس کی یہ حد بیان فرمائی ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (سورہ الانفال آیت ۳۹)

"ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ ظلم و فساد ❶ باقی نہ رہے اور دین کا سارا معاملہ ❷ اللہ ہی کے لئے ہو جائے (انسان کا ظلم ❸ اس میں مداخلت نہ کرسکے)۔"

---

❶ نزول آیت کے وقت یہ حالت مکہ کی تھی کہ وہاں بہت سے مسلمان مشرکین مکہ کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنے ہوئے تھے۔ ابوجہل کے حقیقی بھائی حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ ان کے ماں شریک بھائی عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ اور مکہ کے رئیس اعظم ولید بن مغیرہ کے لڑکے کہ ان کا نام بھی ولید ہی تھا (ولید بن الولید) مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کو باندھ کر ڈال دیا گیا تھا کہ ہجرت نہ کرسکیں۔ اس طرح اور بھی عورتیں اور مرد تھے جو مجبور و مقہور تھے اور مکہ سے نکل نہیں سکتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں ان کے لئے دعا کیا کرتے تھے (بخاری شریف ص ۱۱۰ و ص ۱۳۶ ص ۹۴۶ وغیرہ)۔ لیکن ظاہر ہے آیت میں مکہ کی قید نہیں۔ جب بھی اور جہاں بھی یہ صورتحال ہو تو مسلمانوں کو جہاد کی ہدایت کی گئی ہے۔ بیشک دور حاضر کا بین الاقوامی قانون یہ ہے کہ کسی مملکت کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کسی دوسرے ملک کو حق نہیں ہے۔ مگر ظاہر ہے یہ بین الاقوامی قانون انسانی ہمدردی اور خلق خدا کے فلاح و بہبود کے جذبہ سے ناآشنا ہے، کیونکہ دور حاضر کی حکمراں قوموں کا نصب العین صرف یہ ہے کہ ان کا اقتدار باقی رہے اور عظمت کے جس مینارہ پر وہ رونق افروز ہیں اس میں جنبش نہ آئے۔ بیشک ان قوموں کے افراد میں خلق خدا کی ہمدردی کا جذبہ موجود ہے اور اسی جذبہ کی بناپر ان کے یہاں بہت سے خیراتی ادارے اور بڑے بڑے خیراتی فنڈ قائم ہیں۔ مگر ان کی حکومتوں کا نصب العین نہ خلق خدا کی خدمت ہے نہ انسانی ہمدردی، نہ کوئی اخلاقی اور روحانی دعوت ان کے مقاصد میں داخل ہے۔ یہی سبب ہے کہ ممالک کی اندرونی تحریکات خواہ کتنی ہی انسانیت کش اور ہلاکت انگیز ہوں مگر بین الاقوامی پنچایت کوئی مداخلت نہیں کرتی۔ اسلام اس سنگدلی کو برداشت نہیں کرتا۔

❶ آیت میں لفظ فتنہ ہے یعنی لڑتے رہو جب تک فتنہ نہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کی تفسیر یہ فرمائی: کان الاسلام قلیلا کان الرجل یفتتن فی دینه اما قتلوه واما یعذبره حتی کثرالاسلام فلم تکن فتنه۔ بخاری شریف ص ۶۴۸ یعنی مسلمان تھوڑے تھے، جو شخص مسلمان ہوتا وہ اپنے دین کے بارے میں مصیبت میں مبتلا ہو جاتا تھا یا اس کو قتل کر دیتے تھے یا عذاب میں مبتلا کر دیتے تھے یہاں تک کہ اسلام کی کثرت ہو گئی تو یہ فتنہ نہ رہا۔ یعنی مخالفین دین کا ظلم و فساد نہیں رہا۔

❷ یعنی اعتقاد کی آزادی حاصل ہو جائے اور دین کا معاملہ جس کا تعلق صرف اللہ سے ہے خدا اور انسان کا باہمی معاملہ ہو جائے انسان کے ظلم و تشدد کی مداخلت باقی نہ رہے۔

❸ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ ملک جہاں اس طرح کا بیجا دباؤ اور ظلم و زیادتی ہو وہ اسلامی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے باجگذار ہو جائے یا وہ افراد جو اس طرح کے ظلم میں شریک اور اس کے معاون و مددگار ہیں اسلامی حکومت

خطابات و عمومی ارشادات

مکہ معظمہ سے تشریف لا کر چند روز قبا میں قیام رہا۔ پھر جمعہ کے روز قبا سے روانہ ہوئے تو قبیلہ بنی سالم بن عوف کے میدان [4] میں جمعہ کی نماز [5] پڑھی۔ پھر آپ مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے۔ ان مقامات پر آپ نے جو تقریریں فرمائیں مورخین نے ان کو جمع کیا ہے۔ وہ تقریریں ابن اسحاق نے نقل کی ہیں [6]۔ ان کا ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱)

"ایہاالناس! (اے لوگو) خوب سمجھ لو، کچھ پہلے سے بھیج دو، جو خود تمہارے کام آئے گا۔ خدا کی قسم یقیناً ایسا ہو گا کہ ہر شخص پر (قیامت کی) بے ہوشی طاری ہو گی (جس کے پاس جو کچھ ہے یہیں رہ جائے گا) بکریوں والا بکریاں چھوڑ جائے گا ان کا کوئی گلہ بان نہ ہو گا۔ وہ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہو گا یقیناً ایسا ہو گا کہ اس کا پروردگار براہ راست اس سے خطاب فرمائے گا، نہ کوئی بیچ میں ترجمان ہو گا نہ کوئی رکاوٹ کی چیز درمیان میں حائل ہو گی (جو اس کے لئے آڑ بن سکے) اس کا پروردگار کہے گا: کیا میرے رسول نے تمہارے پاس پہنچ کر تبلیغ نہیں کی تھی، کیا یہ تمام باتیں تمہیں نہیں بتادی تھیں، کیا میں نے تجھ کو مال نہیں دیا تھا؟ کیا تیرے اوپر میں نے اپنا فضل نہیں کیا تھا، پس بتا تو خود اپنے لئے کیا لے کر آیا ہے۔ یہ شخص اپنے دائیں دیکھے گا، اپنے بائیں دیکھے گا، اسکی دولت کا کہیں نام و نشان نہ ہو گا، وہ آگے کی طرف نظر ڈالے گا وہاں دہکتے ہوئے جہنم کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ بس دیکھو دوزخ کی آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ، جو کچھ امکان میں ہو خرچ کرو اور اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ کچھ نہ ہو چھوارے کا ایک ریزہ ہو، وہی خرچ کرو، جس کے پاس یہ بھی نہ ہو وہ میٹھے بول، اچھی بات سے غریبوں کی دلداری کرے، اس کا بھی اس کو ثواب ملے گا۔ نیکی کا ثواب دس گنے سے شروع ہوتا ہے اور سات سو گنے تک پہنچتا ہے۔ والسلام علیکم ورحمتہ اللہ

کے تحت میں آکر حفاظتی ٹیکس (جزیہ) ادا کرنے لگیں۔ حکومت ان کی جان و مال کی عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہو جائے، سورہ ۹ توبہ آیت ۲۸ میں اس کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔

[4] اس میدان کا نام وادی رانوناء ہے۔ البدایہ والنہایہ ص ۲۱۲ ج ۳

[5] اس موقع پر جو آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا حافظ ابن کثیر نے ابن جریر کے حوالہ سے اس کو نقل کیا ہے ملاحظہ ہو ص ۳۱۲ البدایہ والنہایہ جلد ۳ یہ طویل خطبہ ہے اس کے کچھ حصے خطبات ماثورہ میں بھی دیئے گئے ہیں

[6] سیرۃ ابن ہشام ص ۳۰۰ و ص ۳۰۱ ج ۱

وبرکاتہ "

(۲)

"بیشک تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد مانگتا ہوں، ہم اپنے نفسوں کی شرارت سے اور اپنے اعمال بد کے شر سے خدا کی پناہ لیتے ہیں۔ جس پر اللہ تعالیٰ ہدایت کے راستے کھول دے، پھر کوئی اس کو گمراہ نہیں کر سکتا، اور جس کو بھٹکا دے تو کوئی نہیں ہے جو اس کو سیدھی راہ پر لگا سکے۔

میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ تنہا ہے اور اسکا کوئی شریک نہیں، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔ بیشک سب سے اچھا کلام کتاب اللہ ہے۔ یقیناً وہ شخص کامیاب ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ اپنے کلام کو سجادے اور جس کو اللہ تعالیٰ کفر سے ہٹا کر اسلام میں داخل کر دے۔ یقیناً وہ شخص کامیاب ہے جس نے انسانوں کے کلام اور ان کے قصوں کے مقابلے میں اللہ کے کلام کو منتخب کیا ہو، کیونکہ کلام اللہ ہی سب سے بہتر بات، سب سے بہتر کلام، اور سب سے بلیغ قصہ ہے۔

(دیکھو) اس سے محبت کرو، جو اللہ سے محبت کرتا ہے (دیکھو) خدا سے محبت کرو، دل کی گہرائی سے اپنے دلوں کو اسی میں لگادو۔ اللہ کے کلام اور اس کے ذکر سے نہ اکتاؤ۔ تمہارے دلوں میں یہ سختی ہرگز نہ ہو کہ تم اس کی یاد سے غافل ہو جاؤ۔

(یاد رکھو اور سمجھ لو) اللہ تعالیٰ جو مخلوق پیدا کرتا ہے اس میں سے کچھ کو منتخب کرکے اپنے لئے مخصوص کرلیتا ہے۔ جو اعمال اس کو پسند ہیں۔ جن بندوں کو وہ پسند کرتا ہے جو بات اس کو پسند ہے، اس نے نام لیکر ان کو بتادیا ہے اور معین کر دیا ہے (تم بھی اسی کو پسند کرو) اس نے حلال اور حرام کو کھول کر بتادیا ہے۔ بس اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ گردانو، پورا پورا تقویٰ کرو، تمہاری زبان سے جو باتیں نکلتی ہیں ان میں یہ خوبی پیدا کرو کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی تصدیق ہو، وہ اس کی مرضی کے مطابق ہوں۔ اللہ کی بھیجی ہوئی روح (ذات اقدس محمد رسول اللہ ﷺ) تمہارے درمیان ہے اس سے پوری پوری محبت کرو، تمہاری فطرت اپنے رب سے ایک عہد کئے ہوئے ہے (کہ رب وہی ہے اس کے سوا کوئی رب نہیں ہے) اس عہد کو پورا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا غضب اس پر نازل ہوتا ہے کہ اس عہد وپیمان کو توڑا جائے، جو فطرت انسان اپنے رب سے کئے ہوئے ہے۔"

مدینہ طیبہ میں سب سے پہلا خطبہ جمعہ

حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن جریر کے حوالے سے وہ پورا خطبہ نقل کیا ہے جو آنحضرت ﷺ نے بنی سالم بن عمرو بن عوف میں نماز جمعہ کے وقت ارشاد فرمایا تھا۔ ہم اس خطبہ کو تبرکا پورا نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے۔ ائمہ صاحبان جمعہ کے روز یہ خطبہ پڑھیں تو نور علیٰ نور و سعادت بالا سعادت کا مصداق ہو:

خطبہ التقویٰ:

ترجمہ: "میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں، اس سے مدد کی درخواست کرتا ہوں، گناہوں کی مغفرت چاہتا ہوں اور نیک ہدایت کی التجا کرتا ہوں۔ میں اس پر ایمان لاتا ہوں، میں اس ذات برحق کا منکر نہیں ہوں، میں اس کا دشمن ہوں جو اس ذات برحق کا انکار کرے۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ جو یکتا اور تنہا ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اس خدا کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ [1] اللہ تعالیٰ نے اپنے اس رسول محمد کو ہدایت، دین حق، نور کامل اور پند و نصیحت اور حکمت و دانش کی نعمتیں سپرد کر کے ایسے وقت معبوث فرمایا کہ صدیاں گزر گئی تھیں، سلسلہ رسالت منقطع ہو چکا تھا، علم مولیٰ ناپید اور مفقود تھا۔ گمراہی کی گرم بازاری تھی، نور ہدایت پر اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ (دوسری طرف حالت یہ ہے کہ) یہ دنیا جس کو زمانہ کہتے ہیں اس کا سلسلہ ازل سے چل رہا ہے اب ٹوٹنے کے قریب ہے۔ قیامت سر پر ہے اور اس عالم کی آخری میعاد ختم ہو رہی ہے (اب اللہ تعالیٰ کا کوئی اور پیغام آنے والا نہیں ہے) اب جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت اور کامیابی حاصل کر لی اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے رو گردانی کر رہا ہے وہ گمراہ ہے اپنا فرض ادا کرنے میں حد سے زیادہ کوتاہی کر رہا ہے اور صحیح راستہ سے بہت دور بھٹک رہا ہے۔

اے لوگو! میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنے کی وصیت کرتا ہوں [1] اور دیکھو سب سے بہتر نصیحت جو ایک مسلمان دوسرے کو کرے یہی ہے کہ اس کو آخرت پر آمادہ کرے (یعنی ایسے کاموں کا شوق دلائے جو مرنے کے بعد کار آمد ہوں) اور یہ کہ خدا ترسی کی ہدایت کرتا رہے اور تاکید کرتا رہے کہ

---

[1] اپنے رسول اور نبی ہونے پر یقین رکھنا نبی اور رسول کو بھی ضروری ہے۔ گورنر فرائض منصبی جب ہی ادا کر سکتا ہے جب اس کو اپنے گورنر ہونے کا یقین ہو اور خود بھی اپنے آپ کو گورنر مانتا ہو، اس کے بغیر اپنے فرائض کا احساس نہیں کر سکتا۔ یہ تکبر نہیں ہے بلکہ اعتراف ہے۔

[1] یعنی دردمندانہ نصیحت جس میں وہ اخلاص ہو جو ایک مرنے والے کے قول میں ہو سکتا ہے جب آخری منزل میں ہوتا ہے اور عقوبت کا نظارہ اس کے سامنے ہوتا ہے۔

پرہیز گاری اور پارسائی کی زندگی اختیار کریں۔

اے لوگو! ان باتوں سے پرہیز کرو جن سے بچنا اور پرہیز کرنا اتنا ضروری ہے کہ خدا اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے ان سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ اس سے افضل کوئی نصیحت ہو سکتی ہے اور نہ کوئی تذکیر اور یاددہانی اس سے زیادہ ضروری اور مفید ہو سکتی ہے۔

دیکھو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنا اور اس طرح تقویٰ کرنا کہ دل لرز رہا ہو اور خوف خدا ذہن و دماغ پر چھایا ہوا ہو۔ یہ تقویٰ ایک عمل کرنے والے کے لئے بہت بڑا معاون اور بہت بڑا مددگار اور نہایت مخلص رفیق ہے۔

اور جو شخص ظاہر و باطن میں اپنا معاملہ اللہ سے درست کر لے جس سے مقصود محض رضا خداوندی ہو، کوئی دنیاوی غرض اور مصلحت پیش نظر نہ ہو، تو یہ ظاہر و باطن کی مخلصانہ اصلاح دنیا میں اس کے لئے باعزت یادگار، اور مابعد الموت کے لئے بہترین ذخیرہ ہے۔ جس وقت انسان ان اعمال کا سب سے زیادہ ضرورت مند ہو گا جو اس نے پہلے سے بھیجے ہوں۔

(دیکھو) (خدا ترسی اور ظاہر و باطن کی اصلاح کی کوشش کار آمد چیزیں یہی ہیں جو مرنے کے بعد انسان کی بہترین رفیق ہوں گی) ان کے علاوہ جو بھی ہے وہ انسان کے لئے یہاں تک بے کار ہے کہ قیامت کے روز انسان تمنا کرے گا کہ کاش اس عمل کے اور میرے درمیان مدت دراز کی مسافت ہوتی۔

یاد رکھو! اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے اس کی بے انتہا مہربانی اور اس کے بے پایاں رحم و کرم ہی کا تقاضا ہے کہ وہ خود اپنی ذات کا تم کو خوف دلا رہا ہے (کہ تم غافل، لاابالی، نفس پرست نہ بنو کہ اللہ کے عذاب کے مستحق ہو جاؤ کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہوتا ہے اس کی طاقت بھی بے پایاں ہے جس کو عذاب دینا چاہے تو کوئی نہیں جو اس کے عذاب کو روک سکے)

اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے کہ اس کا قول حق ہے، جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے جو وعدہ کرتا ہے پورا کرتا ہے اس میں خلاف نہیں ہوتا۔ اس کا ارشاد ہے کہ اس کی بات پلٹی نہیں جاتی اور وہ بندوں پر ظلم بھی نہیں کرتا۔ پھر وہی بات ہے۔ اللہ سے تقویٰ کرو، موجودہ وقت اور حالت میں بھی اور مستقبل میں بھی۔ پوشیدہ بھی اور اعلانیہ بھی۔ جو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ فرماتا اور اس کے اجر کو بڑھاتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرے وہ کامیاب پورا پورا کامیاب۔ بہت بڑی کامیابی کے ساتھ کامیاب۔

غرض یہ ہے کہ بہر صورت خوف خدا کو سامنے رکھو۔ خوف خداوند اکسیر ہے جو عذاب خدا سے بچاتا ہے اس کی سزا اور اس کی ناراضی سے محفوظ رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنا اور خوف خدا وہ تریاق ہے جو چہرہ کو روشن کر دیتا ہے، رب کو راضی کرتا ہے اور درجہ کو بلند کرتا ہے۔ پس جہاں تک ممکن ہو تقویٰ کا حصہ پورا پورا حاصل کرو اور دیکھو بارگاہ رب العزت کے حق میں کوتاہی مت کرو، اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم کی قدر کرو کہ اس نے اپنی کتاب میں تمہیں کامل و مکمل تعلیم دی ہے۔ تمہارے لئے واضح طور پر راستہ مقرر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لئے کر دیا کہ جھوٹے اور سچے کھل کر سامنے آجائیں۔ پس جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا ہے تم بھی احسان کرو۔ تمہارا احسان یہ ہے کہ خود اپنے افعال اور اعمال کو درست کرو، اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے دوستی رکھو، اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن جانو، وہی رب العزت ہے وہی مولا برحق ہے جس نے تمہیں اپنے دین کامل کے لئے منتخب فرمایا: تمہارا نام مسلم رکھا تاکہ جو برباد ہو تو اس حالت میں برباد ہو کہ کھلی حجت اس کے سامنے ہو، اس کو یہ عذر نہ رہے کہ اس کے سامنے بات واضح نہ ہو سکی اور جو زندہ رہے تو اس طرح زندہ کہ اپنے زندہ رہنے کی دلیل اور حجت اس کے پاس ہو ولا حول ولا قوۃ الا باللہ (اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ہماری نہ کوئی فکری طاقت ہے نہ عملی قوت)"

دیکھو مختصر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو اور مابعد الموت کے لئے عمل کرتے رہو۔(اور پوری طرح سمجھ لو) کہ جو بندہ اس رشتہ کو درست کر لیتا ہے جو اس کے اور اس کے پروردگار کے مابین ہے تو خود اللہ تعالیٰ ذمہ دار بن جاتا ہے کہ ان معاملات کو درست کر دے جو اس بندے اور دوسرے انسانوں کے درمیان ہیں۔

(بات صاف ہے) اللہ تعالیٰ کی حکومت ہے وہ انسانوں پر حکومت کرتا ہے اور انسانوں کے حق میں اپنے فیصلے نافذ کرتا ہے۔ انسان اپنے پروردگار کے مالک نہیں ہیں، نہ انہیں خالق ارض و سما کی کسی بات پر کوئی قابو ہے۔ کبریائی اور عظمت صرف اللہ کے لئے ہے۔ ہم میں نہ کوئی طاقت ہے نہ قوت ہے جو کچھ قدرت و طاقت ہے وہ خدا کی مہربانی اور اس کی مدد سے ہے جو بلند و بالا اور بہت بڑی شان والا ہے۔

مقام فکر اور دلیل صداقت

ان تمام خطبوں پر ایک دفعہ اور نظر ڈالئے۔ موضوع خطاب کیا ہے، بار بار زور کس بات پر دیا جا رہا ہے۔

خدا کا خوف۔ اللہ سے ظاہر و باطن ہر طرح سے ڈرتے رہنا، ظاہر و باطن کی اصلاح، اللہ کو یاد رکھنا اور کثرت سے یاد کرنا۔

غور فرمایئے یہ خطبے کب دیئے جا رہے ہیں؟ یہ خطبے خاص اس وقت جب مخالفین تحریک اور دشمنان اسلام کی منصوبہ بند کوششوں سے جان بچا کر سانس لینے کا پہلا موقع ملا ہے جبکہ آپ کا سر قلم

کرنے والوں یا گرفتار کرنے والوں کے لئے بڑے سے بڑے انعام کا اعلان فضا میں گونج رہا ہے۔

اول سے آخر تک خطبوں کے ایک ایک حرف پر نظر ڈال لیجئے۔ کیا کہیں کوئی ایک لفظ، کوئی اشارہ، کوئی کنایہ بھی ان دشمنوں کی طرف ہے؟

ان تیرہ سالہ زندگی کی بے پناہ اور مسلسل مصیبتوں کا جو خود اپنے عزیزوں اور اہل قبیلہ کی طرف سے ڈالی گئی تھیں کیا کوئی ذکر ہے؟

غور فرمایئے! وسعت ظرف، علو حوصلہ، بلندی ہمت،

سوچیے! کیا ایسی ذات بابرکات کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اس نے خدا کے نام پر جھوٹ بولا۔ (معاذ اللہ)

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

نئے میدان عمل میں پہلے کام

(۱)
تعمیر مساجد و اقامت صلوٰۃ

(۱) لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ (سورہ توبہ۔ ۱۰۸)

"البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول دن [1] سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اس کی پوری پوری حقدار ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو (اور بندگان الٰہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں) اس میں ایسے لوگ (آتے) ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ پاک صاف رہیں اور اللہ تعالیٰ (بھی) پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

(۲) اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ (سورہ توبہ۔ ۱۸)

"فی الحقیقت مسجدوں کو آباد کرنے والا تو صرف وہ ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہ مانے جو لوگ ایسے ہیں انہیں سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ہدایت یاب (سعادت اور کامیابی کی راہ پانے والے) ہونگے۔"

(۳) وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (سورہ بقرہ۔۴۳)

"نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور سر نیاز خم کرو ان کے ساتھ جو اللہ کی بارگاہ میں سر جھکا رہے ہیں۔"

---

[1] اول یوم کے معنی یہی کئے گئے ہیں کہ اول یوم وجودہ یا اول یوم بناء یعنی وجود میں آنے کے پہلے دن سے یا تعمیر کے پہلے دن سے لیکن یہاں یہ نکتہ بھی نظر انداز نہ ہونا چاہئے کہ یوم کے معنی دور کے بھی آتے ہیں۔ کمافی قولہ تعالیٰ خلق الارض فی یومین (المفردات فی غریب القرآن) یعنی ہجرت کے بعد جو دور شروع ہوا اس کے آغاز میں۔ اور یہی سبب ہے کہ اس اول یوم کو تاریخ یعنی سنہ ہجری کا پہلا دن مانا گیا۔ افاد السھیلی ان الصحابۃ رضی اللہ عنہم اخذوا التاریخ من قولہ تعالیٰ لمسجد اسس علی التقوے من اول یوم (وفاء الوفاء ص ۱۷۷ ج ۱) یعنی صحابہ کرام نے لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ سے ہی استدلال کرتے ہوئے سنہ ہجری کا آغاز اس دن سے کیا ہے۔

مسجد قبا:

قبا کا قیام عارضی تھا مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا کوئی لمحہ اس فرض کی انجام دہی میں صرف نہ ہوتا جس کے لئے وہ خدا کے رسول اور پیغامبر بنائے گئے تھے۔

اقامۃ دین [1] جو انبیاء علیہم السلام کا نصب العین ہوتا ہے اس کا پہلا کام ہے اقامت الصلوٰۃ یعنی ایسا ماحول بنانا اور ایسی جماعت تیار کرنا جس کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز اور جس کے دل کا چین ذکر اللہ ہو۔

قبا پہنچ کر سب سے پہلے آپ نے اس فرض کو انجام دیا۔ اس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے جو نمبر اول میں تحریر کی گئی ہے۔

جماعت:

خدا پرستی یعنی خدا واحد کی عبادت آپ ﷺ کی فطرت تھی۔ شب معراج میں خاص نوعیت کی تعلیم دی گئی اور اگلے روز حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نازل ہو کر پانچوں وقت کی نمازوں کی عملی تعلیم بھی دیدی۔ دو روز تک پانچوں وقت کی نمازیں پڑھا کر جس طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ارکان اور اوقات نماز کی تعلیم دی: جماعت اور نماز باجماعت کا طریقہ بھی بتادیا، لیکن جب تک آنحضرت ﷺ مکہ معظمہ میں رہے تسلسل کے ساتھ نماز باجماعت کا موقع نہیں مل سکا۔ جہاں اسلام کا نام لینا ہی مشکل تھا وہاں جماعت کا سلسلہ کس طرح قائم ہو سکتا تھا۔ مدینہ کے حضرات اسلام سے مشرف ہوئے۔ ان کی تعلیم کے لئے خاص خاص حضرات کو بھیجا گیا۔ یہاں کچھ حلقے مسلمانوں کے قائم ہوئے تو نمازوں کی جماعتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

پھر ان حضرات نے اپنے ہی اجتہاد سے ہفتہ میں ایک روز عمومی جماعت کے لئے بھی مقرر کر لیا اور سرور کائنات رسول اللہ ﷺ ابھی مکہ معظمہ میں تھے کہ نماز جمع کی فرضیت بھی نازل ہو گئی۔ جس نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کی تصدیق کر دی۔ صحابہ کرام کا یہ اجتہاد وہ تھا جس پر آنحضرت ﷺ فخر کیا کرتے تھے کہ یہود اور نصاریٰ نے ہفتہ میں ایک دن عمومی اجتماع کے لئے مقرر کیا مگر وہ منشاء خداوندی کے مطابق نہیں تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس دن کی توفیق بخشی جو منشاء خداوندی کے عین مطابق تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کوئی مسجد تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ اور تاریخ اسلام اب تک بجز ایک مسجد کے جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مکہ معظمہ میں اپنے مکان کے سامنے میدان میں بنالی تھی [2]،

---

[1] یعنی دین کے منشاء اور مقصد کو صحیح طور سے سمجھنا اس کے تمام پہلوؤں کا خیال رکھنا اور پوری مستعدی سے اس کو جامہ عمل پہنانا۔

[2] بخاری شریف ص ۵۵۳

کسی اور مسجد کی تعمیر سے نا آشنا تھی، کوئی مکان کوئی میدان یا کسی میدان کا کوئی حصہ نماز کے لئے مقرر کر لیا جاتا تھا۔ وہاں لوگ نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ عموماً بکریوں کے باڑے [1] میں کسی حصہ کو نماز کے لئے مخصوص کر لیا کرتے تھے۔ ورنہ جہاں وقت آتا نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

قبا کا قیام عارضی تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ کتنے روز قیام رہا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ صرف تین روز قیام رہا، مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس عارضی قیام میں آنحضرت ﷺ نے مسجد کی بنیاد ڈال دی [2]۔ کلثوم بن ہدم جو آنحضرت ﷺ کے میزبان تھے انہیں کا ایک میدان تھا جس میں کھجور سکھائے جاتے تھے۔ اسی میدان میں یہ مسجد تعمیر کی گئی۔ سب سے پہلے آپ نے پتھر رکھا۔ دوسرا پتھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور تیسرا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے رکھوایا۔ پھر جملہ صحابہ نے حصہ لیا۔ خود ہی مزدور تھے اور خود ہی معمار، مزدوروں میں خود آقا دوجہان بھی شامل رہے۔ بھاری بھاری پتھر اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا۔ مٹی بدن اطہر پر پڑتی، کوئی صحابی آگے بڑھ کر پتھر لے لیتا تو آپ دوسرا اٹھا لیتے تھے۔ [3]

مسجد کی تعمیر کے ساتھ آداب معاشرت اور اخلاق کی تعمیر بھی ہوئی حتیٰ کہ کلام اللہ شریف میں جب مسجد کا تذکرہ فرمایا تو ساتھ ساتھ اہل مسجد کی بھی تحسین فرمائی: فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا (توبہ۔ ۱۰۸) (اس میں وہ لوگ ہیں جو محبت کرتے ہیں۔ اس بات سے کہ پاک صاف رہیں) پھر ان کو شرف لازوال اور فخر دائم یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کا پروانہ بھی عطا ہو گیا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (توبہ۔ ۱۰۸) (اللہ تعالیٰ محبت فرماتے ہیں پاک صاف رہنے والوں سے)

مسجد مدینہ، مسجد النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام:

قبا سے مدینہ تشریف آوری ہوئی تو جس جگہ ناقہ بیٹھا تھا، وہی جگہ مسجد کے لئے منتخب کی گئی۔ یہ جگہ ایک میدان کے کنارہ پر تھی۔ قبیلہ بنی نجار کے حضرات یہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔ [4] زمین کے مالک یہاں کھجوریں بھی سکھایا کرتے تھے۔ میدان کے باقی حصہ میں کھجور کے درخت کھڑے

---

[1] یہ باڑے رہائشی مکانوں کے قریب ہوتے تھے اور عام لوگ انہیں باڑوں میں رہا بھی کرتے تھے۔

[2] واسس المسجد الذی اسس علی التقویٰ بخاری شریف ص۵۵۵ وفاالوفاء کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل بعد میں ہوئی۔ مدینہ میں قیام فرمانے کے بعد آپ صحابہ کرام کے ساتھ قباء تشریف لائے اور مسجد کی تعمیر کرائی۔ وفاء الوفاء ص۱۷۹ ج۱۔

[3] وفاء الوفاء ص۱۸۰ ج۱

[4] حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے یہاں ایک دیوار بیت المقدس کے رخ پر بنا دی تھی۔ یہیں جمعہ کی نماز بھی پڑھایا کرتے تھے۔ سایہ کی کوئی چیز دیوار پر نہیں تھی۔ ابن سعد ص ۲ ج ۲ ہماری اصطلاح میں ایسی مسجد کو قناتی مسجد کہتے ہیں۔ عید گاہیں عموماً ایسی ہی ہوتی ہیں۔

تھے۔ کچھ پرانی قبریں اور کچھ مکانوں کے کھنڈر تھے۔ ایک طرف کچھ نشیب تھا وہاں پانی بھر جاتا تھا۔ اس خرابہ کی قسمت جاگی، سید الانبیاء ﷺ نے اسی کو مسجد کے لئے منتخب فرمایا۔ یہ طول و عرض میں سو سو گز سے کچھ زائد تھا۔ ❶

سہل اور سہیل کے والد رافع بن ابی عمرو کا انتقال ہوچکا تھا۔ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ ان کے مربی تھے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ میدان ان ہی یتیموں کا تھا۔ انہوں نے چاہا کہ بلا کسی معاوضہ کے مسجد کے لئے پیش کردیں، مگر آنحضرت ﷺ اس طرح کی پیشکش ❷ بڑے آدمیوں سے بھی منظور نہیں فرمایا کرتے تھے۔ یتیم بچوں سے کیسے منظور فرمالیتے۔ دس دینار قیمت تجویز کی گئی۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ قیمت ادا کرکے زمین مسجد کے لئے وقف کردی۔ ❸ رضی اللہ عنہم

زمین ہموار کی گئی، پانی سینچ دیا گیا، قبروں سے ہڈیاں نکلیں ان کو الگ دبا دیا گیا۔ درخت کٹوائے گئے، بنیاد کھودی گئی، تعمیر شروع ہوئی، یہاں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہ ہی مزدور تھے، وہ ہی معمار، سید الانبیاء ﷺ بھی برابر کے شریک تھے۔

عجیب و غریب پُر تقدس جذبہ سے کام ہو رہا تھا۔ پتھر اٹھائے جاتے تو یہ رجز پڑھا جاتا تھا:

هذا الحمال لاحمال خيبر هذا ابر ربنا واطهر

"خیبر (جو کھجوروں کی منڈی ہے) وہاں سے بھی بوجھ اٹھایا جاتا ہے اور لادا جاتا ہے۔ یہ بوجھ اس جیسا نہیں ہے (بلکہ) اے ہمارے رب تو جانتا ہے یہ اس سے بہت اچھا نیکی والا اور بہت پاکیزہ ہے۔

کبھی یہ رجز پڑھا جاتا اور سید الانبیاء ﷺ کی زبان مبارک بھی ساتھ ساتھ ترنم فرما ہوتی تھی: ❹

اللهم لا خير الا خير الآخرة فانصر الانصار والمهاجرة ❺

کبھی اس میں یہ ترمیم فرمالیتے:

اللهم ان الاجر اجر الآخرة فارحم الانصار والمهاجرة ❶

---

❶ ابن سعد ص ۲ ج ۲۔

❷ یعنی آنحضرت ﷺ کوئی ضرورت ظاہر فرماتے اس پر بطور ہدیہ وہ چیز آپ کو پیش کی جاتی تو بطور ہدیہ اس کو منظور نہیں فرماتے تھے بلکہ قیمت ادا فرماتے تھے۔ جیسے مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک ناقہ پیش کیا تو آپ نے قیمتاً منظور فرمایا۔ البتہ بغیر آنحضرت ﷺ کی طلب کے کوئی ہدیہ پیش کیا جاتا تو اس کو منظور فرمالیتے تھے۔

❸ ابن سعد ص ۲ ج ۲ غزوہ خیبر کے بعد جب مسجد بڑھائی گئی تو اس کے لئے جو زمین خریدی گئی تھی اس کی قیمت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ادا فرمائی۔ ترمذی شریف مناقب عثمان، ص ۲۰۹ ج ۲۔ مگر اب زمین کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی اس ٹکڑے کی قیمت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دس ہزار اور ایک روایت ہے کہ پچیس ہزار ادا کی ہے۔ وفاء الوفاء ص ۲۴۱ ج ۱۔

❹ بخاری شریف ص ۵۵۵ و ابن سعد ص ۲ ج ۲

❺ "اے اللہ صرف آخرت کی بھلائی ہی بھلائی ہے، پس مدد فرما انصار کی اور مہاجرین کی "

یہ مسجد اگرچہ دوسری ہے۔ مگر اس لحاظ سے اولیت اس کو ہی حاصل ہے کہ جو آبادی مستقل قیام کے لئے طے فرمائی گئی اس میں پہلی مسجد یہی ہے۔ اس بنا پر حسب ارشاد رحمۃ للعالمین ﷺ لمسجد اسس علی التقویٰ من اول یوم کا اصل مصداق یہی ہے کیونکہ قبا صرف نزول گاہ تھا اور جو مستقل قیام گاہ اور رقبۃ الاسلام تھا وہ یہی مقام ہے جہاں ناقہ نبی ﷺ نے گردن پھیلادی تھی اور جہاں تبع یمن ❷ نے سیکڑوں سال پہلے خاتم الانبیاء ﷺ کے لئے نزول گاہ تعمیر کر دیا تھا۔ بس مسجد النبی ﷺ کی اولیت قیام گاہ مستقل کی اولیت ہے ❸۔ اور مسجد قبا کی اولیت عارضی قیام گاہ کی اولیت۔ عارضی اور مستقل جو فرق ہونا چاہیئے وہ یہاں بھی کارفرما ہے۔

تعمیر:

اس وقت بیت المقدس کی جانب نماز پڑھی جاتی تھی۔ لہذا قبلہ اسی طرف یعنی شمال کی جانب رکھا گیا۔ اس طرف کی دیوار ستر ہاتھ لمبی بنائی گئی، دوسری جانب ساٹھ ہاتھ۔

بنیادیں پتھروں سے بھری گئیں۔ تین ہاتھ کی اونچائی تک دیواریں بھی اسی پتھر سے چنی گئیں۔ ان کے اوپر کچی اینٹوں کی تعمیر کی گئی۔ البتہ دروازوں کے بازو پتھروں کے رہے، ساٹھ ہاتھ (تیس گز) چوڑی چھت کے سہارے کے لئے بیچ میں کھمبے (ستون) کھڑے کئے۔ تین تین کھمبوں کی دو لائنیں ایک طرف (شرقی جانب میں) اور دو لائنیں غربی جانب میں۔ دونوں لائنوں کے بیچ کا حصہ وسیع رکھا گیا، میدان میں

---

❶ ”اے اللہ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا اجر ہی اجر ہے جو مقصود و مطلوب ہونا چاہئے، پس رحم فرما انصار اور مہاجرین پر“

❷ تبع بن الاقرن یمن کا بادشاہ تھا۔ اس کی اولاد میں جو بادشاہ ہوئے ان کو تبع ہی کہا گیا۔ انہیں میں سے ایک تبع ایک فوجی مہم کے سلسلہ میں یثرب بھی پہنچا۔ وہ یہاں قتل عام کر کے اس آبادی کو ختم کرنا چاہتا تھا کہ اہل علم نے اس کو خبر دی کہ نبی آخر الزماں کا یہ دار الہجرۃ ہوگا۔ وہ متاثر ہوا، برباد کرنے کے ارادہ کو ملتوی کیا اور یہاں ایک مکان تعمیر کرادیا کہ آنحضرت ﷺ جب تشریف لائیں تو یہاں قیام فرمائیں اور ایک تحریر بھی لکھ کر دے دی۔ جو نسلاً بعد نسل محفوظ رہی اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہنچی۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس تبع کا نام اسعد تھا۔ کنیت ابو کرب، اس نے آنحضرت ﷺ کی شان میں دو شعر بھی کہے تھے۔

شهدت علی احمد انه رسول من الله باری النسم

فلو مد عمری الی عمره لکنت وزیرا له وابن عم

ترجمہ: ”میں شہادت دیتا ہوں کہ احمد اس خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہونگے جو جانوں کا پیدا کرنے والا ہے اگر میری عمر ان کے زمانہ تک دراز ہو گئی تو میں ان کا وزیر بھی ہونگا۔ (سلسلہ نسب کے لحاظ سے) ابن عم بھی“ (معارف ابن قتیبہ ص ۲۱۱ وفاء الوفاء ص ۱۳۴ ج ۱)

❸ ایک توجیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آغاز کے لحاظ سے اگرچہ مسجد قبا اولیٰ ہے کہ اس کی تعمیر پہلے شروع ہوئی لیکن تکمیل کے لحاظ سے مسجد مدینہ مقدم ہے۔ ملاحظہ ہو وفاء الوفاء ص ۱۷۹ ج ۱

سے جو کھجور کاٹے گئے تھے ان کے کھمبے اگلی لائن میں لگائے گئے جو قبلہ کی جانب تھی۔ چھت میں نیچے بلیلاں رکھ کر ان کے اوپر کھجور کے پٹھے (شاخیں جن پر پتے ہوتے ہیں) پتوں سمیت بچھا دیئے گئے۔ ان کے اوپر ہلکی ہلکی مٹی پھیلا دی گئی اور چھپرا کی طرح ڈھلوان رکھی گئی، مگر پھر بھی بارش ہوتی تو ٹپکتی تھی۔ نیچے پختہ فرش نہیں تھا صرف ہموار زمین تھی۔ پانی ٹپکتا تو کیچ ہو جاتی تھی۔ اسی لئے کچھ دنوں بعد چھت پر مٹی زیادہ کر دی گئی اور فرش پر کنکریاں بچھا دی گئیں۔ چھت کی اونچائی سات ہاتھ (ساڑھے تین گز یعنی ساڑھے دس فٹ)

تین طرف دروازے رکھے گئے۔ قبلہ کی طرف کوئی دروازہ نہیں تھا۔ جنوب اور مشرق و مغرب کی جانب دروازے تھے۔ [1] کچھ دنوں بعد جب بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا (جو مدینہ سے جنوب کی جانب ہے) تو اس طرف کی دیوار کا دروازہ بند کر دیا گیا اور جانب شمال کی دیوار جو پہلے دیوار قبلہ تھی اس طرف دروازہ کھول دیا گیا [2] اور اسی دیوار [3] سے متصل وہ سائبان بنا دیا گیا جو صفہ کہلاتا تھا، جو ان اصحابہ کا مسکن تھا جن کے اہل و عیال نہیں ہوتے تھے اور تعلیم، روحانی تربیت، نیز رضاکارانہ خدمات کی غرض سے یہاں رہا کرتے تھے۔ معاش کے لئے دن کو لکڑیاں چن لیتے تھے۔ مگر رات کی تاریکی میں تلاوت قرآن اور نوافل کے قندیل روشن رکھتے تھے۔

ابتداء میں منبر نہیں تھا تو ایک ستون کی برابر میں مٹی کی چوکی (چبوتری) بنادی گئی تھی۔ آقائے دوجہان صلی اللہ علیہ وسلم اسی پر رونق افروز ہو کر خطاب فرمایا کرتے تھے اور ستون پر سہارا لگالیا کرتے تھے۔

حجرات امہات المومنین:

مسجد کی تعمیر سے فراغت ہوئی تو مسجد سے متصل ہی ازواج مطہرات کے لئے مکان بنوائے۔ اس وقت تک حضرت سودہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نکاح میں آچکی تھیں، اس لئے دو ہی حجرے بنوائے۔ جب ازواج مطہرات آتی گئیں تو اور مکانات بنتے گئے۔

---

[1] وفاء الوفاء ص ۲۴۲ ج ا، اس عمارت کے لئے کوئی چندہ نہیں کیا گیا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے پیش کرنا چاہا اور درخواست کی کہ باقاعدہ چھت ڈلوا دی جائے۔ فرمایا نہیں۔ عریش کعریش موسیٰ خشیبات و ثمام والشان اعجل۔ یعنی موسیٰ علیہ اسلام کے چھپر کی طرح (یہ چھت ہوگی) کہ نیچے لکڑیاں (بلیلاں) ان کے اوپر پھونس، (پھر فرمایا) انسان کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ عجلت لئے ہوئے (نازک ہے) (ابن سعد ص ۲ ج ۲ وفاء الوفاء ص ۲۴۲ ج ا)

[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال شب قدر کے متعلق فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ میں پانی اور کیچڑ میں سجدہ کر رہا ہوں۔ اس وقت بادل کا نام و نشان نہ تھا۔ مگر دفعۃً رات کو بارش ہوئی تو واقعی صبح کو پانی اور کیچڑ میں سجدہ کرنا پڑا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک پر بھی مٹی لگی ہوئی تھی۔ (بخاری شریف ص ۲۷۰ وفاء الوفاص ۲۴۲۔)

[3] وفاء الوفاء ص ۲۶۲ ج ا۔ ان حضرات کو مسجد ہی میں سونے کی اجازت تھی۔ ابن سعد ص ۱۳ ج ۲ و بخاری ص ۶۳۔

مسجد سے متصل حضرت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کی جائیداد تھی۔ ہر ایک مکان کے لئے وہی اپنی جائیداد کا ٹکڑا پیش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ تمام جائیداد محبوب رب العالمین ﷺ کے نذر کر دی۔ مسجد کی طرح چار حجرے بھی کچی اینٹوں کے تھے اوپر کھجور کے پٹھوں اور پتوں کی چھت چھوٹے سے صحن کے گرد کھجور کی کھپچیوں (پٹھوں) کی دیواریں جن پر مٹی لیس دی گئی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کا ایک کواڑ تھا۔ باقی کے دروازوں پر ٹٹیاں تھیں۔ پانچ حجرے ایسے بنائے گئے کہ ان میں کچی اینٹیں بھی نہیں لگائی گئیں بلکہ ٹٹیاں کھڑی کر کے ان پر مٹی لِھپیں دی گئی اور اوپر کھجور کے پٹھوں اور پتوں کی ہلکی سی چھت ڈال دی گئی۔ ان کے دروازوں پر نہ ٹٹیاں تھی نہ کواڑ، بلکہ ٹاٹ یا کمبل کے پردے پڑے رہتے تھے جو طول میں تین ہاتھ اور عرض میں ایک ہاتھ سے کچھ زائد تھے۔ چھتیں ایسی نیچی کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا دور تھا، جب میں ذرا بڑا ہو گیا تھا میں ان حجروں میں جاتا تو کھڑے ہو کر ان حجروں کی چھتوں کو ہاتھ لگالیا کرتا تھا۔ رات کو گھروں میں چراغ جلانے کا رواج نہیں تھا، لہذا ان حجروں میں رات کو صرف نور حق کی روشنی رہتی تھی۔

سنہ ۸۷ھ میں اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک نے مسجد نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کی توسیع کی تو ان مبارک حجروں کو مسجد میں شامل کر لیا۔

ابو امامہ حضرت سہیل بن حنیف فرمایا کرتے تھے۔ کاش ان حجروں کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا تاکہ لوگ دیکھتے کہ جس نبی کے دست مبارک پر تمام خزانوں کی کنجیاں رکھ دی گئی تھیں اس نے خود اپنے لئے کیا پسند کیا تھا۔ [1]

صفہ و اصحاب صفہ :

پہلے گذر چکا ہے کہ تبدیلی قبلہ کے بعد جب نماز جنوب کی جانب رخ کر کے پڑھی جانے لگی تو اس طرف کی دیوار میں جو دروازہ تھا وہ بند کر دیا گیا اور پہلی دیوار قبلہ (شمالی دیوار) میں دروازہ کھول دیا گیا۔ اس سے متصل چبوترہ بنا دیا گیا اور اس پر سائبان ڈال دیا گیا۔ اسی کو صفہ کہا جاتا تھا۔ [2] نادار مسلمان جن کے اہل و عیال نہیں ہوتے تھے ان کا مسکن یہی ہوتا تھا۔ توکل ان کا سرمایہ ہوتا تھا۔ سوال کرنا ممنوع، تعلیم، روحانی تربیت اور رضاکارانہ خدمات ان کے فرائض اور مشاغل ہوتے تھے۔

---

[1] ابن سعد ص ۱۸۱ ج ۲ وفاء الوفاء ص ۳۴۷ ج ۱ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور دوسرے اکابر تابعین نے بھی اسی جذبہ کا اظہار فرمایا۔

[2] قال عیاض الصفہ بضم الصاد و تشدید الفاء ظلۃ فی موخر مسجد النبی ﷺ یاوی الیھا المساکین۔ (وفاء الوفاء ص ۳۲۱ ج ۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ستر اصحاب صفہ کو دیکھا کہ ان کے پاس چادر تک نہ تھی فقط تہہ بند تھا یا صرف کمبل جس کو اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے۔ کمبل بھی اس قدر چھوٹا کہ کسی کی آدھی پنڈلیوں تک پہنچتا، کسی کے ٹخنوں تک۔ نماز میں ستر کھلنے کا خطرہ رہتا تو ہاتھ سے تھامے رکھتے تھے۔ ❶

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھانے کی چیز صدقہ میں آتی تو ان کو دیدیتے، خود تناول نہیں فرماتے تھے کیونکہ صدقہ آپ کے لئے حرام تھا۔ جو چیز بطور ہدیہ آتی تو ان کو بلالیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ ❷

یہ حضرات فاقہ سے نہیں گھبراتے تھے کیونکہ خود اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے کہ کئی کئی وقت گزر جاتے اور فاقہ نہیں ٹوٹتا، بھوک سے کبھی اتنا ضعف ہو جاتا کہ نماز کی حالت میں گر پڑتے، لوگوں کو خیال ہوتا کہ دورہ پڑ گیا ہے حالانکہ دورہ فاقہ کا ہوتا تھا۔ ❸

کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو انصار پر تقسیم فرمادیتے کہ اپنے بساط کے موجب ہر شخص ایک ایک دو دو کو لیجائے اور اپنے ساتھ ان کو کھانا کھلائے۔ ❹

مسجد مبارک کے دو ستونوں میں ایک رسی بندھی رہتی تھی۔ کھجوروں کے موسم میں حضرات انصار کھجوروں کے گچھے (خوشے) اپنے باغات سے لاکر لٹکادیتے تھے، جو کھجور پک جاتا اس کو لکڑی سے جھاڑ کر کھالیا کرتے تھے ❺۔ ان بہادر و جاں باز فقراء اور درویشان باوقار کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشارت دیا کرتے تھے۔

لو تعلمون ما لکم عند اللہ لاحببتم ان تزدادوا فقراً وحاجۃ۔ ❻

"اگر تم جان جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہارے لئے کیا تیار ہے تو تم آرزو کرو کہ ہمارا یہ فقر وفاقہ اور بڑھ جائے۔"

ان حضرات کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔

نماز جنازہ کی جگہ:

---

❶ بخاری شریف ص ۶۳، ج ا و فتح الباری ص ۴۲۶ ج ا

❷ ترمذی شریف باب فی معیشت اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۵۹ ج ۲،

❸ ترمذی شریف باب فی معیشت اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۵۹ ج ۲،

❹ یہ بھی صورت ہوتی کہ آپ فرمادیتے کہ جن کے یہاں دو کھانے والے ہوں وہ تیسرے کو لیجائے اور جس کے یہاں کھانے والے چار ہوں وہ دو دو کو لیجائے اور ساتھ کھانا کھلائے۔ ایک روز آپ نے اسی طرح اصحاب صفہ کو تقسیم فرمادیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں چار کھانے والے تھے۔ خود حضرت ابو بکر، ان کے صاحبزادے اور اہلیہ اور ایک خادم مگر آپ اپنے ساتھ تین کو لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سات اصحاب کو لے گئے (بخاری شریف ص ۸۴ و ص ۵۰۶ وغیرہ)

❺ وفاء الوفاء ص ۳۲۴ ج ا

❻ ایضاً ص ۳۲۲ ج ا و ترمذی شریف باب فی معیشہ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۵۹ ج ۲،

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو جس کسی بیمار کی نزعی کیفیت ہوتی (مرنے کے قریب ہوتا) تو آنحضرت ﷺ کو اطلاع دی جاتی۔ آپ تشریف لاتے اس کے لئے دعا فرماتے۔ وہ شخص وفات پا جاتا تو اکثر ایسا ہوتا کہ تجہیز و تکفین آپ کے سامنے ہی ہوتی اور آپ دفن کے وقت تک وہاں رہتے تھے۔ اس میں آپ کو بہت دیر ہو جاتی تھی۔ اس کا ہمیں احساس ہوا تو ہم نے یہ کر لیا کہ وفات کے بعد آنحضرت ﷺ کو اطلاع دیتے۔ آپ تشریف لاتے، نماز جنازہ پڑھاتے پھر کبھی واپس تشریف لے جاتے اور کبھی دفن ہونے تک وہاں تشریف رکھتے۔ پھر ہمیں محسوس ہوا کہ آپ کو اس میں بھی زحمت ہوتی ہے تو یہ طے کر لیا کہ آنحضرت ﷺ کو تکلیف نہ دی جائے گی بلکہ جنازہ لے کر خود آپ کی خدمت میں پہنچ جایا کریں گے۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا۔ جب جنازہ لیکر کاشانہ نبوت پر پہنچے تو قریب ہی ایک جگہ تھی وہاں آپ نماز پڑھاتے۔ پھر یہی معمول ہو گیا کہ اسی خاص جگہ پر نماز جنازہ پڑھائی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ اس جگہ کا نام ہی موضع الجنائز پڑ گیا۔ [1]

نماز باجماعت

عبادت، عربی لفظ ہے جس کا ترجمہ پوجا کیا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت ہے غایۃ التذلل یعنی انتہا درجہ عاجزی، بے چارگی، بے بسی، اسی کے اظہار کو عبودیت کہتے ہیں۔ اپنے مالک اور خالق کے سامنے اپنی بے بسی اور عاجزی کے اظہار کے لئے جماعت کی ضرورت نہیں بلکہ گوشہ خلوت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ پر کیف اور پر خلوص وہ عاجزی ہوتی ہے جو تنہائی میں ہو، جہاں بندہ تصور معبود میں غرق ہو۔ معبود اور مالک کے سوا کسی کا وجود تو کیا کسی کا تصور بھی نہ ہو۔ اسلام نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : [2]

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۱۴ جلد اول قسم ثانی، آنحضرت ﷺ کا معمول یہی تھا کہ موضع الجنائز میں نماز پڑھایا کرتے تھے جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب الصلوٰۃ علی الجنائز بالمصلی والمسجد میں پیش کی ہیں۔ ص ۷۷ اگر بعض مرتبہ کسی عارض کی وجہ سے مسجد میں بھی نماز پڑھ لی ہے۔ فتح الباری ص ۱۵۵ ج ۳ باب مذکور) اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا مذہب یہ ہے کہ کسی خاص ضرورت کے بغیر مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے۔ البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جائز قرار دیتے ہیں (واللہ اعلم بالصواب)

[2] فرائض کے علاوہ نوافل میں سنت یہی ہے کہ اپنے مکان میں پڑھی جائیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سید الثقلین ﷺ سے دریافت کیا کہ افضل کیا ہے، مکان میں یا مسجد میں۔ ارشاد ہوا تم دیکھتے ہو میرا مکان مسجد سے کتنا قریب ہے۔ اس کے باوجود اپنے مکان میں نماز پڑھوں یہ مجھے زیادہ محبوب ہے بمقابلہ مسجد میں نماز پڑھنے کے۔ اِلّا یہ کہ فرض نماز ہو (ابن ماجہ) ارشاد ہوا مکان میں نماز پڑھنا نور ہے لہذا اپنے مکانات کو منور کرو (ابن خزیمہ)۔ ارشاد ہوا کچھ نمازیں (نفلیں) گھروں میں پڑھا کرو اپنے مکانات کو قبریں نہ بنالو (بخاری شریف وغیرہ)۔ ایک ارشاد یہ ہے کہ جہاں لوگ نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (سورہ الاعراف۔ ۵۵)

"پکارو اپنے رب کو عاجزی کرتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے پوشیدہ طور پر"

دوسرے موقع پر ارشاد ہے:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾

(سورہ الاعراف، آیت ۲۰۵)

"یاد کر اپنے رب کو دل ہی دل میں عاجزی اور نیاز مندی کے ساتھ ڈرتے ڈرتے اور زبان سے بھی آہستہ آہستہ بغیر پکارے صبح وشام اور ایسا نہ ہو کہ تم ان میں ہو جاؤ جو غافل رہتے ہیں۔"

لیکن جس طرح اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے عبادت کو مکمل کیا۔ مثلاً پہلی امتوں میں کسی امت کی نماز میں صرف سجدہ ہوتا تھا۔ رکوع نہیں ہوتا تھا۔ کسی امت کی نماز میں صرف رکوع اور کسی امت کی نماز میں صرف قیام ہوتا تھا۔ کھڑے کھڑے دعائیں پڑھا کرتے تھے، نہ سجدہ کرتے نہ رکوع۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ جس نماز کی تعلیم دی گئی اس میں قیام اور قعدہ بھی ہے اور سجدہ اور رکوع بھی۔ پھر جس طرح ظاہری ارکان کے لحاظ سے مکمل ہے۔ معنی کے لحاظ سے بھی مکمل ہے کہ سب سے پہلے اللہ اکبر کہا جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور عظمت کا اقرار۔ پھر اس کی حمد وثناء[1] اور اس کے ارشادات[2] اور آیات الٰہیہ کی تذکیر، پھر جملہ نقائص سے اس کی پاکی اور عظمت[3]، اس کی پروردگاری اور بلندی وبرتری کا اعتراف اور اس[4] بات کا اظہار کہ وہ حمد کرنے والوں کی حمد سنتا ہے۔ پھر بارگاہ رب

(مثلاً مسجد) ایسی جگہ نماز پڑھی جائے۔ اس کے مقابلہ میں گھر میں نماز پڑھنے کی وہی فضیلت ہے جو فرض نماز کی فضیلت نفل نماز پر ہے۔ ترغیب ترہیب (بحوالہ بیہقی)

[1] سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض یا واجب ہے جس کے شروع میں ہے:۔ الحمد للہ رب العٰلمین، الرحمن الرحیم، مالک یوم الدین۔ اور اس سورت کی اہمیت یہ ہے کہ حدیث میں اس سورت کو نماز سے تعبیر کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف تقسیم کر دیا ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو وہ مانگتا ہے (تقسیم کی تفصیل یہ ہے) کہ بندہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثناء کی، پھر بندہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری عظمت بیان کی، پھر بندہ کہتا ہے: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور بندہ کی درخواست منظور ہے۔ پھر بندہ کہتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ بندے نے اپنے لئے درخواست کی ہے اس کی درخواست منظور ہوگی۔ مسلم شریف ص ۱۷۰ ج ۱

[2] سورہ فاتحہ کے بعد قرآن پاک کا کچھ حصہ پڑھنا ضروری ہے۔ قرآن پاک میں احکام بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور توحید رسالت کے دلائل بھی۔ مشاہدات یا تاریخی واقعات کے ذریعہ پیش کئے گئے ہیں۔

[3] سبحان ربی العظیم رکوع میں۔ سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ

[4] رکوع سے کھڑے ہوتے ہوئے سمع اللہ لمن حمدہ (وہ اس کی سنتا ہے جو اس کی حمد کرتا ہے۔

ذوالجلال میں جملہ تعظیمات [1] کی پیش کش۔ اس کے رسول پر درود و سلام۔ پھر اپنے لئے دعا۔

اس ظاہری اور معنوی تکمیل کے ساتھ ایک خصوصیت یہ ہے کہ انفرادی عمل کو اجتماعی عمل بنایا گیا اور جو کام الگ الگ کرنے کا تھا اس میں سب کی شرکت لازم کردی گئی یعنی پانچ وقت کی نمازیں، جن کا پڑھنا ہر ایک عاقل بالغ مسلمان کے لئے ہر حالت میں ضروری ہے [2]۔ جن کو فرض کہا جاتا ہے ان کے متعلق نہایت تاکید [3] سے حکم ہوا کہ سب مل کر ایک ساتھ پڑھیں۔ ایک پڑھانے والا ہو (امام) باقی سب اس کی پیروی کرنے والے (مقتدی)۔

اس جماعت کا ایک مرکز ہونا چاہئے [4] جس کو مسجد کہا جاتا ہے۔ پنج وقتہ نمازوں میں ایک مخصوص اور محدود حلقہ (مثلاً محلہ) کے خدا پرستوں کا اجتماع ہونا چاہئے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ اس سے وسیع پیمانہ پر اور اسلامی تہوار یعنی عید، بقر عید کے موقع پر اس علاقہ کے تمام حلقوں کا مشترکہ اجتماع، آبادی سے باہر کسی وسیع مقام پر ہونا چاہئے۔

جماعت کے فوائد :

بیشک بندہ اور خدا کے درمیان جو تعلق اور رشتہ ہے اس کے تسلیم کرنے اور اس کے بروئے کار لانے کے لئے مظاہرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر یہ تو ضروری ہے کہ بندگان خدا میں یاد خدا کا جذبہ پیدا ہو، خدا پرستی کا رواج ہو، پرستش حق کی فضا بنے۔ اللہ تعالیٰ کا نام کھلم کھلا لیا جائے۔ اس کی عظمت و معبودیت کی شان دکھائی جائے تاکہ جو خدا کو بھولے ہوئے ہیں انہیں اللہ یاد آئے، جو اپنے رب سے ٹوٹے ہوئے ہیں وہ اپنا رشتہ رب سے جوڑیں۔ ظاہر ہے یہ مبارک مقاصد اجتماع [5] کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔

تعلیم و تبلیغ اور اصلاح کے نقطہ نظر سے فائدہ یہ ہے کہ دوسروں کو ترغیب ہوتی ہے، شہری زندگی

---

[1] التحیات للہ والصلوٰت والطیبات۔

[2] مسافر ہو یا مقیم، بیمار ہو یا تندرست۔

[3] اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کے ارشادات آگے آئیں گے (انشاء اللہ) یہاں قرآن پاک کے اسلوب سے سبق لیجئے۔ قرآن پاک میں جہاں نماز کا حکم ہوا ہے عموماً جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ حٰفِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (سورہ بقرہ۔۲۳۸) اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (سورہ اعراف۔۲۸) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا (سورہ حج ۷۷ وغیرہ تک، نیز صلوا (نماز پڑھو) کے بجائے جگہ جگہ اقیموا الصلواۃ ارشاد ہوا ہے۔ اقامۃ الصلوات یہی ہے کہ نماز ایسی شان سے پڑھی جائے کہ دینداری اور خدا پرستی کی فضا بنے۔ کلمۃ اللہ سربلند ہو شان حق نمایاں ہو۔

[4] قرآن حکیم نے اس مرکز کو یہ اہمیت دی ہے کہ ستر پوشی کا حکم دیا تو نماز کو مسجد سے تعبیر کیا۔ ارشاد ہے: خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (سورہ الاعراف۔ ۳۱) "لے لو اپنی آراستگی مسجد کے وقت (یعنی ہر نماز کے وقت) "یعنی باقاعدہ نماز وہی ہے جو اس طرح ہو کہ آپ آراستہ ہو کر مسجد میں جائیں۔"

[5] امام ابو حنیفہؒ نے اس اجتماع میں ایک وحدت تسلیم کی کہ امام کو اصل قرار دیا اور مقتدیوں کو اس کا تابع۔ قرأت فاتحہ اور قرأت قرآن کا فریضہ امام ادا کریگا۔ اس کی قرأت سب کی قرأت ہوگی: من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ (الحدیث)

میں خدا پرستی کا رواج ہوتا ہے اس کا شوق بڑھتا ہے۔ معاشی اور سماجی لحاظ سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مل جل کر کام کرنے کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ تعاون اور اشتراک عمل کی رسم پڑتی ہے اور جب "ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں محمود وایاز" تو اخوت اور مساوات بھی نظریہ کی حد سے آگے بڑھ کر میدان عمل میں جلوہ گر ہوتی ہے اور جب ایک صف میں کندھے [1] سے کندھا ملا کر سیدھے کھڑے ہوتے ہیں کہ نہ کوئی آگے نکلا ہوا ہو اور نہ کوئی پیچھے ہٹا ہو۔ ہر ایک کا ٹخنہ دوسرے کے ٹخنہ کی سیدھ میں ہو۔ اور یہ سب خواہ ان کی تعداد لاکھوں ہو، ایک ہی امام کی آواز پر کبھی ہاتھ کانوں تک اٹھائیں، کبھی ہاتھ باندھ لیں، کبھی سیدھے کھڑے ہوں کبھی ایک ساتھ جھک جائیں، کبھی زمین پر ماتھے رکھ دیں کبھی دوزانو بیٹھ جائیں، تو ایک عسکری تربیت اور فوجی نظم وضبط کی شکل رونما ہوتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ مسجد مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کا مرکز بھی بنی۔ یہیں ان کو انصاف مہیا کرنے کے بندوبست ہونے لگے اور یہیں مسلمانوں کی ضرورتوں، ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کے اقدامات ہونے لگے۔ غرض اس طرح کے بہت سے فائدے وجود پذیر اور ظہور فرما ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جب مدینہ میں آزاد فضا میسر آئی اور یہ موقع ملا کہ اللہ کا نام کھلم کھلا لیا جائے تو آنحضرت ﷺ نے جماعت کو لازم قرار دیا[2]۔ یہاں تک کہ حضرات صحابہ کا عام مذاق یہی بن گیا کہ جماعت کے بغیر وہ نماز کو جائز ہی نہیں سمجھتے تھے [3]۔ بیمار آدمی بھی ساتھیوں کے سہارے مسجد میں آتا اور جماعت میں شریک ہوتا تھا اور سستی وہی کرتا تھا جس کے دل میں نفاق ہوتا تھا۔ پھر شہر یا آبادی ہی نہیں بلکہ جہاں بھی تین مسلمان ہوں ان کے لئے یہی حکم ہوا کہ اگر وہ جماعت سے نماز نہیں پڑھتے تو ان پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے۔ (کہ ان کے مذہبی معاملات درہم برہم ہو جاتے ہیں ان کا صحیح نظم قائم نہیں ہوتا۔)

---

[1] ارشاد خداوندی ہے: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (سورہ صف۔۴) اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے ان سے جو راہ خدا میں اس طرح صف باندھ کر مقابلہ باطنی دشمن یعنی شیطان اور شیطانی جذبات سے ہوتا ہے۔

[2] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے ارادہ کیا کہ میں لکڑیاں جمع کراؤں۔ پھر نماز پڑھنے کیلئے نماز کی اذان دیدی جائے تو کسی کو کہدوں کہ وہ نماز پڑھائے پھر میں ان کے یہاں جاؤں جو جماعت میں حاضر نہ ہوں اور ان کے گھروں کو آگ لگادوں (بخاری شریف ص۸۹) اندازہ فرمایئے رحمۃ اللعلمین ﷺ جو اہل ایمان کے حق میں ایسے رؤف رحیم ہیں کہ ہر وہ بات ان کو شاق ہوتی ہے جو مسلمانوں کے لئے پریشانی کا سبب بنے، ترک جماعت پر اتنے ناراض ہوں) کتنی ضروری ہوئی۔

[3] قد روی عن غیر واحد من اصحاب النبی ﷺ انھم قالوا من سمع النداء فلم یجب فلا صلوٰۃ لہ (ترمذی شریف ص۳۰)

مواخات

مہاجرین اور انصار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) میں بھائی چارہ

(۱)

پچاس کے قریب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ آچکے ہیں۔ باقی آ رہے ہیں۔ آنے والوں میں وہ بھی ہیں جو مکہ میں صاحب حیثیت تھے۔ جائیدادوں اور کاروبار کے مالک تھے، مگر اب یہ سب قرآن پاک کے الفاظ میں "الفقراء" ہیں [1]، کیونکہ نہ صرف جائیدادوں پر بلکہ ان کے مال و متاع اور سامان و اسباب پر بھی دوسروں کا قبضہ ہو چکا ہے۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے رعب وداب اور دھاک کے آدمی چند ہی تھے جنہوں نے کھلم کھلا ہجرت کی۔ باقی سب وہ تھے جو چھپتے چھپاتے خالی ہاتھ بمشکل تمام مدینہ پہنچے تھے۔ ان کے بدن کے کپڑے بھی سالم نہیں تھے۔ (کسی قدر تفصیل گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے)

(۲)

پوری دنیا میں صرف وہ مٹھی بھر جاں نثار ان، پردیسی فقراء اور تہی دستوں کے مددگار تھے جنہوں نے بیعت عقبہ کے موقع پر ان کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تھی، مگر یہ کتنے تھے؟ ان کے ذرائع کیا تھے؟ صرف تہتر یا بچھتر جب کہ ان میں دو عورتیں بھی تھیں۔ [2]

(۳)

یثرب اول تو کاروباری قصبہ نہیں تھا اور جو کاروبار تھا اس پر یہودیوں کا قبضہ تھا۔ قبیلہ اوس اور خزرج کے لوگ جن سے حضرات انصار کا تعلق تھا وہ کاشتکار تھے۔ کسی کے پاس اپنی زمین تھی کوئی دوسروں کی زمین میں بٹائی پر کاشت کرتا تھا۔ جن کی زمینیں اپنی تھیں اقتصادی ڈھانچہ ان کا بھی بگڑا ہوا تھا۔ جس کے پاس جو کچھ پس انداز تھا وہ اوس اور خزرج کی آپس کی لڑائی میں ختم ہو چکا تھا جن کا سلسلہ تقریباً ایک سو بیس سال کے بعد تین چار سال پہلے ختم ہوا تھا۔

عموماً بیع سلم [1] (بدھنی) کی شکل میں یا سود پر پیشگی رقم لے لی جاتی تھی اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ پوری پیداوار اس سلم یا سود کی نذر ہو جاتی تھی۔

---

[1] سورہ ۵۹ حشر، آیت ۸،

[2] جو حضرات بیعت کے موقع پر حاضر نہیں ہو سکے اور مسلمان ہو چکے تھے ان کی تعداد بھی اس سے زیادہ نہ ہو گی۔

ان قبیلوں کے کچھ لوگ ان حالات سے مستثنیٰ تھے مگر ان میں سے چند کے سوا باقی سب صاحب جائیداد، بڑے لوگ اپنے سابق مذہب پر قائم تھے۔

(۴)

اللہ کے گھر (مسجد مبارک) کی تعمیر شروع ہوئی تو رحمۃ اللعالمین ﷺ کے سامنے ان درماندہ پر دیسی مہاجرین کی بود وباش کا مسئلہ بھی تھا کہ اگر ان کے رہنے کا ٹھکانا ہو جائے تو دارالھجرت میں وطن کی کچھ آسائش میسر آسکے اور پراگندہ حالی ختم ہو۔

ممکن تھا ان کے لئے الگ محلہ آباد کر دیا جاتا۔ معاشرت کا جو فرق تھا کہ اہل مدینہ کاشتکار اور زمیندار تھے اور مہاجرین تاجر پیشہ، شہری زندگی کے عادی، اس کا بھی تقاضا یہی ہونا چاہئے کہ ان کی آبادی الگ ہوتی۔ نئی آبادی کے لئے مالی مشکلات کا حل وہ باہمی تعاون تھا جس نے بلا کسی غیر معمولی خرچ کے مسجد مبارک اور ازواج مطہرات کے حجرات کی تعمیر کرادی تھی۔ لیکن علیحدہ آبادی سے مہاجرین اور انصار میں شیر وشکر جیسی یگانگت نہیں پیدا ہو سکتی تھی اور باہمی انسیت والفت کی وہ نعمت جو اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو عطا فرمائی تھی (جس کو کلام پاک میں خاص طور پر نمایاں فرمایا گیا تھا)[2] وہ مشاہدہ بن کر سامنے نہیں آسکتی تھی۔

جن کو مساوات، اشتراک عمل اور ایک دوسرے کے لئے ایثار واخلاص کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنا تھا۔ علیحدہ آبادی نہ ان کے لئے مناسب تھی نہ وہ خود یہ علیحدگی برداشت کر سکتے تھے جو اسلامی معاشرہ میں اونچ نیچ کی بنیاد بن جاتی۔

اس کے علاوہ تعلیم وتربیت کے لحاظ سے جس مساوی سطح کی ضرورت تھی علیحدہ آبادی اس کے لئے خلیج بن جاتی۔

حضرات مہاجرین کم وبیش دس بارہ سال تک برکات نبوت سے فیضیاب ہو کر تربیت یافتہ عالم و فاضل بن چکے تھے۔ حضرات انصار کی مخلصانہ ذہانت اگرچہ ان کے لئے رہنما ہوتی تھی مگر اس ذہانت میں رحمۃ اللعالمین ﷺ "رؤف رحیم" کا رنگ بھرنے اور حضرات انصار کو مہاجرین کی سطح پر لانے کے لئے جس تواصی بالحق[3] باہمی احتساب، افادہ اور استفادہ، تعلیم وتعلم کی ضرورت تھی الگ آبادی کی صورت میں وہ پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

---

[1] بخاری شریف ص۲۹۸،

[2] هُوَ الَّذِیٓ اَیَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَبِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیۡنَهُمۡ اِنَّهٗ عَزِیۡزٌ حَكِیۡمٌ ﴿۶۳﴾ (الانفال، آیت ۶۲،۶۳)

[3] ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے اور اس پر عمل کرنے کی نصیحت کرنا۔

(۵)

عرب میں عقد موالات کا طریقہ رائج تھا۔ غیر قبیلہ کا آدمی کسی بھی قبیلہ میں پہنچتا، اور ایک معاہدہ کرکے اس قبیلہ میں داخل ہو جاتا، اب اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہوتا۔ معاہدات صلح و جنگ میں شریک رہتا اور مرنے کے بعد اس کا ترکہ بھی اسی قبیلہ میں تقسیم کیا جاتا۔ حضرات مہاجرین اور انصار میں یہ عقد ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ عقد موالات کچھ روایتیں رکھتا تھا۔ ان میں ایسی روایات [1] بھی تھیں جن کو اسلام برداشت نہیں کر سکتا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو بدبودار [2] فرمایا۔ اور قرآن حکیم نے انکی مخالف اور متضاد بنیادوں [3] پر اسلامی تہذیب و اخلاق کی عمارت بلند کی۔ اب یہ پیغمبرانہ تدبر تھا کہ عقد موالات کے بجائے آپ نے عقد مواخات کی بنیاد ڈالی۔

(۶)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مکان میں حضرات مہاجرین و انصار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کا اجتماع ہوا۔ یہ کل نوے حضرات تھے۔ پینتالیس مہاجرین، پینتالیس انصار، آنحضرت ﷺ نے اپنی صوابدید کے موجب ان میں سے ایک ایک انصاری کو ایک ایک مہاجر کا نام بنام بھائی قرار دے دیا۔ یہ رحمتہ اللعالمین ﷺ کی پیغمبرانہ فراست اور مردم شناسی تھی کہ جن کو آپ نے بھائی بنایا فطری طور پر ان کے مزاج برادرانہ تھے۔ وہ حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ ایک دوسرے کے ہمدرد اور مددگار بن گئے اور مزاجوں کی موافقت کے ساتھ جب حضرات مہاجرین سے لِلّٰہِیَّت اور اعلیٰ اخلاق کا بھی ظہور ہوا تو حضرات انصار کے اخلاص نے عقیدت کی

---

[1] ہمارے زمانہ کا سیاسی گٹھ جوڑ اور پارٹی بندی اس کا نمونہ ہے کہ حق و انصاف کا نام لینا بھی جرم ہوتا ہے۔ جابجا، جائز و ناجائز پارٹی کی حمایت کی جاتی ہے اور اسی کو تدبر اور دانش مندی سمجھا جاتا ہے۔

[2] دعوھا فانھا منتنہ بخاری شریف ص۷۲۹

[3] زمانہ جاہلیت میں اس تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی کہ حق پر کون ہے اور تقاضا انصاف کیا ہے۔ صرف یہ معاہدہ (عقد موالات) ہی دلیل ہوتا تھا یعنی چونکہ ہمارا حلیف میدان جنگ میں ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم بھی اس کی حمایت میں میدان جنگ میں ہوں۔ اسلام نے اس قسم کے معاہدہ ہی کو حرام قرار دیا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کا مشہور ارشاد ہے لاحلف فی الاسلام اور مسلمانوں کیلئے قرآن پاک کی خاص ہدایت یہ ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ (النساء۔۱۳۵) ترجمہ: مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے یہ اللہ کے لئے گواہی (سچی گواہی) خواہ خود تمہارے خلاف ہو یا ماں باپ اور قرابت والوں کے خلاف ہو۔" نیز ارشاد ہے: "اگر کسی قوم سے کسی بنا پر ناراضگی بغض اور غصہ ہے تو ہرگز ہرگز ایسا نہ ہو کہ یہ بغض تمہیں ابھار دے۔ اس بات پر کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو۔ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے" (سورہ مائدہ رکوع ۲ آیت ۸) "اور ایک گروہ نے اگر تمہیں خانہ کعبہ میں جانے سے روک دیا ہے جس سے تمہیں غم و غصہ ہے تو اس کا یہ اثر ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ یہ غم و غصہ تمہیں اس بات پر ابھار دے کہ تم زیادتی کرنے لگو (تمہارا دستور تو یہ ہونا چاہئے کہ نیکی اور پرہیزگاری کے کام میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم کے کام میں مدد نہ کرو)" (سورہ ۵ مائدہ آیت ۲)

شان اختیار کرلی۔

ام العلاء رضی اللہ عنہا ایک انصاری خاتون تھیں جن کے گھرانے کے حصہ میں حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ آئے تھے۔ وہ اپنے مہمان کی اتنی معتقد ہو گئیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو ام العلاء رضی اللہ عنہا نے بڑے وثوق سے کہا: شہادتی علیک لقد اکرمک اللہ یعنی میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یقیناً آپ کو بخش دیا ہے۔ ❶

رشتہ اخوت اور حضرات انصار کا ایثار

وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ (سورہ نساء۔۳۳)

"اور جن سے اقرار باندھا تم نے ان کو پہناؤ ان کا حصہ (شاہ عبد القادرؒ)

عرب میں عقد موالات کا اثر مرنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مولیٰ (جس سے یہ معاملہ ہوتا تھا) وہ چھٹے حصے کا مستحق ہوا کرتا تھا۔ مندرجہ بالا آیت کے بموجب رشتہ اخوت کا اثر وفات کے بعد ظاہر ہونا چاہئے تھا کہ ایک دوسرے کا وارث ہوتا۔ مگر حضرات انصار نے بیعت عقبہ کے سلسلہ میں جب دعوت دی تھی تو امداد کا وعدہ بھی کیا تھا۔ آقاء دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے جب رشتہ اخوت قائم فرمایا تو حضرات انصار کی مخلصانہ اور ایثار شیوہ ذہانت نے اس کے معنیٰ یہ سمجھے کہ امداد کا طریقہ برادرانہ ہونا چاہئے۔

امداد کرنے کے لئے املاک تقسیم نہیں کی جاتی مگر برادر زندگی میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرات انصار نے فیصلہ فرمایا کہ مہاجر بھائیوں کو اپنی زندگیوں میں برابر کا شریک بنالیں۔ چنانچہ دربار رسالت میں درخواست پیش کر دی:

اقسم بیننا وبی اخواننا النخیل ❷

"ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان باغات تقسیم فرمادیجئے۔"

منصوبہ یہ تھا کہ بھائیوں کا حصہ بھائیوں کے قبضہ میں دیدیا جائے۔ وہ اس کو اپنی ملک سمجھیں، اپنی صوابدید کے بموجب اس میں تصرف کریں اور فائدہ اٹھائیں لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت نے یہ منظور

---

❶ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح وثوق کر لینے اور قسم کھانے کو پسند نہیں فرمایا۔ کیونکہ کسی کو معلوم نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ آپ نے تعلیم دی کہ یہ کہنا چاہئے کہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہوگا۔ (بخاری شریف ص ۱۶۶) مگر حضرت ام العلا رضی اللہ عنہا کا یہ وثوق اور یقین اس بناء پر تھا کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے غیر معمولی تقویٰ اور آپ کے اعلیٰ اخلاق نے ان کو گرویدہ اور معتقد بنا دیا تھا۔

❷ بخاری شریف ص ۳۱۲ و ص ۵۳۴

نہیں فرمایا کہ حضرات انصار کی املاک سے ان کی ملکیت ختم ہو۔ دوسری طرف دشواری یہ تھی کہ خود حضرات انصار کا جو مقصد تھا وہ اس پیشکش سے پورا نہیں ہوتا تھا۔ حضرات انصار کا مقصد تو یہ تھا کہ مہاجرین کی مالی مشکلات ختم ہوں لیکن اس طرح تقسیم کے بعد حضرات مہاجرین "صاحب زمیں" ضرور ہو جاتے مگر یہ حضرات تاجر پیشہ کاشتکاری اور زراعت سے ناواقف تھے۔ وہ ان افتادہ زمینوں سے پیداوار کر کے وہ امداد حاصل نہیں کر سکتے تھے جس کے لئے حضرات انصار نے یہ ایثار کیا تھا۔

رحمت عالم ﷺ نے حضرات انصار کو اس دشواری کی طرف توجہ دلائی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: امداد کی صورت یہ ہے کہ زمین و باغ کے بجائے پیداوار کا حصہ مہاجرین کو دو۔

باغات کی خدمت اور زمین میں کاشت کی ذمہ داری آپ صاحبان لیں اور پیداوار مہاجرین کو دیدیں۔ ❶

حضرات مہاجرین نے بھی یہی فرمائش کی: کام کی ذمہ داری آپ لیں اور پیداوار میں ہمیں شریک کر لیں۔

حضرات انصار نے جیسے ہی یہ تجویز سنیں، دفعۃً ان کے جذبات کی صدا بلند ہوئی:

"سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا" (ہم نے سن لیا ہے ہم پوری پوری تعمیل کرینگے۔ البقرہ۔۲۸۵) دنیا نے بہت سے انقلاب دیکھے مگر اس انقلاب کی کوئی مثال چشم عالم کے سامنے نہیں آئی کہ مالک خود اپنی مرضی سے کاشتکار اور اجنبی لوگ پردیس سے آئے ہوئے خود بخود حصہ دار بن گئے۔ ❷

حضرات انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تصور یہی تھا اگرچہ آنحضرت ﷺ نے اس کو منظور نہیں فرمایا۔ حضرات مہاجرین کی حیثیت کو عارضی قرار دیا۔ چنانچہ جب حضرات مہاجرین کو افتادہ زمینیں مل گئیں تو حضرات انصار کی جائیدادیں واپس کر دی گئیں۔

---

❶ البدایہ والنہایہ ص۲۲۹ ج۳ و ص۲۲۸ ج۳

❷ عام طور پر یہی صورت ہوئی اگرچہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا کہ زمینیں اور باغ لے لیا اور خود کام کیا۔ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کو جو درخت دیئے گئے تھے وہ ان پر مالکانہ تصرف کرتی رہیں اور اپنی ملک ہی سمجھتی رہیں۔ حتیٰ کہ جب ان سے واپس کرنے کو کہا گیا تو تیار نہ ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ نے تقریباً دس گنی جائیداد دیکر ان کو واپس کرنے پر راضی کیا (ص ۷۹ و ۸۰ ج ۴ البدایہ والنہایہ بحوالہ مسند احمد) علامہ علی بن برہان الدین حلبیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرات انصار کی پیش کش اگرچہ یکساں تھی کہ وہ اپنی نصف املاک دینا چاہتے تھے۔ مگر حضرات مہاجرین میں سے بعض نے تو اس کو اس صورت سے منظور کیا کہ حضرات انصار ہی کام کرینگے اور ان کی پیداوار مہاجرین حضرات کو دیتے رہیں گے اور بعض نے ان اراضی کو بطور بٹائی منظور کیا کہ وہ خود کام کریں گے اور نصف حصہ انصار کو دیتے رہیں گے۔ (سیرۃ حلبیہ ص۲۹۷ ج ۲)۔ مگر اس دوسری صورت میں کوئی خاص ایثار نہیں ہے حالانکہ حضرات انصار کا ایثار اتنا تھا کہ مہاجرین حضرات کو یہ فکر ہو گیا کہ تمام اجر و ثواب یہ سمیٹ لینگے ہم تہی دامن رہ جائیں گے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

یہ ایثار کیوں تھا؟

قرآن شریف میں ہم بھی پڑھتے ہیں:

اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۡ وَاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ❶ (سورہ المومن۔ ۳۹)

"یہ دنیا (موجودہ زندگی) صرف چند دن کا کام چلانا ہے اور برت لینا ہے۔ بیشک آخرت ہی ٹھیراؤ (مستقل قیام) کا مقام ہے۔"

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (سورہ العنکبوت۔ ۶۴)

"بیشک اصل زندگی عالم آخرت ہے"

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا ؕ (سورہ مزمل۔ ۲۰)

"اور جو نیک عمل اپنے لئے آگے بھیج دو گے اس کو اللہ کے پاس پہنچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے۔"

ہمارا عقیدہ یہی ہے اور بلاشبہ ان آیتوں پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن ہمارے ایمان و عقیدہ کو یقین کا وہ درجہ حاصل نہیں ہے جو مشاہدہ کی شان رکھتا ہو۔ پھر مشاہدہ بھی غلطی کر جاتا ہے۔ ہماری آنکھیں آفتاب کو گردش کرتا ہوا دیکھتی ہیں۔ ہر صبح و شام کو طلوع و غروب ہمارا مشاہدہ ہے۔ لیکن سائنس کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ مشاہدہ غلط ہے۔ آفتاب گردش نہیں کرتا زمین گھومتی ہے۔ جب مشاہدہ بھی غلط ہو جاتا ہے تو یقین کا کوئی اور درجہ بھی ہو سکتا ہے جو مشاہدہ سے بالا ہو۔ جو سراسر یقین ہی یقین ہو۔ اس میں کسی طرح بھی شک و شبہ یا کسی قسم کے احتمال کی گنجائش نہ ہو۔ جس کو اصطلاحاً عین الیقین ❷ کہتے ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یقین کا یہی درجہ ❸ حاصل تھا۔ اسی یقین کی بنا پر حضرات انصار اپنی جائیدادیں تقسیم کرنے پر خوش تھے کہ ہم نے آخرت کی حقیقی زندگی کے لئے بہت بڑا سرمایہ حاصل کر لیا اور جس کو راہ خدا میں اپنی ملک سے نکالا اس پر ابدی اور لازوال ملک کی مہر لگ گئی جو کبھی مٹنے والی

---

❶ یہ جو زندگی ہے دنیا کی سو برت لینا ہے اور وہ گھر جو پچھلا ہے وہی ہے ٹھیراؤ کا گھر" (حضرت شاہ عبد القادرؒ)

❷ مشاہدہ آتش یقین پیدا کر دیتا ہے کہ یہ آگ ہے اور یہ جلاتی ہے۔ لیکن جو یقین آتش سوزاں میں بھسم ہونے والے کو ہو سکتا ہے وہ صرف مشاہدہ کرنے والے یا ناپنے والے کو نہیں ہو سکتا۔ جلنے اور خاکستر ہونے والے کا یقین ہی ہے عین الیقین ہے۔

❸ یہی عین الیقین صحابہ کرام کی افضلیت کا سبب ہے کیونکہ امت میں یہ درجہ کسی کو بھی حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ امت میں کسی کو بھی یہ شرف حاصل نہیں ہے کہ صادق مصدوق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بالمشافہ کوئی ارشاد سنا ہو جس سے یقین کا آفتاب روشن ہوا ہو۔

نہیں ہے۔ دوسری طرف اسی یقین اور عین الیقین نے ان حضرات مہاجرین کے پاک دلوں میں اضطراب پیدا کر دیا جو مفت میں صاحب جائیداد اور زمیندار بن گئے تھے۔ اضطراب اس پر تھا کہ حضرات انصار کے اس ایثار کا ثمرہ یہ ہو گا کہ اجر و ثواب کا ہر ایک درجہ حضرات انصار ہی حاصل کرلیں گے۔ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) ہم اس درجات تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

چنانچہ حضرات مہاجرین نے اپنے آقا کی خدمت میں (ﷺ) عرض کیا:

"یارسول اللہ جن لوگوں میں ہم آکر اترے ہیں ہماری چشم بصیرت نے ان جیسے ہمدرد و غمگسار نہیں دیکھے۔ تنگی ہو یا فراخی ان کی ہمدردی میں فرق نہیں آتا۔ اپنی جائیدادیں ہمیں دیں پھر کام کی ذمہ داری بھی خود لے لی۔ محنت وہ خود کریں گے اور نفع میں ہمارا حصہ لگائیں گے پس سارا اجر و ثواب وہی سمیٹ لیں گے۔"

آنحضرت ﷺ نے حضرات مہاجرین کو اطمینان دلایا کہ:

"اگر تم ان کا احسان [1] مانو اور ان کے لئے دل سے دعا کرتے رہو تو تمہارا ثواب بھی کم نہ ہو گا۔" [2]

حضرات انصار کے اسی یقین کا یہ اثر تھا کہ جو ایثار کر چکے تھے اس پر وہ قانع نہیں تھے۔ چنانچہ جائیداد کے اس بٹوارہ کے بعد بھی ان کا دست کرم کوتاہ نہیں ہوا وہ ان کی طرف بھی بڑھتا رہا۔ جنہیں جائیداد نہیں ملی تھی جو گرہستی اور صاحب اہل و عیال نہیں تھے، یہ اصحاب صفہ تھے ان کی خدمت بھی وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔

ایثار و اخلاص کی مثالیں

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (سورہ حشر۔۹)

---

[1] ہمارے ایک بزرگ تحریر فرماتے ہیں: دعا کا احسان درہم و دینار کے احسان سے کم نہیں ہے۔ پھر فرماتے ہیں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے یہاں جب کوئی سائل آتا اور دعائیں دیتا جیسا کہ سائلوں کا طریقہ ہے تو ام المومنین بھی اس فقیر کو دعائیں دیتیں اور بعد میں خیرات دیتیں۔ کسی نے کہا: اے ام المومنین آپ سائل کو صدقہ بھی دیتی ہو اور جس طرح وہ آپ کو دعا دیتا ہے آپ بھی دعا دیتی ہیں۔ فرمایا: میں اگر اس کو دعا نہ دوں اور فقط صدقہ دوں تو اس کا احسان مجھ پر زیادہ رہے گا کیونکہ دعا، صدقہ سے کہیں بہتر ہے۔ اس لئے دعا کی مکافات دعا سے کر دیتی ہوں تا کہ میرا صدقہ خالص رہے دعا کے مقابلہ میں نہ ہو۔ کذا فی المفاتیح شرح المصابیح۔ لہذا جو شخص دراہم معدودہ دیکر مخلصانہ دعاؤں کا سودا کر سکتا ہے وہ کبھی نہ چوکے اور اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے دعا ضرور حاصل کرے۔

جمادے چند دادم جاں خریدم — بحمد اللہ زہے ارزاں خریدم

سیرۃ المصطفےٰ از حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی ص ۱۳۱ ج ۱

[2] البدایہ والنہایہ ص ۲۲۸ ج ۱

"اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو"

اس آیت میں حضرات انصار کی جو خصوصیت بیان فرمائی گئی اس کی مثال [1] حضرت ابو طلحہ کا واقعہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

ایک فاقہ زدہ شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا کہ یارسول اللہ میں سخت بھوکا ہوں [2]۔ آپ نے گھر والوں سے دریافت کرایا کچھ کھانے کو ہے؟ ہر ایک گھر سے جواب آیا صرف پانی ہے۔ آپ نے حاضرین سے فرمایا: کوئی صاحب ان کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں حاضر ہوں۔ غرض وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ گھر میں جا کر بیوی سے کہا: رسول اللہ ﷺ کے مہمان کی عزت کرو (ادب و احترام سے مدارات کرو) اہلیہ محترمہ نے کہا: صرف بچوں کے سہارے کا کھانا موجود ہے۔ حضرت ابو طلحہ نے فرمایا: جو کچھ ہے۔ تیار کرو، چراغ [3] روشن کرلو بچوں کو بہلا کر سلادو۔ محترم خاتون نے ایسا ہی کیا۔ کھانا تیار کیا چراغ جلایا جب کھانے بیٹھے تو یہ خاتون اٹھیں بظاہر اس لئے کہ چراغ کی بتی بڑھادیں (لو تیز کردیں) مگر بڑھانے کے بجائے میاں بیوی کی آپس کی تجویز کے مطابق چراغ بجھا دیا۔ اندھیری میں کھانا شروع [4] کیا۔ میاں بیوی صرف ہاتھ اور منہ چلاتے رہے گویا کھا رہے ہیں، کھایا کچھ نہیں۔ بھوکے پیٹ رات گزاری۔ [5]

یہ تھا ایثار۔ اب اخلاص ملاحظہ فرمایئے کہ آنحضرت ﷺ نے ظاہر فرمادیا تھا کہ اقتدار میں حضرات انصار کا حصہ نہیں ہوگا۔ ان کے مقابلہ میں دوسروں کو بڑھایا جائے گا۔ مگر ان حضرات کو نہ اپنے اقتدار کی طلب تھی نہ اولاد کے لئے۔ وہ خود بھی عشق مولا میں گم تھے۔ اسی عشق کا متوالا اپنی اولاد کو دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کو اپنے آقا محمد ﷺ کی خوشنودی مطلوب تھی اور اس آقا کی خوشنودی کے ذریعہ تمام آقاؤں کے آقا حضرت حق جلّ مجدہ کی رضا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کو اس پر ناز تھا کہ جہاں یہ پیشن گوئی کی جاتی تھی:

---

[1] ایک اور مثال بھی بیان کی گئی ہے کہ ایک صاحب کو بکری کی سری پیش کی گئی۔ انہوں نے کہا فلاں صاحب اور ان کے بچے زیادہ ضرورت مند ہیں چنانچہ سری ان کے یہاں بھیجی گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے صاحب کا نام لے کر اور ان کی ضروریات ظاہر کر کے ان کے یہاں بھجوادی۔ اسی طرح سات آدمیوں میں گھوم کر پہلے شخص کے پاس آئی۔ ہر ایک دوسرے کو اپنے سے مقدم رکھتا تھا (ص ۹۵ ج ۷ فتح الباری بحوالہ ابن مردویہ)

[2] فتح الباری ص ۹۴ ج ۷

[3] گویا مہمان کے اعزاز میں۔ کیونکہ کسی ضرورت سے ہی چراغ جلایا جاتا تھا، ورنہ عام طور پر گھر میں چراغ جلانے کا دستور نہیں تھا۔ بخاری شریف ص ۵۶

[4] عام عادت تھی اس لئے دوبارہ چراغ جلانے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

[5] بخاری شریف ص ۵۳۵ و ص ۵۳۶

انکم ستلقون بعدی اثرۃ "تم میرے بعد دیکھو گے کہ دوسروں کو تم پر ترجیح دیجائیگی"۔ ان کو بڑھایا جائے گا تم کو نظر انداز کیا جائے گا۔

وہاں بشارت بھی ساتھ ساتھ دی جاتی تھی۔

فاصبروا حتی تلقونی وموعدکم الحوض [1]

"صبر کرنا یہاں تک کہ تمہاری میری ملاقات ہو اور ملاقات کا مقام حوض کوثر ہو گا، اسی کا وعدہ ہے۔"

اور جب ان حضرات کے ایثار و اخلاص کا یہ عالم ہے تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جس کی ایک نظر نے پوری جماعت میں یہ اخلاص و ایثار پیدا کیا وہ خود اخلاص و ایثار سے تہی دامن ہو (معاذ اللہ) اور کیا محمد رسول اللہ ﷺ کے ایثار، اخلاص اور آپ کی صداقت و حقانیت کی یہ کھلی ہوئی دلیل نہیں ہے۔

صلوٰت اللہ علیہ وعلیٰ اصحابہ الکرام واتباعہ اجمعین۔ آمین

اخلاص و للّٰہیت کی انتہا

جو آپ کے کام آئے وہ بہتر ہے اُس سے جو ہمارے پاس رہے

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (الاعلیٰ۔۱۷)

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا ۔(سورہ حشر۔ ۹)

"محبت کرتے ہیں ان سے جو وطن چھوڑ کر آئے ان کے پاس اور نہیں پاتے اپنے دلوں میں کوئی رشک اس سے جو دیا جائے مہاجرین کو۔"

سنہ ۴ھ میں قبیلہ بنی نضیر کے یہودیوں نے آنحضرت ﷺ کو شہید کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ان کے شر سے محفوظ رکھا۔ مگر ظاہر ہے ان کے اس منصوبہ سے وہ معاہدہ ختم ہو گیا جو بقاء باہم کے متعلق سنہ ۱ ہجری میں ہوا تھا۔

(تفصیل آگے آئے گی) لا محالہ ان کو وہ سزا دی گئی جو از روئے معاہدہ لازم تھی یعنی ان کو اس علاقہ سے خارج کر دیا گیا، انکی جائیدادیں اسلامی محروسہ میں داخل ہوئیں۔ چونکہ یہ علاقہ جنگ کے بغیر قبضہ میں آیا تھا تو اس کو مجاہدین پر تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ وحی الٰہی [2] نے اس کو خاص رسول اللہ ﷺ کا حق قرار

---

[1] بخاری شریف ص ۵۳۵

[2] سورہ ۵۹ الحشر آیت ٦

دیا۔[1]

رسول خدا رحمتہ اللعالمین ﷺ کے سامنے سب سے پہلے حضرات صحابہ کی مشکلات تھیں۔ آپ نے حضرات انصار کو جمع فرما کر استصواب فرمایا کہ اس علاقہ کی اراضی انصار اور مہاجرین دونوں کو دی جائیں یا صرف حضرات مہاجرین کو دی جائیں تاکہ وہ حضرات انصار کی جائیدادیں واپس کر دیں اور ان کے مکانات خالی کر دیں؟

ارشاد گرامی کا جواب دینے کے لئے قبیلہ اوس اور خزرج کے دونوں سردار سعد بن عبادہ (خزرج)، سعد بن معاذ (اوس) کھڑے ہوئے۔ عرض کیا یارسول اللہ جو کچھ آپ تقسیم فرمائیں حضرات مہاجرین کو تقسیم فرمادیں۔ ہمیں نہ اپنے مکانات کی ضرورت ہے نہ جائیدادوں کی۔ بلکہ ہم بہت خوش ہونگے اگر ہماری جائیدادوں اور ملکیتوں میں سے کچھ اور مہاجرین کو عنایت فرمادیں، جو راہ خدا میں وطن سے بے وطن ہوئے، گھروں سے اجڑے، جائیدادوں سے محروم ہوئے۔

آنحضرت ﷺ نے یہ حوصلہ مندانہ جواب سنا تو مطمعن ہوئے اور دعا دی:

اللھم ارحم الانصار وابناء الانصار

(اے اللہ رحم فرما انصار پر اور انصار کی اولاد پر)

اور بعض دوسری روایتوں میں تیسر الفظ ابناء ابناء الانصار بھی ہے۔

اب آپ نے اس علاقہ کا ایک حصہ حضرات مہاجرین کو عنایت فرمایا۔ حضرات انصار میں سے دو صاحب بہت ضرورت مند تھے۔ حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ ان کو کچھ جائیداد عطا فرمائی، باقی علاقہ اپنے پاس رکھا جس میں آنحضرت ﷺ کی طرف سے کاشت ہوتی تھی[2] اور اسکی آمدنی میں سے ازواج مطہرات کا نفقہ ادا فرماتے تھے۔ باقی تمام آمدنی مسلمانوں کی جماعتی[3] اور انفرادی

---

[1] اس وقت تک مملکت کی ضرورتیں بھی غیر معمولی تھیں کہ ایک مملکت کی بنیاد رکھی جارہی تھی اور حضرات مہاجرین و انصار میں اگرچہ ایسے صاحب استطاعت بھی تھے جو ضروریات زندگی فراہم کرسکتے تھے مگر کچھ ایسے تہی دست بھی تھے کہ فاقہ کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا تو اگر یہ جائیداد مجاہدین پر مساویانہ تقسیم کر دی جاتی تو نہ مملکت کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوسکتی تھیں نہ فاقہ زدہ انصار و مہاجرین کو قابل اعتماد امداد مل سکتی تھی۔ اب قرآن پاک کے الفاظ میں ان جائیدادوں پر آنحضرت ﷺ کا تسلط تسلیم کرایا گیا۔ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ (حشر آیت ٦) یعنی تمام جائیداد پر آپ کا اختیار تمیزی تسلیم کیا گیا تو آپ نے مساویانہ تقسیم کے بجائے ایسا بندوبست فرمایا کہ افراد کی ضرورتیں بھی پوری ہوئیں اور جماعت کی اقتصادی اور جنگی ضرورتوں کو بھی مدد مل سکی۔ واللہ اعلم

[2] السیرۃ الحلبیہ ص۲۹۷ ج۲

[3] فیجعله فجعل مال الله۔ بخاری شریف ص۵۷۵ و ص۸۰۷ وغیرہ فی السلاح والکراع عدۃ فی سبیل الله (ص۷۲۵ بخاری شریف و قسطلانی)

خصوصاً جہاد کی ضرورتوں میں صرف کر دیتے تھے۔

بہر حال حضرات انصار نے نہ صرف یہ کہ اس زمین میں حصہ لینے سے معذرت کر دی بلکہ اپنی باقی جائیدادوں کے متعلق بھی پیش کش کر دی۔ یہ ہے عملی مثال اس بلندی حوصلہ اور وسعت قلب کی جس کو زیب عنوان آیت میں سراہا گیا ہے۔

چند سال بعد بحرین کا علاقہ محروسہ اسلامیہ میں داخل ہوا تو آنحضرت ﷺ نے چاہا کہ حضرات انصار کو کچھ زمینیں عطا فرما دیں۔ مگر حضرات انصار نے ان کے لینے سے صرف انکار ہی نہیں بلکہ بضد ہو گئے کہ جتنی زمینیں ہمیں عطا فرمائی ہیں اتنی ہی حضرات مہاجرین کو بھی عنایت فرما دیں۔ اتنی گنجائش نہیں تھی۔ ارشاد ہوا:

امالافاصبروا حتی تلقونی انه سیصبکم اثرۃ (بخاری شریف ص ۵۳۵)

اگر آپ صاحبان منظور نہیں کرتے تو صبر سے کام لو یہاں تک کہ تم (حوض کوثر پر) مجھ سے ملو گے (یعنی اس ایثار کے جواب میں ایثار نہیں ہو گا) بلکہ تمہیں ترجیحات سے واسطہ پڑے گا کہ دوسروں کو تم پر مقدم رکھا جائے گا۔ تمہارے حقوق کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا۔

اسماء گرامی برادران مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم

رجسٹروں کو اس وقت توفیق نہیں ہوئی تھی کہ حضرات صحابہ کے اسماء گرامی اپنے صفحات میں محفوظ کریں اور بھائی بننے والوں کو لکھاوٹ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تاہم راوی حضرات کے سینوں نے جو نام محفوظ رکھے عیون الاثر فتح الباری و سیرۃ ابن ہشام کے حوالہ سے یہاں درج کئے جاتے ہیں:

حضرات مہاجرین	حضرات انصار	حضرات مہاجرین	حضرات انصار
ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ	خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ	حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ	عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ
عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ	عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ	ابو مرثد رضی اللہ عنہ	عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ
ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ	سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ	عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ	عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ
عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ	سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ	عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ	ابو دجانہ رضی اللہ عنہ
زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ	سلامہ بن سلامہ وقش رضی اللہ عنہ	ابو سلمہ بن عبد الاسد رضی اللہ عنہ	سعد بن خثیمہ رضی اللہ عنہ
عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ	اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ	عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ	ابو الهیثم بن تیہان رضی اللہ عنہ
طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ	کعب بن مالک رضی اللہ عنہ	عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ	عمیر بن الحمام رضی اللہ عنہ

سعید بن زید رضی اللہ عنہ	ابی بن کعب رضی اللہ عنہ	طفیل بن الحارث رضی اللہ عنہ	سفیان نسر خزرجی رضی اللہ عنہ
مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ	صفوان بن بیضاء رضی اللہ عنہ	رافع بن معلیٰ رضی اللہ عنہ
ابو حذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ	عباد بن بشر رضی اللہ عنہ	مقداد رضی اللہ عنہ	عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ
عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ	حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ	ذوالشمالین رضی اللہ عنہ	یزید بن الحارث رضی اللہ عنہ
ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ	منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ	ارقم رضی اللہ عنہ	طلحہ بن زید رضی اللہ عنہ
سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ	ابو الدرداء عویمر بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ	زید بن الخطاب رضی اللہ عنہ	معن بن عدی رضی اللہ عنہ
بلال رضی اللہ عنہ	ابو دریحہ عبد اللہ بن عبد الرحمن رضی اللہ عنہ	عمرو بن سراقہ رضی اللہ عنہ	سعد بن زید رضی اللہ عنہ
عاقل بن بکیر رضی اللہ عنہ	مبشر بن عبد المنذر رضی اللہ عنہ	عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ	مجذر بن وماء رضی اللہ عنہ
خنیسبن حذافہ رضی اللہ عنہ	منذر بن محمد رضی اللہ عنہ	عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ	حارث بن صمہ رضی اللہ عنہ
سرہ بن ابی رھم رضی اللہ عنہ	عبادہ بن الخشخاش رضی اللہ عنہ	مہجع مولیٰ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ	سراقہ بن عمرو بن عطیہ رضی اللہ عنہ

مواخات قبل ہجرت

تعاون و تناصر اور افادہ و استفادہ کی ضرورت جیسی مدینہ طیبہ میں تھی ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں بھی تھی، کیونکہ اس سے بے سہاروں کو سہارا مل جاتا تھا اور بے پناہوں کو پناہ۔ چنانچہ بقول علامہ حافظ ابن عبد البر: مکہ میں بھی رشتہ اخوت مواخات کے ذریعہ مضبوط کیا گیا تھا۔ یہ برادران مہاجرین ۱۸ تھے۔ ان کے مبارک اسماء گرامی سے اس صفحہ کو آراستہ کیا جا رہا ہے۔

۱۔ سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	حضرت علی کرم اللہ وجہہ
۲۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ	عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ
۳۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ	عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ
۴ حمزہ رضی اللہ عنہ	زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ
۵۔ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ	عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ
۶۔ عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ	بلال بن رباح رضی اللہ عنہ
۷۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ
۸۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ	سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ
۹۔ سعید بن زید رضی اللہ عنہ	طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ

(ماخوذ از عیون الاثر ص۱۹۹ ج۱، حافظ ابن سید الناس)

مسجد اور حجرات کی تعمیر اور مواخات پر دوبارہ نظر

اقتصادی تعمیر، بنیادی نظریہ، طریقہ تعمیر اور دور حاضر کی اقتصادی تحریکات

محمد رسول اللہ (فداہ روحی) (ﷺ اور حضرات مہاجرین جو مسجد کی اور پھر حجروں (ازواج مطہرات کے بیوت) کی تعمیر کر رہے ہیں، اسی شہر کے رہنے والے ہیں جو ملک عرب کا مرکزی شہر ہے، جو اپنے تمدن میں دنیا کے متمدن شہروں سے پیچھے نہیں ہے۔ جس کی آبادی باقاعدہ ہے۔ مختلف محلوں میں بٹی ہوئی۔ بیچ میں سڑکیں، بازار پر رونق، مکانات پختہ، ہر طرح کی آرائش سے آراستہ۔ ایک مکان وہ بھی ہے جس کو "دارالقواریر"[1] کہا جاتا تھا۔ (شیش محل) آنحضرت ﷺ اور آپ کے مہاجر رفقاء نے انہیں محلوں میں پرورش پائی تھی، انہیں گلیوں اور کوچوں میں کھیلے تھے۔ انہیں سڑکوں پر دوڑے اور چلے تھے۔ پھر تاجر بن کر انہیں بازاروں میں خرید و فروخت کرتے رہے تھے۔

دارالہجرت (مدینہ طیبہ) میں جب یہ حضرات خود مزدور اور معمار بن کر کچی اینٹوں، چھوٹے بڑے ناہموار پتھروں، کھجور کی ٹٹیوں اور کھجور کے پٹھوں اور پتوں سے مسجد مبارک اور حجروں کی تعمیر کر رہے تھے۔ تو اپنے خاندانی مکانات اور مکہ کے محلات کا نقشہ ان کے ذہنوں سے محو نہیں ہوا تھا۔ نبوت کے ابتدائی تین سال میں جو تربیت دی گئی تھی اس کا نصاب اور طریقہ تربیت پہلے گذر چکا ہے۔ یہ تربیت صرف تین سال تک ہی نہیں رہی بلکہ قیام مکہ کی پوری مدت میں اس کا سلسلہ جاری رہا اور وہ رنگ جو پہلے تین سال میں کھلا تھا وہ پختہ اور زیادہ پختہ ہوتا رہا۔ بلاشبہ یہ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ تمدن کے تمام نقشوں کو چھوڑ کر جفاکش، زاہدانہ اور درویشانہ زندگی کا نقشہ جمایا جا رہا ہے۔

مگر قرآن پاک میں حضرت حق جل مجدہ کا ارشاد تو یہ ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ (سورہ الاعراف۔ ۳۲)

"تو کہہ! کس نے منع کیا ہے رونق اللہ کی جو پیدا کی اُس نے اپنے بندوں کے واسطے اور ستھری چیزیں کھانے کی۔ تو کہہ وہ ہے ایمان والوں کے واسطے دنیا کی زندگی میں نری (مخصوص طور پر) اُن کی ہیں قیامت کے دن۔"

پھر زینت سے یہ اجتناب کیوں؟

---

[1] معجم البلدان

آپ کو فراموش نہ ہونا چاہئے کہ حضرات صحابہ نے اس دور کو تعمیر ملت کا دور اول قرار دیا تھا۔ چنانچہ اسی سال کو اسلامی سنہ (سنہ ہجری کا پہلا سال) مانا گیا۔ کلام الٰہی نے بھی من اول یوم [1] کا لفظ استعمال کر کے صحابہ کرام کے اس تخیل کی تائید فرمائی۔

آج ہر طرف پس ماندہ قوموں کو ترقی دینے کا شور ہے۔ لیکن جب ان کی ہمدردی کے دعویدار سیاسی رہنما مساوات اور سوشلزم کا نام لے کر کہتے ہیں "معیار زندگی بلند کرو" تو مسجد مبارک اور تعمیر حجرات کا سادہ نقشہ خاموشی سے اشارہ کرتا ہے کہ قوم کی تعمیر ایسے نعرے سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس طرح کے عمل سے ہوتی ہے۔ ہمدردی یہ نہیں کہ آپ اپنی کوٹھی کی سب سے اونچی منزل پر رونق افروز ہو کر خاک نشین غریبوں کو حکم دیدیں کہ ایسی ہی کوٹھی تم بھی بناؤ تاکہ مساوات اور برابری رونما ہو۔ اس کو ہمدردی نہیں کہا جاسکتا یہ ستم ظریفی ہے۔ اس نعرے سے آپ اپنے کردار کو مشتبہ کر دیتے ہیں کہ آپ اس نمائشی نعرے سے غریبوں کو سبز باغ دکھا کر اپنی عیش پرستی کے لئے وجہ جواز [2] نکالتے ہیں۔

ہمدردی یہ ہے کہ آپ قصر معلّٰی کی سطح بالا سے نیچے اتریں، غریبوں کی ٹوٹی چٹائی پر ان کے برابر بیٹھیں، پھر ان کو ساتھ لے کر آگے بڑھیں۔ یعنی پہلا مرحلہ یہ ہے کہ بلند کرنے کے بجائے آپ معیار زندگی کو برابر کریں۔ سیرتِ مبارکہ کا ایک روشن باب یہ ہے کہ آپ نے اقتصادی تعمیر و ترقی کیلئے یہی اسلوب اختیار فرمایا۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

(۱) ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ ٹٹیوں کا تھا۔ ٹٹیوں میں سوراخ ہو گئے تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ دومتہ الجندل میں تشریف لے گئے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس غیبوبت میں حجرے کی دیواریں کچی اینٹوں کی بنوالیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ سے واپس ہوئے تو سب سے پہلے انہیں کے یہاں تشریف لے گئے۔ دریافت کیا: یہ تعمیر کیسی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے معذرت کی کہ دیوار اس لئے بنوالی ہے کہ پردہ ہو جائے کسی کی نظر نہ پڑ سکے فرمایا: مال کا بدترین [3] مصرف یہ تعمیر [4] ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آپ نے (صلی اللہ علیہ وسلم) عذر قبول فرمایا: مگر اس عمل کی تائید اور حمایت نہیں فرمائی جس سے ایک امتیاز پیدا ہو رہا تھا۔

---

[1] لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ (سورہ توبہ)
[2] یعنی جب معیار زندگی بلند کرنا نصب العین قرار دیا گیا تو جس کا معیار بلند ہو گیا ہے وہ قابل اعتراض نہیں۔ گویا وہ منزل پر پہلے پہنچ گیا ہے۔
[3] یعنی کرایہ کے لئے مکانات بنوانا بھی ایک قسم کی زمینداری ہے جو پسند نہیں ہے (واللہ اعلم بالصواب)
[4] طبقات ابن سعد ۱۸۱ ج ۲ (الجزء الاول من القسم الثانی)

(۲) اسی دور کا یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک راستے کے کنارے پر ایک مکان دیکھا جو حال میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کا پھاٹک شاندار بنایا گیا تھا اور پھاٹک پر قبہ نما محراب بھی رکھی گئی تھی۔ دریافت فرمایا: یہ مکان کس کا ہے۔ ایک انصاری کا نام بتایا گیا۔ آنحضرت ﷺ خاموش ہو گئے۔ اگلے روز یہ انصاری دربار رسالت میں حاضر ہوئے تو خلاف معمول آقا دو جہاں ﷺ کا رخ پلٹا ہوا پایا۔ حاضرین مجلس سے اس بے التفاقی کی وجہ معلوم کی تو کوئی خاص سبب کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ البتہ کل کے واقعہ کا تذکرہ کیا گیا کہ جب حضرت والا ﷺ آپ کے مکان کی طرف سے گذرے تھے تو قبہ دار پھاٹک کو دیکھ کر دریافت فرمایا تھا کہ یہ پھاٹک کس کا ہے۔ انصاری جاں نثار نے یہ بات سنی، واپس مکان پر پہنچے اور پورے پھاٹک کو منہدم [1] کرا کر زمین کے برابر کر دیا۔[2]

(۳) یمن کا ایک قبیلہ بنو اشعر تھا۔ اس قبیلہ کے جو خاندان مسلمان ہو گئے تھے وہ مدینہ میں رہتے تھے اور فوجی خدمات (جہاد) میں حصہ لیا کرتے تھے۔ ہر ایک خاندان اپنے آمد و خرچ کا خود ذمہ دار تھا۔ لیکن ان کا یہ بھی دستور تھا کہ اگر کسی کی آمدنی میں کمی ہو جاتی (مثلاً موسم کے ختم پر نئی فصل سے پہلے تنگی ہو جاتی یا سفر میں کسی کا توشہ ختم ہو جاتا) تو ایسا کرتے تھے کہ تمام خاندانوں میں جس کے یہاں جو غلہ یا توشہ ہوتا وہ سب ایک جگہ اکٹھا کر لیتے تھے پھر سب کو برابر تقسیم کر دیتے۔ یہ آپس کی ہمدردی اور باہمی اتفاق کی صورت آنحضرت ﷺ کو اتنی پسند تھی کہ مجمع میں اس کی تعریف فرماتے ہوئے یہاں تک فرماتے:

هم منی وانا منهم (وہ میرے ہیں میں ان کا) (بخاری شریف ص ۳۳۸)

(۴) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کو ان سے بہت زیادہ تعلق خاطر تھا۔ جب آپ سفر پر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں ان سے رخصت ہوتے۔ اور جب سفر سے واپس ہو جاتے تو سب سے پہلے ان کے یہاں تشریف لے جاتے۔ ایک مرتبہ آپ سفر سے واپس ہوئے اور حسب معمول ان کے یہاں تشریف لے گئے مگر حجرہ (کمرہ) کے اندر نہیں داخل ہوئے، دروازہ سے ہی واپس تشریف لے آئے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس مرتبہ نئی بات یہ کی تھی کہ حجرے کے دروازے پر کپڑے کا پردہ آراستہ کر دیا تھا۔

---

[1] اخلاص کی انتہا یہ ہے کہ منہدم کر دینے کی اطلاع بھی نہیں دی۔ کچھ دنوں بعد جب دوبارہ اس طرف سے آنحضرت ﷺ کا گزر ہوا تو خود آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس پھاٹک کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ تب آپ نے فرمایا اما ان کل بناء وبال علی صاحبہ الا مالا الا مالا الا مالا ہر ایک تعمیر اس کے بانی کے حق میں وبال ہے مگر وہ جو ضروری ہو بہت ضروری ہو جس کے بغیر چارہ نہ ہو

[2] ابو داؤد شریف باب فی البناء ص ۳۶۴ ج ۲ مجتبائی

حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت موجود نہیں تھے۔ واپس ہوئے تو حضرت فاطمہ غمگین بیٹھی تھیں جب انہیں معلوم ہوا کہ غمگین اس لئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور خلاف معمول باہر سے ہی واپس ہو گئے تو خدمت مبارک میں حاضر ہو کر کبیدگی کا سبب دریافت کیا۔ ارشاد ہوا:

"دروازہ پر کپڑے کا پردہ سجا رکھا ہے مجھے ایسے تکلفات سے کیا واسطہ۔"

اب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ناراضگی کا سبب معلوم ہوا تو معافی چاہی اور عرض کیا جو حکم ہو اس کی تعمیل کروں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غریب عیالدار کا نام لیا اور فرمایا کہ یہ کپڑا ان کے یہاں پہنچا دو۔ [1]

(۵) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہ وغیرھما کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو سونے کے زیورات سے منع کیا۔ یہاں تک فرمادیا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے محبوب کو آگ کا کنگن پہنائے وہ اس کو سونے کا کنگن پہنا دے۔ [2]

(علماء کا اتفاق ہے کہ یہ ممانعت ابتداء میں تھی اس کے بعد عورتوں کو سونے کے زیورات کی اجازت دی گئی، البتہ یہ ضروری قرار دیا گیا کہ ہر سال ان کی زکوٰۃ بلاناغہ پوری پوری ادا ہوتی رہے)

سلسلہ مواخات اور سیاسی رہنماؤں کیلئے ایک سبق

وَيُزَكِّيهِمْ [3] وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران آیت ۱۶۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں قیام فرما ہوئے تو آپ کی حیثیت سیاسی سربراہ (امیر) کی بھی تھی۔ آپ مہاجرین کی آبادکاری کیلئے کوئی قانون بنا سکتے تھے۔ مگر سیرۃ مبارکہ کا سبق یہ ہے کہ قانون بنانا کارگر نہیں، دلوں کو بنانا چاہئے۔ سیاسی یا اقتصادی انقلاب کے بجائے دلوں کی دنیا میں انقلاب برپا کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بہت مشہور [4] ارشاد ہے جس کا مفہوم یہ ہے:

"جسم انسان میں ایک پارچہ گوشت ہے اگر وہ ٹھیک ہے تو بدن کی پوری عمارت آباد، اگر وہ خراب ہے تو بدن کی پوری عمارت ویران۔ یاد رکھو وہ قلب ہے۔"

کلام اللہ شریف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ بیان فرمائی تھی:

---

[1] ابوداؤد شریف باب فی اتخاذ الستور

[2] ابوداؤد شریف باب ماجاء فی الذہب النساء ص ۲۳۰ ج ۲ مجتبائی

[3] ان کو (اہل ایمان کو) پاک صاف کرتے ہیں (سنوارتے ہیں) اور ان کو کتاب اور حکمت (دانش و بینش) کی تعلیم دیتے ہیں۔ سورہ ۳، آیت ۱۶۳

[4] بخاری شریف وغیرہ صحاح

" تمہارا (اہل ایمان کا) رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق (سخت ناگوار) گذرتا ہے۔
تمہاری بھلائی کا حریص (بہت خواہشمند) ہے وہ مومنوں کے لئے شفقت رکھنے والا رحمت
والا ہے۔ [1] وہ ان کو (اہل ایمان کو) اللہ کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو سنوارتا ہے (ہر طرح
کی برائیوں سے انہیں پاک کرتا ہے)" [2]

قانون کے سامنے چاروناچار گردنیں جھک جاتی ہیں مگر دل نہیں سنورتے۔ یہ نبی رحمت، رؤف رحیم کی نظر کیمیا اثر کی برکت تھی کہ حضرات انصار کے دل ایسے سنوارے، بخل اور حب مال کی برائی ختم ہو کر ایثار، فدائیت اور سخاوت کے وہ بے پناہ جذبات ان میں موجزن ہوئے کہ جیسے ہی رشتہ اخوت قائم ہوا انہوں نے خود درخواست پیش کر دی۔

اقسم بیننا وبین اخواننا النخیل [3]
ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان باغات تقسیم کر دیجئے۔"

حضرات انصار کا اصرار یہ تھا کہ حضرات مہاجرین کو ان جائیدادوں کا مالک بنادیا جائے لیکن رحمۃ اللعالمین ﷺ جیسے غریب اور پردیسی مہاجرین کے حق میں مشفق و محسن تھے، اسی طرح آپ کا دامن رحمت انصار پر بھی پھیلا ہوا تھا۔ ان کے حق میں بھی آپ رؤف رحیم تھے۔ آپ نے ملکیت کی تقسیم منظور نہیں فرمائی۔ صرف پیداوار کی تقسیم کا فیصلہ فرمایا۔ تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ (یہ ہونی چاہیے شان سیاسی سربراہ اور رہنماء قوم کی)

---

[1] سورہ ۹ توبہ آیت ۱۲۸
[2] سورہ ۳ آل عمران آیت ۱۶۴
[3] بخاری شریف ص ۳۱۲ و ص ۵۳۴

سیرت مبارکہ کے اشارات
اور
تحریکات دورِ حاضر کے نظریات میں بنیادی فرق

وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْأَشْيَاءُ

سیرت مبارکہ کے پر تقدس سلسلہ میں سوشلزم کمیونزم وغیرہ دور حاضر کی تحریکات کا ذکر کرنا سوءادب اور گستاخی ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْأَشْيَاءُ (یعنی کسی حقیقت کی پوری وضاحت جب ہوتی ہے جب اس کی مقابل اور برعکس چیز کو سامنے رکھا جائے)

نور آفتاب کی قدر اسی وقت ہوتی ہے جب ظلمت شب کی مصیبت جھیلی ہو۔ لہذا ان تحریکات کے بنیادی نظریات کا کسی قدر تذکرہ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سیرت مبارکہ کے ان اشارات کی وضاحت ہو سکے جن کا تعلق اقتصادیات سے ہے اور انصاف پسند اہل بصیرت ان کی قدر و منزلت معلوم کر سکیں۔ اس کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ تحریکات حاضرہ کے متوالوں میں ایسے بھی ہیں جو ان تحریکات کا پیوند دامن اسلام سے جوڑنا چاہتے ہیں اور اس کو اسلام پر ایک احسان سمجھتے ہیں۔ لہذا بنیادی فرق کی وضاحت اس لئے بھی ضروری ہے کہ ایسے محسنین اسلام کے سامنے حقیقت جلوہ گر ہو سکے۔

(۱)

سب سے پہلا فرق یہ ہے کہ ان تحریکات کے بانیوں نے اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جس کا سمجھنا سب سے پہلے ضروری تھا۔

ان تحریکات کا منشاء اگر انسانی سماج کی فلاح و بہبود ہے تو سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ انسان کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ انسان کیا ہے۔ انسانیت کیا ہے، تاکہ انسان کی فلاح و بہبود کے معنٰی اور ترقی کا معیار معین ہو سکے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ تحریکات دور حاضر کی پیداوار ہیں اور اس سے پہلے انسان کے دماغ پر تالے

پڑے ہوئے تھے۔ ان تالوں کی کنجیاں بیسویں صدی عیسوی میں انسان کے ہاتھ آئی ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صرف ڈیزائن اور نقشہ بدلا ہے ورنہ ان تحریکات کی بنیادیں بہت قدیم ہیں اور اس طرح کے انقلاب سے دنیا ہمیشہ دوچار ہوتی رہی ہے۔ [1]

موجودہ تحریکات اور ان کی ہم جنس سابق تحریکات کی مشترکہ کوتاہی یہ ہے کہ ان کی بنیاد صرف خدافراموشی پر نہیں ہے بلکہ خود فراموشی بھی ان کی بنیادوں کا کنکریٹ اور اینٹ گارا ہے۔

انسان کیا ہے، کیوں پیدا ہوا، اس کا مستقبل کیا ہے۔ اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ موت کی حقیقت کیا ہے؟ وہ فنا ہے یا انتقال (یعنی حالت کی تبدیلی اور ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہو جانا)

اگر موت انتقال ہے اور انسان موت کے بعد بھی باقی رہنے والی حقیقت ہے تو مابعد الموت کا تعلق موجودہ زندگی سے کیا ہے؟۔ قول و عمل اگر باقی رہنے والی حقیقتیں ہیں تو کس طرح؟ اور ان کا کچھ اثر مابعد الموت ہو گا یا نہیں۔ عاقبت اندیش انسان کا فرض ہے کہ میدان عمل میں قدم رکھنے سے پہلے ان سوالات کو حل کرلے۔ ان سوالات سے غفلت خود فراموشی ہے جس کا نتیجہ خدافراموشی ہوتا ہے۔ من لم یعرف نفسہ لم یعرف ربہ۔

انسان ایک جاندار ہے۔ جو اپنے اندر غور و فکر اور تحقیق و تنقید کی طاقت رکھتا ہے۔ جس کی بنا پر اس نے خاص طرح کی زندگی اختیار کی۔ جس نے درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے موجودہ تمدن کی صورت اختیار کرلی۔ جس کے بہت سے شعبوں میں سے ایک شعبہ وہ ہے جس کو سائنس اور فلسفہ کہا جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ کائنات کی آخری سرحد تک پرواز کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کو کچھ ایسے ضابطوں اور قوانین کی ضرورت ہے جو اس زندگی کو محفوظ رکھ سکیں۔ اور اس کو خوشگوار بنا سکیں۔ چنانچہ وہ یہ ضابطے بناتا ہے اور ان کو رائج کرتا ہے۔

یہ ہیں وہ انکشافات جو تحریکات کے بانی صاحبان کو حقیقت انسان کے متعلق خود بخود یا اس سائنس اور فلسفہ کے ذریعے سے ہوگئے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر چیز کی حقیقت سے واقف ہے۔ لیکن اس کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے اس کا جواب سائنس اور فلسفہ نے بھی نہیں دیا۔ اس کے برعکس قرآن حکیم کے شروع ہی میں چند تمہیدی فقروں کے بعد سب سے پہلے انسان کی وہ خصوصیت بیان کی گئی ہے جو اس کو

---

[1] فارسی زبان اور تاریخ ایران سے دلچسپی رکھنے والے مزدوک سے واقف ہیں جس نے تقریباً پانچویں صدی عیسوی میں تحریک چلائی تھی کہ زر، زن اور زمین سب کے لئے مشترک ہے۔ زنان را خلاص گردانید واموال راماباح داشت وہمہ مردمان رادر خواستہ زن شریک ساخت چنانکہ در آتش وآب وعلف انباز ند (دبستان مذہب) والملل و نحل ص ۸۶ ج ۲، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو احقر کی تصنیف "اقتصادی تحریکات اور اسلامی تعلیم کے اشارات۔"

باقی تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ ساتھ ساتھ اس کی وہ حیثیت واضح کی گئی ہے جو اس کو پوری کائنات یعنی عالم مخلوقات میں حاصل ہے۔

(۳)

صرف اسلام ہی نہیں بلکہ جملہ مذاہب اس پر متفق ہیں کہ

(۱) انسان کا خاتمہ موت پر نہیں ہو جاتا بلکہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ موت کی حقیقت فنا ہو جانا نہیں ہے بلکہ موت ایک تبدیلی اور انتقال ہے یعنی عالم مشاہدہ سے ایک ایسے عالم کی طرف منتقل ہو جانا جو ہمارے مشاہدہ سے بالا ہے۔

(۲) اور یہ کہ انسان کا حقیقی اور دائمی مستقبل وہ ہے جس کا آغاز اس انتقال اور اس تبدیلی کے بعد ہو گا جس کو موت کہا جاتا ہے۔

لیکن اگر حقیقی مستقبل اور حقیقی زندگی وہ ہے جو موت کی گھاٹی کو پار کرنے کے بعد سامنے آئے گی تو موجودہ زندگی کا تعلق اس سے کیا ہو گا؟ اس زندگی کا آغاز از سر نو ہو گا یعنی نیست سے ہست اور عدم کی جگہ ایک وجود کا آغاز ہو گا یا وہ زندگی موجودہ زندگی کا نتیجہ اور ثمرہ ہوئی۔ گویا آج ہم بو رہے ہیں اور مرنے کے بعد اس کو کاٹیں گے یا وہ ایک قدرتی ارتقا ہو گا۔ یعنی جس طرح انسان کا موجودہ وجود ایک ارتقائی درجہ ہے جو تخلیق کے بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد ظہور پذیر ہوا ہے۔[1] ایسے ہی مابعد الموت بھی ایک ارتقائی درجہ ہو گا۔ سائنس نے اس کا جواب نہیں دیا۔ مذہب اس کا جواب دیتا ہے اور قرآن حکیم اس جواب کو سامنے رکھ کر نہ صرف اقتصادیات وسیاسیات بلکہ انسان کی پوری زندگی کے لئے ضابطہ حیات مقرر کرتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی سیرۃ مبارکہ جو قرآن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہے اس کی عکاسی کرتی ہے۔

(۴)

خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اس کو مانے۔ انسان کو ضرورت ہے کہ اپنے آپ کو باہوش ثابت کرنے کے لئے خدا کو مانے۔ اس شخص کو باہوش نہیں کہا جا سکتا جس کا دعویٰ یہ ہو کہ تاج محل

---

[1] ڈارون کا نظریہ ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ ہمارے پیش نظر قرآنی آیات ہیں جن میں یہ ترتیب قائم کی گئی ہے کہ انسان کی سرشت مٹی سے ہوئی۔ پھر ہر انسان کے مراتب تولید میں نطفہ، پھر حلقہ (خون بستہ) پھر گوشت کا لوتھڑا پھر انسانی شکل، پھر نفخ روح، پھر ولادت، پھر بچپن، جوانی، کہولت، پھر بڑھاپا، بس جس طرح نفخ روح (جان پڑ جانے کے بعد) بطن مادر میں رہا اور وہاں سے اس عالم میں آیا۔ یہ بھی ایک انتقال ہے۔ اسی طرح موجودہ عالم بطن گیتی ہے جہاں وہ اپنے اوصاف وخصائل اور اپنے کردار عمل کے ساتھ نشوونما پا رہا ہے اور مرنے کے معنیٰ کہ وہ بطن گیتی سے دوسرے عالم میں منتقل ہو گا اور جس طرح ماں باپ کی خصلتیں اور ان کے امراض عموماً بچہ میں سرایت کر جاتے ہیں انسان کے اعمال و کردار کے اچھے برے اثرات بھی انسان میں اثر کر جائیں گے۔ دوسرے عالم میں ان کے اثرات ظاہر ہونگے۔

خود بخود وجود میں آگیا۔

یہ شخص اگر اسی کور باطنی کے ساتھ تاج محل کی سیر کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ بانی اور معماروں کی قدر نہیں کرے گا۔ بلکہ یہ کہ وہ سنگ تراشی، نقش سازی، ڈیزائن سازی اور انجینئرنگ وغیرہ کے تصورات سے بھی محروم رہے گا۔ اس کے ذہن میں بھی نہیں آئے گا کہ ڈیزائن سازی بھی کوئی خاص فن ہے۔ سنگ خار اور سنگ مرمر پر پھول اور بوٹیاں بنانا پھر ان میں رنگ بھرنا اور ایسے مسالے تیار کرنا کہ صدہا سال کی سیکڑوں برساتیں ان پر کوئی اثر نہ کر سکیں۔ عمارت کے طول و عرض، بلندی وغیرہ کو موزوں رکھنا بھی قابل قدر ہنر ہیں۔

یہ ظالم تاج محل کو خود رومان کر ان تمام فنون اور ان کے ماہرین پر ظلم کرتا ہے۔ ان فنون کے ایجاد کرنے اور ترقی دینے کا کوئی سوال اس کے سامنے نہیں آتا۔ وہ خود اپنے اوپر بھی ظلم کرتا ہے اور اپنی ظالمانہ فطرت سے ان تمام فنون کو بھی مجروح اور مفلوج کر دیتا ہے۔ ایسے کور باطنوں کو اگر اقتدار کی باگ ڈور دیدی جائے تو کیا تمدن ایک قدم بھی آگے بڑھ سکے گا۔

کائنات کے اس تاج محل میں جو حسن اور خوبیاں ہیں ان کو صحیح طور پر وہی پہچان سکتا ہے جو اس کے پیدا کرنے والے کو پہچانے۔ اسی کو معرفت حق کہا جاتا ہے۔ معرفت حق حقیقت پسندی اور خدا پرستی کی بنیاد ہے۔ اس کو مضبوط کرنے اور ترقی دینے کا نام روحانیت ہے۔

(۵)

انسان کی حیثیت:

انسان کی حیثیت اگر یہ ہے کہ وہ ایک جاندار ہے جس کو عقل کی نعمت دے دی گئی ہے۔ تو اس سے اعلیٰ اخلاق، شرافت اور روحانیت کا مطالبہ خاص وزن نہیں رکھتا۔ اگر وزن رکھتا ہے تو صرف اتنا جو بتقاضاء عقل ضروری ہو۔ مگر اسلام نے انسان کی حیثیت بہت بلند قرار دی ہے۔ وہ کمالات تخلیق کا بہترین نمونہ [1] اور نظام قدرت کا شاہکار ہے جس کو یہ عزت اور عظمت [2] دی گئی ہے کہ وہ اس پوری کائنات میں خالق کائنات کا خلیفہ [3] ہے۔ کائنات کی بڑی سے بڑی مخلوق حتیٰ کہ چاند سورج اور زمین و آسمان کو بھی خالق و قادر ذوالجلال نے اس کے لئے مسخر [4] کر دیا ہے۔ وہ ہر ایک پر حکم چلا سکتا ہے جس کو چاہے اپنے

---

[1] لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (سورہ والتین۔۴)

[2] وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (سورہ بنی اسرائیل۔ ۷۰)

[3] اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (سورہ بقرہ آیت ۳۰)

[4] وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ (سورہ ابراہیم۔۳۳) وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (سورہ جاثیہ آیت ۱۲)

کام میں لا سکتا ہے۔

یہ ہے انسان کی حیثیت اسلام کی نظر میں اور خود فراموشی یہ ہے کہ انسان اپنی اس حیثیت سے اور اس حیثیت کے بموجب جو اس کے فرائض ہیں ان سے غافل ہو۔

فرائض :

خلافت و نیابت کے منصب جلیل کا جس طرح یہ تقاضا ہے کہ خلیفہ اپنے آقا کا فرمانبردار اور وفادار ہو۔ ایسے ہی اس کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے آقا کے کمالات کا مظہر ہو۔ اور ان نقائص سے پاک ہو جو کمالات کی ضد ہیں اور عیب سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم نے سب سے پہلے فقروں میں خالق کائنات کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

۱۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	بہت رحم کرنے ولا بہت مہربان
۲۔ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ	تمام جہانوں کا پالنے والا
۳۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ	مالک انصاف کے دن کا

(۱) سب سے پہلے ضروری ہے کہ انسان میں رحم ہو۔ شفقت اور مہربانی ہو۔

(۲) اس کی فطرت میں تربیت ہو (یعنی پرورش کرنا، سکھانا، سدھانا، ضرورتمندوں کی ضرورتیں پوری کرنا) سخاوت، بخشش اور سیر چشمی جیسے صفات سے وہ آراستہ ہو۔

رب العالمین خود نہیں کھاتا دوسروں کو کھلاتا ہے۔ وہ بھوک پیاس سے بھی بے نیاز ہے لیکن انسان (جو کھانے پینے کا محتاج ہے) اگر بھوکوں کی ضرورت کو اپنی بھوک سے مقدم رکھے تو اس کا نام ایثار اور قربانی ہے۔

(۳) رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سب سے بڑا منصف ہے اس کے خلیفہ کو بھی عدل و انصاف کا پیکر ہونا چاہئے۔

(۴) خالق کائنات رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ [1] ہے يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ [2]۔ اس کی صفت ہے اس کے خلیفہ اور نائب کو بھی ذی علم ہونا چاہئے۔ وہ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اور عٰلِمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ نہیں ہو سکتا، مگر اس کا فرض ہے کہ اپنے علم کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے اور دعا کرتا رہے۔ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا [3]

---

[1] ان تمام باتوں کا جاننے والا جو پردۂ آسمان میں یا سینۂ زمین میں چھپی ہوئی ہیں۔ (الفاطر۔۳۸)
[2] ان تمام باتوں اور ان تمام طاقتوں کو جانتا ہے جو سمندر یا خشکی میں ودیعت ہیں۔ (الانعام۔۵۹)
[3] سورہ طٰہٰ آیت ۱۱۴

(۵) رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ صرف خالق ہی نہیں بلکہ اس کی صفت ہے: بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ [4] نئی طرح بنانے والا (ایجاد کرنے والا) زمینوں اور آسمانوں کا۔

فکر انسان کو بھی چاہئے کہ تخلیق و ایجاد کی باریکیوں کی تلاش کرنے میں مصروف رہے۔ وہ نیست کو ہست اور معدوم کو موجود تو نہیں کر سکتا۔ یہ تو وہی کر سکتا ہے جس کے ایک حکم "کن" پر نیست ہست بن جائے [1] اور عدم محض جامہ وجود سے آراستہ ہو جائے۔ البتہ وہ یہ ضرور کر سکتا ہے کہ موجودات کی پوشیدہ صلاحیتوں کا کھوج لگائے اور مخفی طاقتوں کے اسباب و ذرائع معلوم کر کے جدید ایجادات کو بروئے کار لائے۔

مختصر یہ کہ یہ اوصاف کمال کا سلسلہ ہے۔ ان کے برعکس اوصاف نقص ہیں۔ رحم، مہربانی اور شفقت کے مقابلہ میں سخت مزاجی، سنگ دلی، جبر و قہر، سخاوت اور سیر چشمی کے مقابلہ میں بخل، تنگ دلی اور کنجوسی، حاجت روائی اور کارسازی کے مقابلہ میں خود غرضی اور نفع اندوزی، ایثار کے مقابلہ میں، حرص طمع، رشوت ستانی اور ذخیرہ اندوزی، عدل و انصاف کے مقابلہ میں ظلم، علم کے مقابلہ میں جہل وسفاہت، تحقیق و تنقید کے مقابلہ میں اندھی تقلید۔

انسان میں قدرت نے دونوں صلاحیتیں رکھی ہیں۔ وہ اوصاف و کمال کو اپنا کر کامل و مکمل بھی بن سکتا ہے اور اوصاف نقص کو اختیار کر کے، ذلیل، کمینہ اور شیطان اخرس بھی بن سکتا ہے۔ شریعت [2] کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان اوصاف نقص سے پاک ہو کر اوصاف کمال اختیار کرے۔ اسی کو تقدس کہا جاتا ہے۔ اس مطالبہ کو پورا کرنے کی کوشش تزکیہ ہے جو آنحضرت ﷺ کی بعثت کا اہم مقصد اور آپ کی زندگی کا اہم ترین کارنامہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دور حاضر کی تحریکات کا مقصد یہ ہے کہ ملک کا ہر ایک باشندہ خوشحال ہو، زندگی کی ضرورتیں اس کو میسر ہوں، باشندگان ملک اطمینان کی زندگی گزار سکیں۔ یہ مقصد بہت مبارک ہے لیکن جب تک انسان بری خصلتوں سے پاک نہ ہو کیا یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟ یہ دوسرا فرق ہے جو سیرت مبارکہ کی تعلیمات کو موجودہ تحریکات سے ممتاز کرتا ہے کہ سوشلزم و نیشنلزم وغیرہ کا اسکول تزکیہ اور اصلاح اخلاق کے مفہوم سے ناآشنا بلکہ اس کے ماحول میں یہ الفاظ قطعاً بے جوڑ اور مضحکہ انگیز ہیں جبکہ سیرۃ مبارکہ کی تعلیمات تزکیہ کو ایسا محور قرار دیتی ہیں کہ ہر ایک نظام اسی کے گرد گھومتا ہے اور اسی کی

---

[4] سورہ الانعام آیت ۱۰۱

[1] ہو جا۔ یعنی عالم کون و ہست میں آجا۔ عالم وجود میں آجا۔

[2] اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۔(سورہ الاحزاب۔ ۷۲)

درگاہ سے سند جواز حاصل کرتا ہے۔ کوئی بھی نظام ہو اگر اس کی بنیاد تزکیہ پر نہیں ہے تو باطل اور فاسد ہے، کیونکہ سیرت مبارکہ کی تعلیمات کا مطمح نظر صرف حیوانی زندگی نہیں جو چند روزہ عارضی ہے بلکہ اس کا مطمع نظر وہ حقیقی زندگی ہے جو ابدی اور دائمی ہوگی جس کی خوش گواری تزکیہ پر موقوف ہے۔

(۶)

ٹیکس کی عربی ضربیہ ہے۔ آپ پورے قرآن شریف کا مطالعہ کر لیجئے آپ کو کہیں کوئی ایسا لفظ نہیں ملے گا جو مالی نظام کے سلسلہ میں ٹیکس اور ضربیہ کے مفہوم کو ادا کرتا ہو۔ کیونکہ ٹیکس کی تہ میں جبر اور قہر ہوتا ہے۔ قانون کے بنانے والے اگرچہ عوام کے نمائندے ہوتے ہیں مگر اس کے نفاذ کی پشت پر حکومت کی مسلح طاقت ہوتی ہے۔ اس طرح استحصال تو ہو سکتا ہے کہ حکومت کو رقم مل جائے اور اس کے بجٹ کا خسارہ پورا ہو جائے مگر ادا کرنے والوں کے اخلاق کی اصلاح اور دلوں کا تزکیہ نہیں ہو سکتا۔ بخل، طمع، حرص جیسے امراض بدستور رہتے ہیں اور آرڈی ننس یا قانون کی بھیانک طاقت ان امراض میں نفرت، غصہ، بغض اور عداوت جیسی بیماریوں کا اضافہ کر دیتی ہے۔

جاگیر داری نظام، سرمایہ داری، زمینداری، انتہا یہ کہ فردی ملکیت ختم کر دی جائے تو بہت سے محشر تو برپا ہو سکتے ہیں مگر دلوں کی پاکی اور اخلاق کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ بلکہ خاتمہ ملکیت سے عائلی نظام [1] درہم برہم ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ [2] وہ نفرت انگیز انارکی ہوتا ہے جو دامن عصمت و عفت کے بھی تار پود بکھیر دیتا ہے۔

جس مالی نظام کی قرآن حکیم رہنمائی کرتا ہے اس کا نتیجہ اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ داری، جاگیر داری حتیٰ کہ ملکیت بھی ختم ہو جائے [3]، مگر یہ خاتمہ اس طرح ہو گا کہ دلوں کی دنیا بھی بدل جائے گی

---

[1] صاحب خانہ کا اثر اور دباؤ نہ رہے تو ظاہر ہے گھر کا نظام درہم برہم اور اثر اور دباؤ صرف اس بنا پر نہیں کہ بیوی کا شوہر یا بچوں کا باپ ہے بلکہ دباؤ اور اثر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ مالک و قابض ہے۔ بے دست و پا صاحب خانہ کا اثر صرف اخلاقی مطالبہ ہوتا ہے اور جب باپ کا دباؤ نہ ہو تو کیا اولاد با اخلاق بن سکتی ہے؟

[2] خانگی نظام ختم ہونے کے بعد جب سرکاری پرورش گاہوں میں بچے پرورش پائیں گے تو ایک طرف قرابت اور رشتہ داری کے جملہ حقوق ختم بلکہ رشتہ داروں کو پہچاننا مشکل بھی ہو گا اور بے کار بھی، دوسری جانب جنسی تعلقات کے لئے سلسلہ ازدواج بے معنیٰ ہو جائے گا۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمایئے احقر کی تصنیف "دور حاضر کے سیاسی اور اقتصادی مسائل" "اور اسلامی تعلیم کے اشارات"

[3] انسان اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے تو ہر چیز کا اصل مالک اللہ ہے۔ بندہ کی ملکیت صرف نیابت ہے جو مالک حقیقی کی منشا اور اس کی مصلحت کے تحت اور اس کے احکام کے تابع ہو گی۔ پھر اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ اپنے بندوں کا محافظ مشکلات کو حل کرنے والا۔ حاجتوں کو پورا کرنے والا (حل المشکلات قاضی الحاجات) پس جب بھی پرورش، حفاظت، تعلیم و تربیت وغیرہ کی ضرورتیں پیش آئیں گی، انسان پر بحیثیت نائب و خلیفہ ان ضرورتوں کو پورا کرنا ضروری ہو گا۔ انفرادی ضرورتیں افراد سے پوری ہوں گی۔ زکوٰۃ و صدقات اسی لئے ہیں کہ ضرورت مند افراد کی انفرادی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ لہٰذا ان کی ادائیگی کے لئے حکومت کا توسط ضروری نہیں ہے وہ وہاں بھی لازم نہیں جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے۔ صاحب استطاعت کا فرض

-
خارجی طاقت یعنی آرڈیننس یا قانون کی شوراشوری۔ اہل ثروت اور ارباب دولت کو سراسیمہ اور پریشان نہیں کرے گی بلکہ خود اپنے اندرونی جذبات کی سوزش ان کی نظر میں اس دولت کو وبال جان اور اس کے خرچ کرنے کو راحت واطمینان بنادے گی۔

مالی نظام کے سلسلہ میں جو الفاظ قرآن حکیم یا سنت نبویہ نے استعمال فرمائے ان پر نظر ڈالئے۔ وہ سب انقلاب انگیز ہیں مگر بجٹ کے خسارہ کو پورا کرنے کے لئے نہیں بلکہ دلوں کی بیماریوں کو دور کرنے کیلئے

-
سب سے پہلا اور سب سے مشہور لفظ زکوٰۃ ہے جس کے مفہوم میں، تزکیہ، داخل ہے۔ زکوٰۃ کے معنٰی پاکی ہیں اور تزکیہ کے معنٰی پاک کر دینا۔ یعنی زکوٰۃ اس لئے فرض ہوتی ہے کہ دلوں کو پاک کر دے۔ بخل وہ ناپاکی ہے جو دلوں کو ہی نہیں بلکہ اس ملکیت کو بھی ناپاک کر دیتی ہے جو اس کے زیر اثر ہو۔ زکوٰۃ دل کو بخل سے پاک کرتی ہے تو ساتھ ساتھ دولت کو بھی پاک کر دیتی ہے۔ دوسرا لفظ صدقہ ہے جو صدق سے ماخوذ ہے۔ یعنی صدقہ اس بات کی عملی دلیل ہے کہ ملی ضرورتوں کے احساس یا غریبوں اور فقیروں کی ہمدردی کا دعویٰ ایک سچی حقیقت ہے۔ محض نمائش اور بناوٹ نہیں۔ یہ دو مد لازمی ہیں۔ ان کے مصارف بھی معین ہیں۔ یہ ضرورت مند افراد کی امداد کے لئے مخصوص ہیں۔ ان دو مدوں کے ذریعہ قوم کی غریبی دور ہو سکتی ہے۔ ان کے لئے حکومت کا واسطہ بھی ضروری نہیں براہ راست صاحب دولت پر فرض ہے کہ اتنی مقدار اپنی مِلک سے نکالے اور ضرورتمند کی ملکیت میں دیدے۔ مملکت یا ملّت کی اجتماعی ضرورتوں پر زکوٰۃ و صدقات واجبہ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی۔ ان ضرورتوں کے لئے قرآن حکیم نے فرض یا انفاق فی سبیل اللہ کا لفظ استعمال کیا ہے :

وَ اَقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا (سورہ مزمل۔۱۴)

"قرض دو اللہ کو اچھی طرح قرض دینا۔"

وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ لَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ (سورہ بقرہ آیت ۱۹۵)

"اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور (خرچ کو بند کر کے یعنی بخل کر کے) مت ڈالو اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں"

ہے کہ وہ ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرے۔ اسی لئے ان میں تملیک بھی ضروری ہے یعنی ضرورت مند کو محض اجازت دے دینا کافی نہیں بلکہ مالک بنانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ البتہ اجتماعی ضرورتیں ہیئت اجتماعیہ یعنی خلافت کے ذریعہ پوری ہوں گی۔ یہ اجتماعی ہیئت خلافت اِلٰہیّہ کی حیثیت سے افراد پر اقتدار رکھتی ہے اور افراد کی مملوکات پر بھی۔ وہ کسی کی ملک چھین نہیں سکتی مگر پابندی لگا سکتی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے "دور حاضر کے سیاسی واقتصادی مسائل"

فرض کیجئے اسلامی مملکت کی مخالف حکومتیں اپنی جنگی طاقتیں زیادہ سے زیادہ مضبوط کررہی ہیں۔ اسلامی مملکت کی آمدنی کے عام ذرائع دفاعی ضرورتیں نہیں پوری کر سکتے۔ ہنگامی امداد کی ضرورت ہوتی ہے، حکومتیں ایسی صورتوں میں قومی قرض [1] یا قرضہ جنگ کی اپیل کرتی ہیں۔ مگر قرآن حکیم یہ قرض اللہ کے لئے طلب کرتا ہے۔ انفاق یعنی خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ بھی فی سبیل اللہ یعنی پہلے انسان کا رشتہ اللہ سے جوڑتا ہے۔ غیر اللہ سے اس کے دل کو پاک کرتا ہے۔ مال و دولت اور ہر چیز کے مقابلہ میں اللہ کی محبت بڑھاتا ہے اور ایمان کا معیار یہ قرار دیتا ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (سورہ بقرہ آیت ۱۶۵)

"جو ایمان لائے وہ بہت بڑھے ہوئے ہیں اللہ کی محبت میں"

اسی محبت کے نتیجہ میں وہ اس سے مالی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ ہے تزکیۂ قلب۔

(۷)

تزکیہ کس طرح ہوتا ہے:

تزکیہ کا آغاز خود اپنے نفس سے ہوتا ہے۔ پہلے خود اپنی اصلاح کرے، اپنے نفس کو بخل، طمع، حب مال جیسی آلودگی سے پاک کرے، تب درجہ بدرجہ دوسروں سے اصلاح قبول کر لینے کی توقع کر سکتا ہے۔

اس سلسلہ تحریر کا تعلق جناب رسالت مآب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ سے ہے لہذا وہی مثالیں پیش کی جارہی ہیں جن کا تعلق خود ذات اقدس سے ہو (ﷺ)۔

دولت پرستی اور حب مال سے قلب کو پاک کرنے کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ نے (ﷺ) طے فرمالیا کہ جو کچھ آمد ہو وہ شام تک خرچ کر دی جائے۔ کاشانہ نبوت میں رات کو کوئی ایک حبہ بھی باقی نہ رہ سکے۔

گردنوں کو پھاند کر گزرنا خلاف ادب ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ ہاں کسی مجبوری کی صورت میں یہ بے ادبی معاف سمجھی جائے گی۔ آنحضرت ﷺ کو ایک روز خود ایسا کرنا پڑا۔ آپ عصر کی نماز پڑھارہے تھے کہ آپ کو خیال آیا کہ فلاں زوجہ مطہرہ کے یہاں آپ کی کچھ چاندی

---

[1] بہت ممکن ہے حکومتوں نے قرض کی اصطلاح بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن سے ہی سیکھی ہو۔ لیکن اگر یہ اصطلاح قرآن سے سیکھی ہے تو محض الفاظ قرآن کے ہیں روح قطعاً غیر قرآنی ہے۔ قرآن صاحب دولت سے اس تعلق کی بنا پر دولت لیتا ہے جو اس کا خدا کے ساتھ ہے اور حکومتیں سود کا لالچ دیکر قرض لیتی ہیں۔ قرآن والے قرض سے دولت کی محبت کم ہوتی ہے، بخل کے مرض میں تخفیف ہوتی ہے اور سرکاری قرض سے ان امراض میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا ہے اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ قرآنی قرض کا بار صرف صاحب دولت پر پڑتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھ کر قرض لیتا ہے کہ اس کا اجر دنیا میں کچھ نہیں ملے گا اللہ کے یہاں ملے گا۔ اور سرکاری قرض کا بار غریبوں پر پڑتا ہے کیونکہ سود کی ادائیگی نئے ٹیکس لگا کر یا ٹیکسوں میں اضافہ کر کے کی جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں غریب کی غریبی میں اضافہ ہوتا ہے اور دولتمند اور زیادہ دولتمند ہو جاتا ہے۔

رکھی ہوئی ہے، جیسے ہی آپ نے سلام پھیرا بڑی پھرتی سے آپ کھڑے ہوئے اور ان زوجہ مطہرہ کے یہاں تشریف لے گئے فوراً ہی واپس تشریف لے آئے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ لوگ حیران ہیں کیا ماجرا ہے؟ خلاف معمول اس طرح تیزی سے کیوں تشریف لے گئے ابھی کوئی دریافت نہیں کرنے پایا تھا کہ آپ نے خود ہی فرمادیا: مجھے نماز پڑھتے ہوئے یاد آیا[1] کہ کچھ چاندی رکھی ہوئی ہے۔ مجھے گوارا نہیں کہ شام کا وقت ہو اور چاندی میرے پاس رہے (ایک روایت میں یہ ہے کہ چاندی میرے گھر میں رات گزارے) لہذا میں کہہ آیا ہوں کہ اس کو تقسیم[2] کردیں۔[3]

یہ احساس لطیف کی نزاکت ہے کہ عصر کا وقت ہے۔ شام ہونے اور رات آنے میں کافی دیر ہے[4]۔ مگر یہ دیر بھی دیر نہیں معلوم ہوئی۔ گویا دولت کی آلودگی سے جس قدر جلد ممکن ہو دامن پاک ہوجائے۔ یہ تھوڑی سی چاندی کا معاملہ تھا ممکن ہے دو تین تولہ ہی ہو مگر دولت کے بڑے سے بڑے انبار کے متعلق بھی آپ کا جذبہ یہی تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے رات کی چاندنی میں آپ تشریف لے جارہے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ سامنے احد کا پہاڑ تھا۔ آپ نے فرمایا اگر احد پہاڑ کی برابر سونا میرے پاس ہو تو میری خوشی یہ ہوگی کہ تین راتیں نہ گزرنے پائیں کہ وہ سب راہ خدا میں خرچ ہوجائے۔ ایک دینار بھی میرے پاس باقی نہ رہے بجز اس دینار کے جو کسی مطالبہ کو ادا کرنے کے لئے محفوظ رکھنا پڑے۔[5]

زندگی بھر درہم و دینار کو یہ سعادت میسر نہ ہوئی کہ کاشانہ نبوت میں رات گزار سکے۔ بعد وفات کے لئے ارشاد ہوا:

لا تقسم ورثتی دینارا أولا درهماً۔ ما ترکت بعد نفقة نسائی ومونته عاملی فهو صدقة[6]

(یعنی) یہ تو ہوگا ہی نہیں کہ میرے وارث دینار یا درہم تقسیم کرسکیں۔ (البتہ کچھ جائیدادیں میری تحویل میں ہیں۔ تو) ازواج کے نفقہ اور کارندے کے حق المحنت کے علاوہ جو کچھ میرا ترکہ ہو وہ صدقہ ہے

---

[1] نماز میں کسی بات کا یاد آجانا غیر اختیاری ہے اور یہ بھی فطری بات ہے کہ انسان کا ذہن اور دماغ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ لہذا فطری اور غیر اختیاری پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ البتہ نماز سے غافل ہوکر خیال میں مصروف اور مشغول نہ ہوجانا چاہئے۔ اس خیال کو ہٹا کر نماز ہی کی طرف دھیان لگادینا چاہئے۔ سنت مبارکہ کی تعلیم یہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[2] ضرورت مند اور مستحق لوگوں کی کمی نہیں تھی۔

[3] بخاری شریف ص ۱۶۳ و ص ۱۱۷

[4] مسلک احناف کے بموجب گرمیوں میں تقریباً دو گھنٹے اور حضرات شوافع کے مسلک کے بموجب دوسرے مثل ہی میں عصر کی نماز پڑھی گئی تھی تو ابھی تقریباً ایک تہائی دن باقی تھا۔ مگر الفاظ حدیث (کرهت ان یمسی اویبیت عندنا) بخاری شریف ص ۱۶۳ سے وہی متبادر ہے جس سے مسلک احناف کی تائید ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

[5] بخاری شریف ص ۹۵۴ و ص ۳۲۱ وغیرہ

[6] بخاری شریف ص ۳۸۹

"۔

استحصال کی بندش:

تزکیہ کا مطلب صرف یہی نہیں رہا کہ اکتناز نہ ہو۔ یعنی حاصل شدہ درہم و دینار کو شب باشی کا موقع نہ ملے (شام سے پہلے ہی خرچ کر دیا جائے) بلکہ تزکیہ کا دوسرا رخ یہ تھا کہ آمدنی صرف وہ ہو جو ہر طرح مقدس، طیب اور پاک ہو۔ پھر اس پاک میں بھی یہ پابندی کہ زکوٰۃ یا صدقہ نہ ہو۔ یہ پابندی نہ صرف اپنے لئے بلکہ

(الف) نسلاً بعد نسل اپنی تمام اولاد کے لئے۔

(ب) تمام خاندان کے لئے جو آل ہاشم کہلاتا تھا (انتہا یہ کہ)

(ج) اپنے خاندان کے تمام آزاد کردہ[1] غلاموں کے لئے

پھر لطف یہ کہ (۱) محمد رسول اللہ ﷺ کا تمام تر ترکہ صدقہ، آپ کے وارثوں کو یہ حق نہیں کہ اس کو تقسیم کر سکیں۔ مگر صدقہ یا زکوٰۃ کی یہ مجال نہیں کہ وہ آل ہاشم کا دامن چھو سکے۔ (۲) پوری امت کے لئے یہ ضابطہ کہ

توخذ من اغنیاءھم وترد علی فقراءھم

یعنی جس قوم یا گروہ کے دولت مندوں سے زکوٰۃ لی جائے وہ اسی گروہ یا قوم کے ضرورتمندوں کو دیدی جائے۔ مگر آنحضرت ﷺ اور آپ کے خاندان کے لئے اس میں یہ ترمیم کہ اس ضابطہ کا جزو اول تو واجب العمل کہ اگر دولت مند ہوں تو عام مسلمانوں کی طرح ان سے بھی زکوٰۃ و صدقہ لیا جائے۔ لیکن دوسرا جزو (کہ ان کے ضرورت مندوں کو دیا جائے) حرام۔ یعنی آل ہاشم کے دولت مند یہ نہیں کر سکتے کہ عام دستور کے بموجب وہ اپنی زکوٰۃ کی رقم یا صدقہ فطر اپنے کسی ہاشمی رشتہ دار یا اس کے آزاد غلام کو دے دیں۔ یہ رقم لامحالہ کسی غیر ہاشمی مسلمان کو ہی دینی ہو گی۔

صدقہ کے کھجور آئے ہوئے پڑے تھے۔ جگر گوشہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بچے تھے[2]۔ انہوں نے ایک کھجور منہ میں رکھ لیا۔ جیسے ہی سرکار دو عالم ﷺ کی نظر پڑی لخت جگر کو تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا:

کخ کخ اما شعرت انا لا ناکل الصدقه

---

[1] جن کو مولیٰ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ عربوں کا حوصلہ یہ تھا کہ وہ اپنے مولیٰ کو بھی اپنے خاندان کا فرد سمجھا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے سوال کو یہی حیثیت دی ہے۔ ارشاد ہے: ان الصدقه لاتحل لنا وان موالی القوم من انفسهم۔ ترمذی شریف ص ۸۳ ج ۱، ابوداؤد شریف ص ۲۴۰ ج ا وھکذا فی النسائی ص ۳۶۶ ج ۱

[2] پیدائش نصف رمضان سنہ ۳ھ (تاریخ الخلفا) آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت تقریباً ساڑھے چھ سال عمر تھی۔

"اخ تھو۔ اخ تھو۔ تمہیں اتنی تمیز نہیں کہ ہم صدقہ ❸ نہیں کھایا کرتے۔"

رازدرون پردہ گداران کی کیفیت :

ان تمام پابندیوں اور احتیاطوں کے بعد اندرون نشیمن کیا حالت رہا کرتی تھی۔ ذرا جھانک کر دیکھو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ جب بھی میں کھانا کھانے بیٹھتی ہوں، طبیعت ایسی بھر آتی ہے کہ اگر چاہوں تو خوب روسکتی ہوں۔ مجھے وہ حالت یاد آجاتی ہے جو آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں رہی۔ یہاں تک کہ ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ خدا کی قسم کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ دونوں وقت آپ روٹی اور گوشت سے شکم سیر ہوئے ہوں۔ ❶

میدہ آپ نے عمر بھر نہیں دیکھا۔ کبھی آپ کے لئے چپاتی نہیں پکائی گئی۔ جو کا آٹا بھی بے چھنا پکتا تھا، یہی خوراک تھی۔ اس پر بھی دو دو ماہ گزر جاتے تھے کہ چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔ دو کالی چیزیں یعنی کھجور اور پانی غذا ہوا کرتی تھیں، البتہ انصاری پڑوسی دودھ بھیج دیا کرتے تھے۔ ❷ حضرت انس رضی اللہ عنہ (آنحضرت ﷺ کے خادم خاص) فرماتے ہیں: گھر کے ❸ آدمی نو تھے۔ دن رات کے خرچ کیلئے ان سب کے واسطے صرف ایک صاع ❹ ہوتا تھا اور ایسا بھی ہوا کہ آپ نے یہودی کے یہاں زرہ رہن رکھ کر جو منگوائے اور ایسا بھی ہوا میں آنحضرت ﷺ کے لئے جو کی روٹی اور باسی چربی لے گیا۔ ❺ اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔

بچھانے کا گدا چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، ❻ اکثر کھرّے چارپائی پر آرام فرماتے تھے۔ چٹائی کے پٹھے جسم مبارک میں گڑ جایا کرتے تھے۔ ❼

وفات ہوئی تو زرہ ایک یہودی کے یہاں ❽ تیس صاع جو کے عوض میں رہن تھی۔ ❾

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک موٹا کمبل پیوند لگا ہوا اور ایک موٹے کپڑے

---

❸ بخاری شریف ص ۲۰۲، وفتح الباری
❶ ترمذی شریف ص ۵۸ ج ۲
❷ بخاری شریف ص ۹۵۶
❸ ازواج مطہرات۔ دسویں خود آنحضرت ﷺ
❹ ایک صاع کا وزن دو سو ستر تولہ (تین سو چھ چھٹانگ) تقریباً ۲ کیلو چھ ۶ سو گرام
❺ بخاری شریف ص ۳۴۱
❻ بخاری شریف ص ۹۵۶
❼ بخاری شریف ص ۳۳۵
❽ تیس صاع تقریباً ڈھائی من
❾ بخاری شریف ۴۰۹ وشمائل ترمذی شریف

کی لنگی نکال کر ہمیں دکھائی اور فرمایا ان دو کپڑوں میں رسول اللہ ﷺ کی روح قبض ہوئی۔ [10]

وفات کے بعد ترکہ یہ تھا: (ضروری) اسلحہ، ایک خچر، قطعہ آراضی جس کو صدقہ کر دیا تھا۔ [1]

ایک معمہ : ....

سنہ ۷ھ میں خیبر فتح ہوا۔ اس کے بعد ازواج مطہرات کے نفقے مقرر کر دیئے گئے۔ ہر ایک خاتون کا سالانہ نفقہ اسی (۸۰) وسق کھجور اور بیس وسق جو [2] ۔ ایک وسق ۲ کا وزن پانچ من ڈھائی سیر۔ اس حساب سے اسی وسق کھجور چار سو پانچ من اور بیس دسق جو ایک سو ایک من دس سیر۔ کھجور اور جو کا جو بھی نرخ مانا جائے۔ جب ایک شخص کی خوراک کے لئے مہینہ میں ایک من اور سال بھر میں بارہ من جو یا کھجور بہت کافی ہوتے ہیں تو یہ کئی سو من کی مقدار فاضل ہی تھی۔ اس کے ذریعہ زندگی بہت خوش حال بن سکتی تھی پھر یہ تنگی کیوں تھی؟

جواب: کوئی حساب داں اس معمہ کو حل نہیں کر سکتا۔ قرآن حکیم نے اس کا جواب دیا ہے۔ جب صحابہ کرام کی شان یہ بیان فرمائی:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (سورہ حشر۔۹)

"(ضرورتمندوں کو) اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں باوجودیکہ خود ان کو شدید ضرورت ہوتی ہے۔"

اور اللہ کے پاک بندوں کی یہ شان بیان فرمائی:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (الدھر۔۸)

"اور کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت پر (جب کھانا خود ان کو بھی محبوب ہوتا ہے اور وہ خود بھی ضرورت مند ہوتے ہیں) مسکین کو، یتیم کو اور قیدی کو"۔

ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے اگر عوام کی اقتصادی حالت معلوم ہو جائے تو معمہ حل ہو جائے گا۔

عوام کی حالت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو آپ کا مع اہل وعیال یومیہ وظیفہ نصف بکری [3] مقرر کیا گیا تھا کیونکہ متوسط درجہ کے مہاجر کی یومیہ آمدنی کا اوسط یہی تھا یہ آمدنی فی کس نہیں بلکہ فی گھر تھی۔

اور جب متوسط درجہ کے مہاجرین کی یہ آمدنی تھی تو غریبوں کی آمدنی کا اوسط تو فی گھر اس سے بھی

---

[10] بخاری شریف ص ۸۶۵ ترمذی شریف ص ۲۰۶ ج ۱

[1] بخاری شریف صد ۲۱۳ ،

[2] ایک دسق ساٹھ صاع کا اور ایک صاع ۳ سیر چھ چھٹانک (۲۷۰ تولہ)

[3] تاریخ الخلفاء ص ۵۸ مجتبائی بحوالہ طبقات ابن سعد

کم ہو گا جس کا لازمی تقاضا عمومی افلاس تھا۔ پس عمومی افلاس اور عوام کی خستہ حالی اس معمہ کا حل ہے۔ اسکی وضاحت حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ سے ہوتی ہے:

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں جب از سر نو وظائف مقرر کئے تو ہر ایک زوجہ مطہرہ کا سالانہ وظیفہ دس ہزار درہم مقرر کیا۔ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش (رضی اللہ عنہا) کے یہاں یہ رقم پہلی مرتبہ پہنچی تو فرمایا: اللہ تعالیٰ امیر المومنین پر رحم فرمائے۔ یہ رقم میرے پاس بھیجی حالانکہ میری سہیلیوں میں ایسی ہیں جو مجھ سے زیادہ باہمت ہیں وہ زیادہ مستعدی سے اس رقم کو تقسیم کر سکتی تھیں۔

جب پیش کرنے والوں نے کہا: محترمہ! یہ تقسیم کرنے کے لئے نہیں ہیں یہ تو آپ کے جیب خرچ کے لئے ہیں تو فرمایا: اچھا یہاں ڈال دو۔ ان کو رکھوا کر ان پر کپڑا اڈلوا دیا۔ اور اپنی خادمہ سے فرمایا: کپڑے کے نیچے ہاتھ ڈال کر فلاں خاندان کے لئے رقم نکالو۔ فلاں خاندان کے لئے نکالو۔ اسی طرح خاندان شمار کراتی رہیں اور ان کے لئے رقومات علیحدہ کراتی رہیں۔ خادمہ نے کہا: سیدہ میں بھی تو حاضر ہوں کچھ میرے لئے بھی، فرمایا: جو کچھ کپڑے کے نیچے رہ گیا ہے وہ تمہارا ہے۔

خادمہ نے کپڑا اٹھایا تو صرف پچاسی درہم باقی تھے۔ وہ اس کو عطا فرما دیئے۔ ❶

یہ تھا اسلامی سوشلزم، اگر اس کو سوشلزم کہا جاسکتا ہے جو تقسیم دولت کا قانون نہیں بنواتا بلکہ دلوں میں دولت سے نفرت اور غریبوں کی ہمدردی کا وہ جذبہ بھر دیتا ہے کہ ان کو اطمینان جب ہی ہوتا ہے جب پوری دولت تقسیم ہو جائے اور امیر غریب کی سطح پر آجائے۔ اسی کو تزکیہ کہا جاتا ہے کہ بخل، حب مال اور حرص و طمع کے جراثیم سے وہ پارہ گوشت پاک وصاف ہو جائے جس کو دل کہا جاتا ہے۔

نتیجہ:

یہ بحث بظاہر بے محل ہے مگر جب شروع ہو گئی تو اب یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ یہ اقتصادی نظام جس کی بناء مساوات پر رکھی گئی تھی جس کے لئے دولت مند غریب کی سطح پر آجاتے تھے وہ کتنی جلد کامیاب ہوا اور کیسا کامیاب ہوا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وظیفہ یومیہ نصف بکری معین کیا گیا تھا یعنی پانچ درہم یومیہ۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دو سالہ دور خلافت میں درج رجسٹر مسلمانوں کے وظائف مقرر کئے تو اسی نسبت سے یعنی فی کس پانچ درہم یومیہ۔ ❶

---

❶ کتاب الخراج الامام ابی یوسف رحمہ اللہ ص ۴۵۔

❶ کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۶۴۶ ص ۳۶۳۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ: فضائل، خدمات اور مناصب کا لحاظ کرتے ہوئے وظائف مقرر فرمائے جو بارہ ہزار درہم [2] سالانہ تک تھے۔ جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق تھا تو یہ ضابطہ مقرر کر دیا کہ جیسے ہی بچہ پیدا ہو اس کا وظیفہ جاری کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ یمن کا علاقہ زرخیز تھا تو وہاں یہ حالت ہو گئی کہ ایسے ضرورت مند نہ رہے جن کو زکوٰۃ دی جا سکے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ یمن کے والی (گورنر) تھے انہوں نے جو زکوٰۃ وصدقات کی رقمیں وصول کیں ان کا ایک تہائی مرکز بیت المال (مدینہ) میں بھیجا مگر بجائے مبارکباد کے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی جانب سے تنبیہ نامہ پہنچا:

"آپ کو یمن اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ وہاں سے چندہ یا جزیہ وصول کر کے یہاں بھیجیں۔ آپ کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہاں کے اہل استطاعت سے زکوٰۃ وصدقات وصول کریں اور اسی علاقہ کے ضرورت مندوں پر تقسیم کر دیں۔ پھر آپ نے یہ رقم کیسے بھیجی"؟

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا:

سب کو دے دیا گیا جب یہاں کوئی لینے والا نہ رہا تو یہ فاضل رقم بھیج دی"۔

اگلے سال حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے نصف اور تیسرے سال زکوٰۃ کی پوری رقم مرکزی بیت المال میں بھیج دی اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مرتبہ بھی اتنی سختی سے لکھا تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا دو لفظی جواب یہ تھا۔

ماوجدت احداً یاخذ منی شیئاً [3]

کوئی نہیں ملا جو مجھ سے کچھ لے لے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور شروع ہوا تو مدینہ کی یہ حالت ہو گئی کہ لوگ زکوٰۃ کی رقم لئے پھرتے تھے اور کوئی شخص ایسا نہیں ملتا تھا جو اسے قبول کر لے۔

سنہ ۷ھ میں خیبر فتح ہوا تھا۔ اس وقت سے اسلامی مملکت اس قابل ہوئی تھی کہ کسی درجہ پر مالی نظام قائم ہو سکا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور خلافت سنہ ۲۳ھ سے شروع ہوا اس سولہ سال کے عرصہ میں پوری مملکت کی یہ حالت ہو گئی کہ غربی کا نام ونشام نہیں رہا۔ [4] ساتھ ساتھ تعمیرات کا سلسلہ شروع

---

[2] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارہ ہزار درہم سالانہ باقی تمام ازواج کے دس دس ہزار۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تمام مہاجرین کے جو غزوہ بدر میں شریک تھے پانچ پانچ ہزار۔ حضرات انصار جو بدر میں شریک تھے ان کے چار چار ہزار (کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۵۴۹ صفحہ ۲۲۴)

[3] کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۱۹۱، صفحہ ۵۹۶۔

[4] اس نظام کی بنیادیں اتنی مضبوط تھیں کہ شدید خانہ جنگی کے باوجود خوشحالی کا دور دورہ رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت یعنی خلافت راشدہ کے تیس سال ختم ہونے کے بعد اگرچہ وصول اور خرچ کے بارہ میں وہ احتیاط باقی نہیں رہی تھی مگر جو اقتصادی ساکھ قائم ہو چکی تھی وہ قائم رہی۔ جس کی ایک مثال یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تقریباً ستاون سال بعد جب

ہوا تو وہی مدینہ جس میں قبہ دار پھاٹک ناپسند فرمایا گیا تھا اب اس کی تعمیرات محدود علاقہ سے آگے بڑھ کر کوہ سلع تک پہنچ گئیں۔ جو احد کے قریب مدینہ سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر ہے۔

تیسرا کام: قریش واہل یثرب کا معاہدہ

یہود سے مصالحت

(۱)

یثرب و مضافات یثرب (مدینہ) اس عرب کا ایک علاقہ تھا جہاں نہ کوئی حکومت و سلطنت تھی نہ فوج اور پولیس۔ پورا عرب آزاد و خود سر قبائل کا ایک وسیع جنگل تھا۔ وہاں صرف معاہدات کا ایک نظام تھا۔ وہی قبائل کو جوڑتا تھا اور وہی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ دو قبیلوں میں اگر جنگ ہو گئی تو وہ ان قبیلوں تک ہی نہیں رہتی تھی بلکہ ان کے حلیف اور معاہد قبیلے میدان میں اتر آتے تھے۔ اس طرح دو قبیلوں کی لڑائی دو نظاموں (دو قبائلی گروپوں) کی لڑائی بن جاتی تھی۔

یثرب کے دو قبیلے اوس و خزرج کے افراد مسلمان ہوئے تھے ان کے بھی معاہدات تھے۔ یثرب کے قریب (بنو قریظہ، بنو نضیر وغیرہ) یہود کے جو قبائل آباد تھے ان معاہدات میں شریک تھے۔ بن قریظہ، قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔

ان معاہدات میں جس طرح دفاع کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ حملہ آور کا مقابلہ آپس کی متحدہ طاقت سے کریں گے اسی طرح یہ بھی ہوتا تھا کہ اگر حلیف قبیلہ کا کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہو گی۔

پنچائتی قسم کے کچھ قاعدے اصول متعارفہ کے طور پر رائج تھے جو عام طور پر تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کے بموجب قتل کی بعض صورتوں میں "قصاص" ہوتا تھا۔ یعنی جان کے بدلے جان بعض صورتوں

حضرت عمر بن عبد العزیز (المتوفی رجب سنہ ۱۰۷ھ، ۷۲۰ء) نے نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لیا تو آپ نے عبد الحمید بن عبد الرحمن (گورنر عراق) کو حکم بھیجا کہ وظائف مقررہ ادا کر دیں۔ گورنر صاحب نے تعمیل حکم کے بعد رپورٹ بھیجی کہ تمام وظائف ادا کئے جا چکے ہیں تب بھی کافی رقم باقی ہے۔ دربار خلافت سے حکم صادر ہوا آپ کے صوبہ میں جتنے مقروض ہیں ان کا جائزہ لو اور ان سب کے قرض ادا کر دو جو فضول خرچی کی بنیاد پر مقروض نہ ہوئے ہوں۔ گورنر صاحب نے تعمیل کے بعد رپورٹ بھیجی کہ سب مقروض کے قرض ادا کئے جا چکے ہیں تب بھی رقم باقی ہے۔ حکم صادر ہوا جن نوجوانوں کے نکاح نہیں ہوئے ان کے نکاح کرا دیجئے اور مہر اس رقم سے ادا کر دیجئے۔ گورنر صاحب نے اس حکم کی تعمیل کے بعد بھی یہی رپورٹ بھیجی کہ رقم باقی ہے۔ حکم صادر ہوا جو غیر مسلم کاشتکار جزیہ ادا کرتے ہیں ان کا جائزہ لیجئے۔ ان کو تقاوی کی ضرورت ہو تو ان کی تقاوی دیدیجئے کہ وہ آسانی اور سہولت کے ساتھ زمیں بو سکیں۔ (کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۵۱ حدیث ۶۲۱)

میں جان کے بدلے جان نہیں بلکہ دیت لازم ہوتی تھی۔ دیت کے سو اونٹ مقرر تھے۔ دیت اور بعض صورتوں میں "خون بہا" صرف قاتل یا قاتل کے اہل خانہ سے وصول نہیں کیا جاتا تھا بلکہ قاتل کی سوسائٹی سے وصول کیا جاتا تھا۔ جس کو عاقلہ کہتے تھے۔ اس کی حدود ہوتی تھیں اس میں (سوسائٹی میں) قاتل کے قبیلے کے آدمی بھی ہوتے تھے۔ حلیف قبیلوں کو بھی اس میں شریک ہونا پڑتا تھا اور معاہدات میں یہ طے ہوتا تھا کہ اگر دیت لازم ہو تو کس قبیلہ کو دیت میں کتنا حصہ لینا ہوگا۔ ان شرائط کو جو قصاص، خون بہا اور دیت کے متعلق ہوا کرتی تھیں ان کو "معاقل" کہا جاتا تھا۔

(۲)

قریشی حضرات جو ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے ایک نیا عنصر تھے۔ اگرچہ حضرات انصار نے ان کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اور اس طرح مکی اور مدنی مسلمانوں کا ایک گروپ بن سکتا تھا جو ایک نئی سیاسی اور مذہبی پارٹی کی حیثیت میں رونما ہوتا؟ مگر رحمت عالم ﷺ نے یہ صورت اختیار نہیں فرمائی۔

یہ گروپ ایک وزن رکھتا تھا اور اگر صرف سیاسی انقلاب مقصود ہوتا تو یہ گروپ کار آمد ہو سکتا تھا لیکن جس کا نصب العین دعوت الی اللہ تھا وہ اس جتھ بندی کو پسند نہیں کر سکتا تھا۔

حضرات انصار یعنی قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کے جو افراد مسلمان ہوئے تھے ان کے پورے قبیلے اور کتنے بطن مسلمان نہیں ہوئے تھے اور بہت سے وہ تھے کہ ان کے گھر کے بھی سب آدمی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ وہ سابق مذہب پر قائم تھے۔ اس طرح کی جتھہ بندی آپس میں تصادم اور مقابلہ کی شکل پیدا کر دیتی جس کا نتیجہ فساد فی الارض اور قطع ارحام ہوتا جو اسلام میں بدترین جرم ہے۔

جتھہ بندی اور علیحدگی کے برخلاف رحمت عالم ﷺ نے اتفاق و اتحاد اور میل ملاپ کا راستہ اختیار کیا۔ آپ نے اس علاقہ کے تمام باشندوں میں خیر سگالی اور تعاون و امداد باہمی کی روح پیدا کرنی چاہی۔ مواخات جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے اس کی پہلی کڑی تھی۔ جس سے آپ نے مہاجرین اور انصار میں نہ صرف تعاون اور خیر سگالی کا رشتہ قائم کیا بلکہ انصار اور مہاجرین کو بھائی بھائی بنا دیا۔

یثرب میں ایک فرقہ مشرکین کا تھا جو قریش مکہ کا ہم مذہب تھا اور قریش مکہ اس کو آسانی سے اپنا آلہ کار بنا سکتے تھے۔ دوسرا فرقہ یثرب کے قرب وجوار میں یہود کا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرات مہاجرین کا رابطہ ان سے بھی قائم کر دینا چاہا۔

(۳)

مدینہ میں تشریف لانے کے بعد آپ نے جو کام سب سے پہلے کئے ان میں تیسرا کام یہ تھا کہ آپ نے مہاجرین اور ان تمام فرقوں میں بقاء باہم، تعاون اور خیر خواہی اور خیر اندیشی کا رشتہ قائم کرنے کے لئے ایک تحریر مرتب فرمائی اس کو عہد نامہ بھی کہہ سکتے ہیں اور ایک وفاق کا دستور اساسی بھی۔ قریش مکہ کی تمام

کوششوں کو ناکام بناتے ہوئے جس کامیابی کے ساتھ آنحضرت ﷺ اور حضرات مہاجرین مکہ سے نکل کر مدینہ تشریف لائے تھے اور یہاں ایک مرکز کی بنیاد ڈال دی تھی اس نے جس طرح قریش کو چراغ پا کر دیا تھا حتیٰ کہ انہوں نے فوراً ❶ ہی اس مرکز کو ختم کرنے کی سازش شروع کر دی تھی اس کا بھی تقاضا تھا کہ حضرات مہاجرین اور باشندگان یثرب و مضافات یثرب کے درمیان تعاون، تحفظ اور بقاء باہم کا عہد و پیمان ہو۔ اس عہد نامہ سے یہ تقاضا بھی پورا ہو رہا تھا۔

(۴)

اس عہد نامہ کا ایک فریق حضرات قریش میں جو ایمان واسلام سے مشرف ہوئے اور ہجرت کر کے مدینہ میں قیام پذیر ہوئے جن کو عہد نامہ میں المومنین والمسلمین من قریش سے تعبیر کیا گیا ہے، دوسرا فریق اہل یثرب ہیں (کسی مذہبی فرقہ کی بناء پر نہیں بلکہ باشندہ یثرب کی حیثیت سے) ان میں حضرات انصار کے علاوہ وہ بھی شامل ہیں جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اپنے کفر و شرک پر قائم تھے۔ ان میں عبداللہ بن ابی بن سلول جیسے رؤسا بھی تھے جو کھلم کھلا ❷ آنحضرت ﷺ اور اسلام کی مخالفت کیا کرتے تھے۔

یہود بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع وغیرہ اہل یثرب نہیں ہیں۔ یہ قبائل یثرب سے باہر مضافات یثرب میں آباد تھے۔ اہل یثرب (اوس اور خزرج) سے ان کے معاہدات تھے۔ ان معاہدات کو آنحضرت ﷺ نے نظر انداز نہیں فرمایا بلکہ ان کو مستحکم اور مضبوط کیا ہے۔ چنانچہ انہیں معاہدات کے واسطہ سے ان کو اس عہد نامہ میں شامل فرمایا ہے:

آنحضرت ﷺ کوئی فریق ❸ نہیں ہیں آپ ایک سرپرست ہیں اور اس معاہدہ کے بانی کی حیثیت سے آپ کو مرکزی شخصیت تسلیم کیا گیا ہے اور یہ طے کیا گیا ہے کہ باہمی نزاعات میں آپ کی ذات پاک مرجع ہوگی اور آپ کا فیصلہ آخری ہوگا۔

آپ کی یہ مرکزی حیثیت کسی مادی طاقت کی بنیاد پر نہیں ہے۔ انصار و مہاجرین کی مٹھی بھر جماعت جو آپ کے ساتھ تھی یہ طاقت نہیں رکھتی تھی کہ مشرکین یثرب اور قبائل یہود کو اس پر مجبور کر دے کہ وہ آپ کو مرکز اور مرجع تسلیم کریں۔ یہ آپ کی پر تقدس شخصیت کا اعجاز تھا کہ مخالفین کے قلوب بھی اس

---

❶ چنانچہ اپنے ہم مشرب یعنی مشرکین مدینہ کو خط لکھا کہ مسلمانوں کو نکال دو یا ان سے جنگ کرو، ورنہ ہم مدینہ پہنچیں گے اور تمہارے جوانوں کو قتل کر دیں گے۔ عورتوں کی آبرو خراب کرینگے (ابوداؤد شریف باب خبر النضیر) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں جلد اول (قریش کی طرف سے یثرب میں مخالف محاذ)

❷ ملاحظہ ہو بخاری شریف ص ۶۵۶ و ص ۹۱۶ و ص ۹۲۴ وغیرہ حدیث اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ جس میں تذکرہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک مجمع کو خطاب فرمانا چاہا تو عبداللہ بن ابی بن سلول نے توہین آمیز انداز سے مخالفت کی۔

❸ جو تمام جہانوں کے لئے رحمت بن کر آیا وہ تو سب کا تھا وہ کسی ایک کا کیسے ہو سکتا تھا۔

اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ آپ سے صرف سچائی، انصاف اور ہمدردی و خیر خواہی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ آپ جیسا شخص کاذب و ظالم نہیں ہو سکتا۔ آپ کی اسی مقبولیت نے جو چند روز میں حاصل ہو گئی تھی آپ کو مرجع اور مرکز بنایا اور آپ کی اسی مقبولیت نے ان کا بھی وزن بڑھا دیا جو آپ کے جاں نثار تھے۔ پھر اس معاہدہ کے ایک ایک لفظ پر نظر ڈالئے کوئی بات بھی ایسی نہیں جس کا انکار کیا جا سکے۔ سچائی، تقویٰ اور نیک کردار کی تاکید بار بار کی گئی ہے جس سے انکار کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

سرپرستانہ حیثیت کے علاوہ (جو نزاع کے وقت مرجع بنے گی) اور کوئی اختیار آپ نے اپنے لئے منظور نہیں کرایا۔

دنیا کی تاریخ نے اس عہد نامہ کو یہ اہمیت دی ہے کہ اس کو "اقدم دستور مسجل فی العالم" (دنیا میں بنیادی حقوق کی سب سے پہلی باقاعدہ دستاویز) بھی کہا گیا۔ لہٰذا ہم اس کو بجنسہ نقل کرتے ہیں۔ اردو داں حضرات کی آسانی کے لئے ہر ایک فقرہ کے سامنے اس کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ فقروں کے شروع میں نمبر عہد نامہ میں نہیں ہیں۔ یہ مترجم کا اضافہ ہے تاکہ منشاء اور مفہوم پوری طرح واضح ہو جائے۔ اس عہد نامہ کی حیثیت ابن ہشام نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

قال ابن اسحاق و کتب رسول اللہ ﷺ کتاباً بین المہاجرین والانصار و وادع فیہ یہود وعاھدھم و اقرھم علیٰ دینھم و اموالھم علیھم وشرط و اشترط لھم

(ترجمہ: فن مغازی کے امام علامہ ابن اسحاق نے بیان فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ایک کتاب (تحریر) لکھی۔ مہاجرین اور انصار کے درمیان اس تحریر میں یہود سے بھی مصالحت کی صورت اختیار کی۔ ان سے معاہدہ کیا اور ان کو اپنے دین پر قائم رکھا اور جو جائیدادیں ان کی تھیں ان پر قائم رکھا۔ کچھ شرطیں ان پر لگائیں اور کچھ شرطیں ان کے لئے تسلیم کیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱) ھٰذا کتاب من محمد النبی رسول اللہ بین المومنین والمسلمین من قریش واھل یثرب ومن تبعھم فلحق بھم وجاھد معھم

"یہ تحریر ہے محمد اللہ کے نبی کی طرف سے جو اللہ کے رسول ہیں قریش کے مومنین و مسلمین اور اہل یثرب کے درمیان اور جو ان کے [1] تابع ہیں اور ان سے الحاق کئے ہوئے ہیں۔ اور کوشش وجدوجہد

[1] نحوی قاعدہ کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ جو اہل یثرب کے تابع اور ان کے ساتھ ہیں۔ اسی عہد نامہ کے دوسرے حصہ میں یہود کا تذکرہ ہے اس میں یہود بنی النجار، یہود بنی الحارث وغیرہ کے الفاظ میں جن سے اسی کی تائید ہوتی ہے یعنی بنی النجار کے ساتھ جو یہود ہیں انہیں یہود بنی النجار کہا گیا ہے باقی دوسری صورت کہ یہ معنیٰ لئے جائیں کہ جو یہود مسلمانوں کے تابع ہیں وہ

میں ان کے ساتھ ہیں۔

(۲) انّھم امۃً واحدۃ دون الناس

"یہ کہ یہ سب (اپنے ماسوا) تمام انسانوں کے مقابلہ میں ایک امت ❷ ہونگے"

(۳) المھاجرون من قریش علی ربعتھم۔ ❸

"قریش کے وہ افراد جو ہجرت کر کے آئے ہیں وہ اپنے حال پر بدستور رہیں گے۔ ان کی آزادی اور ان کے حقوق بدستور رہیں گے۔"

یتعاقلون بینھم وھم تفدون عانیھم بالمعروف والقسط بین المسلمین

"قصاص وخون بہا اور دیت کے متعلق جو ان کا دستور ہے اور جو ان کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے ان کا کوئی شخص قید ہوگا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کرینگے (کوئی حلیف اس کا ذمہ دار نہیں ہوگا) یہ تمام باتیں اس طرح ہونگی کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ طے کیا جائے گا۔"

(۴) وبنوعوف علی ربعتھم یتعاقلون معاقلھم الاولیٰ کل طائفۃ تفدی عانیھا بالمعروف والقسط بین المومنین۔

بنو عوف کی آزادی اور ان کے حقوق بدستور رہیں گے۔ قصاص، خون بہا اور دیت کے متعلق جو ان کا دستور ہے اور جو ان کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے۔ ان کا کوئی شخص قید ہوگا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کریں گے۔ یہ تمام باتیں اس طرح ہونگی کہ مسلمانوں کے ساتھ عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ کیا جائے۔

پھر اسی طرح قبائل بنو الحارث، بنو ساعدہ، بنو جشم، بنو النجار، بنو عمرو بن عوف، بنو بنیت، بنو الاوس کے نام لئے گئے ہیں اور ہر ایک قبیلہ کے نام کے ساتھ یہ صراحت کر دی گئی ہے جو مہاجرین اور بنو عوف کے لئے کی گئی ہے کہ ان کی آزادی اور ان کے حقوق بدستور رہیں گے۔ قصاص۔ خون بہا اور دیت کے متعلق جو ان کا دستور ہے اور جو ان کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے۔ ان کا کوئی شخص قید ہو جائے گا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کریں گے۔ یہ تمام باتیں اسی طرح ہوں گی کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ کیا جائے گا۔

نحوی لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہیں اور عہد نامہ کے سیاق اور پرداخت کے بھی مخالف ہے۔ علاوہ ازیں جو یہود مسلمانوں کے ساتھ ہوں ان کو ایک علیحدہ فقرہ (۱۱) میں بیان کیا گیا ہے۔

❷ گروہ، قوم، جماعت یعنی اگر مذہبی آزادی حاصل رہے تو مسلمان دوسری قوم یا گروہ کے ساتھ مل کر امۃ واحدہ ہو سکتے ہیں۔

❸ ربعتھم کعبۃ ای حالۃ حسنۃ وامرھم الذی کانوا علیہ (قاموس)

(۵) ان المومنین لا یترکون مفرحاً[1] ان یعطوہ بالمعروف فی فداء اوعقل

یہ کہ مسلمان کسی ایسے شخص کو جو قرض میں دبا ہو اکثر العیال ہو اس بات سے نہیں چھوڑیں گے (محروم نہیں کرینگے) کہ اس کو اچھی طرح عطیہ دیں۔ فدیہ یا دیت کے سلسلہ میں[2]

(۶) وان لا یحالف مومن مولیٰ مومن دونہ

اور یہ کہ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہو گا کہ وہ کسی مسلمان کو نظر انداز کر کے اس کے حلیف سے معاہدہ کرلے (جو مسلمان پہلے سے حلیف ہے اس کو بھی اس معاہدہ اور عہد وپیمان میں شریک رکھنا ہو گا)

(۷) وان المومنین المتقین ایدیھم علی کل من بغی منھم اوابتغی[3] دسیعۃ ظلم۔ اواثم اوعدوان اوفساد بین المومنین وان ایدیھم علیہ جمیعاً ولوکان ولد احدھم

اور یہ کہ اہل تقویٰ مومنین سب کی طاقت متحد رہے گی، اس شخص کے مقابلہ میں جو ان سے بغاوت کرے (ان پر ظلم وزیادتی کرے) یا ظالمانہ طریقہ پر ان سے وصول کرنا چاہے، یا مسلمانوں کے آپس میں گناہ، ظلم یا فساد پھیلانا چاہے۔ ایسے شخص کے مقابلہ میں ان کی طاقت متحد رہے گی خواہ (وہ ظالم) کسی کا اپنا لڑکا ہی ہو۔

(۸) ولا یقتل مومن مومنا فی کافر ولا یُنصر کافر علی مومن

"یہ کہ کوئی مومن کسی مومن کو کسی کافر کی حمایت[4] میں قتل نہیں کرے گا۔ نہ کسی کافر کی کسی مومن کے مقابلہ میں مدد کی جائے گی۔"

---

[1] المفرح المثقل من الدین الکثیر والعیال (ابن ہشام ص ۳۰۲ ج ۱)

[2] یعنی اگر کوئی مقروض اور کثیر العیال مسلمان ہو اور اس پر کسی سلسلہ میں فدیہ یا دیت لازم ہو جائے تو مسلمانوں کو حق ہو گا کہ وہ اچھی طرح اس کی امداد کریں اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو عام مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس امداد کا حق ہو گا اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا موقع نہیں ہو گا۔ (واللہ اعلم)

[3] ای ابتغیٰ منھم ان یدفعوالیہ علی وجہ ظلمھم ای کونھم مظلومین (مجمع البحار)

[4] حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ مکہ کے مشہور رئیس، دشمن اسلام امیہ بن خلف سے کاروباری سلسلہ میں معاہدہ کئے ہوئے تھے۔ غزوہ بدر میں حضرات انصار نے امیہ بن خلف کا تعاقب کیا۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس کو بچانا چاہا اس میں خود ان کو بھی تلوار لگ گئی اور زخمی ہو گئے مگر مجاہدین انصار نے امیہ کو قتل کر ہی دیا۔ (بخاری شریف ص ۳۰۸) اب اگر امیہ کے حامی ان انصار سے قتل امیہ کا بدلہ لینا چاہتے (جیسا کہ قاعدہ تھا، بلکہ ضروری سمجھا جاتا تھا) اور اس سلسلہ میں معاہدہ کی بنا پر یا کسی اور تعلق کی بنا پر حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ سے مدد چاہتے تو معاہدہ کی اس دفعہ کے بموجب حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ کے لئے جائز نہ تھا کہ وہ حامیانہ امیہ بن خلف کی امداد کرتے۔ اس دفعہ کے معنیٰ یہ بھی لئے گئے ہیں کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کو کسی کافر کے مقابلہ میں قتل کرنے کا مجاز نہ ہو گا۔ مگر اس مفہوم کے لئے لفظ "بکافر" ہونا چاہئے تھا۔ یہاں "فی کافر" ہے فی کافر کی صورت میں معنے وہی ہو سکتے ہیں جو ترجمہ میں لکھے گئے۔ علاوہ ازیں میدان جنگ یا دار الحرب میں تو بیشک یہی ہے مگر دار الاسلام میں یہ حکم نہیں ہے وہاں اگر مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دے تو امام اعظم رحمہ اللہ کا مسلک یہی ہے کہ مسلمان کو ذمی کافر کے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

(۹) وان ذمة الله واحدة يجير عليهم ادناهم
یہ کہ اللہ کی ذمہ داری (پناہ) ایک ہے (یعنی اللہ کے نام پر جو ذمہ داری لی جائیگی اس کا احترام تمام مسلمانوں پر لازم ہو گا) پناہ دے سکتا ہے مسلمانوں کی ذمہ داری پر سب سے معمولی درجہ کا مسلمان بھی۔ [1]

(۱۰) وان المومنين بعضهم مولى بعض دون الناس
اور یہ کہ ہر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا ولی ہو گا (معاہدہ صلح وجنگ میں شریک ہو گا) یہ ولایت غیر مسلم کو حاصل نہیں ہو گی۔

(۱۱) وانه من تبعنا من يهود فان له النصر الاسوة غير مظلومين ولا متناصر عليهم
اور یہ کہ جو یہودی ہمارے ساتھ ہوں گے ان کی مدد کی جائے گی۔ ان کے ساتھ ہمدردی کی جائے گی وہ مظلوم نہیں ہونگے نہ ان کے ساتھ انتقامی [2] کارروائی کی جائے گی۔

(۱۲) وان سلم المومنين واحدة لا يسالم مومن دون مومن فی قتال فی سبيل الله الاعلى سواء وعدل بينهم
اور یہ کہ مسلمانوں کی صلح ایک ہے۔ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے بغیر قتال فی سبیل اللہ (راہ خدا میں جنگ) کے سلسلہ میں صلح نہیں کر سکتا مگر اس صورت میں کہ مساوات ہو اور آپس میں پوری طرح انصاف ہو (جب کسی معمولی مسلمان کے عہدو پیمان کو بھی یہ اہمیت ہے کہ وہ سب مسلمانوں کا عہدو پیمان مانا جاتا ہے تو مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ صلح یا عہد و پیمان ایسی صورت سے کرے جس میں حقوق کی مساوات اور سراسر عدل و انصاف ہو۔ اگر اس میں کوتاہی کی ہے تو صرف اپنے حق میں نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے حق میں کوتاہی ہے [3]) واللہ اعلم

(۱۳) وان كان غازية غزت معنا يعقب بعضها بعضا [1]
"اور یہ کہ مجاہدین (غازیوں) کی جو جماعت ہمارے ساتھ (ہمارے نظام کے ماتحت) غزوہ کریگی اس کا غزوہ نمبروار ہو گا۔ ایک ہی جماعت (فوج) مسلسل نہیں جائے گی بلکہ اگر ایک مرتبہ جاچکی ہے تو اب دوسری جماعت جائے گی۔ اس کے بعد اپنے نمبر پر یہ جاسکے گی۔"

---

[1] یعنی اگر معمولی درجہ کا مسلمان جو ذمہ دارانہ حیثیت نہیں رکھتا، نہ افسر ہے نہ عہدیدار، عام مسلمان میں سے ایک ہے وہ بھی کسی غیر مسلم کو پناہ دیدے یا اس سے کوئی معاہدہ کرلے تو تمام مسلمانوں پر اس کی پابندی ضروری ہو گی۔

[2] یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کے بر خلاف ان کے مخالفین کی مدد نہیں کی جائے گی۔

[3] اس کے باوجود افسر اعلیٰ کو مسترد کرنے کا حق نہیں ہے۔ وہ مسترد اسی وقت کر سکتا ہے جب ایسا عہدو پیمان ہو جس میں سراسر معصیت ہے، کسی حرام کو جائز یا حلال کو حرام قرار دے دیا گیا ہو۔ تفصیلات کتب فقہ میں ہیں۔

[1] ای يكون الغزوة بينهم نوباً فاذا خرجت طائفة ثم عادت لم تكلف ان تعيد ثانية حتى يعقبها اخرى غيرها (مجمع البحار تحت کلمۃ عقب)

(۱۴) وان المومنین یبی ءُ بعضهم بعضاً بمانال دماءهم فی سبیل الله

"اور یہ کہ مسلمان ایک دوسرے کے برابر ہو گا۔ اس (امتحان کی بنا پر جو پیش آیا ہو گا ان کے خونوں کو اللہ کی راہ میں۔ یعنی جانی قربانی معیار ہے فرق مراتب اسی معیار پر ہو گا جنکی قربانیاں مساوی ہیں ان کا درجہ بھی مساوی ہو گا۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ قبائل میں جو فرق مراتب ❷ پہلے تھا اب وہ قابل تسلیم نہیں ہو گا۔ جب تک قربانیاں بھی اس درجہ کی نہ ہوں۔"

(۱۵) وان المومنین المتقین علی احسن هدی واقومه

اور یہ مومن متقی بہت بہتر طور وطریق اور نہایت مضبوط اصول پر قائم رہیں گے (اہل ایمان اور اہل تقویٰ کا فرض ہو گا کہ ان کے اطوار بہتر اور ان کے اصول واخلاق مضبوط ہوں)

(۱۶) وانه لایجیر مشرك مالا لقریش ولا نفسا ولا یحول دونه علیٰ مومن

اور یہ کہ کوئی مشرک قریش کے کسی مال کی ذمہ داری نہیں لے گا نہ کسی قریش کی جان کی ضمانت کرے گا (پناہ دیگا) نہ کسی قریش کی حمایت میں کسی مسلمان کے آڑے آئے گا۔

(۱۷) وانه من اعتسبط مومناً قتلاً عن بینة فانه قود بها الا ان یرضی ولا المقتول بالعقل وان المومنین علیه کافة ولا یحل لهم الاقیام علیه

جو شخص کسی بے قصور مسلمان کو قتل کر دیگا جس کا بینہ (باقاعدہ) شہادت موجود ہو تو اس کے قصاص میں ماخوذ ہو گا۔ (جان کے بدلہ جان دینا ہو گی) البتہ اگر مقتول کے وارث خون بہا پر راضی ہو جائیں تو خون بہا دینا ہو گا اور تمام مسلمانوں کو جماعتی حیثیت میں اس اصول کو نافذ کرنا ہو گا جب تک اس پر عمل نہ ہو جائے کسی اور کام میں مشغول ہو جانا مسلمانوں کے لئے درست نہ ہو گا۔

(۱۸) انه لایحل لمومن اقر بما فی هٰذه الصحیفة وآمن بالله والیوم الاخر ان ینصر محدثا ❷ اویوویه وانه من نصره او اٰواه علیه لعنة الله وغضبه یوم القیٰمة لایوخذ منه صرف ولا عدل

اور یہ کہ جائز نہیں ہو گا کسی صاحب ایمان کے لئے جو اس دستاویز کے مضمون کا اقرار کرے اور جو اللہ

---

❷ چنانچہ پہلے قبائل بنی تمیم، بنی اسد، بنی عامر افضل مانے جاتے تھے اور ان کے مقابلہ میں قبائل جهینہ، مزینہ، مسلم اور غفار کا درجہ کم تھا، مگر چونکہ یہ قبائل پہلے ہی اسلام سے مشرف ہوئے اور حضرات انصار ومہاجرین کے ساتھ خدمات انجام دیں تو آنحضرت ﷺ نے ان کی فضیلت بیان فرمائی۔ ارشاد ہوا: قریش والانصار وجهینه ومزینه واسلم وغفار واشجع میرے مددگار ہیں اور اللہ اور رسول ان کے مددگار ہیں۔ اللہ اور رسول کے علاوہ ان قبائل کا اور کوئی مددگار نہیں ہے۔ (بخاری شریف باب ذکر اسلم وغفار مزینہ وجہنہ واشجع ص ۴۹۸)

❷ محدثا۔ دال پر زیر جنایت کرنے والا (مجمع البحار) یہ کوئی فتنہ اٹھانے والا، سازش کرنے والا بھی ہو سکتا ہے اور بدعتی یعنی کسی بدعت کا ایجاد کرنے والا بھی ہو سکتا ہے اور اگر دال پر زبر ہو تو مراد فتنہ یا بدعت ہو گی اور یہ مطلب ہو گا کہ کسی صاحب ایمان کے لئے جائز نہیں ہو گا کہ کسی فتنہ کو پسند کرے اور اس کو بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دے۔ وایوءہ الرضا عنہ وصبرہ علیہ واقرار فاعلہ (مجمع البحار)

اور قیامت کے دن پر ایمان لائے یہ کہ کسی فتنہ پرداز کی مدد کرے یا کسی فتنہ اٹھانے والے کو پناہ دے (اپنے یہاں ٹھیرائے)۔ اور جو اس کی مدد کرے گا اور اس کو پناہ دیگا (ٹھیرنے کا موقع دیگا) اس پر اللہ کی لعنت خدا کا غضب، قیامت کے روز نہ اس کی توبہ قبول ہو نہ فدیہ (کفارہ) [2]

(۱۹) وانکم مهما اختلفتم فیه من شیئ فان مرده الی الله والی محمد

اور یہ کہ جب بھی اس عہد نامہ کی کسی بات میں اختلاف کرو تو مرجع اللہ ہو گا اور محمد ﷺ اس کا فیصلہ ذات اقدس محمد ﷺ کے حوالہ ہو گا جو اس عہد نامہ کے بانی اور معاہدہ کرنے والوں کے سرپرست ہیں۔ اور آپ سے ہی فیصلہ کی اپیل ہو گی۔

(۲۰) وان الیهود ینفقون مع المومنین ماداموا محاربین

جب تک کسی جنگ کا سلسلہ رہے تو مصارف جنگ مسلمانوں کے ساتھ یہود کو بھی برداشت کرنے ہوں گے۔

(۲۱) وان یهود بنی عوف امة مع المومنین للیهود دینهم وللمسلمین دینهم۔ موالیهم و انفسهم الامن ظلم او اثم فانه لایوقع الانفسه و اهل بیته

اور یہ کہ بنی عوف کے یہودی اور مسلمان ایک امت ہونگے۔ یہود کے لئے ان کا دین ہو گا اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین۔ اپنے اپنے مذہبوں میں آزاد رہتے ہوئے تیسرے کے مقابلہ میں ایک متحدہ طاقت ہونگے۔ اور جو ان کے موالی ہیں آزاد کردہ غلام یا ان کے حلیف اور وہ خود ان سب کے لئے یہی ہے (کہ وہ اپنے دین پر) مگر وہ شخص جو ظلم کرے۔ کیونکہ ایسا شخص خود اپنے آپ کو اور اپنے اہل بیت (متعلقین) ہی کو برباد کرے گا۔ (اس بربادی کی ذمہ داری خود اس پر ہو گی)۔

(۲۲) وان لیهود بنی النجار مثل مالیهود بنی عوف

یہود بنی نجار کے لئے بھی وہی شرطیں اور وہی حقوق ہیں جو یہود بنی عوف کے بیان کئے گئے۔

(۲۳) اس کے بعد یہود بنی الحارث، یہود بنی ساعدہ، یہود بنی جشم، یہود بنی الاوس، یہود بنی ثعلبہ کا نام لیا گیا ہے اور ہر ایک کے متعلق یہ الفاظ دہرائے گئے ہیں۔ مثل مالیهود بنی عوف، ان کو وہی حقوق حاصل ہونگے جو یہود بنی عوف کے حقوق ہیں۔

آخر میں یہ ہے:

الامن ظلم او اثم فانه لایوقع الانفسه واهل بیته

مگر وہ شخص جو ظلم کرے یا کوئی جرم کرے کیونکہ ایسا شخص خود اپنے آپ کو اور اپنے بیت (متعلقین) کو برباد کردیگا اس بربادی کی ذمہ داری خود اس پر ہو گی۔

---

[2] یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ نہ اس کی نفل عبادت قبول ہو نہ فرض۔ (مجمع البحار)

(۲۴) پھر یہ چند تشریحی اور توضیحی دفعات ہیں:

(الف) وان جفنة بطن من ثعلبة

(الف) یہ کہ جفنہ، ثعلبہ کا بطن (ضمنی قبیلہ) ہے۔

(ب) وان لبنی الشطینة مثل مالیهود بنی عوف و ان البردون الاثم

(ب) یہ کہ بنی شطنہ کے وہی حقوق ہیں جو یہود بنی عوف کے (تسلیم کئے گئے) اور یہ کہ ہر (نیکی اور بھلائی) نصب العین اور اصول کار ہو گا گناہ اور جرم نہیں۔

(ج) وان موالی ثعلبه كانفسهم

(ج) قبیلہ ثعلبہ کے موالی (حلیف آزاد کردہ غلام) کی حیثیت، خود بنی ثعلبہ جیسی ہو گی۔

(د) وان بطانة [1] یهود كانفسهم

(د) یہود کے اہل وعیال ان کے خواص اور ماتحت خاندانوں اور افراد کی حیثیت خود یہود جیسی ہو گی (ان کے وہی حقوق ہونگے جو یہود کے ہیں)۔

(ہ) وانه لایخرج منهم احد الا باذن محمد

(ہ) اور یہ کہ جو جس کے ماتحت یا جس کے ساتھ ہے وہ اس سے علیحدہ نہیں ہو گا مگر محمد ﷺ کی اجازت سے

(۲۵) وانه لاینحجز علی ثار جرح

اور یہ کہ نہیں بندش لگائے گا کوئی زخم کے قصاص (زخم کے بدلے میں زخم) پر [2]۔

(۲۶) وانه من فتك فبنفسه واهل بيته الامن ظلم وان الله علی ابر هذا

"جو کسی کو بے خبری میں دھوکہ سے مار دے اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے، اور اس کے اہل بیت پر، مگر وہ شخص جس نے ظلم کیا ہو اور ہم اللہ کو حاضر ناظر جان کر عہد کرتے ہیں کہ خوبی اور پوری ذمہ داری کے ساتھ ان شرائط پر عمل کریں گے۔"

(۲۷) وان علی الیهود نفقتهم وعلی المسلمین نفقتهم

"اور یہ کہ یہود اپنے مصارف کے ذمہ دار ہوں گے اور مسلمان اپنے مصارف کے۔ (جو اس عہدنامے کی شرطوں کو پورا کرتے ہیں، کرنے پڑیں گے۔"

(۲۸) وان بینهم النصر علی من حارب اهل هذه الصحیفة

"اور یہ کہ جو فریق اس معاہدہ میں شریک ہیں وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے ان کے

---

[1] بطانة الرجل اهله وخاصته وصاحبه (قاموس)

[2] ا۔ جب کہ توریت کا حکم تھا کہ زخم کے بدلہ میں اسی جیسا زخم، اس اصول کو ختم نہیں کیا جائے گا۔

مقابلہ میں جو ان معاہدہ کرنے والوں سے جنگ کرینگے۔"

(۲۹) وان بینهم النصح والنصیحة والبردون الاثم وانه لایاثم امرء بحلیفه و ان النصر للمظلوم۔

"اور یہ کہ اس معاہدہ کے تمام فریق آپس میں ایک دوسرے کی خیر خواہی کرینگے، ایک دوسرے کو اچھی باتوں کی ہدایت کرینگے، نیک کردار رہیں گے جرم اور گناہ نہیں کرینگے۔ اور یہ کہ کوئی شخص اپنے حلیف کے ساتھ مجرمانہ فعل نہیں کریگا۔ اور یہ کہ مظلوم مستحق۔ مدد ہو گا۔"

(۳۰) وان الیهود ینفقون مع المومنین ماداموا المحاربین

"اور یہ کہ جب تک کوئی جنگ ہو گی تو مسلمانوں کے ساتھ یہود بھی خرچہ جنگ برداشت کرینگے۔"

(۳۱) وان یثرب حرام جرفها لاهل هذه الصحیفة

"اور یہ کہ وہ پورا علاقہ جو حدود یثرب میں ہے ان سب کے لئے واجب الاحترام (محفوظ علاقہ) ہو گا جو اس عہد نامہ میں شریک ہیں۔"

(۳۲) وان الجار کالنفس غیر مضار ولا اثم

"اور یہ کہ پڑوسی کو خود اپنی جان کی برابر سمجھا جائے گا، نہ اس کو نقصان پہنچایا جائیگا نہ اس کے ساتھ کوئی مجرمانہ فعل کیا جائے گا۔"

(۳۳) وانه لاتجار حرمة الا باذن اهلها

"اور یہ کہ نہیں حفاظت اور پناہ میں لیا جائے گا کسی خاتون کو مگر اس کے اہل (ذمہ دار) کی اجازت سے"❶

(۳۴) وانه ماکان بین اهل هذه الصحیفة من حدث او اشتجار یخاف فساده فان مرده الی الله والی محمد رسول الله ﷺ وان الله علی اتقی مافی هذه الصحیفة وابره

"اور یہ کہ اس عہد نامہ کے فریقوں کے درمیان جو کوئی نئی بات پیش آئے یا کوئی نزاع ہو جس سے فساد کا خطرہ ہو تو اس میں اللہ اور محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا اور یہ کہ ہم سب اللہ کو حاضر وناظر جان کر عہد کرتے ہیں کہ جو کچھ اس عہد نامہ میں ہے اسکی پوری پابندی کرینگے اور اس کو نیکی اور بھلائی کے ساتھ پورا کرینگے۔"

(۳۵) وانه لاتجار قریش ولا من نصرها

"اور یہ کہ نہ قریش کو پناہ دی جائے گی نہ اس کو جو قریش کی مدد کرے۔"

(۳۶) وان بینهم النصر علی من دهم❷ یثرب

---

❶ مکہ کے مشرکین قریش اس معاہدہ میں داخل نہ تھے۔ لہذا جب صلح حدیبیہ کے بعد ان کی عورتیں مسلمان ہو کر مدینہ منورہ پہنچیں تو ان کو پناہ میں لے لیا گیا۔

❷ دھمک غشیک (القاموس)

”اور یہ کہ اس عہد نامہ کے تمام شریک ایک دوسرے کی مدد کریں گے، اس کے مقابلہ میں جو یثرب پر چڑھ آئے (حملہ کرے)“

(۳۷) وانہ اذادعوا الی صلح یصالحونہ ویلبسونہ فانھم یصالحونہ ، ویلبسونہ، وانھم اذا دعوا الی مثل ذلک فانہ لھم علی المومنین الامن محارب فی الدین

”اور یہ کہ اس عہد نامہ کے جملہ فریق جب (مسلمانوں کی طرف سے) ان کو کسی کے ساتھ صلح کرنے کی دعوت دی جائے گی وہ صلح کرینگے اور صلح پر عمل کرینگے اور یہ کہ جب مسلمانوں کو اسی جیسی صلح کی دعوت دی جائے تو وہ بھی صلح کرینگے۔ مسلمانوں پر یہ انکا حق ہوگا مگر یہ کہ کسی سے دین کے بارے میں جنگ ہو رہی ہو (مذہبی جنگ ہو)

(۳۸) علی کل اناس حصتھم من جانبھم الذی قبلھم

اور یہ کہ ہر فریق پر اس حصہ کی ذمہ داری ہے جو اس کی جانب میں ہے۔

وان یہود الاوس موالیھم وانفسھم علیٰ مثل مالاھل ھذہ الصیحفتہ مع البر المحض من اھل ھذہ الصحیفۃ وان البر دون الاثم لایکسب کاسب الاعلی نفسہ وان اللہ علی اصدق مافی ھذہ الصحیفۃ وابرہ۔

اور یہ کہ قبیلہ اوس کے یہود ان کے موالی (حلیف یا آزاد کردہ غلام) ان کو وہی حقوق ہونگے جو اس عہد نامہ کے تمام فریقوں کو ہونگے، پوری نیک کرداری اور مخلصانہ بھلائی کے ساتھ۔ نیک کرداری ہی ہمارا اصل اصول ہوگا۔ مجرمانہ فعل (سے کوئی تعلق نہیں ہوگا) ہر ایک عمل کرنے والا اپنے عمل کا ذمہ دار ہوگا (اس کے فعل کو کسی دوسرے پر نہیں ڈالا جاسکے گا) اور اللہ تعالیٰ کو ہم حاضر وناظر جان کر یہ عہد کرتے ہیں کہ جو کچھ اس دستاویز میں لکھا گیا ہے اس پر پوری سچائی سے اور نیک کرداری کے ساتھ عمل کرینگے۔

(۴۰) وانہ لایحول ھذا الکتاب دون ظالم واثم وانہ من خرج امن ومن قعد امن بالمدینۃ الامن ظلم واثم وان اللہ جار لمن بر والتقیٰ ومحمد رسول اللہ ﷺ

اور یہ کہ یہ تحریر کسی ظالم اور مجرم کیلئے آڑ نہیں بنے گی۔ جو مدینہ سے باہر ہو وہ بھی امن میں اور جو اندر رہے وہ بھی امن میں رہے گا۔ مگر یہ کہ وہ ظلم کرے یا مجرمانہ حرکت کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کا محافظ ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ اس کے محافظ ہیں جو نیک کردار رہ کر پوری پابندی کے ساتھ اس پر عمل کرے۔

تحویل قبلہ، انقلاب عظیم

سب سے افضل امت۔ سب سے افضل قبلہ

جھنڈا قوم بناتی ہے۔ کسی قوم کی قومیت جھنڈے سے نہیں بنتی۔ البتہ جھنڈا نشان قومیت بن جاتا ہے۔ جھنڈے کے رنگ یا وضع قطع کا کوئی فطری تعلق قوم کی فطرت سے نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ روایات کا لحاظ وضع اور رنگ کے انتخاب کے وقت رکھا جاتا ہے۔ پھر وہ جھنڈا خود پیکر روایات اور نشان عظمت بن جاتا ہے۔ اس کی سربلندی یا سرنگونی قسمت۔ قوم کا فیصلہ سمجھی جانے لگتی ہے۔

تقریباً یہی شان عبادت اور عبادت کرنے کے رخ قبلہ کی ہے۔ عبادت یعنی بندگی، نیاز مندی، عاجزی اور فروتنی کا تعلق، اندرونی احساس اور قلب و ضمیر سے ہے۔ نہ پورب [1] سے ہے نہ پچھم سے۔ نیکی [2] اور بھلائی شرافت، حسن اخلاق اور خوبی کردار کا نام ہے۔ نیکی یہ نہیں ہے کہ مشرق کی طرف منہ کرلیں یا مغرب کی طرف مگر یہ ایک عبادت گذار (حتیٰ کہ وہ بھی جو مانتا ہے) کہ جس کی وہ عبادت کر رہا ہے وہ کسی ایک رخ یا کسی ایک جگہ میں نہیں ہے وہ لامکان و لازمان ہے۔ ہر جگہ ہے، اور ہر طرف ہے۔ عبادت کے لئے ایک رخ مقرر کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ کیونکہ جس طرح عمل کی پابندی کے لئے وقت کا مقرر کرنا ضروری ہے ایسے ہی دل کے جماؤ اور توجہ کے ٹھہراؤ کیلئے بھی رخ کا مقرر کرنا ضروری ہے اور

---

[1] ارشاد خداوندی ہے وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ الآیتہ اللہ ہی کا ہے پورب اور اللہ ہی کا پچھم۔ جس طرف بھی رخ کرلو وہاں اللہ ہے۔ (سورہ بقرہ ۔۱۱۵)

[2] لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ (الآیتہ) یعنی نیکی اور بھلائی یہ نہیں کہ تم اپنے چہرے پھیر لو، پورب کی طرف یا پچھم کی طرف۔ ہاں نیکی اور بھلائی اور حسن کردار اس کا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب (وحی الٰہی) پر اور نبیوں پر، پھر اس ایمان کے تقاضے کو پورا کیا کہ جب کہ مال کی ضرورت تھی کہ وہ تندرست تھا، دنیاوی زندگی کا میدان اس کے سامنے تھا، اس نے اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال کر دیا، مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو اور مسافر کو اور سائلین کو اور گردنوں کے (چھڑانے) میں۔ اور برپا کیا نماز کو (پوری شان کے ساتھ نماز باجماعت ادا کی) زکوٰۃ ادا کی اور وہ جو پورا کریں عہد جب عہد کرلیں اور جو صبر کرنے والے ہیں سختی اور شدت میں اور خوف وہراس کے وقت (آیت ۱۷۷ سورہ بقرہ)

افراد قوم میں یکجہتی بھی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب سب کی عبادت ایک ہی طرف ہی رخ پر ہو۔ [1]

مکہ کے مشرک اگرچہ سر نیاز بتوں کے سامنے خم کرتے تھے۔ مگر ان کے تحت الشعور میں یہ تھا کہ ان کا قبلہ "کعبہ" ہے جس کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام نے رکھی تھی۔ جس کی تجدید حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند رشید حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کی، جو ہمارے مذہبی پیشوا بھی ہیں اور خاندانی مورث اعلیٰ بھی ۔

اہل شرک اور بت پرستوں کے بالمقابل اہل کتاب (یہودی اور نصرانی) تھے جن کا قبلہ بیت المقدس یا بیت اللحم تھا۔ سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم عبادت کے لئے اٹھے تو اگرچہ کعبہ کو آپ نے نظر انداز نہیں فرمایا۔ مگر آپ نے قبلہ اس کو بنایا جو تقریباً ڈھائی ہزار سال سے انبیاء علیہم السلام کا قبلہ چلا آرہا تھا۔ حرم کعبہ میں آپ نماز پڑھتے تو کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر رخ شمال کی طرف کرتے تھے یعنی وہ قبلہ بھی آپ کے سامنے رہتا تھا۔ جو آل اسماعیل علیہ السلام کا قبلہ تھا اور وہ قبلہ بھی سامنے ہوتا جو بنی اسرائیل کا قبلہ تھا۔ لیکن جب آپ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو یہاں یہ اجتماع قبلتین ممکن نہیں تھا، کیونکہ مکہ یہاں سے جنوب میں تھا اور بیت المقدس شمال میں، لامحالہ آپ نے انبیاء علیہم السلام کے ڈھائی ہزار سالہ قبلہ ہی کو اختیار فرمایا۔ چنانچہ مسجد کی تعمیر کی تو اسی دیوار کو دیوار قبلہ قرار دیا جو بیت المقدس کی جانب تھی (شمالی دیوار)، لیکن سوال یہ تھا کہ اس دین کیلئے جو حق و باطل کے لئے فرقان عظیم ہے خالص اور نکھری ہوئی توحید جس کی بنیاد ہے، جس کی تعلیم میں یہ قوت ہے کہ کبھی اس کے منسوخ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آسکتی جو ابدالآباد تک باقی رہنے والا کامل و مکمل دین ہے اس کا قبلہ بھی بیت المقدس رہے جو اہل شرک کا قبلہ تو بیشک نہیں ہے۔ مگر جو اس سے وابستہ ہیں وہ خود اتحاد اور یک جہتی سے محروم دو ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہودی اور عیسائی ہر ایک ٹکڑی دوسرے کی تردید کر رہی ہے اور جہاں تک اخلاق و کردار کا تعلق ہے تو اخلاق و کردار میں اہل شرک کے ہمدوش ہیں، بلکہ کچھ آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ قتل انبیاء کے دھبے بھی ان کے دامن پر نمایاں ہیں۔ اور اگر قبلہ بدلا جاتا تو قبلہ کا مسئلہ صرف ایک رخ کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک مرکز کا مسئلہ بھی ہے۔ حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور تک حق پرستی، توحید، دعوت الی اللہ، ہدایت و ارشاد یعنی مذہبی اور روحانی رہنمائی کا فریضہ بنو اسرائیل کے سپرد رہا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بیشمار انعامات ان پر ہوتے رہے۔ بنو اسرائیل کا دینی مرکز بیت المقدس تھا۔ اب سوال یہ بھی تھا کہ دعوت و ارشاد کی مرکزیت، جس کو اصطلاحاً امامت، اور خلافت الٰہیہ کہا جاتا ہے کیا اسی قوم کے سپرد رہے گی یا اس میں تبدیلی ہوگی۔ اگر تبدیلی ہوگی تو کیوں اور تبدیلی کے بعد جس قوم کو یہ

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ عرف تفسیر کبیر

امامت سپرد ہوگی تو کیا اس کا قبلہ بھی یہی رہے گا یا اس کو بھی بدلا جائے گا۔ اور اگر بدلا جائے گا تو کیوں؟

ان سوالات کے جوابات عقل و قیاس یا جذبات کی منطق سے نہیں دیئے جاسکتے تھے۔ کیونکہ کسی فرد یا قوم کو امامت نوع انسان کا درجہ خدا ہی کی طرف سے سپرد ہوتا ہے اور یہ کہ خدا پرست پرستش کے وقت اپنا رخ کس طرف کریں۔ یہ بھی وہی بتا سکتا ہے جس کی خوشنودی کے لئے پرستش کی جاتی ہے۔ لیکن ایک سربراہ کو انقلاب کے موقع پر جب مختلف سوالات (اور خصوصاً جب ایسے سوالات در پیش ہوں جن کا تعلق خود انقلاب اور مقصد انقلاب سے ہو) جو تردد اور تشویش ہو سکتی ہے، اس سے کہیں زیادہ تردد اس ہادی اعظم کو در پیش تھا جو اس لئے دنیا میں آیا تھا کہ طالبان حق کو ہدایت وارشاد کی آخری منزل طے کرائے اور ان کے لئے ایسا راستہ معین کر دے کہ زمانہ کی کوئی بھی گردش اس میں کجی یا ناہمواری پیدا نہ کر سکے۔ اس لئے وہ بار بار اس سمت کی طرف نظر اٹھاتا جس سمت سے عقدہ کشائی کی توقع تھی۔ ہادئ برحق کے تردد کا عکس ان ❶ پر بھی پڑ رہا تھا جو اس کے لئے اس لئے وابستہ ہوئے تھے کہ ذہنی تشویش و تردد کو اطمینان سے بدلیں اور وہ نور حاصل کریں جو نہ صرف دنیا کی تاریکیوں میں بلکہ ظلمات محشر میں بھی ان کے لئے شمع راہ ہو۔

اشارے:

چند سال پہلے محمد رسول اللہ ﷺ کو وہ شرف اعظم حاصل ہو چکا تھا جو نہ صرف نوع انسان بلکہ حق یہ ہے کہ پوری کائنات میں نہ آج تک کسی کو میسر آیا تھا نہ آئندہ آنے والا تھا۔ یعنی آپ شب معراج میں اس بلند ترین مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں تک نہ کسی نبی مرسل کی رسائی ہوئی تھی نہ کسی ملک مقرب کی۔ جبرئیل امین علیہ السلام اس سے بہت نیچے درماندہ رہ کر یہ معذرت کر چکے تھے۔

اگر یک سر موئے بالا پرم   فروغ تجلی بسوزد پرم

اس عروج و سیر میں آپ نے بیت معمور ملاحظہ فرمایا تھا جس کے گرد ہر روز ستر ہزار فرشتے مصروف طواف ہوتے ہیں۔ ❷ وہیں بانی ملت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تھی کہ آپ بیت معمور سے تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ ❸ اسی سیاحت قدسی میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں پھر عرش معلیٰ کی اسی سیاحت سے واپسی میں یہ ہوا تھا کہ جب بیت المقدس میں نزول اجلال ہوا تو تمام انبیاء اور مرسلین صف

---

❶ صحابہ کرام کے تردد اور انتظار و اشتیاق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تبدیلی قبلہ کی خبر جس کو پہنچی اور جس حالت میں پہنچی فوراً عمل شروع کر دیا۔ جو صحابہ نماز پڑھ رہے تھے انہوں نے نماز میں خبر سنی تو فوراً نماز ہی میں اپنا رخ بلکہ امام سمیت پوری جماعت کا رخ شمال سے جنوب کو یعنی بیت المقدس کی جانب سے کعبہ کی سمت کو کر لیا۔ (بخاری شریف وغیرہ

❷ جن کا دوبارہ کبھی نمبر نہیں آتا (بخاری و مسلم حدیث معراج)

❸ مسلم شریف۔

آراستہ ہوئے اور امامت کے لئے اسی سید الثقلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آگے بڑھایا گیا۔ ❶

پنج وقتہ نمازوں کا قبلہ یہ بیت المقدس ہو۔ جہاں مسجد اقصیٰ ہے جو ایک گذر گاہ ہے عرش بریں پر جانے والے کا۔ یا وہ کعبہ ہو جو نقطہ محاذات ہے۔ ❷ اس بیت معمور کا جس کا طواف ملائک کے جھمگٹ ہر وقت کرتے رہتے ہیں جو تکیہ گاہ ہے ابراہیم خلیل اللہ کا (علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام) اس طرح کے مشاہدات اشارہ کر رہے تھے کہ امام الانبیاء اور اس کی امت خیر الامم کا قبلہ خانہ کعبہ ہونا چاہئے۔ مگر جہاں نص صریح اور قطعی فیصلہ کی ضرورت ہو وہاں اشاروں کو کافی نہیں سمجھا جاسکتا۔ البتہ یہ اشارے قطعی فیصلہ اور امر واضح کی توقع ضرور دلاسکتے تھے اور یہ توقع اشتیاق اور یہ اشتیاق اضطراب بن سکتا تھا اگر انتظار طویل ہوتا۔

یہی اشتیاق واضطراب وانتظار تھا جس کی وجہ سے آپ بار بار اس سمت کو نظر اٹھاتے تھے، جہاں سے مراد پوری ہونے کی توقع تھی۔ بالآخر انتظار ختم ہوا۔ جب ہجرت سے سوا سال بعد فرمان خداوندی نازل ہوا:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (البقرہ ۱۴۴)

"ہم دیکھ رہے ہیں کہ (حکم الٰہی کے شوق وطلب میں) تمہارا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھ رہا ہے تو یقین کرو ہم عنقریب تمہارا رخ ایک ایسے قبلہ کی طرف پھیر دینے والے ہیں جو تم چاہتے ہو اور اب کہ اس معاملہ کے ظہور کا وقت آگیا ہے تو چاہئے کہ تم اپنا رخ مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو (نماز کے وقت) اسی طرف رخ پھیر لو" (آیت ۱۴۴)

وجوہات:

رب المشرقین والمغربین، خالق السمٰوٰت والارض، رب العرش الکریم کے کسی حکم کے متعلق وجہ دریافت کرنا بے ادبی ہے لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ (الانبیاء۔۲۳) (وہ جو کچھ کرتا ہے اس پر اس سے باز پرس نہیں کی جاسکتی) اور جبکہ مشرق ومغرب اسی کا ہے اور ہر جگہ اور ہر سمت میں اس کا جلوہ یکساں ہے تو بلاشبہ اس کو اختیار ہے کہ قبلہ کے لئے جو سمت چاہے مقرر کر دے۔ چون وچرا کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ حکم جس کے پانچ کلمے ہیں فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (البقرہ۔۱۴۴) ایک انقلاب انگیز فیصلہ بھی ہے جو وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (آل عمران۔۲۶) کی پوری شان اپنے اندر رکھتا ہے۔

---

❶ البدایہ والنہایہ ص۱۱۳ ج۳۔

❷ طبری ومسند اسحاق۔ فتح الباری ص۲۳۵ ج۲۔

کیونکہ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ امامت عظمٰی اور خلافت اِلٰہِیّہ کا منصب جس پر تقریباً ڈھائی ہزار سال سے بنو اسرائیل فائز تھے اب وہ ان سے چھن کر بنو اسماعیل کے سپرد کیا جارہا ہے۔ وہی احکم الحاکمین جس کی بارگاہ عظمت تک کسی باز پرس کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی اپنی شان یہ بیان فرماتا ہے کہ ذرہ برابر بھی ظلم اس سے صادر نہیں ہوتا۔ [1]

ناممکن اور محال ہے کہ جو رب ہے پالنے پوسنے والا ہے۔ وہ اپنے ہی پیدا کئے ہوئے بندوں پر کوئی ظلم کرے۔ [2]

بلاشبہ اس کی شان یہ ہے کہ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے) مگر اس مطلق العنان قدرت کے باوجود اس نے قوموں اور امتوں کی ذلت و عظمت کے لئے ضابطے مقرر کر دیئے ہیں۔

(الف) جس قوم کو جو نعمت وہ عطا فرمادیتا ہے وہ اس میں انقلاب اور تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہ کرے۔ (آیت ۵۳ سورہ الانفال) (اور اپنی عظمت آفرین خصوصیات کو ختم نہ کردے۔) عروج کے بعد زوال اس ضابطہ کے بموجب ہوتا ہے اور ترقی کے لئے ضابطہ یہ ہے۔

(ب) جو حالت کسی قوم کی ہوتی ہے وہ قادر ذوالجلال اس میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی نہ کرے۔ (آیت ۱۰ سورہ ۱۳ رعد)

بہرحال رب ذوالجلال نے اپنی شان اور اپنے ہی منظور فرمودہ ضابطہ کا یہ احترام فرمایا ہے کہ اس انقلاب آفریں حکم کی وجوہات بیان فرمائیں اور اس تفصیل سے بیان فرمائیں کہ شاید کسی اور حکم کی وجوہات اس تفصیل سے بیان نہیں فرمائیں۔

آپ قرآن مجید کی تلاوت شروع کیجئے سب سے پہلے آپ سورہ فاتحہ پڑھیں گے جو نرالے رنگ کی حمد وثناء ہے جس میں بندوں کو نہایت جامع دعا کی تلقین بھی ہے اور عبرت آموز سبق بھی۔ پھر وہ سورت شروع ہوتی ہے جو قرآن پاک کی سب سے بڑی سورت ہے۔

اس میں مقصد قرآن حکیم کی وضاحت کے بعد ان تین جماعتوں کا ذکر اور ان کے کردار کا بیان ہے جو کسی بھی تحریک کے برپا ہونے پر ظہور پذیر ہو جاتی ہیں یعنی (۱) ماننے والے (۲) کھلے ہوئے مخالف اور منکر (۳) وہ اغراض پرست بزدل جن کے دلوں میں انکار بھرا ہوتا ہے اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ وہ موافق اور فرماں بردار ہیں۔ اس کے بعد عبادت رب کی ہدایت ہے اور اس رسول کا ذکر ہے جو طریقہ عبادت کی تعلیم دے رہا ہے جس کی تصدیق کے لئے وہ معجزہ پیش کیا گیا ہے جس کا نام قرآن ہے۔ پھر نوع انسان کی

---

[1] آیت ۴۰ سورہ ۴ النساء

[2] وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (حٰم سجدہ آیت ۴۶)

حیثیت بیان فرمائی گئی ہے کہ اس کو زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت عطا ہوئی، اس کی شان ملائک سے بھی بلند ہے۔ اب خلافت اور امامت کا ذکر شروع ہوا تو بنو اسرائیل کو یاد دلایا گیا ہے کہ یہ نعمت عظمیٰ ان کو عطا ہوئی تھی۔

یہ سورہ بقرہ کی آیت ۴۰ ہے یہاں سے سورہ بقرہ کا پانچواں رکوع شروع ہوتا ہے۔ اس آیت سے لیکر آیت ۱۲۳ تک جو پندرھویں رکوع کے شروع میں ہے، بنو اسرائیل [1] کا تذکرہ ہے۔ ان آیات میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کے انعامات شمار کرائے گئے ہیں جو بنو اسرائیل کو وقتاً فوقتاً عطا ہوتے رہے۔ دوسری جانب اس کا تذکرہ ہے کہ باری تعالیٰ کے ان انعامات کو بنو اسرائیل نے کس طرح (معاذ اللہ) پامال کیا۔ اور کس طرح ان کی دھجیاں بکھیریں۔ ان تمام جرائم کی تفصیل تو بہت طویل ہے یہاں صرف ان جرائم کے عنوان پیش کئے جارہے ہیں جو اپنے اندر خاص اہمیت رکھتے ہیں جو ان تراسی آیتوں میں شمار کرائے گئے ہیں۔

۱۔ اللہ سے جو عہد [2] کیا تھا۔ اس کو توڑ ڈالا۔ اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا (آیت ۱۰۰، ۱۰۱)
۲۔ حیلہ بازی اور ٹال مٹول (آیت ۶۵ تا ۶۶)
۳۔ قبول حق سے گریز اور اس پر فخر (آیت ۸۷ تا ۹۳)
۴۔ سنگ دلی (آیت ۷۴ و ۸۸)
۵۔ کج بحثی (آیت ۶۸ و ۶۹)
۶۔ نسلی حسد (آیت ۸۹ و ۹۰ و ۱۰۹)
۷۔ پوری ڈھٹائی سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پامال کرنا (آیت ۸۴ و ۸۵)
۸۔ داعیان حق سے عناد (آیت ۸۷) ان کا مذاق بنانا (آیت ۱۰۴)
۹۔ احکام خداوندی کو فروخت کرنا (آیت ۴۱ و ۷۹)
۱۰۔ عقائد میں تحریف [3] (آیت ۸۰ و ۱۱۱)
۱۱۔ احکام خداوندی میں تحریف [4] (آیت ۷۵)
۱۲۔ موت سے گریز، دنیاوی زندگی کی شدت حرص (آیت ۹۶)

---

[1] یعنی تراسی آیتوں میں جو دس رکوع ہیں پھیلی ہوئی ہیں۔

[2] طاعت الٰہی اور ایمان بانبیاء کا عہد۔ توریت میں بھی اس عہد کا ذکر جابجا ہے، مثلاً تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے۔ اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کے شرعوں اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا۔ فقرہ ۱۸ باب۔ ۲ (استثناء)

[3] تم نے زندہ خدا رب الافواج کی باتوں کو بگاڑ ڈالا ہے یرماہ، باب ۲۳ فقرہ ۳۷

[4] جو اپنی زبان استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ فرماتا ہے۔ یرماہ باب ۲۳ فقرہ ۳۱ و ۳۲

۱۳۔ گوسالہ پرستی (آیت ۹۲)

۱۴۔ خدا کے بیٹا ماننا[1] (آیت ۱۱۶)

۱۵۔ انبیاء علیہم السلام کو قتل کر ڈالنا (آیت ۶۱ و ۹۱)

۱۶۔ جادو اور کہانت (آیت ۱۰۲ و ۱۰۳)

۱۷۔ گروہ بندی اور گروہ بندی کے ساتھ جنت کی ٹھیکہ داری کہ یہود کہتے تھے کہ جب تک انسان یہودی گروہ بندی میں داخل نہ ہو نجات نہیں پاسکتا اور عیسائی کہتے تھے کہ جب تک عیسائی گروہ بندی میں داخل نہ ہو جنت میں نہیں جاسکتا۔ (آیت ۱۱۱)

قرآن پاک کی محولہ بالا آیتوں میں ان جرائم کو شمار کرایا گیا ہے۔ پھر ان کی مثالیں اور شواہد پیش کئے گئے ہیں۔

اب ایک قدرتی سوال ہے کہ جس قوم کا یہ کردار ہو چکا ہے کیا وہ اس کی اہل ہے کہ منصب امامت کی حامل رہے اور اس کے قبلہ کو نوع انسان اور دین کامل کا قبلہ قرار دیا جائے اور اس میں تبدیلی نہ کی جائے۔

کلام اللہ کی نظر میں تبدیلی صرف مناسب ہی نہیں ہے بلکہ اتنی ضروری ہے کہ اس پر اعتراض وہی کرسکتے ہیں جو فہم وبصیرت سے محروم اور مضحکہ انگیز نادانی (سفاہت) میں مبتلا ہوں۔ چنانچہ تبدیلی قبلہ کے حکم کی تمہید اس طرح فرمائی گئی ہے:

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا (البقرہ آیت ۱۴۲)

"جو لوگ عقل وبصیرت سے محروم ہیں وہ کہیں گے کس بات نے ان (مسلمانوں) کو ہٹا دیا اس قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے رب ابراہیم کا وعدہ اور بنو اسرائیل کی محرومی کا سبب:

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت اور اسکی عظمت بنو اسرائیل میں بھی مسلم تھی اور بنو اسماعیل میں بھی۔ دونوں[2] ان کو اپنا مورث اعلیٰ مانتے تھے۔ قرآن حکیم یہود کے جرائم شمار کرانے کے بعد خاتمہ کلام پر پھر یاد دلاتا ہے کہ "اے بنی اسرائیل یاد کرو میری وہ نعمتیں جو میں نے تم کو بخشیں اور میں نے تم کو

---

[1] یہود اور نصاریٰ دونوں ہی نے خدا کا بیٹا مان لیا تھا۔ یہود نے حضرت عزیر کو اور عسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔

[2] برہمن جس برہما کی تعظیم کرتے ہیں کیا عجب ہے وہ ابرہم یا ابراہام ہی ہو۔ عربوں نے اگر ابراہام کا ابراہیم کر لیا ہے تو اتنی تبدیلی کا حق تو بھارت کے آریوں کو بھی ہونا چاہئے کہ وہ ابرہم کا برہم اور برہما کرلیں جیسے آرین کو آریہ کرلیا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ حال

دنیا جہان والوں پر فضیلت دی"۔ (آیت ۱۲۲)

اس یاد دہانی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسم گرامی لیکر وہ بشارت یاد دلاتا ہے جو حضرت حق جل مجدہ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی تھی:

اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (سورہ بقرہ۔۱۱۴)

"میں تمہیں انسانوں کے لئے امام بنانے والا ہوں"

پھر یاد دلاتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دریافت کیا کہ یہ شرف میری اولاد کو بھی میسر آئے گا، تو بتادیا گیا تھا:

لَا يَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِيْنَ (آیت ۱۲۴)

"نہیں پہنچتا میرا اقرار نافرمانوں کو"

یعنی جو ظلم و معصیت کی راہ اختیار کریں ان کا میرے اس عہد میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

اس صغریٰ اور کبریٰ کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنو اسرائیل خود اس بشارت کے بموجب جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی تھی اس کے مستحق ہیں کہ ان کو منصب امامت سے معزول کر دیا جائے کیونکہ وہ ظالم ہیں اور ظالم بھی ایسے کہ ان جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں جن کو گزشتہ ۸۳ آیتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

اب مستحق شرف کون؟:

قرآن حکیم یاد دلاتا ہے کہ ایک "بیت" خانہ وہ ہے جس کو شروع ہی سے مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا (البقرہ۔۱۲۵) بنایا گیا ہے (تمام انسانوں کا مرجع اور مرکز۔ امن و حریت کا مقام)

اس بیت سے متعلق ہدایت کر دی گئی تھی: وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِمَ مُصَلًّى (البقرہ۔۱۲۵) "ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بنالو۔"

اس بیت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند ارجمند اسماعیل کو حکم دیا تھا: طَهِّرَا بَيْتِیَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (البقرہ۔۱۲۵)

"تم دونوں میرے گھر کو پاک صاف رکھو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے۔"

پھر فرقان حمید یاد دلاتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام جب اس بیت کی بنیادیں (جو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ کی تھیں) بلند کر رہے تھے تو ان کے دلوں کی گہرائیوں سے ان کی زبانوں پر یہ دعا بھی جاری تھی:

"اے پروردگار! ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول ہو۔ بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور

(مصالح عالم) کا جاننے والا ہے۔ اے پروردگار! (اپنے فضل و کرم سے) ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم (تیرے احکام کے فرمانبردار) بن جائیں اور ہماری نسل سے بھی ایسی امت پیدا کر جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو۔ خداوند ہمیں ہماری عبادت کے طور وطریق بتادے اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما اور اپنی عنایت سے نواز، بلاشبہ تیری ذات ہے جس کے درگذر کرنے کی کوئی انتہا نہیں جو رحم کرنے والی ہے"۔ (آیت ۱۲۷ ـ ۱۲۸)

اسی سلسلہ میں ان کی دعا یہ بھی تھی:

"اے ہمارے رب! (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول پیدا ہو جو انہیں میں سے ہو۔ وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے، کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور اپنی پیغمبرانہ تربیت سے ان کے دلوں کو مانجھ دے۔" (آیت ۱۲۹)

اس کے بعد کلام الٰہی تنبیہ کرتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کا مسلک تھا:

(۱) توحید خالص، خدا واحد کی پرستش، جس میں کسی طرح کے شرک کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ (آیت ۱۳۲)

(۲) سپردگی اور فرمانبرداری۔ یعنی اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دینا اور اس کے احکام کی پوری طرح تعمیل کرنا۔ (آیت ۱۳۱)

یہی توحید خالص اور تسلیم ورضا تھی جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام الناس بنایا اور یہی نعمت بنو اسرائیل کو عطا ہوئی تھی جس کی وجہ سے ان کو عالمین دنیا جہان پر فضیلت بخشی گئی تھی۔

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اسی مسلک کی وصیت اپنی اولاد کو کی تھی، ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد میں جس قدر نبی آئے سب نے اسی مسلک کو مضبوطی سے اختیار کیا۔ یہ تمہاری دھڑے بندی جس کا نام یہودیت اور نصرانیت ہے ان سب انبیاء علیہم السلام کا دامن اس سے پاک رہا۔ (آیت ۱۴) تمہاری اسی دھڑے بندی کا نتیجہ ہے کہ کسی نبی کو مانتے ہو کسی کو نہیں مانا یہاں تک کہ قتل بھی کر دیا۔ اسی دھڑے بندی نے تم کو منصب امامت سے محروم کیا۔ درجہ افضلیت سے نیچے گرا کر ذلت و مسکنت کے گڑھے میں ڈالا۔ غضب الٰہی کو تمہاری گردنوں کا طوق بنادیا۔ آج سب سے افضل وہ ہے جو اس دھڑے بندی سے بالا و برتر ہو کر مسلک ابراہیمی کو مضبوطی سے سنبھالے۔ خداءواحد کا پرستار حقیقی بن کر اپنے آپ کو خدا کے حوالہ کردے۔

آج یہ شرف محمد ﷺ اور آپ کی امت کو حاصل ہے۔ لہذا وہی افضل الناس اور امت وسط ہے اور اسی افضلیت کی بنا پر یہ فیصلہ بھی کیا جارہا ہے۔ اس کا قبلہ وہ ہوگا جس کی حرمت و عظمت عہد قدیم سے چلی آرہی ہے جس کے معمار ابراہیم اور اسماعیل علیہ السلام تھے۔

پس منظر پر آپ نظر ڈال چکے۔ اب ان آیتوں کا مضمون مطالعہ فرمایئے جن میں تحویل قبلہ کا حکم ہے جس کا یہ پس منظر تھا۔

ترجمہ: ”جو لوگ عقل و بصیرت سے محروم ہیں وہ کہیں گے مسلمان جس قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے، کیا بات ہوئی کہ ان کا رخ اس سے پھر گیا۔ (اے نبی) تم کہو پورب ہو یا پچھم سب اللہ ہی کے لئے ہے (وہ کسی خاص مقام یا جہت میں محدود نہیں) وہ جس کسی کو چاہتا ہے سیدھی راہ چلا دیتا ہے۔

”اور (اے مسلمانو! جس طرح یہ بات ہوئی کہ بیت المقدس کی جگہ خانہ کعبہ قبلہ قرار پایا) اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے تمہیں امتہ وسط (نیک ترین، عادل اور معتدل) امت بنا دیا تاکہ تم گواہ رہو لوگوں پر (یعنی ایک بہتر نمونہ اور معیار کہ نوع انسان کی ہر امت کو اسی سانچہ میں ڈھلنا اور اسی معیار پر اترنا چاہیئے) اور رسول گواہ رہیں تم پر (وہ تمہارے لئے نمونہ اور معیار ہیں کہ امت اسلامیہ کو اس معیار پر پورا ہونا اور اس سانچہ میں ڈھلنا چاہیئے)۔ اور ہم نے تمہیں اس قبلہ پر جس کی طرف تم رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے اسی لئے رکھا تھا کہ وقت پر معلوم ہو جائے کہ کون لوگ واقعی اللہ کے رسول کی پیروی کرتے ہیں اور کون الٹے پاؤں پھر جاتے ہیں۔ [1] یہ حکم بہت گراں (اور سخت آزمائش کا حکم ہے)۔ مگر ان لوگوں کو نہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے راہ دکھادی ہے (اور وہ اطاعت رسول کے ذوق سلیم سے بہرہ ور ہیں) اللہ ایسا نہیں کہ ضائع ہو جانے دے تمہارے ایمان کو (کہ جو نماز میں بتقاضاء ایمان باللہ و ایمان بالرسول، بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھیں ان کو بیکار قرار دے)۔ بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا شفیق ہے (خصوصاً ان پر جنہوں نے اللہ اور رسول کے حکم کی تعمیل میں کوئی کام کیا۔ اور تبدیلی قبلہ کے متعلق اس کا یہ حکم بھی سراسر شفقت ہی ہے)۔

”(اے پیغمبر!) ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکم الٰہی کے شوق و طلب میں تمہارا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھ اٹھ جاتا ہے، تو یقین کرو ہم آپ کا رخ اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس کو آپ چاہتے ہیں (اچھا) اب کر لیجئے اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف اور تم لوگ (آپ اور آپ کے ساتھی) جہاں بھی ہو اپنے چہرے پھیر لیا کرو اسی طرف، اور جن لوگوں کو کتاب مل چکی ہے (یہود اور نصاریٰ) وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ معاملہ ان کے پروردگار کی طرف سے ایک امر حق ہے (کیونکہ ان کے مقدس نوشتوں میں اس کی پیشن گوئی موجود ہے)۔ اور اللہ بے خبر نہیں ہے ان کی کارروائیوں سے۔ اور اگر تم اہل کتاب کے سامنے دنیا جہان کی ساری دلیلیں بھی پیش کر دو جب بھی وہ تمہارے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں، نہ یہ ہو سکتا ہے کہ (علم و بصیرت کی پوری روشنی حاصل ہونے کے بعد) تم ان کے قبلہ کی پیروی کرنے لگو اور نہ وہ آپس میں

---

[1] یعنی سپردگی اور حکم خدا کی تعمیل کے لئے سرتاسر اطاعت بن جانا جو ملت ابراہیم کی خصوصیت ہے کس میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے، کس میں نہیں پائی جاتی (واللہ اعلم)

ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے والے ہیں۔ (یہود کا قبلہ ہیکل بیت المقدس ہے اور نصاریٰ کسی عمارت یا مکان کو نہیں بلکہ سمت مشرق کو قبلہ بنائے ہوئے ہیں (ابن جریر وغیرہ)

(اور دیکھو) اگر تم نے ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی باوجودیکہ تمہیں اس بارے میں علم حاصل ہو چکا ہے (قبلہ کے متعلق وحی نازل ہو چکی ہے) تو تم بھی ان میں آجاؤ گے جو (نافرمانی کر کے اپنے اوپر) ظلم کرتے ہیں اور جن لوگوں کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ آپ [1] کو ایسا ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو جانتے پہچانتے ہیں لیکن اس پر ایک گروہ ان میں ایسا ہے جو جان بوجھ کر سچائی کو چھپاتا ہے (تحویل قبلہ کا یہ معاملہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک امر حق ہے، پر ہرگز ہرگز ایسا نہ ہو کہ تم شک کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔"

[1] آنحضرت ﷺ کو۔

نکاح السیدہ فاطمۃ الزہراء (رضی اللہ عنہا)

ارشاد خداوندی ہے:

وَ اَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ وَ الصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَ اِمَآئِکُمۡ ؕ اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ یُغۡنِہِمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۳۲﴾

"نکاح کر دو ان کا جو تم میں بے نکاح ہوں اور اپنے غلاموں اور باندیوں کا بھی جو اس قابل ہوں اگر مفلس ہوں گے تو خدا تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے خوب جاننے والا۔" (سورہ النور ۳۲)

آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاص طور سے ہدایت فرمائی:

"علی! تین کام ہیں ان میں تاخیر ہر گز نہ کرنا۔ (۱) نماز جب اس کا وقت ہو جائے' (۲) جنازہ جب آجائے، (۳) بے نکاح جب اس کا کفو مل جائے [1]۔"

ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم پہلے "غنا" چاہتے ہیں، پھر نکاح مگر فرمان خداوندی نے نکاح کو مقدم رکھا اور غنا کا خود وعدہ فرمایا۔

اس کی عجیب و غریب مثال حضرت علی اور سیدہ فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے والد خواجہ ابو طالب کی وفات کے وقت اگرچہ جوان تھے، تقریباً بیس سال کی عمر تھی، مگر آنحضرت ﷺ نے ان کو بچپن ہی سے اپنی تربیت میں لے لیا تھا اور خواجہ ابو طالب کو ان کی طرف سے بے فکر کر دیا تھا۔

ابو طالب دولت مند نہیں تھے کہ ان کے وارث ان کے ترکہ سے دولت مند ہو جائے۔ اس کے علاوہ ہجرت کرنے والے بزرگ وہ تھے کہ دولت مند [2] بھی فقیر ہو گئے تھے۔ لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھی جو

---

[1] ترمذی شریف باب ماجاء فی الوقت الاول من الفضل ص ۲۴

[2] آنحضرت ﷺ نے مکہ معظمہ میں بھی مواخات (بھائی چارہ) قائم فرمایا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل ہوا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو اپنے ساتھ شامل کیا اور اخ قرار دیا۔ مدینہ منورہ میں جو مہاجرین اور انصار کرام میں مواخات رشتہ

تھا وہ توکل کا سرمایہ تھا اور بس۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عمر پندرہ سال کے قریب ہوئی تو رشتے آنے شروع ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی مشورہ دیا گیا کہ وہ بھی خواستگاری پیش کر دیں۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو احساس تھا کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی آپ نے مشورہ دینے والوں سے بھی کہا۔ مگر تہی دستی اور غربت کا عذر کسی نے بھی قابل التفات نہیں سمجھا۔ مشورہ دینے والوں نے یہی کہا کہ بارگاہ رسالت میں اس کی ضرورت نہیں کہ تمہارے پاس دولت ہو۔ اس کے علاوہ آنحضرت ﷺ آپ کے مشفق مربی ہیں۔ تمہارا گوشہ خاطر معلوم ہو جائے گا تو وہ خود منظور فرمالیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھ پر مشورہ دینے والوں نے اتنا اصرار کیا کہ بالآخر مجھے تعمیل کرنی پڑی۔ میں نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ خدمت مبارک میں حاضر ہوا، مگر ایک طرف میری شرم و حیا، دوسری طرف ذات اقدس کا رعب و جلال۔ حاضر ہونے کو حاضر ہو گیا مگر زبان بند، طبیعت مجوب، خاموش بیٹھ گیا۔ آنحضرت ﷺ کی مربیانہ شفقت ہی کار فرما ہوئی۔ خود دریافت فرمایا: کیسے آئے ہو، کچھ کام ہے۔ اس کے جواب میں بھی خاموشی ہی تھی۔ پھر خود ہی فرمایا: فاطمہ سے رشتہ کے لئے آئے ہو۔

میں نے عرض کیا: ”نعم“

فرمایا: پھر کیا دو گے؟

میں نے عرض کیا، میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔

ارشاد ہوا: میں نے تمہیں زرہ دی تھی وہ کیا ہوئی۔ ❶

جیسے ہی آنحضرت ﷺ کا اشارہ سمجھ میں آیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زرہ بیچنے کی نیت کر لی۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ۴۸۰ درہم میں بیچ کر پوری رقم اپنے مربی و سرپرست آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کر دی۔ اس میں سے تقریباً ایک تہائی خوشبو پر خرچ ہوئی باقی دوسری ضرورتوں پر۔

آپ نے احباب کو طلب فرمایا: اور نکاح پڑھ دیا۔

مکان کا انتظام:

دُلہن کو لانے کے لئے مکان کی ضرورت ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ دلہن

اخوت قائم فرمایا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی نہیں آتا گویا آپ کی مواخات قائم رہی جو آنحضرت ﷺ سے مکہ معظمہ میں قائم ہو گئی تھی مقصد یہ کہ سلسلہ مواخات سے جو سہولت حضرات مہاجرین کو مل گئی تھی کہ رہنے اور کاشت وغیرہ کا انتظام ہو گیا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ سہولت بھی نہیں ملی تھی۔

❶ مشورہ دینے۔ پھر حاضری اور گفتگو کی۔ یہ تمام تفصیل البدایہ والنہایہ سے ماخوذ ہے ص ۳۶۶ ج ۳

کو وہیں اتارا، پھر مستقل قیام کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا گیا کہ حضرت حارثہ بن نعمان کے مکان خالی پڑے ہیں، ان سے ایک مکان لے لو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خودداری نے مکان کی فرمائش کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ کسی طرح حضرت حارث رضی اللہ عنہ کو معلوم ہو گیا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ سارے مکان آپ کے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو پسند فرمائیں وہ اس مکان کی خوش بختی ہے۔ میں اسی مکان کو جس کو آپ لیں گے زیادہ محبوب (اور مبارک سمجھوں گا) بمقابلہ اس کے جو آپ کے کام میں نہیں آئے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقت بارک اللہ (آپ نے سچ فرمایا: اللہ آپ کو برکت دے)۔ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے اور حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے مکان میں لاکر اُتارا۔"

اللہ تعالیٰ اپنے پاکباز مقربین کو کس طرح محفوظ رکھتا ہے :

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں اپنی دلہن (فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کو رخصت کرانے کا[1] ارادہ کیا تو میں نے بنی قینقاع کے ایک سنہار کی شرکت سے ایک کام کرنا چاہا۔ خیال یہ تھا کہ نفع ہو گا تو ولیمہ کر سکوں گا۔

صورت یہ تھی کہ غزوۂ بدر کے مال غنیمت سے مجھے ایک ناقہ ملی تھی اور ایک اونٹنی مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عنایت فرمائی تھی۔ جب میرے پاس دو اونٹ ہو گئے تو میں نے قبیلہ بنی قینقاع کے ایک سنہار سے یہ طے کیا کہ ہم دونوں ان اونٹوں پر جنگل سے اذخر لے آیا کرینگے اور اس کو بازار میں بیچ دیا کرینگے۔ یہ معاملا نفع ہی کا تھا اس میں نقصان کا سوال ہی نہیں تھا لیکن خدا کو منظور نہیں تھا کہ امام الاولیا بے فکری سے ولیمہ کریں۔

یہ زمانہ وہ تھا اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ حضرت علی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جنہوں نے غزوۂ احد میں شہید ہو کر سید الشہداء کا خطاب (لسان نبوت سے حاصل کیا) وہ جیسے بہادر تھے ایسے ہی منچلے بھی تھے۔ قیام گاہ پر کچھ احباب اکٹھے تھے۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ کسی نے کہا شراب کے ساتھ اونٹنیوں کے کوہان کے کباب بھی ہونے چاہئیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ دونوں اونٹنیاں سامنے کھڑی تھیں۔ حضرت حمزہ فوراً اٹھے اور دونوں اونٹنیوں کے کوہان نکال لئے اور کوہیں چاک کر کے گردے وغیرہ نکال لئے۔ احباب کی فرمائش[2] پوری کر دی مگر ولیمہ کے متعلق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا سارا منصوبہ ختم ہو گیا۔ اسی لئے کہتے ہیں "نزدیکاں رابیش بود حیرانی"

---

[1] بخاری شریف ص ۲۸۰

[2] بخاری شریف ص ۳۲۰ وص ۴۳۴ وغیرہ

نکاح سے کچھ عرصہ بعد رخصتی :

ایک روایت ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح پہلے ہو چکا تھا اور رخصتی نو ماہ[1] بعد ہوئی تھی۔ بخاری شریف کی مذکورہ بالا روایت سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

جہیز:

تاجدار دوعالم شاہ کونین ﷺ نے اپنی لخت جگر سیدہ نساء اہل الجنۃ فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کو جو جہیز دیا اس کی فہرست[2] یہ ہے:

لحاف:	ایک
چمڑے کا گدا جس میں کسی درخت کی چھال بھری ہوئی تھی:	ایک
چکیاں:	دو
مشکیزہ:	ایک،
مٹی کے گھڑے:	دو

صلوات اللہ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین

---

[1] الاستیعاب والبدایہ ولنہایہ ص ۳۴۶ ج ۳

[2] الاصابہ والترغیب والترہیب، باب الترغیب فی الاذکار بعد الصلوٰت

مقاصد بعثت، فرائض نبوت اور تکمیل

دعاءاور قبولیت دعا

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بیت اللہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے تو دل کی تمناؤں کے ترجمان دعائیہ کلمات یہ تھے جو زبان مبارک پر جاری تھے:

رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ‌ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ (البقرہ۔ ۱۲۹)

"اے ہمارے رب! اٹھا ان میں سے ایک رسول انہیں میں کا۔ پڑھے ان پر تیری آیتیں اور سکھادے ان کو کتاب اور پکی باتیں اور ان کو سنوارے۔"

قبولیت دعا:

هُوَ الَّذِىۡ بَعَثَ فِى الۡاُمِّيّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ

(سورہ الجمعہ۔ ۲)

"وہی ہے جس نے اٹھایا ان پڑھوں میں ایک رسول انہیں میں کا پڑھتا ان پاس اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا اور سکھاتا کتاب اور عقلمندی۔" (شاہ عبد القادرؒ)

لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ۔ "(سورہ آل عمران۔ ۱۶۴)

"اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں رسول انہیں میں کا، پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی اور سنوارتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور کام کی بات (شاہ عبد القادرؒ)

"ومے آموزو آن را کتاب و علم" (شاہ ولی اللہؒ)

دعاءاور قبولیت دعا کے الفاظ پر دوبارہ نظر ڈال لیجئے۔ حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کے مقاصد یہ تھے:

تلاوت آیات اللہ، تعلیم کتاب اللہ، تعلیم الحکمہ، تزکیہ

تشریح

تلاوت اٰیات اللہ:

یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ کا ترجمہ یہی کیا گیا ہے۔ "پڑھتا ہے ان پر آیتیں"۔ لیکن پڑھنے ہی کے لئے لفظ قرأت بھی آتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ پڑھو تو قرأت کا لفظ ہی لایا گیا: اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ مگر یہاں دعا میں بھی یَتۡلُوۡا ہے اور قبولیت دعا میں بھی "یَتۡلُوۡا" ہی ارشاد ہوا ہے یعنی تلاوت کرتا ہے تو کیا قرأت اور تلاوت میں کچھ فرق ہے؟

واقعہ یہی ہے۔ تلاوت اور قرأت میں فرق ہے۔ تلاوت کے معنی [1] صرف پڑھنے کے نہیں ہیں بلکہ تلاوت میں عمل بھی ملحوظ ہوتا ہے۔ پھر عمل بھی ایسا کہ تسلسل کے ساتھ ہوتا رہے۔ یعنی تلاوت میں صرف قول نہیں ہوتا بلکہ "قول مع [2] سعی پیہم" یعنی جس طرح آپ آیتیں سنائیں گے ساتھ ساتھ عمل اور عمل کے تسلسل کا بھی مشاہدہ کرادیں گے، یعنی جس طرح یہ ایک معجزہ ہے کہ "ایک اُمی محض" جس نے عمر عزیز کے چالیس دور اس طرح گذارے کہ پڑھنے پڑھانے سے نا آشنا تھا اس کو "اقرأ" کا حکم ہو رہا ہے اور وہ قرأت کر رہا ہے اسی طرح اس معجزہ کے ساتھ ایک عجیب و غریب مشاہدہ بھی ہے کہ پڑھ کر سنانے والا جو کچھ پڑھتا ہے وہ خود اس کی عملی تصویر بن جاتا ہے۔ یعنی پڑھنے کے ساتھ ایسا کردار بھی پیش کرتا ہے کہ آپ اس کے عمل سے بھی اس کو پڑھ سکتے ہیں۔

ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔

ارشاد ربانی ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡهُوۡدًا ﴿۷۸﴾ وَ مِنَ الَّیۡلِ

---

[1] یہ مقصد نہیں ہے کہ تلاوت قرأت اور پڑھنے کے معنی میں نہیں آتا۔ قرآن شریف میں بہت جگہ محض پڑھنے کے معنی میں بھی آیا ہے: وَاتۡلُ عَلَیۡہِمۡ نَبَاَ ابۡنَیۡ اٰدَمَ بِالۡحَقِّ (مائدہ۔۲۷) اور نَتۡلُوۡا عَلَیۡکَ مِنۡ نَّبَاِ مُوۡسٰی وَ فِرۡعَوۡنَ بِالۡحَقِّ (القصص۔۳) وغیرہ۔ مگر جب ماخذ کا لحاظ کیا جائے تو صرف قرأت کے معنی نہیں ہوتے بلکہ کچھ اضافہ بھی ہوتا ہے۔ تفصیل دوسرے حاشیہ میں ملاحظہ فرمایئے۔

[2] تلاوت کا ماخذ "تلو" ہے جس کے معنی ہیں اتباع کرنا، پیچھے چلنا، اس طرح کہ آپ میں اور جس کے پیچھے چل رہے ہیں اس کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ ہو۔ تلاہ، تبعه متابعة لیس بینهم مالیس منها۔ وذٰلك یکون تارة بالجسم وتارة بالاقتداء فی الحکم ومصدره تلو وتلو تارة بالقراءة اوتدبر المعنی مصدره تلاوة والقمر اذا تلاها ارادبه ھٰهنا الاتباع علی سبیل الاقتداء والمرتبة وذلك انه یقال ان القمر هو یقتبس النور من الشمس وهو لها بمنزلة الخلیفة (ثم قال) والتلاوة تختص باتباع کتب الله المنزلة تارة بالقراءة وتارة بالارتسام لما فیها من امر ونهی وترغیب وترهیب اوما یتوهم فیه ذلك وهو اخص من القراءة فکل تلاوة قراءة ولیس کل قراءة تلاوة لا یقال تلوت رقعتك وانما یقال فی القراٰن فی شئٍ اذا قرأته وجب علیك اتباعه (المفردات فی غریب القراٰن)

فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ (سورہ اسراء۔۷۸،۷۹)

شاہ صاحبان کے الفاظ میں اردو اور فارسی ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

"کھڑی رکھ نماز سورج کے [1] ڈھلنے سے، رات کی اندھیری تک اور قرآن پڑھنا فجر کا۔ بیشک قرآن پڑھنا فجر کا ہوتا ہے روبرو [2] ۔ اور کچھ رات جاگتا رہ۔ اس میں۔ یہ بڑھتی ہے تجھ کو۔ شاید کھڑا کرے تجھ کو تیرا رب تعریف کے مقام [3] میں" (شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ)

"برپادار نماز را، وقت زوال آفتاب۔ تا ہجوم تاریکی شب، ولازم گیر قرآن خواندن فجر را، ہر آئینہ قرآن خواندن فجر را حاضر میشوند فرشتگان ۔ ودر بعض شب بیدار باش بقرآن شب خیزی زیادہ شد برائے تو۔ نزدیک است کہ ایستادہ کند ترا پروردگار تو بمقام پسندیدہ" (شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ)

وحی الٰہی کے کلمات کو شمار کیجئے جو ان آیتوں میں ہیں۔ کل تیس لفظ ہیں مگر آنحضرت ﷺ کے عمل اور کردار پر نظر ڈالئے تو دفتر بے پایاں ہے۔ پانچ فرض ان کے اجراء ترکیبی، قیام، رکوع، سجدہ وغیرہ ۔ ان کے اوقات، پڑھنے کا انفرادی اور جماعتی طریقہ پھر ہر ایک کے ساتھ سنتیں، نفلیں، ان کے آداب اور طریقے جو احادیث کے سینکڑوں صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ سب تلاوت کے معنی واضح کر رہے ہیں ۔

فریضہ نماز عام مسلمانوں کے لئے:

چار وقت کی وہ نمازیں جن کا سلسلہ آفتاب ڈھلنے کے وقت سے شروع ہو کر اندھیری رات گئے تک رہتا ہے اور پانچویں وقت کی نماز (صبح کی نماز) جس میں قرآن شریف پڑھنے کی خاص تاکید ہے، کیونکہ یہ "مشہود" ہوتا ہے۔ یعنی اس وقت دن اور رات کے کارگزار فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ یہ پانچ نمازیں آنحضرت ﷺ کی طرح تمام مسلمانوں پر فرض ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی خصوصیت :

---

[1] یعنی کواکب پرستوں کے طریقہ کے برخلاف کواکب پرست طلوع آفتاب کے وقت آفتاب کی پوجا کرتے ہیں تو خدا پرستوں کی عبادت طلوع آفتاب سے پہلے ہوتی ہے یا زوال آفتاب کے بعد۔ واللہ اعلم بالصواب

[2] یعنی دن اور رات کے کارپرداز فرشتے اس وقت جمع ہوتے ہیں۔ وہ قرأت سنتے ہیں کیونکہ وہ قرأت نہیں کرسکتے ان کا وظیفہ تسبیح وتحمید ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

[3] وہ تعریف کا مقام ہے شفاعت کا جب کوئی نہ بول سکے گا تب حضرت عرض کر کر خلق کو چھڑا دینگے تکلیف سے (موضح القرآن)

لیکن آنحضرت ﷺ کی خصوصیت یہ ہے کہ ان پانچ نمازوں کے علاوہ آپ کے لئے ایک اور حکم بھی ہے "فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ" (بنی اسرائیل-۷۹) جس کے معنی حضرت شاہ عبد القادرؒ نے یہ کئے ہیں: "کچھ رات جاگتارہ اس میں (نماز پڑھنے میں) یہ بڑھتی ہے تجھ کو"۔ یعنی یہ خاص طور پر آپ کے حق میں اضافہ ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔ "شب خیزی زیادہ شد برائے تو" گویا نماز تہجد بھی آپ پر فرض ہے۔ یہ فرض امت پر نہیں۔ امت کے حق میں صرف سنت ہے، نہ پڑھیں تو کوئی گناہ نہیں۔ مگر آپ کے حق میں فرض ہے۔

اس خصوصیت کی علت اور حکمت بھی بیان کر دی گئی کہ آپ کو مقام محمود کا منصب عالی عطا کرتا ہے۔ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (بنی اسرائیل-۷۹) (قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہیں ایسے مقام پر پہنچائے جو عالمگیر اور دائمی ستائش کا مقام ہو، جس کی ہر طرح تعریف کی جائے)

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے:

یہ ایک عام اصول ہے یہاں یہی ظاہر کرنا ہے کہ سرور کائنات ﷺ کا جس طرح یہ مقام عالی ہے کہ "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" اسی طرح آپ کے فرائض میں بھی اضافہ [1] ہے اور ایسا اضافہ کہ عام انسانوں کو یہ حوصلہ نہیں ہے کہ اس اضافہ کو برداشت کر سکیں۔ یہ حوصلہ بھی رب محمد نے صرف محمد ہی کو عطا فرمایا تھا۔ جس نے اس اضافہ کو برداشت [2] کیا۔

---

[1] مگر یہ اضافہ عجیب قسم کا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول اللہ آپ تو معصوم و مغفور ہیں پھر یہ ریاضت کیوں کہ پائے مبارک پر ورم آجاتا ہے تو آپ نے جواب دیا۔ افلا اکون عبدا شکوراً "کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں" بخاری شریف ص ۱۶۷ یعنی عام اہل ایمان کے لئے فرضیت اس لئے ہے کہ گناہوں کا کفارہ ہو اور آپ کے لئے فرضیت بربناء شکر ہے۔ اسی لئے نفلیں جو شکر ادا کرنے کے لئے ہوتی ہیں وہ آپ کے حق میں فرض ہیں (واللہ اعلم بالصواب)

[2] برداشت کرنے کی صورت ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نیت باندھنے میں آپ نے تین دفعہ اللہ اکبر فرمایا، پھر فرمایا: ذوالملکوت والجبرو والکبریاء والعظمۃ (مالک ملک، اقتدار اعلیٰ کا مالک، بڑائی اور عظمت والا) پھر قرأت شروع کی تو پوری سورہ بقرہ نہایت اطمینان سے پڑھی پر اسی کے مناسب بہت طویل رکوع کیا۔ پھر اتنا ہی طویل قیام کیا پھر اتنا ہی طویل سجدہ کیا، سجدہ کے بعد بڑے اطمینان سے دیر تک بیٹھے رہے۔ پھر دوسرا سجدہ کر کے کھڑے ہوئے تو سورہ آل عمران پوری پڑھی۔ تیسری رکعت میں سورہ نساء مکمل چوتھی رکعت میں سورہ مائدہ یا سورہ الانعام پوری پڑھی۔ صحابی کے بعد کے راوی شعبہ کو شک ہے کہ کونسی سورت کا نام لیا تھا۔ (ابو داؤد باب مایقول فی الرکوع) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت ﷺ ایسا بھی کرتے تھے کہ تین دفعہ میں تہجد پڑھا کرتے تھے یعنی ایک مرتبہ اٹھے وضو کیا مسواک کی، نفلیں پڑھیں پھر آرام فرمایا، تھوڑی دیر تک سوتے رہے پھر اٹھے اس طرح تین دفعہ سوئے پھر اٹھے اور نوافل پڑھتے تھے (مسلم شریف) ظاہر ہے بار بار اٹھنا کتنا شاق ہوتا ہے۔ پھر تلاوت کی صورت حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے یہ بیان فرمائی کہ ایک ایک حرف الگ الگ کھینچ کر (بخاری شریف، ابو داؤد، ترمذی وغیرہ)

بسلسلہ عبادت آنحضرت ﷺ کی خصوصیات

نماز کے سلسلہ میں صرف یہی نہیں کہ تہجد آپ پر فرض تھا بلکہ تہجد کے علاوہ بھی اور نوافل آپ کے حق میں فرض کا درجہ ❶ رکھتی تھیں۔

روزہ :

نماز کے علاوہ روزے کے بارے میں خصوصیت یہ تھی کہ چند روز کا مسلسل روزہ کہ بیچ میں افطار قطعاًنہ ہو، امت کو اس کی اجازت نہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ کا معمول تھا۔

ایک مرتبہ صحابہ کرام نے اصرار کر کے اجازت ❷ حاصل کی اور مسلسل روزہ رکھنا شروع کیا مگر صرف دوروز بعد ہی اندازہ ہو گیا۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن کہ جاہا سپر باید انداختن

حضرات علماء نے روزے کے تین درجے قرار دیئے ہیں:

(۱) عوام کا روزہ یعنی فقہی قاعدوں کے مطابق کھانے پینے وغیرہ سے رکنا، اور مکروہات و محرکات یعنی غیبت، جھوٹ، خیانت، حسد، مکر وفریب وغیرہ سے اجتناب واحتیاط۔

(۲) خواص کا روزہ، یعنی صرف مکروہات و محرکات سے اجتناب نہیں بلکہ ایسی جائز چیزوں سے بھی احتیاط برتی جائے جو یاد خدا سے غافل کر دیں۔ مثلاً شعر شاعری، یا شکار وغیرہ

(۳) اخص الخواص کا روزہ۔ اللہ کے سوا ہر چیز سے یکسوئی اور بر طرفی اور صرف ذات حق جل مجدہ ، میں محویت اور اس کی ذات وصفات میں ایسی مشغولیت کہ وہی جملہ توجہات کا محور ہو۔

آنحضرت ﷺ کے روزے کی یہی شان ہوتی تھی اور یہ شان نقطہ عروج پر پہنچ جاتی تھی جب آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آخر میں آپ تہجد کی نماز بیٹھ کر ادا فرماتے تھے مگر صورت یہ ہوتی تھی کہ پہلے بیٹھ کر پڑھتے رہتے جب تیس چالیس آیتیں رہ جاتیں تو کھڑے ہو کر پڑھتے، پر رکوع کیا کرتے تھے۔ (بخاری شریف ص ۱۲۵ و ص ۱۵۱ وغیرہ)

❶ مثلاً ظہر کی سنتیں اگر وقت پر نہ پڑھی جائیں تو ان کی قضا نہیں ہے۔ لیکن ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کی ظہر کی سنتیں رہ گئیں تو آپ نے نماز عصر کے بعد ان کو پڑھا۔ بخاری شریف ص ۱۶۴ و ۱۶۵ پھر ان کو معمول بنالیا۔ بخاری شریف ص ۸۳ حالانکہ نماز عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک اور نماز صبح کے بعد سے طلوع آفتاب تک نوافل سے آنحضرت ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے۔ بخاری شریف ص ۸۳ مگر چونکہ آپ کے حق میں نوافل فرض کا درجہ رکھتی تھیں لہذا آپ نے عصر کے بعد یہ نفلیں پڑھیں (واللہ اعلم بالصواب)

❷ بخاری شریف ص ۲۶۳ باب التنکیل لمن اکثر الوصال۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ❸:

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ

ترجمہ: "مخلوق، اللہ کا کنبہ ہے، بس خلق خدا میں اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ کے عیال پر احسان کرے۔"

عجیب و غریب بات یہ ہوتی تھی کہ جس طرح توجہ الی اللہ اور ذات حق میں انہماک بڑھتا تھا اتنا ہی اس کی مخلوق کے حق میں رحم و کرم اور جود و سخا کا درجہ بڑھتا تھا یعنی پروردگار کی محبت اس کی پروردہ مخلوق پر لطف و احسان کی صورت میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شہادت ملاحظہ فرمائیے۔

کان رسول اللہ ﷺ اجود الناس وکان اجود مایکون فی رمضان حین یلقاہ جبرئیل وکان یلقاہ فی کل لیلۃ من رمضان فیدارسہ القران فلرسول اللہ ﷺ اجود بالخیر من الریح المرسلۃ ❶

"(یعنی) رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ سخی تھے اور آپ کی بے پناہ سخاوت کا زیادہ ظہور رمضان میں ہوتا تھا۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ سے ملاقات کیا کرتے تھے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ملاقات رمضان شریف کی ہر ایک رات میں ہوتی تھی۔ وہ آپ سے قرآن شریف کا دور کیا کرتے تھے۔ بس واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سخاوت اور بخشش جو سال بھر نسیم صبح رہتی تھی اس زمانہ میں وہ آندھی سے زیادہ تیز ہو جاتی تھی جس کے جھونکے کسی رکاوٹ کے پابند نہیں ہوتے ہر طرف پہنچتے ہیں اور ہر ایک کو متاثر کرتے ہیں۔

زکوٰۃ:

امت کے لئے ایک نصاب معین کیا گیا کہ اس سے کم پر زکوٰۃ ہی واجب نہیں ہوتی، اور جب واجب ہو جاتی ہے تو صرف چالیسواں حصہ دینا ہوتا ہے۔ باقی سب مال حلال و مباح بلکہ پاکیزہ اور طیب۔ مگر آنحضرت ﷺ کا دستور العمل پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نے طے فرمالیا تھا کہ کاشانہ نبوت سونے چاندی سے پاک رہے گا۔ دینار تو دینار درہم کی بھی مجال نہیں تھی کہ وہ دولت کدہ پاک میں رات گزار سکے۔ ★

جہاد:

جہاد کے سلسلہ میں عام مسلمانوں کے لئے زحف عن القتال (یعنی جنگ کے وقت میدان جنگ سے

---

❸ مشکوٰۃ شریف از شعب الایمان للبیہقی باب الشفعہ والرحمۃ علی الخلق۔

❶ بخاری شریف ص ۲ و ص ۲۵۵ وغیرہ

★ اس سلسلہ میں مفصل بحث پہلے گزر چکی ہے کہ کس طرح سب کچھ خرچ کر کے فاقہ اختیار کیا جاتا تھا (محمد میاں)

بھاگ جانا) حرام ہے، لیکن آنحضرت ﷺ کی شان یہ تھی کہ ابھی دولتکدہ سے بھی نہیں نکلے صرف ہتھیار سجائے ہیں۔ اس وقت ہر ایک مسلمان کے لئے جائز ہے کہ وہ اسلحہ اتار دے اور موقع ہو تو ارادہ جنگ بھی ملتوی کر دے۔ لیکن آنحضرت ﷺ ہتھیار سجانے کے بعد جائز نہیں سمجھتے تھے[1] کہ اسلحہ اتار دیں جب تک فیصلہ کن جنگ نہ کر لیں۔

غرض یہ کردار تھا جس کو پیش کرتے ہوئے آپ آیات اللہ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ جو قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے وہ آپ کے عمل سے آیات اللہ کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

خلاصہ کلام :

تلاوت آیات اللہ کی تشریح کو ہم تبرکاً شہید وفا عبد اللہ[2] بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے اشعار پر ختم کرتے ہیں۔

۱۔ وفینا رسول اللہ یتلوکتابہ	اذانشق معروف من الفجر ساطع
۲۔ ارانا الھدی بعدالعمی فقلو بنا بہ	موقنات ان ماقال واقع
۳۔ یبیت یجافی جنبہ عن فراشہ	اذا استثقلت بالمشرکین المضاجع

(بخاری شریف ص ۱۵۵)

”ترجمہ : (۱) ہمارے بیچ میں اللہ کے رسول ہیں) ﷺ (جو کتاب اللہ کی تلاوت اس وقت کرتے ہیں جب کہ وہ معروف اور جانی پہچانی شئ جو روشن ہوتی ہے جس کو فجر کہتے ہیں۔ شق ہوتی ہے (پو پھٹتی ہے) (۲) اس اللہ کے رسول نے ہمیں نابینائی (گمراہی) کے بعد ہدایت کا راستہ دکھایا۔ پس ہمارے قلوب اس کا یقین رکھتے ہیں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ ہو کر رہے گا۔(۳) یہ اللہ کے رسول اس طرح رات گذارتے ہیں کہ آپ کا پہلو بستر سے الگ رہتا ہے (خاص) اس وقت جبکہ مشرکین (بستر پر دراز ہوتے ہیں اور) بستر ان کے جثوں سے بوجھل ہوتے ہیں۔

تعلیم الکتاب

یُعَلِّمُھُمُ الکِتٰب:

ہزاروں فتاویٰ اور فیصلے جن سے ملت اسلامیہ کے اہل علم حضرات فقہاء استدلال کرتے ہیں اور

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۱۳ ج ۴

[2] وہ جاں نثار اور فداکار جو غزوہ موتہ میں شہید ہوئے۔

غیر مسلم فضلاء کے لئے شمع بصیرت ہیں وہ انہیں غیر متمدن اور پس ماندہ کاشتکاروں یا چرواہوں کے ارشاد فرمودہ ہیں جن کی پس ماندگی کا شاہ ایران مذاق اڑایا کرتا تھا اور خود مکہ کے سردار ان کو حقیر سمجھتے تھے، یہاں تک کہ ابوجہل کو جانکنی کے وقت صدمہ تھا تو یہ کہ اس کو مدینہ کے کسانوں نے مارا۔ یا ان کے ارشادات و فرمودات ہیں جو مکہ کے معمولی دوکاندار تھے اور تحقیق کی جائے تو ان میں کچھ وہ بھی تھے جو رہزنی کیا کرتے تھے اور کچھ وہ تھے کہ بقول علامہ حالی:

تعیش تھا، غفلت تھی، دیوانگی تھی غرض ہر طرح کی حالت بری تھی

ان حضرات نے نہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی نہ کسی دارالعلوم یا دارالافتاء سے استفادہ کیا تھا۔ ان کی تعلیم گاہ و تربیت گاہ اسی ہادی اعظم کی خس پوش مسجد تھی جس کو رب العرش نے تعلیم کتاب کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔

پھر ان میں سے ۲۳ سالہ دور نبوت کے رفقاء تو چند ہی تھے جن کی تعداد چالیس بھی نہیں تھی۔ مدینہ طیبہ کا دس سالہ دور بھی سب کو نصیب نہیں ہوا۔ بہت [1] سے وہ تھے جن کو دو تین سال اور بعض وہ بھی تھے جن کو چندماہ ہی میسر آئے مگر اخذ واستنباط کی وہ غیر معمولی بصیرت نصیب ہوگئی کہ یونیورسٹیوں اور دارالعلوموں کے تعلیم یافتہ فضلاء ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ بصیرت کے ساتھ جو وسعت ذہن میسر آئی وہ بھی پیغمبرانہ تربیت کی برکت تھی۔ یعنی جس طرح وہ خود اخذ واستنباط سے کام لیتے تھے وہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اسی طرح اخذ واستنباط کا حق دوسرے کو بھی ہے۔ وہ جس طرح اپنی رائے کا احترام کرتے تھے دوسرے کے فیصلہ کا بھی اسی طرح احترام کرتے تھے۔

چنانچہ جن اجتہادی مسائل میں آج اختلاف ہے حضرات صحابہ کے دور میں بھی یہ اختلاف تھا۔ اسی لئے ہر ایک فریق کے پاس جس جس طرح آنحضرت ﷺ کی کوئی حدیث ہے کسی صحابی کا قول، یا فیصلہ بھی، وہ اپنے خزینہ یادداشت میں محفوظ رکھتا ہے، مگر باہمی تصادم سے یہ حضرات محفوظ تھے۔ اور سبق آموز بات یہ ہے کہ نہ باہمی رشک وحسد تھا، نہ شوق تعلی نہ جذبہ برتری، تحقیق مسئلہ کے وقت کھلے طور پر تنقید اور جرح، مگر وقت نماز آگیا تو جماعت میں سب شریک، بسا اوقات امام وہی بنا جو نشانہ اختلاف تھا۔

یہ تھا تعلیم الکتاب کا ایک رخ اور حضرات صحابہ پر اس کا اثر۔ دوسری صورت ملاحظہ فرمائیے۔

(ا) قرآن حکیم میں تغییر خلق اللہ یعنی اللہ کی بنائی ہوئی صورت میں تبدیلی پیدا کرنے کو شیطانی فعل فرمایا گیا ہے۔ [2] مگر تغییر خلق اللہ کا لفظ عام ہے۔ جس طرح مردوں کا خصی کرنا تغییر خلق اللہ ہے اور حرام ہے، ختنہ کرنا بھی تغییر خلق اللہ ہے۔ علیٰ ہذا بدن کے کسی حصے کے بال منڈوانا یا کٹوانا۔ یا اکھاڑنا،

---

[1] جیسے حضرت ابوہریرہ ابوموسیٰ اشعری، خالد بن ولید، عمرو بن العاص، عدی بن حاتم رضی اللہ عنہم

[2] سورہ نساء آیت ۱۱۹

ناخون تراشنا یا گدھوانا، یا عورتوں کے سر کے بال مصنوعی طور پر بڑھانا یا چہرے کے بال نوچنا، دانتوں میں مصنوعی طور پر کشادگی پیدا کرنا، ان باتوں میں خدا کی بنائی ہوئی صورت میں تبدیلی ہوتی ہے۔ پس جس کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم الکتاب کے لئے مبعوث فرمایا تھا اس نے ان تمام کی تفصیل فرمائی۔ بعض تغیرات کو مستثنیٰ فرمایا۔ مثلاً ارشاد فرمایا:

الفطرۃ خمس، الختان والاستحداد، وقص الشارب و تقلیم الاظفار و نتف الابط [1]

یعنی یہ پانچ چیزیں، اگرچہ ان میں تغییر خلق اللہ ہے مگر یہ تغییر بتقاضاء فطرت ہے، یہ تغییر حرام نہیں ہے بلکہ فطرت ہے۔ ختنہ کرانا، موئے زیر ناف کو صاف کرنا، مونچھیں کٹوانا، ناخون کتروانا، بغل کے بال اکھیڑنا۔

اس کے مقابل دوسرا ارشاد یہ ہوا:

خالفوا المشرکین۔ وفروا اللحی واعفوا الشوارب [2]

"مشرکین کے خلاف یہ طریقہ اختیار کرو کہ داڑھی بڑھاؤ اور مونچھوں کو خوب باریک کترواؤ"

عورتوں کے متعلق ارشاد ہوا:

لعن اللہ الواشمات والمتوشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغیرات لخلق اللہ۔ [3]

ترجمہ: "ان عورتوں پر خدا کی لعنت جو گودتی ہیں جو گدواتی ہیں جو بال نوچتی ہیں جو خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے دانتوں میں کشادگی کراتی ہیں جو خدا کی بنائی ہوئی صورت کو بدلتی ہیں۔"

خلاصہ یہ کہ تغییر خلق اللہ کی تفسیر و تشریح کہ بعض کو جائز اور مستحسن قرار دیا اور بعض کو ممنوع اور حرام۔ یہ فریضہ نبوت تھا جس کو آنحضرت ﷺ نے انجام دیا۔

(۲) ارشاد ربانی ہے

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (سورہ البقرہ۔ ۲۷۵)

"اللہ تعالیٰ نے خرید و فروخت (تبادلہ) کو حلال قرار دیا اور ربوا (ایسی زیادتی جو بدل سے زیادہ ہو) کو حرام قرار دیا۔"

اب قرض کی صورت میں اگر پانچ روپیہ کے بجائے چھ روپیہ وصول کئے جاتے ہیں تو ظاہر ہے یہ ایک روپیہ بدل سے زائد ہے۔ ربوا یعنی سود ہے۔ لیکن اگر ایک تولہ چاندی کو دو تولہ چاندی، یا ایک سیر گیہوں کو دو سیر گیہوں کے بدلہ میں فروخت کیا جائے۔ تو کیا یہ بیع جائز ہو گی؟ آنحضرت ﷺ نے اس

---

[1] بخاری شریف ص۸۷۵ ،

[2] بخاری شریف ص۸۷۵ ،

[3] بخاری شریف ص۸۷۹

کو بھی حرام فرمایا۔ اور نہ صرف چاندی اور گیہوں بلکہ اس طرح ❶ کی اور چیزوں کے متعلق بھی نہایت سختی کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اگر ہم جنس سے تبادلہ ہے مثلاً سونے کی بیع سونے کی کسی چیز سے ہو رہی ہے تو اس میں بھی مساوات اور نقد ہونا ضروری ہے، نہ کم و بیش جائز ہے نہ ادھار۔ ❷

ان دو مثالوں میں سے ایک کا تعلق خرید و فروخت سے ہے دوسرے کا تعلق آرائش بدن سے۔ ان کے علاوہ ہزاروں مسائل ہیں جن کا تعلق عبادات، معاملات، معاشرت، اقتصاد، امور خانہ داری، آداب مجلس یا ملکی سیاست یا بین الاقوامی تعلقات سے ہے۔ قرآن حکیم نے ان کے متعلق اصولی تعلیم دی ہے اور کہیں صرف اشارہ کر دیا ہے۔

ارشادات رسول اللہ ﷺ جو کتب حدیث کے ہزاروں صفحات میں محفوظ ہیں ان کی توضیح اور تشریح کرتے ہیں۔ پھر حضرات ائمہ مجتہدین نے ان سے اصول اخذ کر کے پیش آنے والے معاملات کو ان اصول کے معیار پر جانچ کر احکام مرتب کئے جو کتب فقہ میں منضبط ہیں۔

ارشادات رسول اللہ ﷺ کی تصدیق حضرت حق جل مجدہ نے فرمادی کہ ارشاد ہوا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم آیت ۳و۴)

"اپنی چاہ اور اپنے نفس کی خواہش پر آپ کچھ نہیں کہتے، آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ وحی ہوتی ہے جو آپ پر نازل کی جاتی ہے۔"

نیز حضرت حق جل مجدہ کا ارشاد ہے:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (حشر۔ ۷)

جو کچھ تمہارے سامنے پیش کریں رسول، اس کو لے لو، اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔"

آنحضرت ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم اعلیٰ بنا کر بھیجا تو آپ نے

---

❶ حدیث میں ایسی چھ چیزیں شمار کی گئی ہیں جن کا تبادلہ اگر ہم جنس سے ہے تو زیادتی اور ادھار حرام ہے۔ تبادلہ برابر سرابر اور ہاتھ در ہاتھ ہونا چاہئے۔ چاندی، سونا، گیہوں، جو، کھجور اور نمک۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے یہ اصول اخذ کیا کہ ایسی تمام چیزیں جو وزن کر کے یا صاع یا رطل جیسے پیمانہ سے ناپ کر بیچی جائیں اگر ان کا تبادلہ ہم جنس سے کیا جائے تو ان میں مساوات اور ہاتھ در ہاتھ ہونا ضروری ہے لہذا چاول، جوار، مکی وغیرہ کا تبادلہ اگر ہم جنس سے کیا جائے مثلاً چاول کی بیع چاول سے کی جائے تو مساوات اور ہاتھ در ہاتھ ہونا ضروری ہے نہ اضافہ جائز ہے نہ ادھار، کیونکہ یہاں جنس کا بھی اتحاد ہے اور قدر بھی متحد ہے کہ دونوں وزنی ہیں وزن کر کے بیچی جاتی ہیں۔ واللہ اعلم

❷ پانچ سیر گیہوں کی قیمت ایک روپیہ بھی لگا سکتے ہیں اور ایک ہزار روپیہ بھی۔ یہ بائع اور مشتری کی باہمی رضامندی پر ہے کہ وہ پانچ سیر گیہوں کو ایک روپیہ کی برابر قرار دیں یا ایک ہزار کے برابر۔ لیکن ہم جنس میں یعنی گیہوں کی بیع گیہوں سے ہو تو وہاں پانچ سیر گندم کو دس سیر گندم کے برابر قرار دینا غلط ہو گا۔ البتہ جو جنس ایسی ہے کہ وہ کیل یا وزن کر کے نہیں بیچی جاتی، گزوں سے ناپ کر یا مثلاً شمار کر کے بیچی جاتی ہے جیسے کپڑا، وہاں امام ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق یہ جائز ہے کہ ایک گز کپڑے کو ایک ہزار گز کپڑے کے عوض میں بیچا جائے مگر نقد۔

دریافت فرمایا:

کوئی مقدمہ آپ کے سامنے آئے گا تو آپ کس طرح فیصلہ کرینگے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کتاب اللہ کے مطابق اور اگر کتاب اللہ میں اس معاملہ کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہوگی تو رسول اللہ کی سنت کے بموجب۔ اور اگر سنت رسول اللہ یعنی آپ کے جو ارشادات یا واقعات میرے علم میں ہیں ان میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہوگی تو اپنے اجتہاد سے کام لوں گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے سینہ پر دست مبارک رکھ کر فرمایا: الحمد لله وفق رسول رسول الله لما یرضی به رسول الله

"الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے رسول کے رسول (فرستادہ) کو اس کی توفیق فرمائی جس کو اللہ کا رسول پسند کرتا ہے۔"

اس ارشاد گرامی نے حضرات مجتہدین کے اجتہاد کی تصویب اور تائید فرمادی۔

تعلیم الحکمہ

یعلمهم الکتب والحکمة:

سکھاتے ہیں ان کو (علماء امت کو) کتاب اور حکمت [1] یعنی کتاب اللہ کی تعلیم کے ساتھ آپ ایسے اصول کی تعلیم بھی دیتے ہیں جن پر قانونی عدل اور دستور و آئین کی حسین اور شاندار عمارت سر بفلک کی جاسکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات ملاحظہ فرمائیے: وہ ایسے ہی اصول کا مجموعہ ہیں یہاں خطبات کے علاوہ چند حدیثوں کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے:

ارشاد ہوا۔ حلال بھی واضح ہے حرام بھی واضح ہے۔ لیکن دونوں کے درمیان کچھ ایسے امور ہیں

---

[1] قرآن حکیم میں یہ الفاظ تین جگہ آئے ہیں۔ سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ جمعہ، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حکمت کا ترجمہ سورہ بقرہ اور آل عمران میں علم کیا ہے اور سورہ جمعہ میں دانش۔ شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ نے (علی الترتیب) تین ترجمے کئے ہیں: پکی باتیں، کام کی بات، عقلمندی۔ مگر ظاہر ہے یہ سب ترجمے تشریح طلب ہیں۔ احقر نے اپنے الفاظ میں اس کی تشریح کردی ہے۔ جہاں تک حضرات مفسرین کا تعلق ہے تو ان کے ارشادات یہ ہیں۔ مایکمل نفوسهم من المعارف والاحکام وقیل هی السنته وقیل هی القضاء وقیل الفقه (ص ۱۳۱ تفسیر مظہری ج ۱) الحکمة العلوم الحقة المستحکمة التی یستفیدها الحکیم من الحکیم بلاتوسط (کتاب ولا بیان تفسیر مظہری ص ۱۶۶ ج ۳۲) الحکمة الشریعة المحکمة المطابقة بشرائع الانبیاء فی الاصول المشهود علیها بالکتب السماویة بالقبول ایضاً (تفسیر مظہری ص ۲۷۵ ج ۹) اصابة الحق بالعلم والعقل قضیه صادقه (المفردات فی غریب القرآن)

جن میں کچھ مشابہت حلال کی ہے کچھ مشابہت حرام کی۔ پس جس نے ایسے مشتبہ امور سے تقویٰ اختیار کیا اور احتیاط برتی۔ اس نے اپنے دین کو بھی اعتراض سے بری کر لیا اور اپنی آبرو بھی بچالی اور جو ان مشتبہ امور میں پڑ گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو اپنے مویشی سرکار کی محفوظ چراگاہ کے پاس چرا رہا ہے قریب ہے کہ وہ مویشی کو اس چراگاہ میں اتار دے۔

"یادرکھو ہر ایک سرکار کی چراگاہ ہوتی ہے۔ یادرکھو (احکم الحاکمین) اللہ تعالیٰ کی چراگاہ حرام امور ہیں۔ یادرکھو بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے وہ ٹھیک رہتا ہے تو بدن ٹھیک رہتا ہے۔ وہ بگڑ جائے تو بدن بگڑ جاتا ہے۔ یادرکھو یہ گوشت کا ٹکڑا وہ ہے جس کو "دل" کہا جاتا ہے۔"❶

اس ارشاد گرامی نے بہت سے اصول کی تعلیم دیدی۔ مثلاً یہ کہ ❷ ایسے تمام امور جن کے جواز اور عدم جواز میں کلام ہو۔ تقویٰ یہ ہے کہ ان کو نہ کیا جائے۔ اصطلاح فقہ میں ایسے امور کو مکروہ کہا جاتا ہے جو درجہ بدرجہ تنزیہی، تحریمی، پھر تحریمی قریب بحرام ہوتا ہے۔

یا مثلاً یہ کہ عقائد و خیالات کی اصلاح سب سے مقدم ہے۔ عقائد خراب ہوتے ہیں تو دل کے جذبات بھی خراب ہوتے ہیں، جو عمل کو خراب کر دیتے ہیں۔

(۲) اسی حدیث میں یہ اضافہ بھی ہے۔❸

"پس جو شخص مشتبہ کام کو چھوڑ دے وہ غیر مشتبہ حرام کو بدرجہ اولیٰ چھوڑ دیگا اور مجرمانہ جرأت کر کے مشتبہ کام کرنے لگے تو وہ عنقریب حرام میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔"

(۳) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں❹ ۔ ایک روز آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے۔ ہم بھی مجلس مبارک میں حاضر تھے۔ ارشاد ہوا:

"اپنے بعد مجھے تمہارے متعلق جس بات کا خطرہ ہے وہ دنیا کی وہ رونق و زینت ہے جو پوری زیبائش کے ساتھ تمہارے سامنے آئے گی۔"

ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ کیا خیر بھی شر کو لا سکتا ہے؟ (یعنی جب یہ رونق و زینت حلال اور جائز راستہ سے آئے گی تو پھر اس سے خطرہ کیوں ہے)۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ اس سوال پر آنحضرت ﷺ نے خاص توجہ فرمائی۔ آپ خاموش ہو گئے اور دیر تک خاموش رہے۔ ہمیں خیال ہوا کہ

---

❶ بخاری شریف ص ۱۳

❷ اس اصول کو سامنے رکھ کر فاتحہ، سوئم، چہارم، چہلم، برسی، شب برات، بی بی فاطمہ کی صحنک و محفل میلاد قیام وغیرہ پر نظر ڈالئے۔

❸ بخاری شریف ص ۲۷۵

❹ بخاری شریف ص ۱۹۸

شاید وحی نازل ہو رہی ہے۔ اس کے بعد آپ نے پسینہ پونچھا اور دریافت فرمایا: "سائل کہاں ہے"۔ گویا اس سوال کو آپ نے معقول قرار دیا۔ پھر فرمایا: "بیشک خیر شر کو نہیں لاتا بشرطیکہ خیر کے تقاضوں کو پورا کرتے رہو"۔ (یعنی دولت کی بنا پر جو حقوق ہوتے ہیں ان کو ادا کرتے رہو) ۔ پھر آپ نے مثال دیتے ہوئے فرمایا: "دیکھو موسم بہار میں جو سبزہ پیدا ہوتا ہے اگر جانور اس کو کھائے چلا جائے تو وہ سبزہ (جو نہایت عمدہ ہے اور سراسر خیر ہے) جانور کو مار ڈالتا ہے یا نیم جان کر دیتا ہے۔ ہاں وہ جانور جو سبزہ کھا کر ساتھ ساتھ ہضم بھی کرتا رہے اور سبزہ سے شکم سیر ہونے کے تقاضے کو پورا کرتا رہے، مثلاً یہ کہ یہی مویشی جب سبزہ سے شکم سیر ہو جائے اور اس کی کہیں تن جائیں تو گھومے پھرے، دھوپ میں بیٹھے۔ پھر فضلہ خارج کرے (اس کے بعد کھائے تو مفید ہو گا) پھر ارشاد ہوا: دیکھو یہ مال ہرا بھرا اور شیریں ہے۔ پس وہ اس مسلمان کا بہت اچھا دوست ہے جو مسکینوں، یتیموں، مسافروں اور ضرورت مندوں کو فراموش نہ کرے، ان کو بھی آسودہ کرتا رہے۔ اور دیکھو جو شخص بلا استحقاق کے مال لیتا ہے (مثلاً سوال کر کے) تو اس کی مثال ایسی ہے کھاتا رہتا ہے پیٹ نہیں بھرتا۔"

تزکیہ

ویزکیھم:

ان کو مانجھتا ہے (مولانا ابوالکلام آزاد)

ان کو سنوارتا ہے (حضرت شاہ عبدالقادر)

ظاہر ہے یہ دوسرا ترجمہ زیادہ حاوی [1]، جامع اور واقعہ اور حقیقتِ حال کے زیادہ مطابق ہے۔

کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اہل ایمان کو صرف مانجھا ہی نہیں بلکہ ان کو آراستہ بھی کیا ہے ان کو حسین اور جمیل بھی بنایا ہے۔ یعنی مانجھنے کے بعد سنوارا۲ بھی ہے۔ جس طرح یہ عمل بہت مشکل ہے کیونکہ یہ ایک کیمیا ہے اور کیمیا بھی وہ جو کانسی یا پیتل کو نہیں بلکہ زیر پا گرد و خس و خاشاک کو سونا بناتا ہے اسی طرح اسکی وسعت بھی اتنی زیادہ ہے کہ ہزاروں صفحات کے دامن بھی اس کو نہیں سمیٹ سکتے کیونکہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کو سنوارنے کی ضرورت نہ ہو۔ اور جو حسین و جمیل بننے کی

---

[1] لغت سے بھی قریب تر یہی ترجمہ ہے یعنی سنوارتا ہے۔ کیونکہ لفظ زکوٰۃ کے معنیٰ صرف پاک کرنا نہیں ہیں بلکہ خوشگوار اور تر و تازہ بنانے کے ہیں۔ زکی الرجل صلح و تنعم فھو زکی (قاموس) والزکوٰۃ لغۃ الطھارۃ والنماء والبرکۃ المدح (مجمع البحار) الزکوٰۃ النمو الحاصل من برکۃ اللہ تعالیٰ (الی ان قال) وبزکاء النفس وطھارتھا یصیر الانسان بحیث یستحق فی الدنیا الاوصاف المحمودۃ وفی الاخرۃ الاجر المثوبۃ (المفردات فی غریب القرآن)

صلاحیت نہ رکھتا ہو۔

فرد میں بھی خرابی ہوتی ہے۔ جماعت میں بھی، ظاہر میں بھی، باطن میں بھی، مرد میں بھی اور عورت میں بھی، پھر اندرون خانہ، بیرون خانہ، حلقہ درس و تلقین، محفل طرب و نشاط، بزم شعر و سخن، انجمن خورد و نوش، بازار، تجارتی کاروبار، بارگاہ عدل و انصاف یا ایوان سیاست اجتماعی مطالبات اور ان سے متعلق خواص کے نظریات، عوام کے جذبات، طرح طرح کی تحریکات، سیاسی چالیں، شاطرانہ حرکتیں، میدان جنگ، جشن فتح یا صلح کانفرنس وغیرہ۔ قدرتی بات ہے کہ ان میں خرابیاں بھی ہوتی ہیں اور خوبیاں بھی۔ خرابیوں کو دور کر کے خوبیاں پیدا کرنا۔ خرابیوں کے عوامل اور محرکات کو پہچان کر دلوں کو ان سے پاک کرنا اور ان کے برخلاف خدا پرستی، صدقات ہمدردی، اخلاص اور ان کے جذبات کو دلوں کے نہان خانوں میں جلوہ گر کرنا ان سب کا نام "تزکیہ" ہے۔ [1]

ان تمام وسعتوں کے ساتھ "تزکیہ" کو فرائض نبوت میں شمار کرایا گیا۔ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ ★ خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ نے اس فریضہ کو حسن و خوبی اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ مگر کس طرح انجام دیا اور آئندہ کے لئے کیا کیا۔ ہدایتیں فرمائیں ان کی تفصیلات کے لئے آپ حدیث، تفسیر، فقہ، سیر و مغازی۔ تہذیب اخلاق، تصوف و احسان کی کتابیں ملاحظہ فرمائیں۔ اس مختصر مجموعہ میں ان کا مختصر بیان بھی ممکن نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان تمام فرائض میں جو پہلے بیان کئے گئے (تلاوت آیات اللہ۔ تعلیم الکتاب تعلیم الحکمہ) تزکیہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ گویا نصب العین تزکیہ ہی ہے اور تمام امور اس کے مقدمات اور ابتدائی مراحل ہیں۔

تزکیہ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ نہ صرف عبادات و اخلاق اور احسان و سلوک کی بنیاد تزکیہ پر ہے بلکہ اسلام نے معاشرت، معیشت، سیاسی نظام اور اس کے لئے مالی نظام انتہا یہ کہ جنگ اور صلح کی بنیاد بھی تزکیہ پر ہی رکھی ہے۔ مقاتلہ و مبارزہ، دشمن کو تباہ کرنا، اس کے ملک کو برباد کرنا "جہاد فی سبیل اللہ" اسی وقت ہو گا جب لڑنے والے وہ ہوں جو اپنا تزکیہ کر چکے ہوں۔ تزکیہ کے بغیر یہ قتل و قتال فساد فی الارض ہے۔ یہی تزکیہ ہے۔ جو زندگی کے ہر ایک شعبہ میں کارفرما ہے۔ مثلاً

ا۔ معاشرت اور سماجی زندگی میں سب سے پہلی چیز نکاح اور ازدواج ہے۔ وحی الٰہی کی ہدایت

---

[1] مثلاً صرف مرض بخل رفع نہیں کیا بلکہ سیر چشمی، وسعت نظر اور جذبات ہمدردی خلق خدا سے ان کو آراستہ بھی کیا۔ (محمد میاں)

★ ملاحظہ فرمایئے آیت ۱۶۴ سورہ آل عمران و آیت ۲ سورہ جمعہ جو قبولیت دعا کے سلسلہ میں ص ۳۶۹ پر گزری اور اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ حضرات صحابہ کو کتاب اللہ نے الرشدون کی سند عطا فرما دی اور انہیں کو رشد و ھدیٰ کا معیار قرار دیا أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً (سورہ حجرات ۔ ۸)

ہے ۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۳۰ (سورہ نور۔ ۳۰)

"کہہ دیجئے مسلمانوں سے، نیچی رکھیں اپنی نگاہیں اور حفاظت کرتے رہیں اپنی شرمگاہوں کی۔ یہ ان کے لئے زیادہ تزکیہ (صفائی اور پاکی) کی بات ہے بیشک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں "۔

اس تزکیہ کو سامنے رکھ کر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یامعشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء [1]

نوجوانو! جو ازدواجی زندگی کی ضروریات پورا کرنے کی استطاعت اور گنجائش رکھے وہ ازدواجی زندگی اختیار کرے [2] کیونکہ اس سے نگاہ پوری طرح نیچی ہوتی ہے اور فرج کی پوری حفاظت ہوتی ہے اور جس میں یہ گنجائش نہ ہو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ روزے رکھے جو شہوانی رجحانات کو مفلوج اور مضمحل کر دیتے ہیں۔

ایک دوسرے کے مکان میں جانے کے لئے وحی الٰہی نے استیذان کو ضروری قرار دیا کہ پہلے اجازت حاصل کرو۔ استیذان کے ساتھ سلام بھی کرو۔ پھر ارشاد ہوا:

وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (سورہ نور۔ ۲۸)

"اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس ہو جاؤ تو واپس ہو جایا کرو۔ یہی تمہارے لئے صفائی اور ستھرائی (تزکیہ) کی بات ہے اور جو تم کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔" [3]

۲۔ معیشت اور کاروبار کے سلسلہ میں تجارت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن تاجر کے لئے

---

[1] بخاری شریف ص۷۵۸

[2] اسلام تجرد کو پسند نہیں کرتا۔ تجرد رہبانیت ہے اور سادھو پنا ہے جو نصب العین نہیں بن سکتا۔ کیونکہ زندگی کی دلچسپیوں کو ختم کر دیا جائے تو ترقیات کی طرف بڑھنے والے قدم بوجھل ہو جائیں، دنیا اپنی رونق کو کھو بیٹھے اور معاشرہ انسانی کی چہل پہل ختم ہو جائے۔ اسلام ارتقاء اور تعمیر کا حامی ہے۔ وہ کسی گوشہ میں بھی تخریب کو پسند نہیں کرتا صرف اس تخریب کو جائز قرار دیتا ہے جو تعمیر کے لئے ہو۔

[3] شروع سے پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے "اے ایمان والو مت جایا کرو گھروں میں اپنے گھروں کے سوا۔ جب تک ان سے اجازت نہ لے لو اور (اجازت لینے سے پہلے) ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کر لو (مثلاً یہ کہو: السلام وعلیکم! کیا حاضر ہو سکتا ہوں) یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا پورا خیال رکھو گے۔ پھر اگر ان گھروں میں تم کو کوئی آدمی معلوم نہ ہو تب بھی ان گھروں میں نہ جاؤ جب تک تم کو اجازت نہ دیدی جائے۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہی تمہارے لئے صفائی ستھرائی کی بات ہے۔

ضروری ہے کہ "الصدوق الامین" (پوری طرح سچا معاملا کرنے والا امانت دار) ہو۔ خیانت اور غلط بیانی وغیرہ سے تزکیہ کر چکا ہو۔

ہر طرح کے کاروبار کے سلسلہ میں ارشاد ہوا: اللہ تعالیٰ طیب (پاک صاف ستھرا) ہے وہ پاکی اور ستھرائی کو پسند کرتا ہے اور پاک اور ستھری چیز ہی قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی ان باتوں کا حکم فرمایا جن کا حکم انبیاء علیہم السلام کو فرمایا تھا۔ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے گروہ پیغمبران! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو"۔ [1]

اسی طرح مسلمانوں کو خطاب فرمایا: اے ایمان والو! کھاؤ وہ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں" اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس شخص کا ذکر کیا جو لمبا سفر کرتا ہے، پراگندہ سر، گرد سے اٹا ہوا اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا کر دعا کرتا ہے: یارب! یارب اور حالت یہ ہے کہ اس کی خوراک حرام، اس کا پانی حرام (ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہوا) اس کا لباس حرام، حرام غذا سے اس کا نشو و نما ہوا۔ ایسے شخص کی دعا کیا قبول ہو سکتی ہے؟ (ترمذی شریف تفسیر سورہ البقرہ ص۱۲۳ ج۲)

حرص، طمع، خود غرضی، بخل، نفع اندوزی، ناپاک خصلتیں ہیں جن سے تزکیہ ضروری ہے۔ یہی خصلتیں ربوا اور سود کی علت پیدا کرتی ہیں۔ لہٰذا نہ صرف سود حرام ہے بلکہ ہر ایسا کاروبار اور ہر ایسا معاملہ حرام جس میں سود کا شبہ ہو۔

سیاسی نظام میں چوٹی کا فرد یعنی سربراہ وہ ہونا چاہئے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ یعنی تزکیہ نفس میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (سورہ حجرات۔۱۳)

"اللہ کے یہاں سب سے زیادہ مستحق احترام وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا ترس اور پرہیز گار ہو۔"

حکومت کیا ہے:

اسلام نے نماز اور روزہ کی طرح حفاظت جان و مال، عصمت اور آبرو کی حفاظت، تعلیم و تربیت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر یعنی اچھی باتیں بتانا ان پر عمل کرانا، بری باتوں سے خود رکنا اور دوسروں کو بھی روکنا، عدل و انصاف، غریبوں کی پرورش، کمزوروں کی مدد، مظلوموں کی فریاد رسی، بیمار کی تیمارداری، ملک اور قوم کی حفاظت وغیرہ کو بھی افراد کے فرائض قرار دیا ہے یعنی ہر ایک مسلمان کا خود اپنا فرض ہے کہ اپنی پوری طاقت و استطاعت ان فرائض کو انجام دینے میں مصروف کرے، ورنہ وہ عند اللہ جوابدہ ہو گا

---

[1] ایسے تاجر کا حشر انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء امت کے ساتھ ہو گا (ترمذی وابن ماجہ وغیرہ) اس کے برخلاف جو تاجر خیانت کرے (اچھا نمونہ دکھا کر برا مال دے یا ملاوٹ کرے، وغیرہ) اس کے متعلق ارشاد ہوا کہ اس کو مسلمان کہنا درست نہیں (من غش فلیس منا۔ ترمذی شریف ص۱۵۷) چور بازاری کرنے والا ملعون ہے (المحتکر ملعون۔ ابن ماجہ وغیرہ)

۔ لیکن جب تک باہمی تعاون نہ ہو بہت ❷ سے فرائض ایسے ہیں جو انجام نہیں پاسکتے۔ اسی باہمی تعاون کے وسیع نظام کا نام نظام حکومت ہے اس کے سربراہ کو خلیفہ المسلمین کہا جاتا ہے یعنی تمام مسلمانوں کا نائب اور ان کا قائم مقام۔

مالی نظام:

سیرۃ مبارکہ کا دامن اس جبر و قہر سے پاک ہے جو ٹیکسوں کے وصول کرنے کے لئے عمل میں لایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام حکومت کی مالی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے جو مالیہ وصول کیا جائے اسلام نے اس کی بنیاد بھی تزکیہ پر رکھی ہے۔

خود غرضی، حرص و طمع، حب مال اور بخل وہ ناپاک خصلتیں ہیں جن سے نفس مومن کا پاک ہونا ضروری ہے۔ یہ نفس کی خباثت ہے کہ دولت و ثروت کی محبت قومی اور ملی ضرورتوں سے اس کی آنکھ بند کر دے۔

جس طرح نماز روزہ فرض ہے ایسے ہی جہاد بھی فرض ہے، جو مال سے بھی ہوتا ہے اور جان سے بھی، جو اسلام اور ایمان کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کی بیداری یہ ہے کہ مسلسل ❶ جہاد کرتا رہے۔ صاحب مال جہاد بالمال بھی کرے گا۔ یہ جہاد در حقیقت خود اپنے نفس سے ہوگا۔ وہ نفس جو بارگاہ بخل ❷ اور دربار حرص و طمع میں ہر وقت حاضر رہتا ہے اس کو مجبور کرنا ہوگا کہ وہ اس ظلمت کدہ سے نکلے۔ خود غرضی

---

❷ مثلاً عدل و انصاف اور مظلوموں کی فریادرسی کے لئے پنچائتوں یا عدالت کا قیام، غریبوں اور کمزوروں کے وظائف، تعلیم و تربیت کے لئے تعلیمی اور اصلاحی ادارے، بیماروں کی تیمارداری کے لئے ہسپتال اور شفاخانے، ملک و قوم کی حفاظت کیلئے قوت دفاع یعنی فوج اور سامان جنگ وغیرہ۔

❶ مقصد یہ ہے کہ تمام فرائض جو حکومت کے فرائض قرار دیئے جاتے ہیں اسلام نے ان کو اہل ایمان کے شخصی اور ذاتی فرائض قرار دیا ہے۔ اسلامی تعلیم کے بموجب اگر ان فرائض کا احساس ہوگا تو اس کا مبارک نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کوئی ہیئت جابرہ اور چیرہ دست طاقت نہیں ہوگی جو قانون کے ذریعے اپنی چیرہ دستی کا مظاہرہ کرے بلکہ نظام حکومت ذریعہ تعاون اور امداد باہمی کا ایک رابطہ ہوگا جس میں ہر ایک فریق دوسرے کا مددگار، احسان مند اور دعاگو ہوگا۔ قوم اپنے سربراہ اور اس کے کارپردازوں کی شکر گذار اور احسان مند اس لئے ہوگی کہ ان کے ذریعہ اس کے ذاتی فرائض حسن و بخوبی سے انجام پارہے ہیں۔ سربراہ اور اس کے اعمال قوم کے شکر گذار اس لئے ہونگے کہ قوم کے تعاون نے ان کی ذمہ داری کی مشکلات کو آسان کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کے ایک ارشاد کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے جو اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ترجمہ یہ ہے: "تمہارے بہترین سربراہ وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو وہ تم سے محبت رکھیں۔ تم ان کو دعائیں دو وہ تم کو دعائیں دیں اور بدترین سربراہ وہ ہونگے کہ تم ان سے بغض رکھو وہ تم سے بغض رکھیں۔ تم ان پر لعنت بھیجو وہ تم پر لعنت بھیجیں۔ (مسلم شریف ص۱۲۹ ج۲) إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ (التوبہ۔۱۱۱)

❷ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ (النساء۔۱۲۸)

کی غلاظت سے اپنا دامن پاک کرے۔ [3]

ہنگامی اور غیر معمولی ضرورتوں کے لئے جو امداد حاصل کی جائے قرآن حکیم نے اس کو انفاق فی سبیل اللہ یا قرض کا عنوان دیا ہے۔ لیکن ایک مقررہ چندہ جو صاحب نصاب پر سال بہ سال فرض ہوتا ہے اس کا نام زکوٰۃ ہے کیونکہ اس کا مقصد تزکیہ ہے۔ یعنی نفس مومن کو بخل کی آلودگی سے پاک کرنا۔ اس تمہید کے بعد ارشاد ربانی کے مضمرات پر گہری نظر ڈالئے۔

ارشاد ربانی ہے:

خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ (توبہ،۱۰۳)

ترجمہ: ”اے رسول! ان لوگوں کے مال سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو (یہ اس لئے کہ) تم ان کو (بخل اور حب مال کی پلیدی سے) پاک کرو اور ان کا تزکیہ کرو (ان کو سدھاؤ اور ان کی تربیت کرو کہ ہمدردی خلق خدا، سیر چشمی، داد و دہش اور امداد باہمی وغیرہ کے وہ عادی ہو جائیں اور یہ باتیں ان کی طبعیت ثانیہ بن جائیں) اور ان کو دعا دو۔ بیشک آپ کی دعا ان کے دلوں کے لئے راحت و سکون ہے۔

حب مال سے صحابہ کرام کے مبارک قلوب کس درجہ پاک ہوئے، حضرات مہاجرین اور حضرات انصار کی قربانیاں اس کی مثال پیش کرتی ہیں۔ حضرات مہاجرین کے پاس جو کچھ تھا وہ انہوں نے مکہ میں خرچ کیا اور اس حالت میں مدینہ پہنچے کہ قرآن حکیم نے ان کے لئے لفظ فقراء [1] استعمال کیا۔

حضرات انصار کی قربانیاں آپ اسی کتاب میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ تمام جائیدادیں نصف نصف تقسیم کر چکے۔ پھر بھی ان کی آرزو رہتی تھی کہ راہ خدا میں زیادہ سے زیادہ خرچ کریں۔ آنحضرت ﷺ نے بحرین کی جائیدادوں سے ان کے نقصانات کی کچھ تلافی کرنی چاہی تو اس کو لینے سے معذرت کر دی کہ پہلے مہاجرین کو آپ عنایت فرمائیں۔ تب یہ جائیدادیں لیں گے ورنہ ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

حب جان سے تزکیہ کا اندازہ کرنے کے لئے اس بے پناہ شوق شہادت پر نظر ڈالئے جو ان حضرات کے مبارک دلوں اور سینوں میں بھر دیا گیا تھا۔

”فزت و رب الکعبہ“ (میں کامیاب ہو گیا ہوں خدا کی قسم) کسی مجاہد نے دشمن کے قتل کرنے پر نہیں کہا تھا۔ حرام بن ملحان کے جب دھوکہ سے نیزہ مارا گیا اور خون کا فوارہ ابل پڑا تو اس خون شہادت سے وضو [2] کرتے ہوئے آپ نے نعرہ لگایا تھا:

---

[3] وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (الحشر۔۹)

[1] لِلۡفُقَرَآءِ الۡمُهٰجِرِيۡنَ الَّذِيۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَاَمۡوَالِهِمۡ (سورہ حشر۔۸)

[2] قال بِدِہٖ ھٰکذا فنضحه علی وجهه و راسه ثم قال فزت و رب الکعبه (بخاری شریف ص۵۸۷) اشارہ کر کے بتایا کہ خون کو اس طرح چلّو میں لیا اور اس کو چہرہ پر ڈالا سر پر چھڑکا اور کہا فزت و رب الکعبہ

"فزت ورب الکعبہ" (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا)

(میں اپنی مراد کو پہنچ گیا) یہ پَرتو تھا اس آرزو شہادت کا جس کے لئے سید الانبیاء کا قلب مبارک بیتاب رہا کرتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے میری تمنا ہے کہ راہ خدا میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ [1]

حضرت عبداللہ بن حبشی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟

ارشاد ہوا: "مذا هریق دمه و عقر جواده [2]" جس کا گھوڑا بھی مارا گیا اور خود اس کا خون بھی بہادیا گیا۔

تزکیہ کا عجیب وغریب طریقہ:

مرض کے علاج کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ کسی مقوی خمیرہ سے بدن کی اصل طاقت کو بڑھادیا جائے تو قوت غریزیہ مرض کو دور کر دیگی۔ شراب جو عرب کی گھٹی میں پڑی تھی اس کے انسداد کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔

وحی الٰہی ناطق ہوئی:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء۔ ۴۳)

"مسلمانو! (ایسانہ کرو کہ تم نشہ کی حالت میں ہو اور نماز پڑھنی شروع کردو) نشہ کی حالت میں تو نماز کے پاس بھی نہ جاؤ (نماز کے لئے ضروری ہے کہ) تم ایسی حالت میں ہو کہ جو کچھ زبان سے کہو ٹھیک طور پر اسے سمجھتے ہو۔"

یہ ارشاد ربانی خمیرہ مقوی تھا۔ نماز اور اپنے خالق کی بارگاہ میں سر نیاز خم کرنے کی عادت ہو چکی تھی ۔ شوق نماز نے شوق نشہ کو کافور کر دیا۔ شراب سے وحشت ہونے لگی۔ محفل میں دوراب بھی چلتا تھا۔ مگر دلوں کا سرور ختم ہو چکا تھا۔ اچانک حرمت شراب کا اعلان ہو گیا۔ تو نہ شراب باقی رہی نہ محفل شراب ۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابو طلحہ (رضی اللہ عنہ) جیسے اکابر کی مجلس تھی۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ ساقی میں خود تھا۔ میں عمر میں بھی سب سے کم تھا۔ منادی کی آواز کانوں میں پڑی۔ مجھ کہا گیا: باہر نکل کر دیکھو آواز کیسی ہے۔ میں نے آواز سنی اور آکر کہا۔ اعلان ہو رہا ہے:

---

[1] بخاری شریف ص ۳۹۲،

[2] ابوداؤد شریف باب بعد باب فی فضل التطوع فی البیت ص ۲۱۱ و ص ۲۱۲۔ مجتبائی

"الا ان الخمر قد حرمت" (آگاہ ہو جاؤ، شراب حرام کر دی گئی ہے)

میزبان محفل صاحب خانہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے فوراً فرمایا: "جاؤ مٹکے اندھا دو"

میں نے تعمیل کی۔ اب پورے مدینہ کی حالت یہ تھی کہ شراب گلیوں میں بہہ رہی تھی۔ جیسے ہی اعلان کانوں میں پڑا مٹکے اوندھے کر دیئے گئے، کسی نے اس تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ اعلان کون کر رہا ہے، کس بنا پر کر رہا ہے۔ [1]

تزکیہ کا عجیب و غریب نمونہ جینا وبال جان :

ایک مومن کامل [2] سے زنا سرزد ہو گیا۔ دوسرے موقع پر یہی حرکت ایک مومنہ سے بھی سرزد ہو گئی۔ تلافی کا ایک راستہ یہ بھی تھا کہ پورے اخلاص کے ساتھ توبہ کر لیتے۔ ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں تھی جب کہ ارشاد ربانی کا سہارا موجود تھا:

"اے میرے بندو، جنہوں نے زیادتی کی اپنے اوپر (گناہ کئے) ناامید مت ہو اللہ کی رحمت سے اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دیتا ہے۔" (الزمر۔ ۵۳)

مگر آئینہ کو مانجھنے سے بہتر یہی ہے کہ آئینہ ہی کو توڑ دیا جائے۔ وہ آئینہ ہی کیا جس پر دھبہ پڑ گیا۔ غور فرمایئے اس سے زیادہ تزکیہ کیا ہو سکتا ہے کہ خود اپنی جان وبال ہونے لگے۔ یہ صاحب ان کا نام ماعز تھا۔ ابن مالک۔ خدمت مبارک میں حاضر ہوئے۔ فریاد کر رہے تھے:

"یا رسول اللہ طھرنی" (یا رسول اللہ مجھے پاک کر دیجئے)

ارشاد ہوا: "ویحك ارجع فاستغفر اللہ وتب الیہ" (بندہ خدا! جاؤ، استغفار کرو، توبہ کر لو)

یہ ارشاد سن کر کچھ چلے۔ مگر دل مضطر کا اضطراب ختم نہیں ہوا، پھر لوٹ کر آئے فریاد کرتے ہوئے:

"یا رسول اللہ طھرنی" (یا رسول اللہ مجھے پاک کر دیجئے)

آنحضرت ﷺ نے پھر واپس کر دیا۔ تین مرتبہ اسی طرح ان کو واپس کیا۔ مگر ان کے اضطراب نے ہر مرتبہ انہیں لوٹنے پر مجبور کیا تب چوتھی مرتبہ فرمایا: کس ناپاکی سے پاک کر دوں۔ عرض کیا یا رسول اللہ میں نے زنا کیا ہے [3]۔ پھر آپ نے باقاعدہ چار مرتبہ اقرار کیا اس کے بعد رجم کا حکم صادر کیا گیا

---

[1] بخاری شریف ص ۶۶۴ و ص ۸۳۷،

[2] مسلم شریف ص ۶۷ ج ۲

[3] آپ نے یہ بھی فرمایا؛ تمہیں جنون تو نہیں ہو گیا ہے۔ تمہیں شراب کا نشہ تو نہیں ہے۔ حضرت ماعز نے انکار کیا اور اپنے اعتراف پر قائم اور پاک کرنے کے اصرار کرتے رہے۔ حضرت ماعز پھر بھی مرد تھے۔ ان سے زیادہ حیرت انگیز اور سبق

۔ چنانچہ ان کو سنگسار کر دیا گیا۔ مگر یہ جو پاک ہونے کے لئے مضطرب تھے اب ان کی پاکی ملاحظہ فرمایئے۔ انہیں ماعز کے متعلق آنحضرت ﷺ نے بشارت دی کہ ایسی توبہ کی ہے کہ اگر پوری امت پر بانٹ دی جائے تو سب کے لئے کافی ہو جائے۔

تزکیہ۔ جو بعثت مبارکہ کا اہم مقصد تھا اس کو کس طرح عمل کے پیرایہ میں جلوہ گر فرمایا: اس کی وضاحت کے لئے چند مثالیں کافی ہیں ان سے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ یہ مقصد کس درجہ ہمہ گیر ہے۔

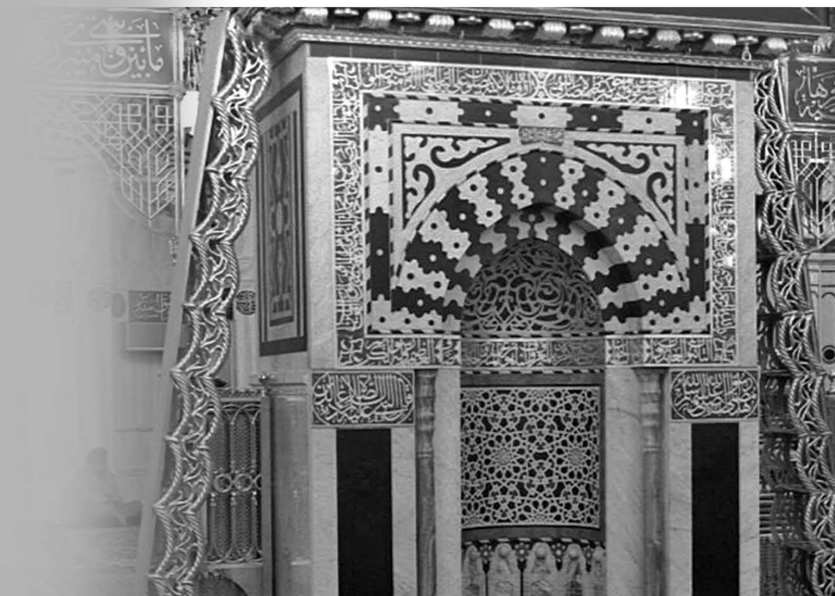
اس کتاب میں یا کسی ایک کتاب میں اس کے تمام شعبے بیان نہیں کئے جاسکتے۔

لہذا یہ کوشش لاحاصل ہے۔ البتہ اتنی تفصیل بیان کر دینی ضروری ہے جس سے شب و روز کی زندگی میں تزکیہ کا نقشہ اور تزکیہ والے کی ایک تصویر سامنے آجائے۔

رات دن میں جو کام انسان عادۃً کرتا ہے اور سونے جاگنے، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے میں جو حالات سامنے آتے رہتے ہیں۔ اور گذرتے رہتے ہیں ان کے آداب کیا ہیں جن کی آنحضرت ﷺ نے تعلیم فرمائی۔ اور بندہ اور اس کے خالق کے تعلق کو کس طرح نمایاں فرمایا۔

آموز واقعہ قبیلہ غامد کی ایک خاتون کا ہے۔ اس نے آکر اسی طرح اعتراف کیا اور یہی اصرار کیا۔ طھرنی۔ مجھے پاک کر دیجئے۔ یہ حاملہ تھی۔ آپ نے فرمایا: پہلے ولادت سے فارغ ہو لو۔ جب بچہ ہو گیا تو پھر آئی اور اصرار کیا طھرنی۔ مجھے پاک کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا: ابھی بچہ کو دودھ پلاؤ۔ دودھ چھوٹنے کے بعد پھر آئی۔ بچہ گود میں اور اسکے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا۔ اور یہی اصرار کہ مجھے پاک کر دیجئے۔ فرمایا: بچہ کا ذمہ دار کون ہو گا۔ ایک انصاری نے بچہ کا ذمہ لیا تب اس کو رجم کیا گیا۔ (مسلم شریف ص ۶۸ ج ۲) حیرت انگیز اور قابل قدر یہ ہے کہ یہ معاملہ خود اس کے اقرار پر تھا، شہادتوں سے اس کا ثبوت نہیں ہوا تھا تو جس مرحلہ پر بھی اعتراف کرنے والا مجرم اپنے جرم کا انکار کر دے اس پر حد نہیں جاری ہو گی۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سوال کر کے کہ تمہیں جنون تو نہیں ہو گیا، تم نے نشہ تو نہیں پی رکھا۔ بار بار موقع دیا کہ وہ کسی طرح اپنے جرم کا انکار کر دے۔ اس خاتون کو ولادت پر دودھ پلانے تک کی مہلت دیکر انکار کر دینے کا موقع دیا۔ مگر حیرت ہوتی ہے ان کا ایمان اور اپنے ناپاک ہو جانے کا یقین اتنا مضبوط تھا کہ کسی صورت سے بھی اس میں جنبش نہیں ہوئی اور جس طرح پہلے اعتراف کے وقت اپنی زندگی کو وبال جان سمجھ رہے تھے، آخر تک وہ ان کو وبال ہی معلوم ہوتی رہی۔ مگر اس ایمان محکم کا یہ نتیجہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے جس طرح حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کی توبہ کی تعریف کی تھی اس خاتون کے متعلق بھی فرمایا کہ ایسی توبہ کی ہے کہ بڑے سے بڑا ظالم بھی ایسی توبہ کرے تو بخشا جائے۔

سیرت رسول ﷺ کے عملی پہلو



امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ

فضائل اخلاق

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

کتاب اللہ کی شہادت

رسول اللہ ﷺ عالم انسانیت کے لیے فضائل و مکارم اخلاق کا بہترین نمونہ تھے۔ جس وجود مبارک کو پوری اولاد آدم کے لیے قیامت تک اسوہ حسنہ قرار دیا گیا۔ اس کی حیثیت اس کے سوا ہو بھی کیا سکتی تھی؟ اس کا پہلا شاہد قرآن پاک ہے۔

(۱) وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿۴﴾ (سورۃ قلم۔۴)

"(اے پیغمبر) تم اعلیٰ اخلاق پر پیدا ہوئے۔"

(۲) فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠

(آل عمران: ۱۵۹)

"(اے پیغمبر) خدا کی یہ بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے اس قدر نرم مزاج واقع ہوئے کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے ہٹ جاتے (یعنی ان کے دل تمہاری طرف اس طرح نہ کھنچتے جس طرح اب بے اختیار کھنچ رہے ہیں)"۔

(۳) لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ (توبہ: ۱۲۸)

"(مسلمانو) تمہارے پاس اللہ کا رسول آگیا ہے، جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا بھوکا ہے۔ مومنوں کے لیے نہایت شفیق و رحیم ہے۔"

حضور ﷺ کے ارشادات

حضور ﷺ کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

بعثت لاتمم حسن الاخلاق۔

"میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔"

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔

”میں تو اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کا معاملہ درجہء اتمام پر پہنچادوں“۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی خبر ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تک پہنچی تھی تو انھوں نے اپنے بھائی کو تحقیق احوال کے لیے مکہ مکرمہ بھیج دیا تھا۔ بھائی نے مکہ مکرمہ سے مراجعت پر ابوذر رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ میں اطلاع دی:

رایتہ یامر بمکارم الاخلاق[1]

”میں نے آپ ﷺ کو دیکھا ہے۔ آپ ﷺ اعلیٰ اخلاق کا حکم دیتے ہیں۔“

یہ بعثت کے بالکل ابتدائی دور کا واقعہ ہے۔ اس دور میں بھی جس کسی کی نظر آپ ﷺ پر پڑی، آپ ﷺ میں جو نمایاں ترین وصف نظر آیا، اسے فضائل اخلاق ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان

امام حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کے اخلاق وعادات کے متعلق سوال کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

آپ ﷺ خندہ جبیں، نرم خو اور مہربان طبع تھے۔ سخت مزاج اور تنگدل نہ تھے۔ کوئی برا کلمہ کبھی منہ سے نہ نکلا۔ عیب جُو اور تنگ گیر نہ تھے۔ کوئی بات ناپسند ہوتی تو اس سے اغماض فرماتے۔ اپنے نفس سے آپ ﷺ نے تین چیزیں بالکل دور کر دی تھیں: (الف) بحث و مباحثہ، (ب) ضرورت سے زیادہ بات کرنا (ج) جو بات مطلب کی نہ ہو، اس میں پڑنا۔ دوسروں کے متعلق بھی تین ہی باتوں سے پرہیز کرتے تھے: (الف) کسی کو برا نہیں کہتے تھے (ب) کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے (ج) کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔ وہی باتیں کرتے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا۔ آپ ﷺ کلام کرتے تو صحابہ اس طرح سر جھکا کر اور خاموش ہو کر سنتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ جب آپ ﷺ خاموش ہو جاتے تو پھر (صحابہؓ) آپس میں بات چیت کرتے۔ کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک ختم نہ کرلیتا آپ ﷺ چپ سنا کرتے۔ لوگ جن باتوں پر ہنستے، آپ ﷺ محض مسکرا دیتے۔ باہر کا کوئی آدمی (یعنی اجنبی) بے باکی سے گفتگو کرتا تو آپ ﷺ تحمل فرماتے۔ دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے تاہم اگر کوئی آپ ﷺ کے احسان وانعام کا شکریہ ادا کرتا تو قبول فرمالیتے۔ جب تک بولنے والا چپ نہیں ہو جاتا تھا، آپ ﷺ اس کی بات نہیں کاٹتے تھے۔ نہایت فیاض، نہایت راست

---

[1] بخاری کتاب الادب، باب حسن الخلق والسخا

گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے۔ اگر کوئی آپ ﷺ کو دفعتہ دیکھ لیتا تو مرعوب ہو جاتا۔ لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا محبت کرنے لگتا۔ ❶ اور کہا کرتا کہ میں نے آپ ﷺ جیسا کوئی بھی اس سے پہلے یا بعد میں نہیں دیکھا۔ یہ محض عہد نبوت کے تیئس برس ہی نہیں بلکہ چند سال پیشتر کے عینی مشاہدات کا بھی جامع مرقع ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہجرت سے قبل رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بعض اہم واقعات بھی دیکھے تھے اور مدنی زندگی میں تو وہ حضور ﷺ کی رفیقہ حیات بن گئی تھیں۔ یہاں تک کہ اس دنیا میں حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا آخری ہفتہ حضرت ممدوحہؓ ہی کے حجرے میں گزرا۔ حضرت ممدوحہ رضی اللہ عنہا نے سہارا دے رکھا تھا، جب روح پاک اس دنیا کو چھوڑ کر عالم قدس میں پہنچی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کے حجرے کو اللہ تعالیٰ نے جسد اطہر کی آخری آرام گاہ بنایا۔ مشاہدے کے جیسے مختلف مواقع حضرت ممدوحہ رضی اللہ عنہا کو میسر آئے، وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہو سکتے تھے۔ آپ ﷺ کے بعض ارشادات ملاحظہ ہوں:

۱۔ جب بھی رسول اللہ ﷺ کو دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ ان میں سے وہ لے لیتے جو آسان اور سہل ہوتی، بشرطیکہ اس میں گناہ کا کوئی پہلو نہ ہوتا، اگر گناہ ہوتا تو آپ ﷺ سب سے بڑھ کر اس سے دوری اختیار کرتے۔ ❷

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی کو سزا نہ دی اور کبھی بدلہ نہ لیا۔ ہاں اللہ کے حکموں کی حرمت زایل کرنے والوں کو آپ ﷺ اللہ کے لیے سزا دیتے تھے۔ ❸

۳۔ عادت شریف یہ تھی کہ برائی کے بدلے میں برائی سے کبھی کام نہ لیا۔ ہمیشہ درگزر کرتے اور معاف فرما دیتے۔ ❹

۴۔ رسول اللہ ﷺ اس طرح کبھی نہ ہنسے کہ آپ ﷺ کا تالو نظر آیا ہو، صرف مسکرا دیا کرتے تھے۔

۵۔ ہر لحظہ دل پر خوف و خشیت الٰہی کا غلبہ رہتا تھا، بادل دیکھتے یا آندھی آتی تو چہرہ مبارک پر تکلیف کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ میں نے (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے) کہا: یا رسول اللہ! لوگ بادل دیکھتے ہیں تو

---

❶ سیرت النبی جلد اول حصہ دوم ص۲۸۹-۲۸۸ بحوالہ شمائل ترمذی

❷ صحیح بخاری، کتاب المناقب

❸ سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص۲۸۷

❹ سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص۲۸۷

اس امید پر خوش ہوتے ہیں کہ بارش ہو گی۔ آپ ﷺ کے چہرے سے تکلیف نمایاں ہوتی ہے۔ فرمایا: عائشہ! کون سی بات مجھے بے خوف کر سکتی ہے کہ اس میں عذاب نہ ہو گا؟ ایک قوم کو آندھی سے عذاب دیا گیا۔ ایک قوم نے عذاب دیکھا تو کہا یہ بادل ہے۔ ❶

۶۔ آپ ﷺ نے نام لے کر کبھی کسی پر لعنت نہ کی، نہ کبھی اپنے کسی خادم، کسی لونڈی، کسی غلام، کسی عورت اور کسی جانور کو اپنے ہاتھ سے مارا۔ ❷

۷۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی کی درخواست رد نہ فرمائی، اِلا یہ کہ وہ ناجائز تھی۔

۸۔ گھر میں تشریف لاتے تو مسکراتے ہوئے آتے، باتیں اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کرتے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے۔ ❸

۹۔ ایک بدوی آیا اور بولا آپ ﷺ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں ہم تو بوسہ نہیں دیتے، فرمایا: اللہ نے تیرے دل سے رحم نکال دیا، اس میں میرا کیا اختیار ہے؟ ❹

۱۰۔ اسود رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: گھر والوں کی خدمت میں رہتے تھے یعنی ان کے کام کیا کرتے تھے، نماز کا وقت آتا تو نماز کے لیے چلے جاتے۔ ❺

۱۱۔ اگر کسی کی کوئی حرکت پسند نہ ہوتی تو اس کا نام لے کر منع نہ فرماتے، اصل فعل کو منع فرمادیتے۔

۱۲۔ رسول اللہ ﷺ کے گھر والوں نے ایک دن میں دو نوالے نہیں کھائے، مگر ان میں سے ایک کھجور کا تھا۔ ❻

اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے خادم انس رضی اللہ عنہ بن مالک کا یہ بیان بھی شامل کر لیجیے کہ میں نے دس سال آپ ﷺ کی خدمت میں گزارے، اس پوری مدت میں آپ ﷺ میرے متعلق ناپسند کا کوئی کلمہ زبان پر نہ لائے۔ نہ کبھی یہ فرمایا: فلاں کام کیوں کیا؟ نہ کبھی یہ فرمایا: فلاں کام کیوں نہ کیا؟ ❼

نبوت سے پیشتر کی زندگی

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیانات کا تعلق زیادہ تر عہد نبوت سے ہے جس کی کل

---

❶ صحیح بخاری

❷ سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص۳۸۷ بحوالہ مسلم وابوداؤد۔

❸ بخاری کتاب الادب۔

❹ بخاری، کتاب الادب

❺ بخاری، کتاب الصلوٰۃ باب اذا دعی الامام الی الصلوٰۃ۔

❻ صحیح بخاری، کتاب الرقاق۔

❼ بخاری، کتاب الادب۔

مدتیئس سال تھی۔ اس سے پیشتر آپ ﷺ چالیس سال کی طویل مدت گزار چکے تھے۔ یہی زندگی ہے جسے قرآن مجید میں ایک مقام پر صداقت نبوت کی ایک قوی دلیل قرار دیا گیا ہے یعنی !

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس:۱۶)

"یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملے (یعنی نبوت) سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں، کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں۔"

مشرکین عرب کو رسول اللہ ﷺ کی صداقت و فضیلت سے انکار نہ تھا، حتیٰ کہ ابو جہل کو بھی اعتراف تھا کہ آپ ﷺ سچے ہیں، مگر وہ کہتے تھے کہ آپ ﷺ ایسی باتیں کہتے ہیں جنہیں ہم قبول نہیں کر سکتے۔ اوپر کی آیت میں صداقت نبوت کی ایک سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے۔ یعنی فرمایا:

"ساری باتیں چھوڑ دو، ایسی بات پر غور کرو کہ میں تم میں نیا آدمی نہیں، جس کے خصائل و حالات کی تمہیں خبر نہ ہو۔ تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک عمر تم میں بسر کر چکا ہوں۔ یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ عمر انسانی کی پختگی کی کامل مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی۔ بتلاؤ اس میں کوئی ایک بھی بات تم نے سچائی اور دیانت کے خلاف دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ انسانی معاملے میں جھوٹ بولوں تو کیا اب ایسا ہو سکتا ہے کہ خدا پر بہتان باندھنے کیلئے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں، مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی چھوٹی سی بات بھی تم نہیں سمجھ پاسکتے؟

تمام علماء اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اس کے اخلاق و خصائل کے اُبھرنے اور بننے کا اصلی زمانہ ہوتا ہے۔ جو سانچا اس عرصے میں بن گیا بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا۔ پس اگر ایک شخص چالیس برس تک صادق و امین رہا تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب و مفتری بن جائے کہ انسانوں ہی پر نہیں، فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (الانعام۔۱۴) پر افترا کرنے لگے؟

چنانچہ بعد میں فرمایا: دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے کہ جو شخص اللہ پر افترا کرے، اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں اور جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر انسان ہے اور شریر مفتری کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ جو مکذب تھے، ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ جو صادق تھا، اس کا

کلمہ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔ [1]

دنیا جانتی ہے کہ جس دور میں سچائی اور دیانت و امانت کی روشنی گل ہو چکی تھی، اس دور میں رسول اللہ ﷺ نے سیرۃ طیبہ کی پاکیزگی اور طہارت سے "الصادق اور الامین" کے لقب حاصل کیے۔ جب حرم کعبہ کی تعمیر کے سلسلے میں حجر اسود کو اصل مقام پر نصب کرنے کے متعلق رؤساء قبائل کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی تو فیصلہ یہ ہوا تھا کہ جو شخص سب سے پہلے حرم میں آئے، اسے ثالث بنا لیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے آئے اور تمام لوگ پکار اٹھے: "امین آگئے"۔ "امین آگئے"، ہمیں ان کا فیصلہ منظور ہے۔ یہ حضور ﷺ کی سیرت کے متعلق ایک ایسی گواہی تھی، جس کی صداقت و حکمیت سے کسی کے لیے بھی اختلاف بجا نہ ہو گا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شہادت

محض یہی نہیں، ایک نہایت زبردست شہادت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ہے، جو بعثت تک پندرہ سال رسول اللہ ﷺ کی رفاقت میں گزار چکی تھیں۔ اس کے بعد دین حق کے دور غربت کی اذیتیں اور مصیبتیں بھی دس سال تک صابرانہ برداشت کر کے عالم بقا کو سدھاریں۔ یہ شہادت بھی عہد بعثت سے نہیں بلکہ بعثت سے پیشتر ہی کی زندگی سے متعلق ہے۔

سورہ علق کی آیتیں آپ ﷺ پر نازل ہو چکیں تو اول نزول وحی کی شدت کا آپ ﷺ پر بے حد اثر تھا اور یہ پہلی وحی تھی، معلوم ہے کہ اس کے بعد بھی جب وحی نازل ہوتی تھی تو چہرہ مبارک پر پسینے کے قطرے نمودار ہو جاتے تھے۔ دوم جو گراں قدر کام اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ذمے لگا دیا تھا، اس کی بے پناہ مشکلات کا آپ ﷺ کو پورا اندازہ تھا، اس لیے آپ ﷺ وہ حرا سے اتر کر گھر تشریف لائے تو قلب مبارک پر لرزہ سا طاری تھا۔ جب طبیعت ذرا سکون پذیر ہوئی تو آپ ﷺ نے پوری کیفیت غمخوار و غمگسار رفیقہ حیات کو سنا کر فرمایا: لقد خشیت علی نفسی (مجھے اپنی جان کا خوف ہے)۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے نہایت پاکیزہ اور سراپا خیر طریق حیات سے پوری طرح آگاہ تھیں۔ انہیں خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ خلق خدا کے ساتھ محبت و شفقت کے ایسے نادر پیکر کو قدرت کامیابی کی منزل پر نہ پہنچائے گی۔ چنانچہ آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

"ہرگز نہیں، خدا کی قسم، خدا آپ ﷺ کو کبھی اندوہ گیں نہ کرے گا۔ آپ ﷺ عزیزوں اور رشتہ داروں سے حسن سلوک کرتے ہیں۔ ناتوانوں، بیکسوں اور غریبوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ جن کے پاس

---

[1] ترجمان القرآن جلد دوم ص ۱۵۱۔ ۱۵۲۔

کچھ نہیں ہوتا، انہیں دیتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔ مصائب میں حق کے معاون ومددگار ہیں۔ صادق القول ہیں۔❷" ❶

یہ شہادت ان فضائل و مکارم کے متعلق ہے جو بعثت سے پیشتر وجود گرامی میں موجود تھے اور حضرت خدیجہؓ سے بڑھ کر ان کا اندازہ شناس کون ہو سکتا تھا؟

اہل ایمان کے اوصاف وخصائل

رسول اللہ ﷺ کے فضائل اخلاق کا اندازہ کرنے کے لیے ایک معیار یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل ایمان کے جو اوصاف وخصائل قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں انہیں سامنے رکھ لیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس وجود مبارک کے ذریعے سے قرآن مجید کی تعلیم مخلوق تک پہنچائی، وہ بہر حال اس تعلیم کا ایک مقدس پیکر ہوگا۔ اسی وجود مبارک کو دیکھ کر صحابہ اپنے عمل درست کرتے تھے اور اسی وجود مبارک کے زیر سایہ ان کے تزکیہ کا سلسلہ جاری تھا۔

قرآن مجید سے وہ تمام آیتیں اس مختصر مضمون میں چن کر جمع کر دینا ممکن نہیں، لیکن ان میں سے چند ملاحظہ فرمالیجیے، جن میں مجلسی، اجتماعی زندگی سے گہرا تعلق رکھنے والے اوصاف کا ذکر ہے:

۱۔ مومن وہ ہیں جو اللہ سے ڈرتے اور باہمی معاملات درست رکھتے ہیں۔ اللہ کا ذکر چھڑے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ اللہ کا کلام سنایا جائے تو ان کے ایمان زیادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں، جو کچھ خدا نے انہیں دے رکھا ہے، اس میں سے راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں وہی حقیقی مومن ہیں (انفال:۱۔۴)

۲۔ بلاشبہ ایمان والے کامیاب ہوئے (ان کی خصوصیتیں کیا ہیں ؟) نمازیں خشوع و خضوع سے ادا کرتے ہیں۔ نکمی اور لغو باتوں سے رُخ پھیرے ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرنے میں سرگرم ہیں۔ عفت و عصمت کی نگہداشت سے کبھی غافل نہیں ہوتے امانتوں اور وعدوں کا انہیں پاس رہتا ہے۔ نمازوں کی حفاظت میں بھی کوتاہی نہیں کرتے۔ (مومنون:۱ – ۱۰)

۳۔ اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں یعنی عجز و فروتنی سے چلتے ہیں۔ جب جاہل یعنی کم عقل، اکھڑ اور بے ادب لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو ملایم بات سنا کر اور صاحب سلامت کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ رات کا وقت (یعنی سونے کا وقت کلب کی تفریحات میں نہیں) اپنے پروردگار کے لیے قیام اور سجود میں گزارتے ہیں اور کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم سے دوزخ کا عذاب

---

❶ کیف کان بدا الوحی

❷ یہ ٹکڑا اسی حدیث کی روایت میں آیا ہے جو بخاری کی کتاب التعبیر میں آئی ہے۔

پھیر دے جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بیجا اڑاتے ہیں اور نہ موقع کی مناسبت کے پیش نظر تنگی کرتے ہیں ۔ وہ کسی کا بے گناہ خون نہیں بہاتے جس سے اللہ نے منع کر رکھا ہے اور بدکاری سے بھی دور رہتے ہیں جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے۔ کسی کی لغویات سے گزر رہے ہوں تو سنجیدگی اور وقار سے گزر جاتے ہیں۔(فرقان: ۶۳-۷۴)

۴۔ "وہ (اہل ایمان) پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں، بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے دور رہتے ہیں۔ جب غصّہ آئے تو معاف کر دیتے ہیں اور خدا نے انہیں جو کچھ دے رکھا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ جب ان پر کوئی زیادتی ہو تو بدلا لیتے ہیں، برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی۔ پھر جو کوئی معاف کر دے اور نیکی کرے، اس کا ثواب اللہ کے ذمّے ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا، جو کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔ ملامت تو ان پر ہے جو لوگوں پر از خود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں، ان کے لئے دردناک عذاب ہے اور جو ظلم سہہ جائے اور معاف کر دے تو یہ بڑی اعلیٰ ہمّتی کے کاموں میں سے ہے"۔(شوریٰ ۳۶:۴۳)

اصل نیکی

اصل نیکی کیا ہے؟

۱۔ اللہ پر ایمان۔
۲۔ یوم آخرت اور فرشتوں پر ایمان۔
۳۔ خدا کی اتاری ہوئی کتابوں اور خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں پر ایمان۔
۴۔ خدا کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مانگنے والوں کو دینا۔
۵۔ مال خرچ کر کے غلاموں کو آزادی دلانا۔
۶۔ نماز اور زکواۃ باقائدہ ادا کرتے رہنا۔
۷۔ عہد کر لینا تو اسے بہر حال پورا کرنا۔
۸۔ تنگی، مصیبت یا خوف و ہراس میں صابر و ثابت قدم رہنا۔(بقرہ: ۱۷۷)

نیز فرمایا:

۱۔ خوش حالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں خدا کے لیے خرچ کرنا۔
۲۔ غصّے کو پی جانا اور لوگوں کے قصور معاف کر دینا۔

یہ دعوت حق کی محض چند جھلکیاں ہیں جنھیں ان پر عمل کرنے والوں کی شکل میں بھی پیش کیا گیا اور محض نیکیوں کی شکل میں بھی۔ کیا کسی کے لیے یہ تصور کر لینا مشکل ہے کہ جس داعی حق کو یہ پاک دعوت

دے کر دنیا میں بھیجا گیا تھا، وہ خود اپنی مقدس تعلیم کا کتنا افضل و اعلیٰ اور کس درجہ منور و مزکّی نمونہ ہو گا۔

حسنِ اخلاق کی اہمیت

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

۲۔ کامل ایمان اس مومن کا ہے، جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو۔

۳۔ قیامت کے روز اعمال کی ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری چیز کوئی نہ ہو گی۔

۴۔ انسانوں کو قدرت کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئی ہیں ان میں سب سے بہتر چیز اچھے اخلاق ہیں۔

۵۔ بندوں میں سے اللہ کے نزدیک سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔

۶۔ آخرت کی زندگی میں میرے لیے سب سے پسندیدہ وہ شخص ہو گا جس کے اخلاق اچھے ہوں اور وہی مجھ سے قریب تر ہو گا۔ ❶

۷۔ کسی نے سوال کیا یا رسول اللہ ﷺ مومنوں میں سے افضل کون ہے ؟ فرمایا: "احسنهم خلقا" (جو سب سے زیادہ خوش اخلاق ہو) ❷

۸۔ انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ حاصل کر سکتا ہے، جو مسلسل روزے رکھنے اور راتوں کو مسلسل عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

آخری ارشاد کے سلسلے میں اتنا عرض کر دینا چاہیے کہ یہ ایک اسلوب بیان ہے، جس میں حسن اخلاق کو اس درجے پر رکھ کر پیش کیا گیا ہے جو نماز اور روزے جیسی نفلی عبادات سے حاصل ہوتا ہے۔ جو شخص فضائل اخلاق کے ساتھ نفلی عبادت میں بھی سرگرم رہے گا، اس کا درجہ اور بھی بلند ہو گا۔

غرض ان ارشادات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فضائل اخلاق کو دین حق میں کتنا بلند درجہ حاصل ہے اور ہونا بھی چاہیئے، کیونکہ اخلاق درست ہوں گے تو افراد و جماعات میں میل جول بڑھے گا۔ ان میں محبت و ہمدردی کو فروغ حاصل ہو گا۔

ایک دوسرے کے نفع و نقصان اور دکھ سکھ کا احساس ترقی کرے گا۔ کش مکش کے اسباب رفتہ رفتہ زائل ہوتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ پورا مجمع انسانیت ایک کنبے کے افراد اور ایک خاندان کے اعضا کی حیثیت میں رہنے سہنے لگے گا۔ ہر قلب میں احترام آدمیت کو صحیح مقام مل جائے گا۔ یہی اسلام کا اصل نصب العین تھا۔ اس کی طرف پیش قدمی جاری تھی کہ اچانک ملوکیتوں اور بادشاہیوں کا دور شروع ہو گیا،

---

❶ سیرۃ النبی جلد ششم ص ۲۰۔۲۲

❷ سیرۃ ابن ہشام، القسم الثانی ص ۳۶۱۔

جس کی ظلمت و تیرگی میں قافلہ اسلام کی ہر متاعِ عزیز گم ہوگئی اور اب کسی بھی چیز کا ٹھیک سراغ لگالینا خاصا مشکل ہوگیا ہے۔ اگر کسی کا سراغ مل بھی جائے تو ہم لوگوں کے ذہنوں میں دور ملوکیت کے وقت سے دین حق کا جو نقشہ جما ہوا ہے، اس میں کسی بازیافتہ شے کے لیے موزوں جگہ نکالنا بظاہر آسان نہ ہوگا۔

باقی رہی تبلیغ اسلام تو وہ ہر مسلمان کے لئے فرداً فرداً اور ہر اسلامی جماعت کے لئے اجتماعاً اس دنیا میں اولین شے ہے، نہ محض اس لیے کہ اسلام اور حق کو پھیلانا ہر فرد و جماعت کے لیے بہترین سعادت ہے، اس لیے بھی کہ ہم جنسوں کی پُر خلوص بہی خواہی ہر مسلمان کے اہم فرائض میں داخل ہے اور تمام ہم جنسوں کو نعمت اسلام کا حامل بنادینے سے بڑھ کر بہی خواہی کوئی نہیں ہوسکتی، جس پر دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح و بہبود موقوف ہے۔ لیکن تبلیغ اسلام کے لیے بھی سازگار فضا صلح و امن ہی سے میسر آسکتی ہے۔؛ اگر نفرت و مخالفت کی آگ دلوں میں بھڑک رہی ہو تو کسی کو پیغام حق سنانے کی کیا صورت ہوگی؟ سیرۃ طیبہ سے ظاہر ہے کہ بدر و حنین کی فتوحات بے شائبہ ریب بہت عظیم القدر تھیں تاہم فتح مبین صلح حدیبیہ ہی قرار پائی، جس نے طول و عرض عرب میں دلوں کے دروازے اسلام کے لیے کھول دیے اور "یدخلون فی دین اللہ افواجاً" کا روح افروز منظر سب نے دیکھ لیا۔

ایمان کیا ہے؟

صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں سے صرف چند حدیثیں یہاں درج کی جاتی ہیں تاکہ اندازہ ہوسکے کہ ایمان و اسلام حقیقۃً کیا ہیں؟ مثلاً:

۱۔ مسلمان وہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان کو کوئی گزند نہ پہنچے اور مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کی ہوئی ہر شے ترک کردے۔

۲۔ اس وقت تک کوئی شخص حقیقۃً مومن نہیں ہوسکتا، جب تک اپنے مومن بھائی کے لیے وہی بات پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

۳۔ جس میں تین باتیں ہوں، اس نے ایمان کی حلاوت پالی۔

الف۔ اللہ اور رسول ﷺ اس کے نزدیک ماسوا سے بڑھ کر محبوب ہوں۔

ب۔ ہر فرد کے ساتھ صرف اللہ کے لیے محبت کرے یعنی محبت کے ساتھ کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔

ج۔ کفر کی طرف لوٹ جانا اسے اتنا ہی بُرا معلوم ہو، جتنا آگ میں ڈالا جانا۔

۴۔ تین باتیں ہیں، جس نے یہ جمع کرلیں، اس نے ایمان جمع کرلیا۔

الف۔ اپنے نفس کے مقابلے میں بھی انصاف پر قائم و استوار رہنا۔
ب۔ دنیا میں سلامتی اور حق پھیلانا۔
ج۔ تنگ دستی کے باوجود اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔

۵۔ حضور ﷺ سے پُوچھا گیا کہ کون سا اسلام بہتر (خیر) ہے۔ فرمایا: کھانا کھلانا اور سب کو سلام کہنا یعنی سلامتی کی دُعا دینا، خواہ جان پہچان ہو یا نہ ہو۔

۶۔ خود ابوذر رضی اللہ عنہ غفاری کی روایت ہے کہ میں نے غلام کو گالی دی۔ رسول اللہ ﷺ نے سُن لی اور فرمایا: ابوذر رضی اللہ عنہ ابھی تم میں جاہلیت باقی ہے، غلام تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ نے انہیں تمہارے ماتحت کر دیا ہے، جس کا بھائی ماتحت ہو، اسے چاہیے بھائی کو ویسا ہی کھلائے جیسا آپ کھائے، ویسا ہی پہنائے جیسا آپ پہنے اور بھائی سے ایسا کام نہ لے، جو اس سے نہ ہو سکے، کوئی سخت کام ہو تو خود اس کی مدد کرے۔

۷۔ جسم میں گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ وہ درست ہو تو سارا جسم درست رہتا ہے۔ وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سنو، وہ دل ہے۔

۸۔ مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑائی کرنا کفر ہے۔

۹۔ جب دو مسلمان تلواروں کے ساتھ مقابلے پر آئیں تو قاتل و مقتول دونوں آگ میں ہوں گے۔ عرض کیا گیا: کہ قاتل تو ہوا مگر مقتول کا یہ حال کیوں ہو گا؟ فرمایا: وہ اپنے ساتھی کو قتل کرنا چاہتا تھا (لیکن موقع نہ پا سکا اور خود مارا گیا)۔

۱۰۔ جس میں چار باتیں ہوں، وہ خالص منافق ہے:
الف۔ امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔
ب۔ بات کہے تو جھوٹ بولے۔
ج۔ عہد کرے تو اسے پورا نہ کرے۔
د۔ جھگڑے تو ناحق کی طرف چلا جائے۔
ان میں سے کوئی بھی بات کسی میں ہو تو نفاق کی علامت ہو گی تا آنکہ وہ اسے ترک کر دے۔

۱۱۔ خدا کے نزدیک پسندیدہ عمل وہ ہے، جس پر مداومت کی جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔

۱۲۔ "کتاب الادب" میں ہے کہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا:
خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا، خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا، خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا۔ عرض کیا: کون یارسول اللہ ﷺ ؟
فرمایا: جس کا پڑوسی اس کی بدیوں سے امن میں نہ ہو۔

ان ارشادات پر غور فرمائیے اور اندازہ کیجئے کہ رسول اللہ ﷺ نے عالم انسانیت کو کس راستے پر چلنے کی دعوت دی؟

آیا اس کے سوا امن عالم اور بہبودِ انسانیت کا کوئی راستہ ہو سکتا ہے؟ ساتھ ہی سوچیے کہ جس سرچشمہ فلاح و صلاح کونین سے یہ اور ایسی ہزاروں موجیں اٹھیں، اس کے طیب و طاہر ہونے کا درجہ کتنا بلند ہو گا۔

دائرۂ اصلاح و درستی

قرآن پاک اور سنت رسول ﷺ میں جو کچھ بصورت امر یا بہ شکل نہی آ گیا ہے، اس میں انسانی زندگی کا کوئی بھی ضروری گوشہ نظر انداز نہیں ہوا۔ خطبہ حج میں رسول اللہ ﷺ نے تین چیزوں کا ذکر بطور خاص فرمایا تھا، یعنی جان، مال اور آبرو، پھر حج کے دن، حج کے مہینے اور مکہ مکرمہ کی حرمت کی طرح جان، مال اور آبرو کی عزت و حرمت کی تاکید فرمائی تھی۔ غور کیا جائے، تو دنیا میں جتنی زیادتیاں، جتنے ظلم اور جتنے گناہ ہیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق اصلاً انھی تین چیزوں میں سے کسی ایک سے نکلے گا جو ہر انسان کو فطرۃً عزیز ہیں۔ کتاب و سنت کی محولہ بالا تعلیمات میں کوئی چیز ایسی نہیں ملے گی، جو ضروری تھی اور اس کے کرنے یا نہ کرنے کی تاکید نہ آئی ہو۔

حُسن خلق

رسول اللہ ﷺ نہایت نرم مزاج اور خوش اخلاق تھے۔ چہرہ مبارک پر اس قسم کی کیفیت چھائی رہتی تھی جس سے دیکھنے والے پر لطف و شفقت کا اثر پڑتا۔ گفتگو وقار و متانت سے فرماتے، ایک ایک جملہ ٹھہر ٹھہر کر بولتے۔ ہر ایک کو نرمی سے سمجھاتے۔ کبھی کسی کی دل شکنی گوارا نہ فرمائی، آپ سوار ہوتے اور راستے میں کوئی صحابی مل جاتا تو اسے سوار کرا دیتے اور خود اتر آتے۔

ایک صحابی کا بیان ہے کہ میں بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا تو ڈھیلے مار مار کر کھجوریں گراتا۔ لوگ مجھے پکڑ کر خدمت اقدس میں لے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ زمین پر ٹپکی ہوئی کھجور کھا لیا کرو، ڈھیلے نہ مارا کرو، پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔

ایک مرتبہ حالتِ قحط میں ایک صاحب نے باغ سے کھجور کے خوشے توڑ کر کھائے اور کچھ دامن میں رکھ لیے۔ باغ کے مالک نے اسے مارا اور کپڑے اتروا لیے، پھر شکایت لے کر حضور ﷺ کی بارگاہ میں پہنچا۔ کھجوریں توڑنے والا بھی ساتھ تھا۔ آپ ﷺ نے مالک باغ سے کہا۔ یہ جاہل تھا، اسے تعلیم دینی چاہیے تھی۔ بھوکا تھا، کھانا کھلانا چاہیے تھا۔ یہ فرما کر کپڑے واپس دلائے اور اسے ساٹھ صاع غلہ اپنے پاس سے دیا،

جو ہمارے حساب سے تین من، تیرہ سیر اور دو چھٹانک ہوتا ہے۔

مجلس نبوی ﷺ میں بیٹھنے کی جگہ نہ رہتی تو نئے آنے والے کے لیے ردائے مبارک بچھا دیتے تھے۔ سلام میں پیش دستی فرماتے۔ راستہ چلتے تو مرد، عورت، بچہ جو سامنے آتا اسے سلام کرتے۔ زبان مبارک پر کبھی کوئی غیر مناسب لفظ نہ آیا۔ انس رضی اللہ عنہ بن مالک کہتے ہیں کہ جب، کسی پر عتاب کرتے تو فرماتے: "مالہٗ تَرِبَ جبینه" اسے کیا ہوا، اس کی پیشانی خاک آلود ہو)[1] محاورے میں اس فقرے کا استعمال ہلکے زجر کے رنگ میں ہوتا ہے۔

بچوں پر شفقت

حضور ﷺ بچوں پر بہت شفقت فرماتے۔ آپ ﷺ سفر سے تشریف لاتے اور لوگ استقبال کے لیے نکلتے تو بچے بھی ساتھ ہوتے اور وہ معمول کے مطابق دوڑ کر ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے، جو پہلے پہنچتے انہیں آپ ﷺ ساتھ سواری پر بٹھالیتے۔ راستے میں مل جاتے تو انھیں خود سلام کرتے اور ان سے بھی شفقت کا یہی برتاؤ ہوتا۔

ایک مرتبہ ایک نہایت غریب عورت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی۔ اس کی دو بچیاں بھی ساتھ تھیں۔ اتفاق سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس وقت کچھ نہ تھا۔ ایک کھجور پڑی تھی وہ اس عورت کو نذر کر دی۔ اس نے کھجور کے دو ٹکڑے کئے اور ایک ایک ٹکڑا دونوں کو دے دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کو سنایا تو فرمایا: جس کے دل میں خدا اولاد کی محبت ڈالے اور وہ اس محبت کا حق ادا کرے تو دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا۔

یہ شفقت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی۔ ایک دفعہ کسی غزوے میں چند بچے بھی بے ارادہ و علم مارے گئے، آپ ﷺ کو اطلاع ملی تو بڑا رنج ہوا۔ کسی کی زبان سے نکلا یارسول اللہ ﷺ وہ مشرکین کے بچے تھے۔ فرمایا: مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں۔ خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو۔ ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔

جابر رضی اللہ عنہ بن سمرہ صحابی اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی پھر آپ ﷺ کے ساتھ ہولیا۔ سامنے سے چند اور بچے آگئے۔ آپ ﷺ نے سب کو پیار کیا اور مجھے بھی پیار کیا۔

غلاموں پر شفقت

اوپر گزر چکا ہے، ابو ذر رضی اللہ عنہ غفاری سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا: تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں '

---

[1] بخاری: کتاب الادب۔

جو خود کھاؤ، انہیں کھلاؤ، جو خود پہنو، انہیں پہناؤ۔ چنانچہ اس کے بعد سے ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کو ہمیشہ کھانے پہننے وغیرہ میں اپنے برابر رکھا۔

غلاموں کے لئے لفظ غلام بھی گوارانہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انہیں غلام یا لونڈی کہہ کر نہ پکارا کرو۔ "میرا بچہ" "میری بچی" کہا کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو غلام آتا، اسے آزاد کر دیتے۔ لیکن وہ لوگ آزاد ہو کر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کی زنجیر میں جکڑے رہتے۔ زید رضی اللہ عنہ بن حارث کا واقعہ محتاج تفصیل نہیں۔ ان کے والد اور چچا لینے کے لیے آئے اور ہر قیمت ادا کرنے کے لئے آمادہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی زید رضی اللہ عنہ کو آزاد کر چکے تھے۔ جانے نہ جانے کا معاملہ زید رضی اللہ عنہ ہی پر چھوڑ دیا۔ اس نے جانے سے انکار کر دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ رحمت کو والدین اور دوسرے خونی اقربا کے ظل عاطفت پر ترجیح دی [1]۔ محبت و شفقت کے اس اعجاز کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے، جس کے سامنے قریب ترین خونی رشتے بھی بے حقیقت رہ گئے تھے؟ زید رضی اللہ عنہ کے بیٹے اسامہ رضی اللہ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جتنی محبت تھی، وہ اسی سے ظاہر ہے کہ بعض نہایت اہم معاملات میں اسامہ رضی اللہ عنہ ہی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں سفارشی بنایا جاتا تھا اور فتح مکہ میں داخلے کے وقت اسامہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ردیف تھے۔

ایک صحابی اپنے غلام کو مار رہے تھے۔ پیچھے سے آواز آئی کہ خدا کو تم پر اس سے زیادہ اختیار ہے۔ صحابی نے مڑ کر دیکھا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اسے لوجہ اللہ آزاد کر دیا۔ فرمایا: اگر تم ایسا نہ کرتے تو آتش دوزخ تمہیں چھو لیتی۔

سب سے آخری وصایا میں سے ایک وصیت یہ تھی کہ غلاموں اور لونڈیوں کے معاملے میں خدا سے ڈرتے رہنا۔ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلاموں کا قصور کتنی مرتبہ معاف کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ جب تیسری مرتبہ یہی گزارش کی تو فرمایا: "ہر روز ستر مرتبہ"۔

غریبوں پر شفقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے ساتھ میرا حشر کر۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا یہ کیوں؟ فرمایا: اس لیئے کہ مساکین دولتمندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے۔ پھر فرمایا: عائشہ رضی اللہ عنہا! کسی مسکین کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ۔ کچھ نہ ہو تو چھوہارے کا ایک ٹکڑا ہی سہی، ضرور دے دو۔ عائشہ رضی اللہ عنہا غریبوں سے محبت کرو۔ انہیں اپنے سے نزدیک رکھو، خدا بھی تم کو اپنے سے نزدیک کرے گا۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں مسجد میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف فقرائے

---

[1] سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۳۸۲۔

مہاجرین کا حلقہ تھا ۔رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو اس حلقے میں بیٹھ گئے۔میں بھی وہیں جا بیٹھا۔ فرمایا: فقرائے مہاجرین کو بشارت ہو کہ وہ دولتمندوں سے چالیس برس پہلے جنت میں جائیں گے۔

فرمایا: جو شخص کسی بیوہ اور مسکین کی خبر گیری کرتا ہے۔اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کی ہے یا اس شخص کی جو دن کو روزے رکھتا ہے اور رات کو عبادت کے لئے کھڑا رہتا ہے۔ [1]

عوالی میں ایک بڑھیا بیمار تھی، اس کے جانبر ہونے کی امید نہ تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب اس کی وفات ہو تو مجھے ضرور خبر کرنا۔ میں جنازے کی نماز پڑھاؤں گا۔ اتفاق سے بڑھیا کا انتقال کچھ رات گئے ہوا۔ صحابہ نے آپ ﷺ کو رات کے وقت اٹھانا گوارا نہ کیا اور بڑھیا کو دفن کر دیا۔ صبح کے وقت آپ ﷺ نے دریافت فرمایا اور پوری کیفیت معلوم ہوئی تو اس خاتون کی قبر پر جا کر نماز جنازہ ادا کی۔

ایک مرتبہ ایک قبیلہ مسافروار مدینہ منورہ آیا۔ اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ کسی کے بدن پر ثابت کپڑا نہ تھا، پاؤں ننگے تھے۔ کھالیں بدن پر بندھی ہوئی تھیں اور تلواریں گلوں میں ڈال رکھی تھیں۔ حضور ﷺ کی نظر مبارک ان لوگوں کی خستگی پر پڑی تو چہرہ انور کا رنگ بدل گیا۔حالت اضطراب میں اندر تشریف لے گئے۔ پھر باہر آئے اور بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دیا۔ نماز کے بعد ایک خطبے میں سب کو ان غریبوں کی امداد پر آمادہ کر دیا۔

شفقت ورافت عامہ کے باب میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ عبادات نافلہ چھپ کر ادا فرماتے تا کہ عام لوگوں کے لئے آپ ﷺ کی پیروی میں اس قدر عبادت کرنا شاق نہ ہو۔

مساوات

مساوات کی جیسی عملی مثالیں رسول اللہ ﷺ کی سیرۃ طیبہ میں ملتی ہیں، ویسی اور کہاں ملیں گی؟ اس سے بڑھ کر مساوات کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے آزاد کردہ غلام زید رضی اللہ عنہ بن حارث کی شادی اپنی پھپھیری بہن سے کر دی تا کہ اونچ نیچ کے فرضی اور خود ساختہ سانچے ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اس کے مندرجہ الفاظ پر غور فرمائیں:

”اے گروہ قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار اللہ نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے“۔

یہ مساوات کا محض درس ووعظ ہی نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ سب سے بڑی، موثر اور ناقابل تردید دلیل بھی تھی۔ دنیا کے تمام انسان آدم کی اولاد ہیں۔ آدم ہی سب کے مورث اعلیٰ تھے۔ اگر ایک گھرانے کے تمام ارکان درجے میں یکساں ہوتے ہیں تو پھر آدم علیہ السلام کی اولاد میں چھوٹے، بڑے، ادنیٰ، اعلیٰ، آقا غلام کی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب۔

تفریق کس بنا پر جائز سمجھی جاسکتی ہے؟ خون، رنگ، نسل، دولت وغیرہ کے امتیازات ان لوگوں نے پیدا کیے، جن کے ہاتھ سے حقیقت کا رشتہ نکل چکا تھا اور جو ہوسناکیوں کی بنا پر انسانیت کے ٹکڑے کرنے کے درپے ہو گئے تھے۔ اللہ کے نزدیک انسانوں میں مراتب کا انحصار حسن عمل پر ہے۔ جس کے پاس عمل کا اندوختہ زیادہ ہو گا، وہ خدا کے نزدیک سب پر فایق ہو گا، اگرچہ کالا اور مفلس ہو۔ وہ لوگ اس سے نیچے رہیں گے جو حسن عمل میں اس کے برابر نہ ہونگے، خواہ ان کے رنگ کتنے ہی گورے اور ان کی دولت و ثروت کتنی ہی لامتناہی ہو۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں زید رضی اللہ عنہ، اسامہ رضی اللہ عنہ، بلال رضی اللہ عنہ یا دوسرے مساکین کا درجہ عباس رضی اللہ عنہ سے کم نہ تھا جو آپ ﷺ کے چچا تھے۔ جنگ بدر میں وہ قید ہو کر آئے تو انصار نے اس بنا پر ان کا زر خرید معاف کر دینا چاہا کہ عباس رضی اللہ عنہ کے والد رشتے میں انصار کے بھانجے تھے مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہرگز نہیں، ایک دام بھی معاف نہ کرو۔

آپ ﷺ مسجد کی تعمیر میں صحابہ کے ساتھ برابر کام کرتے رہے۔ خندق کی کھدائی میں بھی آپ ﷺ نے برابر حصہ لیا۔ سفر میں صحابہ کھانا پکانے کا کام مل جل کر کرتے۔ آپ ﷺ بھی کوئی نہ کوئی کام اپنے ذمے لے لیتے۔ ایک مرتبہ کھانا پکانے کے لیے لکڑیاں لانے کا کام آپ ﷺ نے سنبھالا۔ فدائیوں نے عرض کیا کہ یہ کام ہم کرلیں گے۔ فرمایا: ”میں پسند نہیں کرتا کہ اپنے آپ کو تم سے ممتاز رکھوں۔ خدا اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو ہمراہیوں میں ممتاز بنے۔“

جنگ بدر کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے نکلے تو سواریوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اونٹ تین تین کے حصے میں آیا، باری باری ہر فرد سوار تھا۔ حضور ﷺ کے بھی دو ساتھی تھے، وہ عرض کرتے کہ آپ ﷺ سوار رہیں۔ ہم پیدل چلیں گے۔ فرمایا: نہ میں چلنے میں تم سے کم طاقت ور ہوں اور نہ ثواب کے لیے میں تم سے کم محتاج ہوں۔

مشہور واقعہ ہے کہ بنی مخزوم میں سے ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی بعض لوگ اسے چھڑانا چاہتے تھے اور اس غرض سے اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید رضی اللہ عنہ کو سفارشی بنا کر حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ آپ ﷺ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کی درخواست سنی تو فرمایا: کیا تم حدود خداوندی میں سفارش کرتے ہو؟ پھر خطبہ دیا، جس میں ارشاد ہوا: پہلی امتیں صرف اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی جرم کا مرتکب ہوتا تو اس سے چشم پوشی کی جاتی، کوئی معمولی آدمی پکڑا جاتا تو اسے سزا دلاتے۔ اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو اسے بھی قطع ید کی سزا ضرور دی جاتی۔

ایثار

اخلاق و عادات شریفہ میں ایثار کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے یعنی دوسروں کو اپنی ذات بلکہ اعزہ

پر بھی ہر معاملے میں مقدم رکھنا۔ آپ ﷺ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے جس قدر محبت تھی اس کا بیان مشکل ہے۔ جب آپؓ ملاقات کے لیے تشریف لاتیں تو آپ ﷺ فرط محبت سے کھڑے ہو جاتے، پیشانی پر بوسہ دیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے اور عموماً پوچھتے کوئی خاص کام تو نہیں؟

ایک مرتبہ کسی غزوے میں کچھ کنیزیں آئیں۔رسول اللہ ﷺ انھیں تقسیم فرما رہے تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بھی ایک خادمہ کی سخت ضرورت تھی کیونکہ عسرت کے باعث کوئی ملازمہ نہ تھی اور گھر کا سارا کام حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا خود ہی انجام دیتیں، چکی پیستیں، پانی کی مشک بھر لاتیں۔ اس وجہ سے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے اور جسم مبارک پر نیل کے نشان نظر آتے تھے۔ سیدہ رضی اللہ عنہا عالم حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچیں۔ حضور ﷺ نے معمول کے مطابق پوچھا، کوئی کام ہے؟ سیدہ عالم رضی اللہ عنہا حیا و خود داری کے باعث کچھ نہ کہہ سکیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی ترجمانی کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ابھی اصحاب صفہ کا انتظام نہیں ہوا۔ جب تک ان کا بندوبست نہ ہولے، میں دوسری طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ ایک روایت میں ہے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادیاں بھی ایسی ہی درخواست لے کر آئی تھیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے۔

ایک دفعہ آپ ﷺ کو چادر تحفے میں ملی، آپ ﷺ کو ضرورت تھی، رکھ لی۔ ایک صاحب حاضر خدمت ہوئے اور کہا، کیا اچھی چادر ہے۔ آپ ﷺ نے اتار کر ان صاحب کو دے دی۔ وہ لے کر چلے تو لوگوں نے ملامت کی کہ تم جانتے تھے رسول اللہ ﷺ کسی کا سوال رد نہیں کرتے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ آپ ﷺ کو چادر کی ضرورت تھی۔ اس نے کہا میں نے تو اس لیے لے لی کہ اسی چادر کا کفن بناؤں گا اور یہ میرے لیے باعث برکت ہو گا۔

ایک صحابی کے پاس ولیمے کے لیے کچھ نہ تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ۔ وہ جا کر لے آئے حالانکہ شام کو حضور ﷺ کے ہاں کھانے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ اسی طرح ایک غفاری کی مہمانداری کے لئے بکری کا دودھ تھا جو خود پی کر رات گزارتے تھے۔ دودھ مہمانوں کو پلا دیا اور خود رات فاقے سے گزاری۔

ایثار کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ اطمینان و راحت کا مقام ہو تو دوسروں کو اپنے آپ پر مقدم رکھا جائے۔ دوسرا یہ کہ خطرے اور تحمل شدائد کا مقام ہو تو انسان خود آگے رہے اور دوسروں کو پیچھے رکھے، یہ دونوں پہلو سیرۃ طیبہ میں جابجا نمایاں ہیں۔

سوال اور گداگری سے کراہت

سوال اور گداگری انسانی کردار کے لئے بے حد مضر ہے۔ اس سے احساس خودداری رفتہ رفتہ ماؤف

ہو جاتا ہے۔ انسان تن آسان بن جاتا ہے۔ غیرت و حمیت کا آئینہ بے طرح مکدر ہو جاتا ہے۔ محنت و مشقت سے کسب حلال کے بجائے عجز والحاح سے مانگنے کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسے لوگوں میں عزائم امور کے لیے کوئی تڑپ اور کوئی والہیت باقی نہیں رہتی۔ جس قوم کے افراد عزائم کی لذت سے ناآشنا ہو جائیں، سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بامقصد زندگی کی لذت وصورت سے محروم ہو گئی۔ معذور یا واقعی ضرورت مند افراد کا معاملہ الگ ہے لیکن جو لوگ گداگری کو پیشہ بنا لیتے ہیں وہ پورے معاشرے کے لیے باعث ننگ و عار بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے گداگری کے انسداد پر بھی خاص توجہ فرمائی۔

ایک مرتبہ ایک انصاری نے سوال کیا۔ فرمایا: تمہارے پاس کچھ ہے؟۔ ایک بچھونے اور پیالے کا ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے دونوں چیزیں منگوائیں اور دو درم میں فروخت کر دیں۔ پھر فرمایا: ایک درم سے گھر میں کھانے کی جنس دے آؤ۔ دوسری سے رسی وغیرہ خرید کر جنگل میں نکل جاؤ اور لکڑیاں لا کر بیچو۔ پندرہ روز کے بعد وہ انصاری آئے تو ان کے پاس دس درہم تھے۔ کچھ کپڑا اور غلہ خریدا اور اسی طرح ایک بے کار آدمی معاشرے کا نہایت فعال رکن بن گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ اچھا ہے یا یہ کہ اپنے چہرے پر گدائی کا داغ لگا کر روزِ قیامت حاضر ہوتے؟

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"اگر تم میں سے کوئی رسی لے کر جائے اور لکڑیوں کا گٹھا پشت پر اٹھا کر لائے اور فروخت کرے اور یوں اللہ اس کی آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے، وہ اسے دیں یا نہ دیں"[1] ا

حکیم رضی اللہ عنہ بن حزام کا اپنا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے مانگا۔ آپ نے دے دیا۔ پھر مانگا، دے دیا اور فرمایا:

"حکیم! یہ مال ہرا بھرا اور میٹھا ہے جو اسے سخاوت نفس کے ساتھ لے گا، اسے برکت ہو گی۔ جو نفس کی طمع سے لے گا، اسے برکت نہ ہو گی۔ اس کی کیفیت اس شخص کی سی ہو گی جو کھاتا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا"۔

الید العلیا خیرٌ من السفلیٰ۔

"اونچا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔"

حکیم رضی اللہ عنہ نے پھر عمر بھر کسی سے کچھ نہ مانگا۔[1]

پھر فرمایا:

"مسکین وہ نہیں جو لوگوں کے پیچھے پھرے۔ کہیں سے ایک لقمہ یا دو لقمے یا ایک کھجور، دو کھجوریں

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب قول اللہ تعالیٰ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (توبہ۔۶۰)

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الاستعفاف عن المسئلہ۔

مل جائیں تو دوسرے دروازے پر چلا جائے۔ مسکین وہ ہے جس کے پاس اتنا مال نہیں کہ ضروریات سے بے نیاز کر دے۔ نہ کوئی اس کا حال جانتا ہے کہ صدقہ دے۔ نہ وہ اٹھ کر لوگوں سے کچھ مانگتا ہے''[2]۔

ایک موقع پر تین چیزوں کو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ قرار دیا:

قیل وقال و اضاعۃ المال و کثرۃِ السوال

''فضول باتیں، مال ضائع کرنا اور زیادہ مانگنا۔[3]''

یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اللہ سے دعا کرے کہ اسے سوالی و گداگری کی ذلت سے بچایا جائے تو اللہ بچا دیتا ہے۔ جو خدا اسے غنا کا طلب گار ہو، اللہ اسے غنا مرحمت فرماتا ہے۔ جو شخص صبر کرتا ہے اللہ اسے اور دیتا ہے اور صبر سے بہتر و وسیع تر دولت کوئی نہیں جو کسی کو دی گئی ہو۔

جود و سخا

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

کان النبی ﷺ اجود الناس واجود مایکون فی رمضان[4]

رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور آپ ﷺ کی سخاوت کا ظہور سب سے بڑھ کر رمضان شریف میں ہوتا تھا۔

حدیث ہے کہ:

مَاسُئِلَ النبی ﷺ عن شَیءٍ قط فقال لا[5]

''رسول اللہ ﷺ سے کبھی کوئی چیز نہیں مانگی گئی کہ آپ ﷺ نے جواب میں ''لا'' یعنی کلمہ نفی فرمایا ہو''۔

ایک مرتبہ کسی نے کچھ مانگا۔ فرمایا: ''اس وقت میرے پاس کچھ نہیں، تم میرے ساتھ آؤ۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔ انھوں نے کہا: جب آپ ﷺ کے پاس کچھ نہیں تو آپ ﷺ پر کیا ذمہ داری ہے۔ ایک اور صاحب بھی تھے، وہ بولے یارسول اللہ ﷺ ! آپ دیتے جائیں۔ عرش والا خدا آپ ﷺ کو محتاج نہ کرے گا۔ یہ سن کر آپ ﷺ فرط بشاشت سے مسکرا دیئے۔

ایک مرتبہ کوئی چار اوقیہ چاندی نذر کر گیا۔ تین اوقیے تو تین ضرورت مندوں کو دے دیے۔ چوتھا

---

[2] ایضاً ایضاً باب من سال الناس تکثر

[3] ایضاً ایضاً۔

[4] بخاری: کتاب الادب باب حسن الخلق والسخا

[5] ایضاً ایضاً۔

لینے والا کوئی نہ آیا۔ رات کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند نہیں آتی۔ کبھی اٹھتے ہیں اور نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر ذرا لیٹ کر اٹھتے ہیں اور نماز شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم آرام کیوں نہیں فرماتے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی نکال کر دکھائی اور فرمایا مجھے ڈر ہے۔ مبادا یہ میرے پاس ہو اور موت آجائے۔

ایک مرتبہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ فرمایا: ابوذر رضی اللہ عنہ، اگر کوہ احد میرے لیے سونا ہو جائے تو میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس ایک بھی دینار باقی ہو، بجز اس رقم کے جو ادائے قرض کے لیے رکھ چھوڑوں۔ [1]

احد بہت بڑا پہاڑ ہے۔ وہ سونے کا بن جائے تو اسے ایک دن میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ کم از کم تین دن ضرور لگیں گے، ساتھ ہی قرض ادا کرنے کی اہمیت بھی واضح فرمادی اور ارشاد گرامی سے یہ بھی ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیاضی اور سخاوت کے باعث مقروض رہتے تھے۔ کوئی چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آجاتی تو جب تک تقسیم نہ فرما دیتے مضطرب رہتے۔ ایسے متعدد واقعات کتب حدیث میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

آخر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ جامع ارشاد پیش نظر رکھ لیجئے۔

ماترك رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم دینارا أو درهماً ولا شاةً ولا بعیرا ولا اوطی بشیئ۔

"رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے (دنیا سے رحلت کے وقت) کوئی دینار اور کوئی درہم اور کوئی بکری یا کوئی اونٹ نہ چھوڑا اور نہ کسی شے کے لیے وصیت فرمائی"۔

جب باقی ہی کچھ نہ رہا تو وصیت کی کیا صورت تھی؟

سادگی اور بے تکلفی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ سادگی اور بے تکلفی میں گزری۔ کسی قسم کے لوازم امارت و غنا اپنے گرد جمع نہ کیے۔ لباس، بستر، کھانا غرض ہر چیز عمر بھر بہت سادہ رہی۔ چٹائی، معمولی فرش یا زمین پر بیٹھنے میں کبھی تکلف محسوس نہ ہوا۔ عدی رضی اللہ عنہ بن حاتم بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے تو چمڑے کا ایک گدا تھا جس میں کھجور کی پتی بھری ہوئی تھی، وہی عدی رضی اللہ عنہ کی طرف کھسکا دیا، خود زمین پر بیٹھ گئے۔ عدی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو گدے پر بیٹھنا خلاف ادب سمجھا۔ چنانچہ دوران گفتگو میں گدا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور عدی رضی اللہ عنہ کے درمیان پڑا رہا۔ فرمایا کرتے تھے، گھر میں ایک بستر اپنے لیے، ایک بیوی کے لیے اور ایک مہمان

[1] سیرۃ النبی بحوالہ صحیح مسلم۔

کے لیے کافی ہے، چوتھا شیطان کا حصہ ہے۔ [1]

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے جو مکان بنوائے تھے وہ دس دس بارہ بارہ فٹ کے کچے حجرے تھے، جن میں سے بعض کی دیواریں کچی تھیں اور بعض کے لیے کھجور کی ٹہنیاں کھڑی کر کے اوپر سے لپائی کر دی گئی تھی۔ کھجور کی شاخوں کی چھتیں تھیں۔ اونچائی اتنی کہ آدمی کھڑا ہو کر ہاتھ اوپر اٹھائے تو چھت کو جا لگے۔ عبد الملک اموی کے عہد میں توسیع مسجد نبوی ﷺ کے لیے ان حجروں کو منہدم کرانا ضروری سمجھا گیا تو اہل مدینہ بے اختیار رو رہے تھے۔ ان کی آرزو یہ تھی کہ یہ حجرے محفوظ رکھے جاتے تاکہ دنیا دیکھتی کہ رسول اللہ ﷺ نے روئے زمین پر کس سادگی، بے تکلفی اور زہد و قناعت میں دن گزارے۔

ایک مرتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں کھانے کے لیے بلایا گیا۔ دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ دیواروں پر پردے لٹک رہے ہیں، باہر ہی سے واپس ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مراجعت کا سبب پوچھا تو فرمایا: پیغمبر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ زیب و زینت والے کسی مکان میں داخل ہو۔ اسی قسم کا واقعہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی پیش آیا۔ آپ ﷺ کسی غزوے کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے مکان کی چھت کے ساتھ ایک کپڑا باندھ دیا۔ واپس تشریف لائے اور چھت میں بندھا ہوا کپڑا دیکھا تو اسے اُتار دیا۔ فرمایا: خدا نے ہمیں اس لیے دولت نہیں دی کہ اینٹوں اور پتھروں کو کپڑے پہنائیں۔

ایک مرتبہ کسی نے کمخواب کی قبا ہدیتہ بھیجی۔ آپ ﷺ نے ذرا دیر کے لیے پہن لی۔ پھر اتار کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دی۔ وہ روتے ہوئے آئے کہ جو چیز آپ ﷺ نے ناپسند فرمائی، وہ مجھے عطا کی، فرمایا: پہننے کے لیے نہیں فروخت کر دینے کے لیے بھیجی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے دو ہزار درہم میں فروخت کر دیا۔

صبر و حلم

صبر و حلم اور عفو و درگزر کے باب میں صرف اسی امر کا اعادہ کافی ہے کہ آپ ﷺ نے عمر بھر کسی سے ذاتی بدلا نہ لیا سب کو معاف فرماتے رہے۔

ایک یہودی کے آپ ﷺ مقروض تھے۔ اگرچہ ادائے قرض کے وعدے میں تین روز باقی تھے، مگر یہودی ہمیشہ سے سرمایہ پرست چلے آ رہے ہیں۔ تین روز پہلے ہی آ کر متقاضی ہوا بلکہ حضور ﷺ کے عفو و حلم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ بھی کہہ گزرا کہ عبد المطلب کے خاندان کے لوگ بڑے ناہند ہوتے ہیں ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس وقت موجود تھے، انھوں نے یہودی کو سختی سے جھڑک دیا۔ رسول اللہ ﷺ

---

[1] سیرۃ النبی بحوالہ داؤد۔

مسکرائے اور فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ تمہیں لازم تھا کہ میرے ساتھ اور اس شخص کے ساتھ اور طرح کا برتاؤ کرتے، مجھے حسن ادا کے لیے کہتے اور اسے حسن تقاضا سکھاتے۔ پھر یہ فرماتے ہوئے کہ اگرچہ وعدہ پورا ہونے میں ابھی تین روز باقی ہیں لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس کا قرض ابھی ادا کردو اور بیس صاع[1] جنس زیادہ دینا کیونکہ تم نے اسے سختی سے ڈانٹا تھا۔

رؤسائے طائف نے دعوت اسلام کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سلوک کیا تھا، وہ بیان ہو چکا ہے۔ اوباشوں کو برانگیختہ کرکے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر برسوائے۔ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پہاڑوں کا فرشتہ میرے پاس آیا جی حکم ہو تو دونوں طرف کے پہاڑ ان پر الٹ دوں۔ فرمایا: نہیں مجھے امید ہے ان کے اخلاف میں سے وہ لوگ اٹھیں گے جو خدائے واحد کو مانیں گے۔

غزوہ احد میں دندان مبارک ٹوٹ گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوگئے۔ مگر یہی دعا فرمائی کہ اے خدا میری قوم کو سیدھا راستہ دکھا، وہ حقیقت حال سے ناآشنا ہیں۔

خطبہ حج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام جاہلیت کے خون اور قرضے ختم کردیے تو سب سے پہلا اپنے خاندان کا خون اور اپنے خاندان میں سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا قرضہ ختم کیا۔

عام خصائل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن معاملہ، عدل و انصاف، مہمان نوازی کے معیار قایم کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شرم و حیا، عزم و استقلال اور شجاعت کا پیکر تھے۔ عائلی زندگی کا بہترین نمونہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا اور ازواج رضی اللہ عنہن سے اچھے برتاؤ کے بارے میں بار بار تاکید فرمائی۔ فرمایا: تم میں سے بہتر وہ ہے جو اہل خانہ کے لیے بہتر ہے۔ چرند و پرند سب پر شفقت فرماتے۔ دوسروں کے کام کر دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے اور اس میں ادنیٰ اعلیٰ کی کوئی تمیز نہ تھی۔ کسی کا بھی احسان لینا گوارا نہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر جان نثاری کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ جن کے لیے فرمایا کہ ان کے مال اور صحبت کا میں سب سے زیادہ ممنون ہوں۔ تاہم ہجرت کے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو ناقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پالی تھی، وہ نذر کرنی چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیمت دے کر خریدی۔ مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زمین مالک اور ان کے سرپرست ہبہ کر دینے پر اصرار کرتے رہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیمت دے کر لی۔

ادائے عبادات میں بھی سہولت عامہ بطور خاص ملحوظ خاطر رہتی تھی۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کے

---

[1] قاضی سلیمان مرحوم فرماتے ہیں کہ صاع ہمارے ہاں کے اوزان کے مطابق دو سیر ساڑھے تین چھٹانک کا ہوتا ہے۔ یہی واقعہ یہودی کے اسلام کا باعث بنا۔ اس نے نبی موعود کے حکم کے مطابق جو کچھ سن رکھا تھا اس کی آزمائش کے لیے یہ حرکت کی تھی۔

متعلق معلوم ہوا کہ وہ نماز فجر میں لمبی سورتیں پڑھتے ہیں تو فرمایا: تم میں سے جو نماز پڑھائے مختصر پڑھائے کیونکہ مقتدیوں میں بوڑھے، ضعیف اور کام والے سبھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ زیادہ مدح وستایش بھی پسند نہ تھی۔ آپ ﷺ وضو فرماتے تو صحابہ دست مبارک سے گرنے والے پانی کو چلو میں لے کر برکت کے لیے بدن پر مل لیتے۔ پوچھا ایسا کیوں کر رہے ہیں ۔ عرض کیا خدا و ررسول ﷺ کی محبت میں ، فرمایا: اگر کوئی اس بات کی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہے تو چاہیے کہ جب وہ بات کرے، سچ بولے، جب اسے کوئی امانت سونپی جائے تو اس کا حق ادا کرے اور کسی کا پڑوسی ہے تو حق ہمسایگی اچھی طرح نباہے۔

بعض اہم ارشادات

آپ ﷺ کے بعض اہم ارشادات یہاں درج کیے جاتے ہیں، جن سے اسلام کی تعلیم اور خود حضور ﷺ کی عملی زندگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۱۔ ”تم میں سے جب کوئی شخص کسی کو مال اور صورت میں برتر و افضل دیکھے تو چاہیے کہ اس کی طرف بھی دیکھ لے جو دیکھنے والے سے کمتر اور نیچے ہے“۔ [1]

(دیکھیے افضل و برتر دیکھنے سے دل میں حسد پیدا ہو گا جو گوناگون برائیوں کا سرچشمہ ہے، کمتر شخص کو دیکھنے سے شکر کا جذبہ ابھرے گا جو نیکیوں کا وسیلہ ہے۔)

۲۔ ”تو مسلمانوں کو باہم رحم، محبت اور مہربانی میں ایک جسم کی طرح دیکھے گا، جب ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کے لیے پورا جسم بے خوابی اور بخار کے ساتھ پکارتا ہے“۔ [2]

سعدی نے اس حدیث کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

چو عضوے بہ درد آورد روزگار دگر عضوہا را نماند قرار

۳۔ ”جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیئے کہ یا تو اچھی بات کہے یا چپ رہے“۔ [3]

۴۔ ”آپس میں بغض نہ رکھو، حسد نہ کرو، باہم تعلقات نہ توڑو اور اللہ کے بندو، بھائی بھائی ہو جاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرے“۔ [4]

۵۔ ”سچائی اور راست بازی نیکی کی طرف لے جاتی ہے، اور نیکی جنت میں پہنچاتی ہے۔ انسان برابر سچ

---

[1] بخاری: کتاب الرقاق، باب لینظر الی من ہو اسفل منہ۔

[2] بخاری: کتاب الادب، باب رحمۃ الناس۔

[3] بخاری: کتاب الادب، باب من کان یومن باللہ۔

[4] بخاری ایضاً باب ماینھیٰ عن التحاسد

بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ صدیق ہو جاتا ہے (اسی طرح) جھوٹ برائی کی طرف لے جاتا ہے، برائی آگ میں پہنچاتی ہے۔ انسان برابر جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ خدا کے نزدیک کذاب لکھا جاتا ہے"۔ ❶

٦۔ "شہ زوری دوسرے کو پچھاڑنا نہیں، شہ زور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے"۔ ❷
کسی فارسی شاعر نے ہمارے عہد کی حالت کا نقشہ کیا خوب کھینچا۔
دستے کہ عنان خویش گیر دامروز بہ آستین کس نیست۔

٧۔ " راست روی اختیار کرو، باہم محبت بڑھاؤ اور لوگوں کو خدا کی طرف سے بشارت پہنچاؤ، تنہا عمل تو کسی کو بھی جنت میں نہ لے جائے گا"۔ ❸

٨۔ "جو شہرت کے لیے کام کرے گا، اللہ اسے فضیحت دے گا، جو ریا کے لیے کام کرے گا اللہ اس کی اصل حقیقت لوگوں کو دکھادے گا"۔ ❹

٩۔ "خبردار! بدگمانی کو اپنی عبادت نہ بنانا، بدگمانی تو جھوٹ ہے، بے بنیاد باتوں پر کان نہ لگاؤ، دوسروں کے عیب تلاش نہ کرو، آپس میں بغض نہ رکھو"۔ ❺

١٠۔ "اسیروں کو رہائی دلاؤ، بھوکوں کو کھانا کھلاؤ، بیماروں کی عیادت کرو"۔

١١۔ "لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو، انھیں تنگی اور سختی میں نہ ڈالو، خوشخبری اور بشارت سناؤ، نفرت نہ دلاؤ، مل جل کر رہو"۔

١٢۔ "دو نعمتیں ہیں، جن کی قدر اکثر لوگ نہیں جانتے: اول تندرستی دوم فراخدستی"۔

١٣۔ "تم میں سے کوئی موت کی خواہش نہ کرے، نیک آدمی تو اس لیے کہ شاید وہ اور نیک کام کرے اور بد اس لیے کہ شاید وہ معافی مانگ لے"۔ ❻

پانچ مذموم خصلتیں

"پانچ مذموم خصلتیں ایسی ہیں کہ جب وہ تم پر نازل ہوں تو میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ خصلتیں تم لوگ اختیار کرو:

---

❶ ایضاً باب ما ینھی عن الکذب
❷ بخاری: ایضاً باب الحذر من الغضب
❸ بخاری: کتاب الرقاق، باب القصد والمداومۃ علی العمل۔
❹ بخاری، ایضاً باب الریاو اس معۃ۔
❺ رحمۃ اللعلمین ص ٣٥٣ بحوالہ بخاری۔
❻ کتاب المرضیٰ باب تمنی المریض الموت۔

۱۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم میں فواحش کا ظہور اس حد پر پہنچ گیا ہو کہ لوگ علانیہ ان کا ارتکاب کرنے لگیں اور اس قوم میں طاعون اور ان بیماریوں کا ظہور نہ ہوا ہو، جو ان کے باپ دادا میں موجود نہ تھیں۔

۲۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے ناپ اور تول میں کمی شروع کی ہو اور اس قوم کو قحط سالی، گرانی، سخت محنت و مشقت اور حکمرانوں کے ظلم وجود نے گرفت میں نہ لیا ہو۔

۳۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے اپنے اموال میں سے زکوٰۃ دینا بند کیا ہو اور اسے آسمان سے ہونیوالی بارش سے محروم نہ کر دیا گیا ہو، اگر بہائم نہ ہوں تو بارش بالکل روک دی جائے۔

۴۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے اللہ اور اس کے رسول کا عہد توڑا ہو اور اس پر اغیار کو دشمن بنا کر مسلط نہ کر دیا گیا ہو اور وہ اس قوم کے اموال کا ایک حصہ نہ چھین لیں۔

۵۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم کے پیشواؤں اور رہنماؤں نے کتاب اللہ کے مطابق حکومت سے اعراض کر کے خدائی احکام کے خلاف زبردستی اپنے احکام نافذ کرنا شروع کیے ہوں اور اللہ نے اس قوم کے اندر جدال و قتال اور دشواریاں نہ پیدا کی ہوں"۔ [1]

نور حق کے لیے والہیّت

قرآن مجید میں جابجا اسلام کو نور کہا گیا ہے یعنی حق کی روشنی، مثلاً:

۱۔ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۔ (اعراف:۱۵۷)

"پیروی کی اس نور کی جو اس کے (رسول اللہ ﷺ کے) ساتھ اترا۔"

۲۔ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔ (زمر: ۲۲)

"بھلا جس کا سینہ کھول دیا اللہ نے اسلام کے لیے سو وہ روشنی میں ہے اپنے رب کی طرف سے۔"

۳۔ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۔ (بقرہ:۲۵۷)

"اللہ ان کا ساتھی اور مددگار ہے، جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں انہیں تاریکیوں سے نکالتا اور روشنی میں لاتا ہے۔"

بعض مقامات پر "نور" اس طرح آیا ہے کہ بعض مفسرین کرام کو خیال ہوا کہ غالباً اس سے مراد خود رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات ہے۔ جیسے سورہ مائدہ میں ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۵﴾ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ ۔ (مائدہ ۱۵۔۱۶)

"اللہ کی طرف سے تمہارے پاس "نور" (رسول اللہ ﷺ یا حق کی روشنی) آچکا نیز وہ روشن

[1] سیرۃ ابن ہشام القسم الثانی ص ۶۳۱

کتاب آچکی جس کے ذریعے سے اللہ اپنی رضا و خوشنودی کے پیروں کو سلامتی کے راستوں کی طرف ہدایت دیتا ہے۔"

مندرجہ ذیل دعا سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کے قلب منور میں "نور حق" کے لیے کس درجہ والہیت اور شیفتگی تھی اور یہ دعا آپ ﷺ روزانہ پڑھتے تھے۔

اللّٰھُمَّ فِی قلبی نوراً وَّفی بصری نوراً وَّفی سمعی نوراً وَّعن یمینی نوراً وَّعن یساری نوراً وَّ فوقی نوراً وَّتحتی نوراً وَّ امامی نوراً وَّ خلفی نوراً وَّ اجعل لی نوراً وَّفی لسانی نوراً وَّفی دمی نوراً وَّفی عصبی نوراً وَّفی شعری نوراً وَّفی بشری نوراً۔ اللّٰھُمَّ اعطنی نوراً، اللّٰھُمَّ اعظم لی نوراً، اللّٰھم اجعلنی نوراً۔

"الٰہی! میرے قلب میں نور ہو اور میری آنکھوں میں نور ہو اور میرے کانوں میں نور ہو، اور میرے داہنے نور ہو، میرے بائیں نور ہو، میرے اوپر نور ہو اور میرے نیچے نور ہو اور میرے آگے نور ہو اور میرے پیچھے نور ہو اور نور میرا بنادے اور میری زبان میں نور ہو، میرے خون میں نور ہو اور میرے پٹھوں میں نور ہو اور میرے بالوں میں نور ہو، میرے چہرے پر نور ہو، الٰہیٰ مجھے نور عطا فرما، الٰہیٰ میرے نور کو بڑھا، الٰہیٰ مجھے نور ہی بنادے۔"

سنت رسول پاک ﷺ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی سنت کے متعلق پوچھا۔ فرمایا:

۱۔المعرفۃ راس المالی	میری اصل پونجی معرفت ہے۔
۲۔والعقل اصل دینی	عقل سلیم میرے دین کی اصل ہے۔
۳۔والحبّ اساسی	محبت میری بنیاد ہے۔
۴۔والشوق مرکبی	شوق میری سواری ہے۔
۵۔والذّکر انیسی	اللہ کا ذکر میرا انیس و مونس ہے۔
۶۔والثّقۃ کنزی	اعتماد الٰہیٰ میرا خزانہ ہے۔
۷۔والحزن رفیقی	(ہم جنسوں کی فلاح کے لیے اندوہ قلب میرا رفیق ہے)
۸۔والعلم سلاحی	علم میرا ہتھیار ہے۔
۹۔والصبر ردائی	صبر میری ردا ہے۔
۱۰۔والرضا غنیمتی	رضائے باری تعالیٰ میری غنیمت ہے۔
۱۱۔والعجز فخری	عاجزی میرا سرمایہ فخر ہے۔
۱۲۔والزھد حرفتی	زہد میرا پیشہ ہے۔

۱۳۔والیقین قُوتی — یقین میری روزی ہے۔

۱۴۔والصدق شفیعی — راست بازی اور صداقت میری شفیع یعنی ساتھی ہے۔

۱۵۔والطاعتہ حسبی — طاعت حق میری عزت ہے۔

۱۶۔والجہاد خلقی — جہاد یعنی راہ حق میں انتہائی سعی وجہد میری جبلی ہے۔ خصلت

۱۷۔وقرۃ عینی فی الصلوٰۃ — اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

کیا تاریخ عالم کی کسی شخصیت کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جس میں خصائل جمیلہ اور شمائل حسنہ اس پیمانے پر جمع ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی ذات بابرکات میں بہ درجہ کمال جمع کر دیے تھے؟ یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی بھی دوسری شخصیت کی ایک ایک خصوصیت، ایک ایک حرکت، ایک ایک عمل اور ایک ایک ارشاد مستند روایات کی بناء پر آج تک اس طرح محفوظ بھی نہیں ہوا، جس طرح رسول اللہ ﷺ کے متعلق ایک ایک چیز جمع ہوئی۔ صدق اللہ عزو جل۔

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (الرعد۔۱۷)

"پس جھاگ تو خشک ہو کر جاتا رہتا ہے (کیونکہ وہ کسی کام نہ تھا) اور جس میں بندگان خدا کے لیے نفع ہو، وہ چیزیں زمین میں باقی رہتی ہے۔"

رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء۔۱۰۷)

نوعِ انسانی کے لیے رحمت

یہاں پیغمبر اسلام کے ظہور کا ایک ایسا وصف بیان کیا گیا ہے جو قرآن کے بیان کردہ اوصاف میں سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہے۔[1] یعنی رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ! یہ ظہور کسی ایک ملک، کسی ایک قوم، کسی ایک نسل ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے رحمت کا ظہور ہے۔ یہ وصف بیان کرکے قرآن نے ایک کسوٹی ہمارے حوالے کردی ہے۔ اس پر ہم اس ظہور کی ساری صداقتیں پرکھ لے سکتے ہیں۔ اگر یہ فی الحقیقت تمام نوعِ انسانی کے لیے رحمت کا ظہور ثابت ہُوا ہے تو اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو پھر سچائی نے قرآن کا ساتھ نہیں دیا۔ ہمارا فرض ہے کہ حقیقت کا اعتراف حقیقت کے لیے کرلیں۔

یہ جانچ تاریخ کی بے لاگ اور بے رحم جانچ ہونی چاہیے۔ ہر طرح کی مذہبی خوش اعتقادیوں سے منزہ، ہر طرح کی خود پرستانہ طرف داریوں سے پاک، کیونکہ یہاں حقیقت کی عدالت موجود ہے اور وہ صرف حقیقت ہی کی شہادت پر کان دھرتی ہے۔

تاریخ کا فیصلہ

جہل و تعصب نے ہمیشہ اعلان حقیقت کی راہ روکنی چاہی ہے، لیکن روک نہیں سکی۔ اس کے فیصلے میں بھی تاریخ نے دیر لگائی، لیکن بالآخر اسے تسلیم کرنا پڑا، ضروری ہے کہ فیصلہ خود اسی کی زبانی سُنا جائے اور ایک معتقد کی طرح نہیں بلکہ ایک مورخ کی طرح عالم انسانیت کے ایک ایک گوشے سے شہادت طلب

---

[1] وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ
"اور اے پیغمبر ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ پوری کائنات کے لیے رحمت کا ظہور ہو۔"

کی جائے۔ افسوس ہے کہ اس وقت تک کوئی کوشش ایسی نہیں کی گئی، جو اس موضوع پر عملی حیثیت سے وقیع سمجھی جاسکے۔ ہم نے "مقدمہ تفسیر" میں اس کی کوشش کی ہے اور ایک خاص باب کا موضوع بحث یہی مسئلہ ہے۔ یہاں اتنی تفصیل کی گنجائش نہیں اور اختصار مفید مدعا نہیں، اس لیے مجبوراً قلم روک لینا پڑتا ہے۔(سورۂ انبیا کا حاشیہ)

ابر رحمت اور شادآبی زمین

جب زمین پیاسی ہوتی ہے تو ربّ السمٰوٰت والارض پانی برساتا ہے، جب انسان اپنی غذا کے لیے بے قرار ہوتا ہے تو وہ موسم ربیع کو بھیج دیتا ہے، جب خشک سالی کے آثار چھا جاتے ہیں تو آسمان پر رحمت کی بدلیاں پھیل جاتی ہیں:

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ (روم:۴۸)

"وہ خدا ہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور ہوائیں بادلوں کو اپنی جگہ سے ابھارتی ہیں اور جس طرح اس کی مرضی نے انتظام کر دیا ہے، بادل فضا میں پھیل جاتے ہیں، پس تم دیکھتے ہو کہ ان کے اندر سے مینہ برسنے لگتا ہے اور تمام زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے پھر جب وہ اپنے بندوں پر جو بارش سے مایوس ہو گئے تھے، پانی برسا دیتا ہے، تو وہ کامیاب و خرم ہو کر خوشیاں منانے لگتے ہیں"۔

قدرتی مثالوں کی حکمت

خدا کی تمام مثالیں اور دانائیاں جو وہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے کھولتا ہے، ہمیشہ عام اور قدرتی مناظر سے تعلق رکھتی ہیں تاکہ زمین کی ہر مخلوق ان کی تصدیق کر سکے اور ان سے دانائی حاصل کر سکے۔ وہ ایسے تغیرات و حوادث اور غیر فطری و صناعی چیزوں کا ذکر نہیں کرتے جن کو دیکھنے سمجھنے کے لیئے کسی خاص طرح کی زندگی، خاص طرح کے علم اور خاص طرح کے گرد و پیش کی ضرورت ہو، بلکہ اِس کی ہر تعلیم ایسی عام اور خالص فطری حالات سے متعلق ہوتی ہے، جس کو سن کر جنگل کا ایک چرواہا اور متمدن آبادیوں کا فیلسوف دونوں یکساں اثر کے ساتھ خدا کی سچائی کو پاسکتے ہیں۔ پس اگر تم نے فلسفہ و حکمت نہیں پڑھا، اگر تم نے اجرام سماویہ کے دیکھنے کے لیے کسی رصد خانے کی قیمتی دُور بین نہیں پائی، اگر تم کو مادہ کے خواص کا تجربہ نہیں، اگر تم کسی دارالعلوم کے اندر برسوں تک نہیں رہے، اگر تم صحرائی ہو، اگر تم پہاڑوں کی چوٹیوں پر گوشہ نشین ہو، اگر پھونس کی ایک چھت اور بانسوں کی ایک شکستہ دیوار ہی رہنے اور بسنے کے لیے تمہارے حصے میں آئی ہے اور اس طرح تم نہیں جانتے کہ اپنے خدا کو آسمان کے عجیب و غریب

ستاروں کے اندر کیونکر دیکھو اور اس کے حسن و جمال کو عناصر و ذرات خلقت کی آمیزش و آویزش کے اندر کیونکر ڈھونڈو، تاہم تم انسان ہو، تم کو روح دی گئی ہے اور تم زمین پر بستے ہو، تم آسمان کی ہر بدلی کے اندر، بادلوں کے ہر ٹکڑے کے اندر، ہواؤں کے ہر جھونکے کے اندر، بارانِ رحمت کے ہر قطرے کے اندر، اپنے خداوند حی و قیوم کو، اس کی حکمت و قدرت کو، اس کی رافت و رحمت کو، اس کے پیار اور محبت کو دیکھ سکتے ہو اور اسے پاسکتے ہو۔ تم میں سے کون ہے جس نے امید و بیم کی نظروں سے کبھی آسمان کو نہیں دیکھا اور اس کی بجلیوں کی چمک اور بادلوں کی گرج کے اندر اپنی کھوئی ہوئی امید کو نہیں ڈھونڈا؟

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (روم:۲۴)

"اور قدرت الٰہی کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ جب زمین پیاسی ہوتی ہے اور خشک سالی کے آثار ہر طرف چھاجاتے ہیں تو وہ آسمان پر بارش کی علامتیں پیدا کر دیتا ہے اور تم امید و بیم کی نظروں سے انھیں دیکھتے ہو۔"

موت کے بعد زندگی

پھر وہ کون ہے کہ جب تم اور تمہاری تشنہ و بیقرار زمین پانی کے ایک ایک قطرے کے لیے ترس جاتی ہے، خاک کا ایک ایک ذرہ رطوبت و نمو کے لیے بے قرار ہوجاتا ہے۔ کرہ ارضی اپنی بے خودانہ حرکت میں آفتاب کے آتش کدے سے قریب تر ہوجاتا ہے۔ اس کی تمام کائنات نباتات اپنا حسن و جمال فطری کھو دیتی ہے، پرندے اپنے گھونسلوں میں، ٹہنیاں درختوں میں اور انسان گھروں میں پانی کے لیے ماتم کرتا اور ہر دم آسمان کی گرم و خشک فضا کی طرف مایوسی کی نگاہیں اٹھاتا ہے تو وہ اپنی محبت و ربوبیت کے نقاب میں آتا ہے اور مایوسی کے بعد امید کا، نامرادی کے بعد مراد کا، موت کے بعد زندگی کا پیام زمین کے ایک ایک ذرہ تک پہنچا دیتا ہے۔

وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (روم ۲۴)

"اس کی ربوبیت و رحمت کو دیکھو کہ جب تم امید و بیم کی نظروں سے آسمان کو دیکھتے ہو اور تمام زمین پر مردنی اور ہلاکی چھاجاتی ہے تو وہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور زمین پر موت کے بعد زندگی طاری ہوجاتی ہے۔ یقیناً قدرت الٰہی کی اس نمود میں صاحبان فکر و عقل کے لیے بڑی ہی نشانیاں رکھی گئی ہیں۔"

روح کی پیاس اور دل کی بھوک

یہ وہ انتظام الٰہی ہے جو پروردگار عالم نے انسان کے جسم کی غذا کے لیے کیا ہے، پھر کیا اس نے انسان کی روح کے لیے کچھ نہ کیا ہوگا؟ وہ رب الارباب جو زمین کی پکار سن کر اسے پانی دیتا اور جسم کی بے قراری دیکھ کر

اسے غذا بخشتا ہے، کیا سرزمین روح و معنی کی تشنگی کے لیے کچھ نہیں رکھتا اور دل کی بھوک کے لیے اس کے خزانوں میں کوئی نعمت نہیں؟

وہ کہ اس کی محبت زمین کی مٹی کو خشک نہیں دیکھ سکتی اور درختوں کی ٹہنیوں کو وہ سبز پتوں اور سرخ پھولوں کی زیبائش سے محروم نہیں رکھتا، کیا روح انسانی کو ہلاکت و بربادی کے لیے چھوڑ دے گا اور عالم انسانیت کا مرجھا جانا اسے خوشی دے گا؟ وہ رب العٰلمین جو تمہارے جسم کو غذا دے کر موت سے بچاتا ہے' کیونکر ممکن ہے کہ تمہاری روح کو ہدایت دے کر ضلالت سے نہ بچائے؟

جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ اسلام سے پوچھا کہ:

فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿٤٩﴾ (طٰہٰ:۴۹)

"تمہارا پروردگار کون ہے، اے موسیٰ؟"

تو حضرت موسیٰؑ نے نہ صرف اپنے رب العٰلین کی نسبت خبر ہی دی، بلکہ اس کی الوہیت کی دلیل فطری و قطعی بھی چند لفظوں میں فرمادی:

رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿٥٠﴾ (طٰہٰ:۵۰)

"ہمارا رب وہ ہے جو "رب" ہے اور اس کے لیے اس کی ربوبیت نے کائنات کی ہر چیز کو اس کی خلقی ضروریات بخشیں، پھر اس کے بعد ان کی ہدایت کردی تاکہ صحیح اور فطری طریقے پر کاربند رہ کر اپنی خلقت کے مقاصد حاصل کریں۔"

پس اس نے کہ زمین کی مٹی کے اندر قوت نشو و نما رکھی، پھر پانی برسا کر اس کی ہدایت کردی، یعنی اس کے آگے نفوذ و عمل کی راہ کھول دی اور جس کی ربوبیت نے عالم ہستی کے ایک ایک ذرہ کے لیے خلقت اور ہدایت دونوں کا سامان کر دیا، انسان کو بھی جسم اور روح دونوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کے لیے بھی خلقت اور ہدایت، دونوں کا سامان رکھتا ہے۔

رحمت باری تعالیٰ کے خزانے

اس کی ربوبیت نے جس طرح جسم کے لیے زمین کے اندر طرح طرح کے خزانے رکھے ہیں، اسی طرح روح کی غذا سے بھی اس کے آسمانوں کی وسعت معمور ہے۔ جس طرح جسم کی غذا اور زمین کی مادی حیات و نمو کے لیے آسمانوں پر بدلیاں پھیلتیں، بجلیاں چمکتیں اور موسلا دھار پانی برستا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اقلیم روح و قلب کی فضا میں بھی تغیرات ہوتے ہیں۔ یہاں اگر زمین کی مٹی پانی کے لیے ترستی ہے، تو وہاں بھی انسانیت کی محرومی ہدایت کے لیے تڑپنے لگتی ہے، یہاں پتے جھڑتے ہیں، ٹہنیاں سوکھنے لگتی ہیں اور پھولوں کے رنگین ورق بکھر جاتے ہیں تو تم کہتے ہو کہ آسمان کو رحم کرنا چاہیے۔ وہاں بھی جب سچائی کا

درخت مُرجھا جاتا ہے، نیکی کی کھیتیاں سُوکھ جاتی ہیں، عدالت کا باغ ویران ہو جاتا ہے اور خدا کے کلمہ حق و صدق کا شجرہ طیّبہ دنیا کے ہر گوشے اور ہر حصے میں بے برگ و بار نظر آنے لگتا ہے تو اس وقت رُوحِ انسانیت چیختی ہے کہ خدا کو رحم کرنا چاہیے۔ یہاں زمین پر موت طاری ہوتی ہے تو خدا کی بارش اسے پھر اٹھا کر بٹھا دیتی ہے:

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ (اعراف: ۵۷)

"اور وہ پروردگارِ عالم ہی تو ہے کہ بارش سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے جو بارانِ رحمت کے آنے کی خوشخبری سنا دیتی ہیں، یہاں تک کہ جب اس کا وقت آ جاتا ہے تو وہ وزنی بادلوں کو حرکت دیتی ہیں اور ہم انہیں ایک ایسے شہر کے اوپر لے جا کر پھیلا دیتے ہیں جو ہلاک ہو چکا ہے اور زندگی کے لیے پیاسا ہے۔ پھر پانی برستا ہے اور زمین کی موت کو زندگی میں بدل دیتا ہے، اس کی نمو بخشی سے طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں اور مخلوقات اپنی غذا حاصل کر لیتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم مردوں کو بھی اٹھاتے ہیں اور یہ جو کچھ کہا گیا ہے سو دراصل ایک مثال ہے کہ تم دانائی اور سمجھ حاصل کرو۔"

رحمت الٰہی کی عالمگیر نمود

عالم انسانیت کی فضائے روحانی کا ایک ایسا ہی انقلاب عظیم تھا جو چھٹی صدی عیسوی میں ظاہر ہوا۔ وہ رحمت الٰہی کی بدلیوں کی ایک عالمگیر نمود تھی جس کے فیضان عام نے تمام کائنات ہستی کو سرسبزی و شادابی کی بشارت سنائی اور زمین کی خشک سالیوں اور محرومیوں کی بدحالی کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ وہ خداوند قدوس، جس نے سینا کی چوٹیوں پر کہا تھا کہ میں اپنی قدرت کی بدلیوں کے اندر آتشیں بجلیوں کے ساتھ آؤں گا اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ میرے جاہ و جلال الٰہی کی نمود ہو گی، سو بالآخر وہ آ گیا اور سعیر و فاران کی چوٹیوں پر اس کے ابرِ کرم کی بُوندیں پڑنے لگیں۔

یہ ہدایت الٰہی کی تکمیل تھی، یہ شریعت ربانی کے ارتقاء کا مرتبہ آخری تھا، یہ سلسلہ ترسیل رسل و نزولِ رحمت کا اختتام تھا۔ یہ سعادت بشری کا آخری پیام تھا، یہ وراثت ارضی کی آخری بخشش تھی، یہ امت مسلمہ کے ظہور کا پہلا دن تھا اور یہ حضرت ختم المرسلین و رحمۃ للعلمین محمد بن عبد اللہ کی ولادت باسعادت تھی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہ وسلم۔

یہی واقعہ ولادت نبوی ہے جو دعوت اسلام کے ظہور کا پہلا دن تھا اور یہی ماہ ربیع الاول ہے، جس میں اس امت مسلمہ کی بنیاد پڑی، جسے تمام عالم کی ہدایت و سعادت کا منصب عطا ہونے والا تھا، یہ ریگستان حجاز کی بادشاہت کا پہلا دن تھا، یہ عرب کی ترقی و عروج کے بانی کی پیدائش نہ تھی، یہ محض قوموں کی

طاقتوں کا اعلان نہ تھا، اس میں صرف نسلوں اور ملکوں کی بزرگی کی دعوت نہ تھی جیسا کہ ہمیشہ ہُوا ہے اور جیسا کچھ کہ دنیا کی تمام تاریخ کا انتہائی سرمایہ ہے، بلکہ یہ عالم کی ربانی بادشاہت کا یوم میلاد تھا۔ یہ دنیا کی ترقی و عروج کے بانی کی پیدائش تھی، یہ کرۂ ارضی کی سعادت کا ظہور تھا۔ یہ نوع انسانی کے شرف واحترام کا قیام عام تھا۔ یہ انسانوں کی بادشاہتوں، قوموں کی بڑائیوں اور ملکوں کی فتوحات کا نہیں بلکہ خدا کی ایک ہی اور عالمگیر بادشاہت کے عرش جلال وجبروت کی آخری اور دائمی نمود تھی۔ پس یہی دن سب سے بڑا ہے کیونکہ اسی دن کے اندر دنیا کی سب سے بڑی بڑائی ظاہر ہوئی۔ اس کی یاد نہ تو قوموں سے وابستہ ہے اور نہ نسلوں سے، بلکہ وہ تمام کرۂ ارضی کی ایک عام اور مشترک عظمت ہے جس کو وہ اس وقت تک نہیں بھلا سکتی، جب تک اسے سچائی اور نیکی کی ضرورت ہے اور جب تک اس کی زمین اپنی زندگی اور بقا کے لیے عدالت وصداقت کی محتاج ہے۔

دنیا کی بڑائیاں اور ان کے نتیجے

دنیا میں بڑے بڑے انقلاب ہوئے ہیں۔ یہ انقلابات خاص انسانوں کے وجود سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے ان انسانوں کی پیدائش کے ایام کو بھی دنیا عظمت کے ساتھ یاد رکھنا چاہتی ہے اور اس اعتبار سے اس کی یادگاروں کی فہرست بڑی ہی طویل ہے۔ اس میں بادشاہوں کے زرنگار تختوں کی قطاریں ہیں۔ فاتحوں کی بے پناہ تلواروں کی جھنکار ہے۔ سپہ سالاروں کے زرہ بکتر کی ہیبت ہے۔ حکیموں کی حکمتوں اور دانائیوں کے دفاتر ہیں۔ فلاسفہ وعلماء کے علوم و صحائف کے خزائن ہیں، صناعوں کی ایجاد ہیں۔ وطن پرستوں کے مواعظ ہیں۔ قومی پیشواؤں اور ملکی داعیوں کی جانفشانیوں اور سرفروشیوں کی داستانیں ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا اگر اپنی عظمت کے اصلی دن کو یاد رکھنا چاہتی ہے تو ان میں سے کسے یاد رکھے؟ ان میں سے کون ہے جس نے دنیا کو سب سے بڑی چیز دی ہے تاکہ وہ بھی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کی یاد کو پیار کرے۔

اولوالعزم شہنشاہ

آؤ، ہم سب سے پہلے بڑے بڑے اولوالعزم شہنشاہوں کو دیکھیں جنھوں نے دنیا کے بڑے بڑے رقبوں کو نوکِ شمشیر پر رکھ لیا اور ایسے عجیب وغریب ایوانوں اور محلوں میں بسے، جن کی دیواریں اور چھتیں چاندی، سونے اور لعل وجواہر سے بنائی گئی تھیں۔ انہوں نے بُہت زیادہ مال ومتاع جمع کیا، ان کے پاس لوہے کے بہت سے آلات خونریزی تھے اور ان کی اطاعت وغلامی میں انسانوں کا سب سے بڑا گلہ تھا۔ پس ان کی پیدائش کے واقعہ کو بھی سب سے زیادہ عظیم الشان اور ناقابل فراموش ہونا چاہیے۔ لیکن اگر دنیا ان کی

پیدائش کو یاد رکھے تو بتلاؤ دنیا کے لیے انہوں نے کیا کیا؟ ان کی فتوحات بہت وسیع تھیں اور ان کی وہ دولت جو انہوں نے زمین کی بستیوں کو اجاڑ کر لوٹی تھی، بڑے بڑے وسیع رقبوں کے اندر آتی تھی، لیکن دنیا کو اس سے کیا ملا کہ دنیا کی گردن ان کی یاد کے آگے: اگر وہ بہت بڑے فاتح تھے، تو اس کو یُوں کہو کہ انہوں نے سب سے زیادہ زمین کو ویران کیا، سب سے زیادہ اس کی آبادیوں کو اجاڑا، سب سے زیادہ خُون کی ندیاں بہائیں اور سب سے زیادہ خدا کے بندوں کے گلے میں اپنی غلامی کی لعنت کا طوق ڈالا۔ پھر کیا دنیا اپنی ویرانیوں ، قتل وغارت، نہب وسلب اور اپنی غلامی کی لعنت کے ناپاک دنوں کو یاد رکھے؟ جن کی ابلیسیت نے یہ لعنت پھیلائی تھی، ان کی پیدائش کی نحوست پر خوشیاں منائے؟

سکندر اور دُوسرے فاتح

سکندر دنیائے قدیم کا سب سے بڑا فاتح تھا، جس نے پُوری دنیا سے اپنے تخت کی پُوجا کرانی چاہی، لیکن دنیا اگر اس کی پیدائش کو یاد رکھے تو یہ دن کن واقعات کی یاد ہو گا؟ یہ دنیا کی ویرانیوں، ہلاکتوں اور غلامی کی لعنتوں کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہو گا، جو اسے ہاتھ آئے گا۔ دنیا میں جس قدر بادشاہ پیدا ہُوئے، اگر تم ان کی زندگی کے تمام کارناموں کا حاصل معلوم کرنا چاہو، تو اس کے سوا اور کچھ نہ ہو گا کہ وُہ جتنے بڑے بادشاہ تھے، اتنے ہی زیادہ انسانوں کو غلام بنانے والے تھے، اتنے ہی زیادہ ان کی فطری قوتوں کے لیے پتھر تھے، اتنے ہی زیادہ ان کی قدرتی حرکت و نشو کے لیے زنجیر تھے اور اتنے ہی زیادہ خدا کی عطا کردہ جبلت صالحہ اور انسان کے نوعی شرف واحترام کے لیے انکے اندر بربادیوں اور ہلاکتوں کی نحوست تھی، پس جن کا وجود خود دنیا کے لیے ایک زخم تھا، وہ ان کی یاد میں اپنی گم شدہ شفا کیونکر پا سکتی ہے؟

حکماء وفلاسفہ

حکماء کی حکمت، فلاسفر کا فلسفہ، صناعوں کی ایجادیں، بلاشبہ تاریخ عالم کے اہم مقامات ہیں، لیکن اگر وہ اپنی یاد کے آگے دنیا کو جھکانا چاہتے ہیں، تو انہیں بتلانا چاہیئے کہ انہوں نے اپنی حکمت سرائیوں اور عجیب عجیب ایجادوں سے دنیا کے اصلی دکھ اور زمین کی حقیقی مصیبت کے لیے کیا کیا؟ آسمان کی فضا میں ان گنت ستاروں کی قطاریں پھیلی ہُوئی ہیں۔ بلاشبہ وُہ شخص بہت بڑا غور کرنے والا دماغ اور بڑی ہی کاوش کرنے والی نظر رکھتا تھا، جس نے ہمیں سب سے پہلے بتلایا کہ یہ بڑے بڑے ستارے ہیں، ان میں ثوابت ہیں اور ان کی حرکتوں کے معین اوقات و ایام ہیں، لیکن دنیا جب ستاروں کی یہ بہت بڑی سچائی نہیں جانتی تھی، تو اس وقت بھی بیمار تھی اور یہ معلوم کرکے بھی بیمار ہی رہی۔ اس کا اصلی دکھ یہ نہ تھا کہ انسان آسمان کے متعلق

تھوڑا جانتا ہے، بلکہ ہمیشہ سے وہ اس ایک ہی مرض میں گرفتار رہی ہے کہ انسان خود اپنی نسبت، اپنی فطرت صالحہ کی نسبت، اپنی راہ سعادت کی نسبت کچھ بھی نہیں جانتا۔

صنعت گر

اس صناع کو اگر تم بڑا سمجھتے ہو، جس نے انسان کے لیے فن تعمیر ایجاد کیا تا کہ وہ پائدار مکانوں اور خوبصورت چھتوں کے نیچے بیٹھے، تو تمہیں بتلانا چاہیے کہ کیا انسان درختوں کے نیچے بیٹھ کر نیک اور سچا انسان نہ تھا اور بڑے بڑے محلوں کے اندر بس کر اس نے اپنی گم شدہ حقیقت پالی؟ دنیا کا اصلی مرض انسانیت حقیقی کی گم شدگی ہے۔ سعادت انسانی اور امن ارضی ہی وہ نعمت ہے جس کی ڈھونڈ میں ابتدا سے کائنات کا ذرہ ذرہ تہ و بالا ہو رہا ہے۔ پھر بتلاؤ کہ اگر یہ بڑے بڑے صناع اور موجد ہی انسانیت کی سب سے بڑی بڑائی رکھتے ہیں، تو ان کی ایجادوں نے انسان کو کس قدر امن دیا؟ کس قدر سلامتی بخشی؟ کہاں تک صراط سعادت پر چلایا؟ طلسم حیات انسانی کا کون سا راز افشاء کیا؟ خدا اور بندوں کے رشتوں کو کہاں تک جوڑا؟ پھر اگر وہ یہ نہ کر سکے تو دنیا ان کی ایجادات کو اپنے خزانے میں رکھ سکتی ہے، لیکن ان کی یاد میں اس کے لیے کوئی خوشی نہیں ہو سکتی کیونکہ انہوں نے اس کے اصلی دکھ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔

دور حاضر

اچھا، دنیائے قدیم کے ذخیرے میں جو کچھ ہے، اسے چھوڑ دو، کلدان و بابل اور یونان و اسکندریہ کے کھنڈر اور مسمار شدہ آثار کے اندر اگر دنیا کے لیے کچھ نہ تھا، تو بہت ممکن ہے کہ آج لندن اور برلن و پیرس کی عجیب و غریب آبادیوں اور عقل و فہم کو مبہوت کر دینے والے تمدن کے اندر دُنیا کو وہ چیز مل جائے، جس کے لیے وہ ابتدائے خلق سے حیران و سر گشتہ رہی ہے۔

موجودہ تمدن یورپ کی ابتدا جن بڑے بڑے دعووں سے ہوتی ہے، ضرور ہے کہ وُہ سب کے سب اس وقت تمہارے سامنے ہوں، کیونکہ ہماری موجودہ صحبت ان کے اعادے کی متحمل نہیں۔ ہم کو بتلایا گیا تھا کہ موجودہ تمدن کو دنیا کے قدیم تمدنوں سے کوئی مشابہت نہیں۔ ان کی مختلف شاخوں میں باہم ربط و علاقہ نہ تھا۔ ان کی بنیادیں صحت و حقیقت پر نہ تھیں، وہ انسانی علم و عمل کی تمام شاخوں کو بیک وقت مکمل نہ کر سکی تھی، انہوں نے معلومات و اعمال میں کوئی صحیح نظم و ترتیب پیدا نہیں کی اور انہیں اپنے تمدن کی اشاعت اور پھیلاؤ کے وہ ذرائع حاصل نہ تھے جن کے ذریعہ ہم نے کرۂ ارضی کو علم و تمدن کا ایک گھر بنا دیا ہے۔ پس گزشتہ تمدنوں کی ناکامی سے موجودہ تمدن کی ناکامی پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اور اسی

طرح کے دعوے تھے جن سے موجودہ تمدن کی فضا بھر گئی تھی اور جن کے ذریعے سے اعلان کیا جاتا تھا کہ دنیا میں سب سے بڑی طاقت موجودہ تمدن کی ہے، حالانکہ سب سے بڑا صرف خدا ہے :

لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿٢١﴾ (فرقان: ۲۱)

”بلاشبہ انہوں نے یہ کہہ کر اپنے اندر بڑا گھمنڈ پیدا کیا اور بڑی سخت درجے کی سرکشی کی۔“

اپنے ہاتھوں گھر برباد کرنے والے

سو اب تم دیکھو کہ دنیا اپنے اعتراف کا سر جھکانے کے لیے جب تمدن کے اس سب سے بڑے مغرور بت کی طرف جاتی ہے، تو اسے کیا جواب ملتا ہے۔

آج تمدن کے ابلیسانہ گھمنڈ کا ملعون بُت چُور چُور کر دیا گیا ہے، خدا کا وہ زبردست اور بے پناہ ہاتھ جو قوم ثمود و عاد اور بڑی بڑی آبادیوں اور بڑے بڑے خیموں والوں کو سزا دے چکا تھا، اپنے جلال اور ہولناکی کی آتیشوں کی چمک دکھلا رہا ہے۔ تم یورپ کی موجودہ جنگ [1] اور متمدن اقوام کے باہمی قتل و خونریزی پر چارپایوں کی طرح نہیں بلکہ انسانوں کی طرح نظر ڈالو اور دیکھو کہ یہ کیا ہے جو تمہارے سامنے ہو رہا ہے؟ یہ تمدن اور وحشت کی پکار نہیں، یہ علم اور جہل کی ٹکر نہیں یہ تمدن ہے جو تمدن سے ٹکرا رہا ہے، یہ علم ہے جو علم کو ذبح کر رہا ہے۔ یہ صناعت ہے جو صناعت کو پیس رہی ہے۔ یہ ایجاد کا مغرور شیطان ہے، جو ایجاد ہی کے شیطان لعین کو ڈس رہا ہے اور اس طرح تمدن کا گھمنڈ ہی ہے جو تمدن کے گھمنڈ کو ریزہ ریزہ اور پاش پاش کر رہا ہے۔

يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ ”اپنے گھروں کو وہ اپنے ہاتھوں ہی سے اجاڑ رہے ہیں۔“

پس اگر مسکین دنیا ان انسانوں کو یاد رکھنا چاہتی ہے جو تمدن کے بادشاہ تھے، علم کے فرمانبردار تھے اور ایجاد صناعت کے دیوتا تھے، تو تم اس کا ہاتھ پکڑو اور اسے آج یورپ کے ان میدانوں کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دو جہاں تمدن و علم کا تخت عظمت و جلال آگ اور لہو کی بدلیوں اور دُھوئیں اور زہریلی گیسوں کی مسموم فضا کے اندر بچھایا گیا ہے اور مسمار عمارتوں کے کھنڈروں، سُرخ سرخ خون کی ندیوں اور انسانوں کی تڑپتی ہُوئی لاشوں کے تودوں پر اس کے سنہرے ستون عظمت نصب کیے گئے ہیں۔ پھر اس سے کہو کہ وُہ اپنی احسان مندی اور شکر گزاری کے لیے ان عظیم الشان انسانوں میں سے کسی کی بڑائی کو چھانٹ لے، جو آج

---

[1] یہ مقالہ پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴۔۱۹۱۸) کے دوران میں لکھا گیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹۔۱۹۴۵) نے اس کے مطالب کی مزید تصدیق کر دی۔ عاد و ثمود، فرعون اور ہزاروں دوسرے سرکش مختلف طریقوں سے فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ یورپ پر موت و ہلاکت کی جو ہولناک آفتیں عالمی جنگوں کی شکل میں مسلط ہوئیں ' وہ بھی تو بہر حال ویسے ہی عذاب تھے جو سابقہ قوموں پر مختلف اوقات و ادوار میں نازل ہو چکے تھے۔ کیا اہل یورپ نے اپنے ہاتھوں اپنے گھر برباد نہ کیے؟ ہٹلر، سٹالین، چرچل، دوسرے لوگ ایک دوسرے کو کاملاً مٹا دینے کے لیے ہر ممکن جدوجہد نہ کرتے رہے؟

گیہوں اور جَو کے لیے روتے ہیں کیونکہ ہوا میں اڑنے کے آلات اور پانی کو مفرد اجزا میں بدل لینے کا علم ان کے کچھ کام نہ آیا۔

کس کی یاد منائیں؟

وہ ان میں سے کس کو اپنی پرستش اور یاد کے لیے چُنے گی؟ کیا وہ اس سب سے بڑے فلسفی کو یاد کرے گی، جو چودھویں صدی عیسوی میں آیا اور اس نے تجربے کی راہ کھولی، جس راہ نے انسانوں کو ہلاکت اور خونریزی کے سب سے زیادہ رُوح پاش آلات تک پہنچا دیا؟ وہ کیمسٹری کے اس دیوتا کو یاد کرے گی جس پر موجودہ تمدن کو سب سے زیادہ ناز ہے اور جس نے ایسی زہریلی گیسیں، ایسے مہلک بم اور شیل اور ایسے بے پناہ مرکبات بنا دیے جن کے آگے انسانی جماعتیں بالکل بے بس ہو جاتی ہیں اور منٹوں کے اندر بڑی بڑی آبادیاں موت کی لعنت سے بھر جاتی ہیں؟ اچھا، بھاپ کی طاقت کے مُوجد کو بلاؤ، اس کی بڑائی کیسی عجیب تھی جس نے بھاپ کی غیر معلوم طاقت کو انسان کے تابع کر دیا؟ لیکن آہ! وہ اس دنیا کے لیے کیا کرے جو موت کی نہیں، بلکہ زندگی کی بھُوکی ہے اور دیکھ رہی ہے کہ بھاپ کے شیطان ہی کے اندر وہ سب سے بڑی بے پناہ خباثت ہے، جس نے آج جنگ کے میدانوں میں مختلف بھیسوں اور مختلف صورتوں کے اندر موت کی سب سے بڑی پھنکار مار دی ہے اور تمام انسانی علم و دانائی اس کے بچاؤ کے لیے بیکار ہے!

پھر کیا دنیا تمدن و علم کے ان مغرور بانیوں کی پیدائش پر خوشیاں منائے جنھوں نے اس کی موت اور ہلاکت کے لیے تو سب کچھ کیا، پر اس کے امن و سلامتی اور سعادت و طمانیت کے لیے کچھ نہ کر سکے؟ ان کے پاس انسان کے اڑنے، سمندروں کے اندر جانے، بجلی کو قابو میں کرنے، ہوا کے تموج اور ذرات کو اپنے نامہ و پیام کا سفیر بنانے اور خود بخود بجنے والے باجوں اور بڑے تیزی سے چلنے والی سواریوں کے لیے تو بڑا ذخیرہ ہے۔ لیکن انسان کو نیک اور راست باز بنانے، خدا کی عدالت و صداقت سے زمین کو معمور کرنے، امن اور راحت کی بادشاہت کے قائم کر دینے، ظلم و فساد کے بیج سے زمین کو صاف کرنے، طاقت اور حکم کے جبر سے ضعف اور ناتوانی کو بچانے اور انسانوں کو درندوں اور سانپوں کی طرح نہیں، بلکہ انسانوں کی طرح بسا دینے کے لیے کُچھ بھی نہیں۔

قرآن حکیم کا درس حکمت

تم نے یورپ کے تمدن کی، کتوں کی طرح لوٹ کر اور بھیڑوں کی طرح چل کر ہمیشہ پرستش کی ہے اور مذہب کی تعلیمات کی ہنسی اڑائی ہے کہ وہ "آخرت آخرت" کہتا ہے، مگر یورپ کی طرح دنیا کے لیئے

کچھ نہیں بتلاتا لیکن شاید تم آج قرآن کی اس آیت کو سمجھ سکو۔ جس کے متعلق حدیث صحیح میں آیا ہے کہ اس کی تلاوت آخری زمانے کے فتنہ سے بچائے گی:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾ (کہف:۱۰۳۔۱۰۵)

"تم کو بتلاؤں کہ سب سے زیادہ ناکام و نامراد گھرانے والے کون ہیں؟ وہ جن کی تمام قوت سعی صرف دنیا کی زندگی سنوارنے ہی میں کھوئی گئی اور جہل حقیقت نے ان میں یہ گھمنڈ پیدا کر دیا کہ بہت سی خوبیوں کا کام کر رہے ہیں، یہی لوگ ہیں جنھوں نے پروردگار کی آیتوں اور اس کے حضور حاضر ہونے سے انکار کیا۔ پس ان کے سارے کام اکارت گئے اور قیامت کے دن انہیں کوئی وزن نصیب نہ ہو گا۔"

دوسری جگہ ارباب کفر کے اعمال یہ بتلائے:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿٧﴾ (روم:۷)

"صرف دنیا کی زندگی کا ایک ظاہری پہلو انہوں نے جان لیا ہے اور وہ آخرت کے علاقوں سے بالکل غافل ہو گئے۔"

آخرت سے مقصود یہ نہیں کہ دنیا اور دنیا کے اعمال ترک کر دیے جائیں، بلکہ اس کی عملی تفسیر یورپ کی موجودہ زندگی کو سمجھو، جس نے اپنے تئیں صرف دنیا ہی کے لیے وقف کر دیا اور اس کے گھمنڈ میں وُہ اللہ اور اس کے رشتے کے لیے کوئی وقت اور فکر نہ نکال سکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے وہ چیز تو حاصل کرلی، جس کا نام تمدّن رکھا گیا ہے، لیکن وُہ شے حاصل نہ کر سکی جو انسان کے لیے امن حقیقی کی راہ اور اسلام و سعادت فکری کی صراط مستقیم ہے۔

خدا کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم

تم کہہ سکتے ہو کہ یہ ان انسانوں کا حال ہے، جن کی بڑائیاں صرف جسم و مادہ تک محدود تھیں لیکن اگر دنیا کے لیے ان کی پیدائش کی یاد میں کوئی تسکین اور راحت نہیں تو وہ ان تمام صفوں سے باہر آجائے گی اور دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے دامن میں پناہ لے گی۔ وہ بانیان مذہب کی عظمتوں کا نظارہ کرے گی۔ وہ خدا کے رسولوں اور اس کے پاک پیاموں کے پیامبروں کو ڈھونڈے گی۔

ہاں، اگر دنیا ایسا کرے تو یہ فی الحقیقت اس کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو گا، اس کے دائمی درد اور بے قراریوں کے لیے سکھ اور راحت کی ایک حیات بخش کروٹ ہو گی اور وہ بلاشبہ منزل مقصود کو پالے گی۔ قرآن حکیم نے بھی اس کے دکھ کا یہی علاج بتایا ہے اور جب کہ وہ بادشاہوں، قومی پیشواؤں، کاہنوں اور

علم و مذہب کے جھوٹے مدعیوں کے دامنِ غرور میں لپٹی ہوئی تھی تو اسے وصیت کی کہ وہ سچائی کے رسولوں اور خدا کے داعیوں کی راہ اختیار کرے اور انہی کی زندگی کو اپنا نصب العین بنائے:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (سورۃ فاتحہ)

"خدایا تو ہمیں صراط مستقیم پر چلا، وہ صراط مستقیم جو تیرے نبیوں، صدیقوں، شہیدوں، صالح بندوں کی راہ ہے۔"

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس میدان میں بھی آ کر وہ کون سی زندگی ہے، جس کے اعمال دعوت کے اندر دنیا کو پیامِ امن و سعادت مل سکتا ہے؟

دنیا میں آج جو بڑے بڑے مذاہب موجود ہیں، وہ علم الاقوام کی تقسیم کے مطابق دو قسموں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک سیما طیقی (سامی) سلسلہ ہے، جس کے ماتحت یہودی اور مسیحی قومیں اب تک دنیا میں باقی ہیں۔ دوسرا آرین سلسلہ ہے جس سے گوتم بدھ اور ہندوستان کے تمام داعیان مذاہب وابستہ ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

پھر دنیا کے لیے اگر سب سے بڑا رسول یہودی مذہب کی تاریخ میں ہے، تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور ان کی پیدائش کو سب سے بڑا واقعہ قرار دے گی، لیکن اگر اس نے ایسا کرنا چاہا تو اسے یہ سمجھنے کا حق حاصل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعمال حیات مقدس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مصر کی ایک جابر و ظالم گورنمنٹ کے پنجہ استبداد سے بنی اسرائیل کو نجات دلائی اور اسے غلامی کی ناپاکی سے نکال کر جو انسانیت کے لیے سب سے بڑی ناپاکی ہے، حکومت اور امن و عزت کی طہارت تک پہنچا دیا۔

بلاشبہ انھوں نے اپنی قوم یعنی بنی اسرائیل کی نسل کے لیے بڑا ہی مقدس جہاد کیا اور یہ ان کا یادگار عالم اسوۂ حسنہ ہے، جس کی دنیا کو تقدیس کرنی چاہیے، لیکن سوال یہ ہے کہ انہوں نے تمام دنیا کے لیے کیا کیا؟ دنیا صرف بنی اسرائیل ہی کا نام نہیں۔ [1] غیر الٰہی عبودیت کی زنجیریں صرف بنی اسرائیل ہی کے پاؤں میں نہیں تھیں، بلکہ کرۂ ارضی کی تمام آبادی کے پاؤں اس کے بوجھ سے زخمی تھے، پس دنیا کے لیے وہی تلوار محبوب ہو سکتی ہے جو صرف فرعون کی ڈالی ہوئی زنجیریں ہی نہ کاٹے، بلکہ دنیا کے تمام فرعونوں کے تخت اُلٹ دے۔

---

[1] دراصل ان کی رسالت کا دائرہ کار ہی ان کی قوم تھی نہ کہ بین الاقوامیت۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلائی، مگر پوری دنیا غلامی سے نکلنے کی آرزومند ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

دُوسرا سب سے بڑا اسرائیلی مذہب مسیحی تحریک کا ہے لیکن مسیحی دعوت کی تعلیم ہمارے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ مسیحیت سے منسوب قومیں جو کچھ کہیں گی ہم اسے حضرت مسیح علیہ السلام کے نام سے قبول نہیں کر سکتے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا کہ میں صرف تورات کو قائم کرنے آیا ہوں، خود کوئی نئی دعوت نہیں لایا (متی ۵:۱۷) انہوں نے تصریح کی میرا مشن صرف بنی اسرائیل کی اصلاح تک محدود ہے۔ نیز انھوں نے غیر قوموں میں منادی کرنے سے روکا۔ [1] اور ہمیشہ اپنے کاموں اور اپنی وصیتوں میں اپنی تعلیم کو اسرائیل کے گھرانے تک ہی محدود رکھا۔ پس دراصل انھوں نے جو کچھ بھی خدمت کرنی چاہی وہ محض بنی اسرائیل نامی ایک مسخ شدہ قوم کی تھی، تمام دنیا کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔

پھر ان کا ظہور اس وقت ہوا جب روم کی ظالمانہ حکومت نے شام کے مقدس مرغزاروں کو روند ڈالا تھا اور بت پرست قوموں کی جابر و مستبد گورنمٹیں دنیا کے بڑے حصے کو اپنا غلام بنائے ہوئے تھیں ، لیکن انھوں نے نہ تو اس ظلم و طغیان کے متعلق کچھ کہا اور نہ اس سے کچھ تعرض کیا۔

مسیحی قومیں اور تعلیم مسیح علیہ السلام

پہلی صدی مسیحی کے بعد جس قدر مسیحی قومیں دنیا میں آباد ہُوئیں، ان کو حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم و دعوت سے کچھ تعلق نہ تھا اور وہ سر تا سر یونان کے ایک تعلیم یافتہ یہودی پولس کے مذہب کی پیرو تھیں۔ پولس نے تمام حواریان مسیح علیہ السلام کے مذہب کے خلاف غیر اسرائیلی انسانوں کو بپتسما دینا شروع کیا اور اس طرح روم اور یونان کے مختلف جزیروں اور دیہاتوں میں ایک نیا گروہ پیدا کر لیا پس اگر دنیا حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف جھکنا چاہے گی، تو دنیا کو ان کے کارنامۂ حیات کے لیے بمشکل ایک چوتھائی صدی ہاتھ آئے گی، جس کے اندر ان کے تربیت یافتہ حواریوں کے اعمال نظر آسکتے ہیں اور یہ چند سال فضائل و محاسن اخلاق کا کیسا ہی عمدہ نمونہ پیش کریں، لیکن ان میں دنیا کے لیے کوئی پیغام نجات نہیں۔

پھر اس سے بھی قطع نظر کرو، نتائج کی بحث بعد کو آتی ہے۔ سب سے پہلے دعوت، اعلان، ادعاء اور نفس تعلیم کا سوال ہے۔ دنیا حضرت مسیح علیہ السلام کی یاد پر کیونکر قناعت کرے، جب کہ خود انھوں نے دنیا

---

[1] غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور نہ سامریوں کے کسی شہر میں داخل ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ (متی ۱۰:۶)

کے لیے کچھ نہ کیا، بلکہ ہمیشہ اسے ٹھکرایا، مردود کہا اور اس کے ساتھیوں کو، اس کے دوستوں کو اور اس سے رشتہ رکھنے والوں کو خدا کی بادشاہت کی مہربانی سے محروم بتلایا، حتیٰ کہ ایک آخری فتویٰ دے دیا" تم خدا اور دنیا، دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے (متی ۶:۲۵) اونٹ کا سُوئی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو"۔(متی ۱۹:۲۳)

اس سے در گزر کرو اور اس کی بہتر سے بہتر توجیہ جو کر سکتے ہو کر لو اور نیز پولس کی دعوت ہی کو حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت تسلیم کر لو اور ان تمام قوموں کو جنہوں نے مسیح علیہ السلام کے نام پر بپتسمے کا پانی اپنے اوپر چھڑکا، مسیحی دعوت کا پھل مان لو، لیکن پھر بھی مسیحی تحریک کی پوری تاریخ کا کیا حال ہے؟

مسیحیت کی حکمرانی

جب تک مسیحیت دنیا پر حکمران رہی، جس وقت تک مسیحی مذہب کا دینی تسلط انسانوں سے اطاعت کراتا رہا اور جب تک کہ مسیحی رہنماؤں کی غلامی سے دنیا نے انحراف نہ کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت تک اس کا وجود دنیا کے لیے، دنیا کے علم و تمدن کے لیے، آبادی و عمرانی کے لیے، اخلاق و پاکیزگی کے لیے اور ان سب سے بڑھ کر یہ ایک انسان کی فطری حریت اور شرف انسانیت کے لیے ایک بدترین لعنت رہا، جس نے جلایا، ویران کیا، مسمار کیا، قتل کیا، جیل خانے بھرے، زبانوں پر مہریں لگائیں، انسانی دماغوں کو معطل کیا، لیکن انسان اور انسانیت کی راستی و ترقی کے لیے چند لمحوں کا بھی ایک دور پیدا نہ کیا۔[1] مشہور مورخ گیزو، سیدیو، لامارے اور ڈریپر اس بارے میں ہمارے لیے بہترین راوی ہیں۔

لیکن جس وقت سے کہ مسیحیت کی قوت نے شکست کھائی تمدن کا غیر دینی دور شروع ہوا۔ مذہبی جماعتوں اور مذہبی خلافت (یورپ) کے حلقہ غلامی سے یورپ آزاد ہو گیا اس وقت سے یورپ کے موجودہ تمدن کی بنیاد پڑی اور مسیحی قوموں نے ترقی شروع کی۔ اگر تم کہتے ہو کہ دنیا کے لیے سب سے بڑی عظمت مسیحی مذہب کے بانی میں تھی، تو خود اس کے بانی ہی نے ہمیں معیار حق و باطل بھی بتلا دیا ہے کہ " درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" (مرقس ۱۹۔۱۶) پس دنیا اگر مسیحی مذہب کی پیدائش کے اندر اپنی خوشی کو ڈھونڈے تو اس کو انسان کے امن و سلامتی اور فطرت کی آزادی و سعادت کی جگہ قتل و غارت اور ہلاکت و

---

[1] یورپ اور امریکہ مسیحیت کے بہت بڑے مراکز ہیں، کیا ان کی سرگزشت استعمار خواہ اس کی شکل کوئی ہو، ابتدا سے آج تک عالم انسانیت کے لیے خصوصاً کمزور قوموں، ملکوں اور ملتوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت نہیں بنی رہی؟ اور آج بھی ہر مصیبت کا سرچشمہ یہی استعمار نہیں جس کی وجہ سے امنِ عالم معرض خطرے میں ہے؟ پہلے جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) استعمار پرستوں کی ذاتی اغراض کے باعث برباد ہوئی آج انجمن اقوام متحدہ ویسی ہی حالت سے دوچار ہے۔

غلامی کی یادگار کا جشن منانا پڑے گا کیونکہ ”مسیحیت“ کے درخت کا تو یہی پھل ہمارے سامنے ہے، پھر کیا دنیا اس کے لیے تیار رہے؟

یہ جو کچھ تھا، مسیحی اقوام کی تاریخ قدیم کی بنا پر تھا لیکن اگر اس پر گزشتہ دو صدیوں کے واقعات و نتائج کا بھی اضافہ کر دیا جائے جو اقوام یورپ کے اعمال تمدن سے وابستہ ہیں تو دنیا کی مایوسی اور زیادہ درد انگیز ہو جائے۔

آریائی نسل کی دعوتیں

اس کے بعد مذاہب عالم میں آرین نسلوں کی دعوتیں ہمارے سامنے آتی ہیں، لیکن افسوس کہ دنیا کے لیے ان کے پاس بھی کوئی پیام سعادت نہیں۔ عظیم الشان گوتم بدھ کی تعلیم ووصایا کا ماحصل یہ بتلایا جاتا ہے کہ ”نجات دنیا کے ساتھ رہ کر حاصل نہیں ہوسکتی“۔ پس دنیا کو جن لوگوں نے ٹھکرادیا، دنیا ان کے پاس جاکر کیا سکھ حاصل کرے گی؟ پھر اس نے جو کچھ بھی بتلایا اور سکھلایا ہو، لیکن قوموں اور ملکوں کے دائرہ ہی میں اس کی دعوت محدود رہی۔ ہندوستان میں اسے شکست ملی تو جاپان اور چین میں جاکر محدود ہوگئی۔ پس زمین اپنی اس مصیبت کے لیے جو رقبوں اور ملکوں میں محدود نہیں، عظیم الشان بدھ سے کیا حاصل کرسکتی ہے؟

ہندوستان کے مذہبی ذخیرہ تعلیمات اور ان کی پُر اثر قدامت کی وقعت سے ہم انکار نہیں کرسکتے، تاہم دنیا کے لیے ان کے بانیوں کی عظمت کے اندر کیا خوشی ہوسکتی ہے جب کہ کوہ ہمالیہ کی دیواروں اور بحیرہ عرب کی موجوں سے باہر بھی دنیا ہے، مگر ہندوستان کے مذہبی داعیوں نے صرف ہندوستان کے اندر بسنے والوں ہی کو اپنی ہدایتیں سُپرد کیں۔

نجات و تسکین کا واحد پیام

پس دنیا اگر اپنی نجات کے لیے بے چین ہے تو اس کے لیے راحت اور تسکین کا پیام صرف ایک ہی ہے اور صرف ایک ہی کی زندگی میں ہے۔ اس کا دکھ ایک ہی ہے اس لیے اس کی شفا کے نسخے بھی ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتے۔ اس کا پروردگار ایک ہے جو اپنے ایک ہی آفتاب کو اس کے خشک وتر پر چمکاتا اور ایک ہی طرح کی بدلیوں سے اس کے آباد و ویرانے کو شاداب کرتا ہے۔ اس کی ہدایت و رحمت کا آفتاب بھی ایک ہی ہے اور بہت سے ستارے اس کی روشنی سے اکتساب نور حاصل کرتے ہوں مگر ان سب کا مرکز و منبد نورانیت ایک ہی ہے۔

قرآن حکیم نے آفتاب کو ”سراج“ کہا:

وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿۱۳﴾ (نباء:۱۳)

"اور ہم نے آسمان میں سورج کے چراغ کو بڑا ہی روشن بنایا۔"

اور اسی طرح اس کے ظہور کو بھی "سراج" کہا، جس کی ہدایت و رحمت کی روشنی کرۂ ارضی کی ظلمتوں کے لیے پیام صبح تھی:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾

(احزاب:۴۵-۴۶)

"اے پیغمبر اسلام! ہم نے تم کو دنیا کے آگے حق کی گواہی دینے والا، سعادت انسانیت کی خوشخبری پھیلانے والا، اللہ کی طرف اس کے بندوں کو بلانے والا اور دنیا کی تاریکیوں کے لیے ایک چراغ نورانی بنا کر بھیجا۔"

کرۂ ارض کے لیے آفتاب ہدایت

پس تمام کرہ ارض کی روشنی کے لیے یہی ایک آفتاب ہدایت ہے، جس کی عالم تسخیر کرنوں کے اندر دنیا اپنی تمام تاریکیوں کے لیے نور بشارت پا سکتی ہے اور اس لیے صرف وہی ایک ہے جس کے طلوع کے پہلے دن کو دنیا کبھی نہیں بھلا سکتی اور اگر اس نے بھلا دیا ہے تو وہ وقت دُور نہیں جب اسے کامل عشق و شیفتگی کے ساتھ صرف اسی کے آگے جھکنا پڑے گا اور اسی کو اپنا کعبہ امید بنانا پڑے گا۔

اس مقدس پیدائش نے دنیا میں ظاہر ہو کر یہ نہیں کہا کہ میں صرف بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے آیا ہوں، بلکہ اس نے کہا کہ تمام عالم انسانیت کو غیر الٰہی قوموں سے نجات دلانا میرا مقصد ظہور ہے۔ اس نے صرف اسرائیل کے گھرانے کی گم شدہ رونق ہی سے عشق نہیں کیا، بلکہ تمام عالم کی اجڑی ہوئی بستی پر غمگینی کی اور ان کی دوبارہ رونق و آبادی کا اعلان کیا۔ اس نے اس خدا کی محبتوں کی طرف دعوت نہیں دی جو صرف سینا کی چوٹیوں یا ہمالیہ کی گھاٹیوں میں بستا ہے، بلکہ اس رب العلمین کی طرف بلایا جو پورے نظام ہستی کا پروردگار ہے اور اس لیے تمام کائنات عالم کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔ ہم کو دنیا میں سکندر ملتا ہے جس نے تمام عالم کو فتح کرنا چاہا تھا لیکن ہم دنیا کی پوری تاریخ میں خدا کے کسی رسول کو نہیں پاتے جس نے تمام عالم کی ضلالتوں اور تاریکیوں کے خلاف اعلان جہاد کیا ہو۔

جہانوں کے لیے رحمت

اس کا صرف ایک ہی اعلان ہے جو آغاز خلقت سے اب تک کیا گیا ہے اور اس لیے اگر دنیا نسلوں، قوموں اور رقبوں کا نام نہیں بلکہ مخلوقات الٰہی کی اس پوری نسل کا نام ہے جو کرۂ ارض کی پیٹھ پر بستی ہے تو وہ مجبور ہے کہ ہر طرف سے مایوسی کی نظریں ہٹا کر صرف اس ایک ہی اعلان عام کے آگے جھک جائے اور صرف اسی کی پیدایش کے دن کو اپنی عمر کا سب سے بڑا دن یقین کرے:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا ۝ (فرقان:۱)

"کیا ہی پاک اور برکتوں کا سرچشمہ ہے ذات اس کی جس نے اپنے برگزیدہ بندے پر الفرقان نازل کیا تاکہ وہ قوموں اور ملکوں ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام عالموں کی ضلالت کے لیے ڈرانے والا ہو۔"

دنیا میں جس قدر داعیان حق و صداقت کے اعلانات موجود ہیں۔ اگر دنیا ان کو بھلا دے گی تو یہ صرف قوموں اور ملکوں کی سعادت کی فراموشی ہوگی کیونکہ اس سے زیادہ انہوں نے کچھ نہ کہا لیکن اگر ربیع الاول کو اس نے بھلا دیا تو یہ تمام کرہ ارض کی نجات کو بھلا دینا ہوگا کیونکہ ربیع الاول کی رحمت کسی ایک سرزمین کے لیے نہیں بلکہ تمام عالمین کے لیے تھی (یہاں تک جو کچھ حوالہ قلم ہوا، یہ محض ایک تمہید تھی اور اسلام کی رحمت عامہ کا ایک سرسری مطالعہ، لیکن اس کے بعد اصل سوال ہمارے سامنے آتا ہے یعنی اس پیدایش نے دنیا کی حقیقی اور عالمگیر مصیبت کے لئے کیا کیا؟ اور انسانیت کی سعادت وارتقاے فطری کی کیونکر تکمیل کی؟ اس مبحث عظیم کا احاطہ و استقصاء تو ممکن نہیں لیکن چند سرسری اشارات آنے والی مجلس میں ملیں گے)۔

ربّ العٰلمین اور رحمۃً للعٰلمین

آفتاب توحید وہدایت

قرآن حکیم نے توحید الٰہی کے داعی کریم علیہ الصّلٰوۃ والتسلیم کو "سراج منیر" سے ملقب کیا اور ان کے خصائص کریمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾

(احزاب: ۴۵،۴۶)

"اے پیغمبر! بے شک ہم نے تم کو شہادت دینے والا، بشارت پہنچانے والا، ضلالت وخبائث سے خوف دلانے والا۔ راہ الٰہی کی طرف داعی اور ایک نورانی مشعل بنا کر بھیجا ہے۔"

لیکن ایک دوسرے موقع پر آفتاب کو بھی "سراج" کے لقب سے یاد کیا ہے:

وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ (نوح: ۱۶)

"اور آسمان میں خدا نے چاند کو بھی بنایا، جو ایک نور ہے اور سورج کو بھی بنایا کہ وہ ایک روشن مشعل ہے۔"

اس مماثلت اور اشتراک تشبیہ سے مقصود یہ تھا کہ اسلام کی دعوت بھی اس آفتاب مادی کی طرح ایک آفتاب روحانی ہے۔ آفتاب جب نکلتا ہے تو اس کی روشنی اور حرارت میں کوئی تمیز نزدیک و دور، اعلیٰ وادنیٰ، سیاہ و سفید، باغ و دشت کی نہیں ہوتی۔ اس کی روشنی بلا تمیز مکان و مقام ہر شے پر چمکتی اور ہر حرارت پذیر وجود کو گرم کرتی ہے۔ بعینہ یہی حال اس آفتاب دعوت الٰہی اور نیر درخشان سمائے رسالت کے عموم فیضان بخشی کا تھا، جو گو سعیر سے چلا، مگر فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا جس کی کرنوں میں داہنی جانب شریعت الٰہی کی "نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ" (مائدہ-۱۵) تھی مگر بائیں جانب قیام عدل و میزان کی شمشیر آبدار چمک رہی تھی جس کا طلوع کائنات میں ظلمت کی شکست اور روشنی کی دائمی فیروز مندی تھا کیونکہ آسمان ہدایت پر شریعت الٰہی کے گو سینکڑوں ستارے نمودار ہوئے تھے لیکن تاریکی کی آخری شکست کے لیے دنیا کو آفتاب ہی کے طلوع کا انتظار ہوتا ہے:

وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی ۝۱ وَالنَّھَارِ اِذَا تَجَلّٰی ۝۲ وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی ۝۳ (والیل۔۱۔۳)
"رات کی قسم، جبکہ اس کی تاریکی کائنات کی تمام اشیاء کو چھپا دیتی ہے اور روز روشن کی قسم، جبکہ آفتاب کی تجلی تمام کائنات کو روشن کر دیتی ہے اور دراصل اس خالق کی قسم، جس نے تخلیق عالم کے لیے نر اور مادہ کا وسیلہ پیدا کیا۔"

عالمگیر اخوت واتحاد

اس آفتاب توحید نے طلوع ہوتے ہی تفریق وانشقاق کی تمام تاریکیوں کو مٹا دیا۔ اس کی روشنی کی فیضان بخشی میں اسود وابیض اور عرب وعجم کی کوئی تمیز نہ تھی۔ خدا کی ربوبیت کی طرح اس کی رحمت بھی عام تھی۔ وہ "رب العلمین" تھا، پس ضرور تھا کہ اس کی راہ کی طرف دعوت دینے والا بھی "رحمۃ للعلمین" ہو:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء۔۱۰۷)

"اے پیغمبر! ہم نے آپ کو نہیں بھیجا، مگر تمام عالموں کے لیے رحمت قرار دے کر۔"

انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت اور خدا فراموشی تھی، کہ اس نے رشتہ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں پر انسانی رشتے قائم کر لیے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لیے تھی، قوموں کے باہمی اختلافات ونزاعات کا گھر بنا دیا تھا، لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے، جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں، بلکہ الٰہی تعبد کی وحدت پر ایک عالمگیر اخوت واتحاد کی دعوت دی اور کہا کہ:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقٰکُمْ ؕ (حجرات:۱۳)

"اے لوگو ہم دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ، ورنہ دراصل یہ تفریق وانشعاب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں۔ امتیاز وشرف اسی کے لیے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔"

صرف ایک رشتہ

پس درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن ومقام اور رنگ وزبان کی تفریق کوئی چیز نہیں رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے "وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَ اَلْوَانِکُمْ" (الروم۔۲۲) لیکن اس کو وہ کسی انسانی تفریق وتقسیم کی حد نہیں قرار

دیتا۔ انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں، اصلی رشتہ صرف ایک ہے وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دُور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہو:

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾ (مومنون: ۵۲)

”بیشک تمہاری جماعت ایک ہی امت ہے اور ہم ایک ہی تمہارے پروردگار ہیں۔ پس (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرو“

مقام محمود

آیت ۷۹ (بنی اسرائیل [1]) میں مقام محمود سے مراد ایسا درجہ ہے جس کی عام طور پر ستایش کی جائے فرمایا: کچھ بعید نہیں کہ تمہارا پروردگار تمہیں ایسے مقام پر پہنچادے جو عالمگیر اور دائمی ستایش کا مقام ہو۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب پیغمبر اسلام کی مکی زندگی کے آخری سال گزر رہے تھے۔ مظلومیت اور بے سروسامانی اپنے انتہائی درجوں تک پہنچ چکی تھی، حتیٰ کہ مخالفین قتل کی تدبیروں میں سرگرم تھے۔ ایسی حالت میں کون امید کر سکتا تھا کہ ابھی مظلومیتوں سے فتح و کامرانی پیدا ہو سکتی ہے؟ لیکن وحی الٰہی نے صرف فتح و کامرانی ہی کی بشارت نہیں دی، کیونکہ فتح و کامرانی کی عظمت کوئی غیر معمولی عظمت نہ تھی بلکہ ایک ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوع انسانی کے لیے عظمت وارتفاع کی سب سے آخری بلندی ہے۔ یعنی عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ حسن و کمال کا ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیت خلائق کی عالمگیر اور دائمی مرکزیت حاصل ہو جائے گی۔ کوئی عہد ہو، کوئی ملک ہو، کوئی نسل ہو لیکن کروڑوں دلوں میں اس کی ستایش ہو گی۔ ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہو گی۔ محمود یعنی سرتاسر ممدوح ہستی ہو جائے گی۔ (بنی اسرائیل۔۷۹)

ماشئت قل فیه، فانت مصدّق
فالحب یقضی والمحاسن تشهد!

انسانی عظمت کی انتہا

---

[1] وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾۔ (بنی اسرائیل:۷۹)
”(اے پیغمبر) رات کا کچھ حصہ یعنی پچھلا پہر شب بیداری میں بسر کر، یہ تیرے لیے ایک مزید عمل ہے قریب ہے، اللہ تجھے ایسے مقام میں پہنچادے جو نہایت پسندیدہ مقام ہو۔“

یہ مقام، انسانی عظمت کی انتہا ہے۔ اس سے زیادہ اونچی جگہ اولادِ آدم کو نہیں مل سکتی۔ اس سے بڑھ کر انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی سعی وہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اڑ جا سکتی ہے لیکن یہ بات نہیں پا سکتی کہ روحوں کی ستایش دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے۔ سکندر کی ساری فتوحات خود اس کے عہد وملک کی ستائش اسے نہ دلا سکیں اور نپولین کی ساری جہاں ستانیاں اتنا بھی نہ کر سکیں کہ کورسیکا کے چند غدار باشندوں ہی میں اسے محمود وممدوح بناتیں، جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ محمودیت اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جس میں حسن وکمال ہو، کیونکہ رُوحیں حسن ہی سے عشق کر سکتی ہیں اور زبانیں کمال ہی کی ستایش میں کھل سکتی ہیں، لیکن حسن وکمال کی مملکت، وہ مملکت نہیں جسے شہنشاہوں اور فاتحوں کی تلواریں مسخر کر سکیں۔

زبانوں کی ستائش اور روحوں کا احترام

غور کرو، جس وقت سے نوع انسانی کی تاریخ معلوم ہے، نوع انسانی کے دلوں کا احترام اور زبانوں کی ستایش کن انسانوں کے حصے میں آئی ہیں؟ شہنشاہوں اور فاتحوں کے حصے میں یا خدا کے ان رسولوں کے حصے میں جنھوں نے جسم وملک کو نہیں روح ودل کو فتح کیا تھا؟

یہی مقام محمود ہے جس کی خبر ہمیں ایک دوسری آیت میں دی گئی ہے اور خبر کے ساتھ امر بھی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾ [1]

(احزاب:۵۶)

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کا ایک مشہور وہ معاملہ ہو گا، جو قیامت کے دن پیش آئے گا، جبکہ اللہ کی حمد وثناء کا علم آپ بلند کریں گے اور بلاشبہ محمودیت کا مقام دنیا وآخرت دونوں کے لیے ہے۔ جو ہستی یہاں محمود خلائق ہے، وہاں بھی محمود وممدوح ہو گی۔

جامعیت افضلیت رسول اکرم ﷺ

ان آیات کریمہ [2] سے فضیلت وسیادت حضرت ختم المرسلین کا یوں اثبات ہوا کہ امت مسلمہ کو

---

[1] اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبر (علیہ السلام) پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ اے لوگو جو ایمان لائے تم بھی اس پر صلوٰۃ بھیجو اور سلام، اچھا سلام۔

[2] كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ الخ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ۔

ساری امتوں سے بہتر فرمایا اور شریعت محمدیہ کو تکمیل ادیان اور اتمام نعمت قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ مطیع کی افضلیت مستلزم افضلیت مطاع اور نعمت کا اتمام نعم سابقہ سے اعلیٰ و دائم ہونا، حامل و مبلغ نعمت کے اعلیٰ و افضل ہونے پر دلیل ہے۔ اگر آخری شریعت تمام پچھلی شریعتوں کی جامع اور اس لیے ان سب سے افضل ہے، اگر آخری امت ساری پچھلی امتوں کے برکات و نعم سے مالامال اور اس لیے ان سب سے امثل واصلح ہے اور اگر اس طرح شریعت آخری کے ظہور و زمان و مکان و قوام واعمال کی ساری باتیں پچھلی امتوں کی ان ساری باتوں پر فوقیت و فضیلت رکھتی ہیں تو یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ امت آخری کا رسول و مقوم بھی سارے پچھلے رسولوں کے مراتب و مقامات کا جامع اور اس لیے ان سب سے افضل ومافوق اور "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہاداری" کا مصداق ہو۔ کتاب و سنت کے نصوص و تفریحات اس بارے میں بے شمار ہیں۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ (البقرہ۔ ۲۵۳) کی تفسیر میں اس مطلب کو کمال شرح وبسط اور شاید ایک طرز تازہ واستدلال جدید کے ساتھ لکھا جاچکا ہے اور حقیقت جامعیت رسالت محمدی و جامعیت شریعت اسلامیہ و جامعیت امت مسلمہ اور جامعیت جمیع ماییتعلق بہا پر ایک خاص اسلوب نظر سے بحث کی گئی ہے[1] باقی رہا "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ" (البقرہ۔ ۲۸۵) تو وہ معاملہ دوسرا ہے "تفریق بین الرسل" کو مسئلہ تفضیل سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح "لا تفضل علی یونس بن متی وغیر ذٰلك" تو اسی نہی کا مورد و محل بھی دوسرا ہے اور منہی عنہ معاملہ تفضیل میں وہ تکلم یارائے ہے۔ منجر بہ تفریق بین الرسل جس نے تمام امم سابقہ کو گمراہ کیا، نہ کہ نفس تفضیل۔ کیونکہ "انا سید ولد آدم ولا فخر" اور "آدم ما دون تحت لوائی" کے بعد اور کیا باقی رہ گیا؟ پھر قطع نظر قرآن حکیم کے، خود نصوص سنت اس بارے میں بے شمار و معلوم ہیں۔

رب زدنی علما

آیت ۱۱۴[2] (طہ) میں فرمایا: جب تک سلسلہ وحی پورا نہ ہو جائے، اس بارے میں جلدی نہ کر اور منتظر رہ کہ فیضان غیب کی بخششیں کہاں تک مالامال کرتی ہیں۔ تیری زبانِ حال کی صدا تو یہ ہونی چاہیے کہ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا! یعنی میری تشنگی کی سیرابی کے لیے علم کے یہ سارے دریا اور عرفان حقیقت کی یہ ساری بارشیں بھی کافی نہیں۔ اے علم کی لا انتہائی اور حقیقت کی ناپید کناری! اپنی بخششیں اور زیادہ کر۔

---

[1] مطلب ہے تفسیر "البیان" میں۔

[2] فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

"پس ہر طرح کی بلندی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہی جہاندار حقیقی ہے اور جب تک قرآن کی وحی تجھ پر پوری نہ ہو جائے تو اس میں جلدی نہ کر۔ تیری پکار یہی ہو کہ پروردگار! میرا علم اور زیادہ کر۔"

اس آیت نے واضح کر دیا کہ پیغمبر اسلام کے مقام علم و عرفان کی وسعت و عظمت کا کیا حال تھا؟ وہ کسی حد پر بھی رکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لیے کوئی زیادتی بھی زیادتی نہ تھی۔ اس کے لیے ہر اضافہ نئے استفاضہ کا اشارہ تھا۔ اس کے لیے ہر عطیہ نئے عطیہ کا تقاضا تھا۔ وہ یکسر طلب تھی۔ پیہم رب زدنی کا سوال تھی۔ یہ معلوم ہے کہ یہاں مطلوب کی وسعت کے لیے کوئی انتہا نہیں ہو سکتی، لیکن یہ کیونکر معلوم کیا جائے کہ طالب کی طلب کہاں جا کر منتہی ہوئی تھی۔

کائنات انسانیت پر احسان عظیم

حضرت رحمۃ للعلمین ﷺ نے کائنات انسانیت پر جو لاتعد ولاتحصٰی احسان کیے، ان کا استقصاء کون کر سکتا ہے۔ ان میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ ہر قسم کے تعبد و غلامی اور ذلت و تحقیر کی زنجیریں کاٹ ڈالیں اور سب کے لیے استقلال و حریت ذات و رائے، شرف و احترام نفس اور مساوات صحیح کی بنیادیں استوار کر دیں۔

دنیا استبداد و استعباد کے عذاب الیم میں مبتلا تھی۔ غلامی کی زنجیروں نے اس کا بند بند جکڑ رکھا تھا۔ فرمانروایانِ ملک، امرائے شہر، روسائے قبائل اپنے اپنے حلقہ فرمانروائی میں "اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" (آل عمران: ۶۴) تھے اور ان کے اطاعت گزار اور پیروان کے ہاتھ بالکل مثل معدوم الارادہ آلات عمل کے تھے، جن کی زندگی کا موضوع واحد صرف اپنے قادر قابض کی تکمیل ہوا سے نفس و اتباع مرضات کیا؟

مسیح علیہ السلام سے سترہ سو برس پہلے ذات شاہی ہر تقدیس سے متصف، ہر احترام فوق العادہ سے مقدس اور ہر نقص و عیب سے مبرا تھی۔ خدا کا سایا کم از کم مرتبہ انسانیت سے ایک بالاتر شے ضرور تھی۔

فراعنہ مصر دیوتا تھے۔ اسی لیے مصر کے فرعون نے مسیح علیہ السلام سے سترہ سو برس پہلے اپنے درباریوں سے کہا تھا "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" (النازعات۔ ۲۴) یعنی موسیٰ کا خدا کون ہے؟ تمہارا بڑا خدا تو میں ہوں ۔کلدانیوں کے ملک میں نمرود بابل کی پرستش کے لیے ہیکل بنتے تھے۔ ہندوستان کے راجا دیوتاؤں کے اوتار بن کر زمین پر اترتے تھے۔ رومہ کا پوپ "خدا کے فرزند" کا جانشین اور اس کا آستانہ مقدس سجدہ گاہ ملوک و سلاطین تھا۔

روم کے قیصر اور فارس کے کسریٰ گو دیوتا نہ تھے لیکن فطرت بشریت سے منزہ اور مرتبہ انسانیت سے بالاتر تھے، جن کے سامنے بیٹھنا ممنوع، جن کے نام لینا سوءِ ادب، جن کے سامنے ابتدائے کلام گناہ اور جن کے سامنے ادنیٰ سا اعتراض بھی موجب قتل تھا۔

دنیا اسی تعبد و غلامی اور ذلت و تحقیر میں اسیر تھی کہ بحر احمر کے سواحل پر ریگستانی سرزمین میں ایک "عربی بادشاہ" کا ظہور ہوا، جس نے معجزانہ زور و توانائی سے قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ دیے۔ بابائے رومہ

الکبریٰ کے ایوان مقدس کی بنیادیں ہلادیں۔ تعبد و غلامی کی زنجیریں اس کی شمشیر غیر آہنی کی ایک ضرب سے کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں۔ استقلال ذات و فکر، حریت خیال ورائے، شرف واحترام نفس، مساوات حقوق، ابطال شہنشاہی کی روشنی دنیائے قدیم کے قلب سے نکل کر دنیا بھر میں پھیل گئی۔ شاہان عالم مرتبہ قدوسیت و معصومیت سے گر کر عام سطح انسانی پر آ گئے اور عام انسان سطح غلامی و حیوانیت سے بلند ہو کر مصر و بابل کے دیوتاؤں اور روم وایران کے قیصر و کسریٰ کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہو گئے۔

دینِ رحمت

اسلام دین رحمت ہے۔ اس دین کی کوئی بھی مشق ایسی نہیں، جو عالم انسانیت کے لیے بلا لحاظ نسل و خون، بلا امتیاز رنگ و نسب اور بلا قید مقام و محل یکساں پیامِ رحمت نہ ہو۔ سب سے پہلے اصولی اعتبار سے غور کیجیے۔ دنیا میں ہر نیک و بد کے لیے مہلت حیات اور فیضان معیشت کا انتظام موجود ہے، البتہ اس نظام سے استفادہ ہر فرد کی ہمت، صلاحیت اور جدوجہد پر موقوف ہے۔ کیونکہ:

زندگی جہد است واستحقاق نیست

قدرت نے گوناگوں نعمتوں کے لامتناہی خزانے جابجا مہیا کر رکھے ہیں۔ اچھے بُرے تمام انسان ان سے فائدہ اٹھانے کے مجاز ہیں۔ جزائے اعمال آخرت پر اٹھا رکھی گئی ہے۔ یہ اسی حقیقت کا نتیجہ ہے کہ یہاں رحمت کی کارفرمائی ہے:

رحمت کا تقاضا یہی تھا کہ اس کے فیضان و بخشش میں کسی طرح کا امتیاز نہ ہو اور مہلت حیات پوری طرح سب کو ملے۔ اس نے انسانوں کی انفرادی زندگی کے دو حصے کر دیے۔ ایک حصہ دینوی زندگی کا ہے اور سراسر مہلت ہے۔ دوسرا حصہ مرنے کے بعد کا ہے اور جزا کا معاملہ اسی سے تعلق رکھتا ہے۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَ رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۸﴾ (کہف:۵۸)

”تیرا پروردگار بڑا بخشایش گر اور رحمت والا ہے۔ اگر وہ لوگوں کو ان کے عمل کی کمائی پر پکڑتا تو فوراً عذاب نازل کر دیتا۔ لیکن ان کے لیے ایک میعاد ٹھہرادی گئی ہے۔ جب وہ نمودار ہو گی تو اس سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ انہیں نہ مل سکے گی۔“

مہلت بجائے خود رحمت ہی کی دستاویز ہے تاکہ نیک زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمائیں اور برائیوں میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو اعمال بد سے توبہ کی مہلت حاصل رہے۔ عمل بد کا ارتکاب ہوتے ہی عذاب نازل ہو جاتا تو مہلت کہاں رہتی؟ یاد رکھیے کہ اصلاح و درستی کا طریقہ یہی ہے اور اصل نصب العین اصلاح و درستی

ہی ہے نہ کہ عذاب۔ عذاب تو ان کے لیے ہو سکتا ہے جو سمجھانے بجھانے، آگاہ کرنے اور مہلت دینے کے باوجود فائدہ نہ اٹھائیں اور اپنے غلط مسلک پر قایم واستوار رہیں۔

جرموں اور گناہوں کی نوعیت یا کمیت و کیفیت کیسی ہی ہو، جب توبہ وانابت کے احساس میں جنبش نمودار ہوتی ہے اور غفلت و بے حسی کا خواب سنگیں ٹوٹتا ہے تو رحمت قبولیت کا دروازہ کھول دیتی ہے اور توبہ کرنے والے کے نامہ اعمال کی سیاہی اس طرح ڈھل جاتی ہے۔ گویا اس سے کبھی کوئی گناہ سرزد ہی نہیں ہوا تھا یہ بھی سراسر رحمت ہی کی کارفرمائی کا ثبوت ہے۔

قرآن مجید ہر بندے کو رحمت کی بشارت پہنچا رہا ہے خواہ اس کے اعمال کتنے ہی برے اور مکروہ کیوں نہ ہوں:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ (زمر: ۵۳)

"اے میرے بندو! (جنھوں نے برائیوں کے ارتکاب سے) اپنی جانوں پر زیادتی کی۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو یقیناً اللہ تمہارے تمام گناہ بخش دے گا۔"

اسلام کے ضوابط

اسلامی ضوابط کی غرض وغایت یہی ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی ہر قسم کے اختلال سے محفوظ رہے اور معاشرے میں فتنہ وفساد پیدا نہ ہونے پائے، جو اجتماعی زندگی کے نظام کو درہم برہم کر ڈالتا ہے۔

ویسے ہر مجموعہ وضوابط کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے کے لیے دو باتیں بطور خاص پیش نظر رہنی چاہیئے:

۱۔ آیا اجتماعی زندگی کے لیے قوانین بنانے کے سلسلے میں جائز انفرادی انسانی حقوق کا پورا لحاظ رکھا گیا؟ ایسا نہ ہو تو جائز انفرادی حقوق اور اجتماعی قوانین میں تصادم کی نوبت آتی رہے گی اور ان حالات میں کوئی معاشرہ اختلافات سے، زیادہ عرصے تک محفوظ نہ رہ سکے گا۔

۲۔ اجتماعی قوانین کی غرض وغایت کیا ہے؟ کیا یہ ہے کہ افراد کے درمیان باہم محبت، رحمت اور رافت کو فروغ حاصل ہو؟ جس سے اجتماعی زندگی کی بنیادیں زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو جائیں گی۔ افراد اجتماعی نظام کے عقیل، فہیم، عاقبت اندیش اور حق شناس کارکن بنے رہیں گے، ان میں ایک دوسرے کے حقوق کی حدوں کا اندازہ کر لینے کی تمیز زیادہ قوی ہوتی جائے گی اور ایک دُوسرے کا زیادہ سے زیادہ لحاظ ان کی فطرت ثانیہ بن جائے گا۔

اسلام ایسے ہی معاشرے پیدا کر دینا چاہتا تھا، اس کے مجموعہ ضوابط (جن میں اخلاقی تلقینات بھی شامل ہیں) کا اصل مقصد یہی تھا کہ انسانوں میں ذمّہ داری کے احساس کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے،

جس کے بعد کسی احتسابی نظام کی ضرورت بھی محض برائے نام رہ جائے۔ ابتدائی دور کی مربیانہ سیاست میں اس مقصد کی تکمیل یقیناً بہت قریب نظر آنے لگی تھی۔ لیکن حالات نے یکایک پلٹا کھایا اور مربیانہ سیاست کی جگہ ملوکی نظام نے لے لی۔ پھر جو صورت حال پیش آئی اس کا مرقع صدیوں سے ہر حساس فرد کے لیے دل کا ناسور ہے۔ سب سے بڑھ کر اندوہ و قلق کی بات یہ ہے کہ بیشتر نعرے اسلام کے لگائے جاتے ہیں اور پیش نظر وہی پیمانے ہوتے ہیں، جو دورِ ملوکیت میں فروغ پذیر ہوئے۔

باہم سلوک کی مثالیں

۱۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

تری المومنین تراحمهم وتوادّهم و تعاطفهم كمثل الجسد اذا اشتكىٰ عضوتداعىٰ لهٗ سائرُجسدهٖ بالسَّهَرِ والحُمّٰى [1]

”تو مومنوں کو باہم رحم، محبت اور مہربانی میں ایک جسم کے اعضا کی طرح دیکھے گا۔ جب ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے پورا جسم بے خوابی اور بخار کی دعوت بن جاتا ہے۔“

آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ آیا آپس میں اس رحم، اس محبت اور اس مہربانی کی عملی مثالیں آپ کو کسی طرف نظر آتی ہیں؟ الاّ ماشاء اللہ، یا ہمارے گرد و پیش ایسا کوئی نظارہ روح و قلب کے لیے سرور شادمانی کی بشارت بن سکتا ہے؟

۲۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

واللہ لایومن واللہ لایومن واللہ لایومن قیل و من یا رسول اللہ۔ قال الذی لایامن جارہٗ بوائقہٗ [2]

”اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لاتا، اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لاتا، اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لاتا، کسی نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ کون؟ فرمایا جس کا ہمسایہ اس کی بدیوں سے امن میں نہ ہو۔“

غور کریں کہ اگر ہر ہمسایہ حضور ﷺ کے اس ارشاد پر عمل پیرا ہو جائے۔ ہر لحظہ خیال رکھے کہ اس کی کسی حرکت سے ہمسایے کو تکلیف نہ پہنچے تو پوری آبادیاں نہ محض ہر قسم کے شر سے پاک ہو جائیں بلکہ تمام باشندوں میں ایک دوسرے کے متعلق انتہائی محبت و احترام کے جذبات پیدا ہو جائیں حالانکہ یہ بظاہر ایک جزوی ارشاد ہے تاہم اس کی عملی صورت پر غور کریں تو اس کی وسعت اور اثر خیر کا اندازہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔

یہ اسلام تھا جو دنیا کے لیے رحمت و رافت اور برکات و سعادت کی بشارت لے کر آیا تھا۔ کیا اس سے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہایم۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الادب باب اثم من لایامن جارہ۔

کسی کے لیے داعی اسلام ﷺ کی "رحمۃ اللعالمین" کا اندازہ کر لینا مشکل ہے؟

اشرف المخلوق کے واجبات

انسان کو اشرف المخلوق قرار دیا جاتا ہے۔ کیا اس لیے کہ اس پر فخر و مباہات کی سرشاری میں واجبات کو نظر انداز کر دیا جائے؟ انسان نیک و بد کی تمیز سے بہرہ مند ہے۔ آگ اور پانی میں فرق کر سکتا ہے۔ پھر کیا اس سے کوئی ایسی حرکت یا کوئی ایسا عمل سرزد ہونا چاہیے، جو انسانیت کے حسن اور شرف کے منافی ہو اور جو اسے "اسفل سافلین" میں پہنچا دے؟ یعنی جس سے ہم جنسوں کے طبعی و فطری حقوق پر زد پڑے، خواہ ان کا تعلق ہم جنسوں کی جانوں سے ہو یا اموال سے یا آبروؤں سے؟ ایسا ہر فعل لازماً اجتماعی امن و راحت کے نظام میں کم یا زیادہ اختلال کا باعث ہو گا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسے اختلال انگیز افعال و حرکات سے احتراز حقیقۃً ہر فرد کے لیے ضروری ہے کیونکہ اگر زید کی کوئی حرکت کسی وقت بکر اور اس کے ساتھیوں کو نقصان پہنچائے گی تو دوسرے موقع پر بکر یا اس کے ساتھیوں کی ایسی ہی حرکت خود زید یا اس کے ساتھیوں کے لیے موجب آزار ہو گی۔

اسلام کی برتری یہ ہے کہ اس کے تمام اوامر و نواہی کی بنیاد و اساس معاشرے میں رحمت و محبت جاری و ساری رکھنے کے لیے ہے۔ وہ چاہتا ہے رحمت و محبت کے فروغ و عمومیت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ تمام افراد معاشرہ کے درمیان اخوت، خلوص، ہمدردی اور یکجہتی کے روابط زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوں، یہ سب رحمت ہی کی کار فرمائی کے عوامل ہیں۔

محبوب معبود

غرض اسلام نے دینی عقائد و اعمال کا جو تصور قایم کیا ہے، اس کی بنیاد بھی تمام تر رحمت اور محبت ہی پر رکھی ہے، قرآن مجید کی مختلف تصریحات کے مطابق خدا اور بندوں کے درمیان بھی رشتہ محبت ہی کا ہے۔

سچی عبودیت ہے اسی کی عبودیت جس کے لیے معبود صرف معبود ہی نہ ہو، بلکہ محبوب بھی ہو۔ اسی لیے فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرۃ۔۱۶۵)

"اور جو لوگ ایمان والے ہیں، ان کے دلوں میں تو سب سے بڑھ کر چاہت اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے۔"

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣١﴾

(آل عمران:۳۱)

"(اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے واقعی محبت رکھتے ہو تو چاہیے کہ میری پیروی کرو۔ (کیونکہ میں تمہیں اللہ سے محبت کی حقیقی راہ دکھا رہا ہوں) اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ وہ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔"

حبِّ رسول ﷺ

خود رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکت سے محبت بھی اسی لیے دنیا بھر کے انسانوں پر فایق و برتر ہو گئی کہ ان کے ذریعے سے ہمیں خدا کا راستہ ملا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

لا یومن احدکم حتی اکون احب الیه من والدہ و ولدہ و الناس اجمعین۔ [1]

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک حقیقی مومن نہیں ہو سکتا، جب تک میں اس کے نزدیک باپ، بیٹے اور پورے عالم انسانیت سے محبوب تر نہ ہو جاؤں۔"

رسول اللہ ﷺ جو نور ہدایت لے کر آئے، اس کے سوا ہدایت کا کوئی وجود نہیں اور انسان کے لیے سب سے پہلی چیز ہدایت حق ہے، اس کے بعد تمام رشتے آتے ہیں اور خود رشتوں کے واجبات نیز ان کی تکمیل و سرانجام کے طریقے ہمیں اسی نور ہدایت سے ملے جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے ہماری زندگی میں مشعل راہ بنا۔

خدا سے محبت کی عملی راہ

یہ بھی بتا دیا کہ خدائے بزرگ و برتر سے محبت کی عملی راہ خدا کے بندوں کی محبت سے ہو کر گزری ہے۔ جو شخص چاہتا ہے کہ خدا سے محبت کرے، اسے چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی اور حضور ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے۔

قرآن مجید اور احادیث میں خدا کے بندوں سے پیار کے لیے جو کچھ موجود ہے اس کا خاصا بڑا حصہ جا بجا پیش کیا جا چکا ہے اور اعادہ غیر ضروری ہے۔ اس دنیا میں نگرانی اور دیکھ بھال کے محتاجوں کی کوئی صنف ایسی نہیں، جس کے لیے مختلف صورتوں میں انفاق کے احکام موجود نہ ہوں۔ عزیزوں اور رشتہ داروں کی اعانت، بیواؤں، مسکینوں اور اسیروں کی امداد، غلاموں کو غلامی سے چھڑانا، مسافروں کی خبر گیری، قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے سہارا دینا غرض کون سی ضرورت ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا؟ واضح رہے کہ اسیروں سے مراد وہ لوگ نہیں جو جرموں کے ارتکاب

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان باب حب الرسول ﷺ۔

کے بعد جیل خانوں میں چلے جاتے ہیں، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ میں پکڑے جائیں یا زمانہ ماضی کی طرح اب کوئی ظالم شخص کسی کو گرفتار کر کے اپنا کام لینے لگے۔

جہاں صحیح اسلامی معاشرہ موجود ہو اس کے تمام افراد اپنے واجبات کتاب و سنت کے مطابق پورے کریں، وہاں کوئی ایسا محتاج نظر ہی نہیں آسکتا، جسے کسی کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھنے یا ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہو۔ ارباب استطاعت کا اسلامی جذبہ خیر نیز محتاج کی اسلامی خودداری اور عزت نفس، دونوں اپنی جگہ کار فرما ہوں گے۔ پہلے گروہ کے نزدیک انفاق اسی طرح واجب ہے، جس طرح خود اس گروہ کے لیے ذاتی ضروریات پورا کرنا واجب ہے۔ محتاج کسی سے نہیں لیتا کہ اس کا ممنون ہو، اللہ نے اس کا حصہ مقرر کر دیا ہے اور وہ اپنا حصہ لیتا ہے۔ یہ اسلام تھا جو رسول اللہ ﷺ دنیا بھر کے انسانوں کے لیے لائے تھے۔

حضور ﷺ کے چند ارشادات

حضور ﷺ کے بعض ارشادات بھی ملاحظہ کر لیجیے، فرمایا:

۱۔ خدا کی رحمت انہی بندوں کے لیے ہے جو خدا کے بندوں کے لیے رحمت رکھتے ہیں۔

۲۔ زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

۳۔ جو شخص رحم کرے گا، اگرچہ ایک چڑیا ہی کے لیے کیوں نہ ہو، خدا اس پر رحم کرے گا۔

۴۔ "مَنْ لَّا یَرحَمَ لَا یُرحَمَ۔" یعنی جو شخص رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔"

۵۔ ایک اعرابی نے نماز پڑھتے ہوئے دعا کی کہ اے اللہ مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم کر اور ہمارے ساتھ اور کسی پر رحم نہ کر، جب وہ نماز ادا کر چکا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ تو نے بہت وسعت والے کا دروازہ تنگ کر دیا۔

اعرابی نے یہ دعا بری نیت سے نہیں کی تھی، اس کے تصورات ہی اس قسم کے تھے، حضور ﷺ نے سمجھا دیا کہ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ تمام انسانوں کے لیے بھلائی مانگنے سے بھی اس کی رحمت میں کچھ فرق نہیں آتا۔

صفات الٰہی کا پرتو

انسانیت کی تکمیل یہ ہے کہ صفات الٰہیہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تشبہ پیدا کیا جائے یعنی اتنا تشبہ جتنا انسان کے بس میں ہو۔ ان صفات کا عکس انسان کے آئینۂ فکر و عمل میں ٹھیک ٹھیک اتارنے کے لیے کوئی وقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھنا چاہیے۔ قرآن مجید ہم میں خدا کی رحمت کا تصور پیدا کرنا چاہتا ہے تو صرف اس لیے کہ

ہم بھی سراپا رحمت بن جائیں۔ اسی طرح قرآن خدا کی ربوبیت، رافت، شفقت اور احسان، نیز دوسری صفات کا نقشہ کھینچتا ہے تا کہ ہم میں بھی بقدر ہمت واستطاعت انہی صفات کا جلوہ نمودار ہو۔

قرآن ہمیں بار بار سناتا ہے کہ خدا کی بخشش و درگزر کی کوئی انتہا نہیں اور اس طرح ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم میں بھی اس کے بندوں کے لیے بخشش و درگزر کا غیر محدود جوش پیدا ہو جانا چاہیے! اگر ہم اس کے بندوں کی خطائیں بخش نہیں سکتے تو ہمیں کیا حق ہے کہ اپنی خطاؤں کے لیے اس کی بخشایشوں کا انتظار کریں؟۔

یہ آخری فقرہ اس حدیث پر مبنی ہے کہ مَنْ لَّا یَرحَمَ لَا یُرحَم۔

احکام وشرائع اور تلقینات

جس حد تک احکام و شرائع کا تعلق ہے، جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ۔ ۴۰) (برائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی) اپنی جگہ قائم ہے کیونکہ تمام انسان حوصلے اور ہمت میں یکساں نہیں ہوتے اور نہ ہر جرم ایسا ہوتا ہے کہ بخشا جائے تو مرتکب پر یا معاشرے کے حالات پر بہ ہر حال اچھا اثر پڑے گا۔

تاہم کتاب الٰہی کی تلقینات ہر لحظہ پیش نظر رہنی چاہییں، جو عزیمت کی متقاضی ہیں مثلاً:

۱۔ پھر جس نے درگزر کیا اور معاملے کو بگاڑنے کی جگہ سنوار لیا تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔(شوریٰ:۴۰)

۲۔ اور جو کوئی برائی پر صبر کرے اور بخش دے تو یقیناً یہ اولوالعزمی کی بات ہے۔(شوریٰ:۴۳)

۳۔ خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں اللہ کے لیے خرچ کرنے والے، غصے کو پی جانے والے، ہم جنسوں کے قصور بخش دینے والے اللہ کی محبت انہی محسنین کے لیے ہے۔ (آل عمران:۱۳۴)

۴۔ اور جن لوگوں نے اللہ کی رضا و خوشنودی کے لیے (تلخی وناخوشگواری) صابرانہ برداشت کرلی، نماز قائم رکھی، ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے پوشیدہ اور علانیہ (ہمارے بندوں کے لیے)خرچ کرتے رہے اور برائی کا جواب برائی سے نہیں بلکہ نیکی سے دیا تو یقین کرو کہ یہی لوگ ہیں، جن کے لیے آخرت کا بہتر ٹھکانا ہے۔(رعد:۲۲)

۵۔ اور اگر تمہیں بدلا چاہیے کہ جتنی اور جیسی برائی تمہارے ساتھ کی گئی، ٹھیک اسی کے مطابق بدلا لو اور اگر تم برداشت کر جاؤ تو صابروں کے لیے برداشت کر لینا ہی بہتر ہے۔(نحل:۱۲۶)

اللہ کی بے پایاں رحمت

رسول اللہ ﷺ ہی کی ذات گرامی ہے جس کے ذریعے سے خدائے قدوس کی بے پایاں اور لا

متناہی رحمت کی بشارت بندگانِ خدا کو ملی۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ۔ (اعراف: ۱۵۶)

"میری رحمت کا یہ حال ہے کہ ہر شے پر چھائی ہُوئی ہے۔"

صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک موقع پر کچھ قیدی آئے۔ ان میں سے ایک عورت کو بچہ مل گیا، جو اس کا تھا۔ دیکھتے ہی ماںتا کی خاص تڑپ کے ساتھ اس سینے سے لگا کر دُودھ پلانے لگی۔ بچہ مل جانے کی خوشی اور دُودھ پلانے کی پُر سرور تسکین سے وہ بظاہر اس درجہ سرشار ہو گئی کہ گردو پیش اور ماحول کا بھی کچھ خیال نہ رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیفیت دیکھ کر فرمایا۔

اترون ھٰذہ طارحۃً ولدھا فی النار قلنا: لا وھی تقدر ان لا تطرحہ۔ فقال: اللہ رَاحِمٌ بعبادہ من ھٰذہ بولدھا۔

"تمہارا کیا خیال کہ آیا یہ عورت اپنا بچہ آگ میں ڈال دینے کے لیے تیار ہو جائے گی؟ ہم نے عرض کیا کہ جب تک اس کی طاقت و قدرت میں ہے کبھی نہ ڈالے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اپنے بندوں کے لیے اس سے زیادہ رحیم ہے جتنی یہ عورت اپنے بچے کے لیے ہے۔"

انسانوں، حیوانوں، پرندوں، چرندوں، درندوں وغیرہ میں سے کسی گروہ کو لے لیجیے، بچے کے لیے ماں کی ماںتا سے بڑھ کر پُر خلوص محبت کا نظارہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ماںتا کا نظارہ دیکھ کر بندوں کے لیے اللہ کی رحمت کا ذکر فرما دیا اور اس محبت کا نقش لوگوں کے قلوب و ارواح پر جما دینے کی صورت اس کے سوا کیا تھی کہ دنیا کی بہترین محبت سے بہ طور مثال کام لیا جائے۔ حقیقۃً بندوں سے اللہ کی محبت کا صحیح اندازہ پیش کرنے کی دل نشین تر صورت کون سی ہے؟

جزئیات مسائل

اگر آپ بعض امور کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی جزئیات سامنے رکھ لیں تو یقین ہے کہ سراپا حیرت زدہ رہ جائیں گے کیونکہ آج تک کائنات انسانیت کا کوئی بڑے سے بڑا عالم، فلسفی یا کوئی اور شخص ایسا استقصا نہیں کر سکا۔ تاہم وہ بیان کر دی جائیں تو آپ کے قلب و رُوح سے بے اختیار صدا بلند ہو گی، بلاشبہ ان میں سے ہر جزئیہ حق ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ پڑوسیوں کے حقوق کی نشاندہی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

۱۔ اگر پڑوسی بیمار ہو تو اس کی عیادت اور خبر گیری کی جائے۔

۲۔ اگر وہ انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کا ساتھ دو یعنی تدفین میں ہاتھ بٹاؤ۔

۳۔ اگر وہ ضرورت مند ہو اور تم میں استطاعت ہو تو اسے قرض دو۔

۴۔ اگر وہ کوئی برا کام کر بیٹھے تو اس کی پردہ پوشی کرو۔
۵۔ اگر اسے کوئی نعمت یا مال ملے تو مبارک باد دو (جس سے دلی مسرت کا اظہار مقصود ہوتا ہے)۔
۶۔ اگر اس پر کوئی مصیبت آپڑے تو اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرو۔
۷۔ اپنے گھر کی عمارت اس طرح بلند نہ کرو کہ پڑوسی کے گھر کی ہوا رک جائے۔
۸۔ جب تمہارے گھر میں کوئی اچھا کھانا پکے تو کوشش کرو کہ تمہاری ہنڈیا کی مہک پڑوسی (اور اس کے بال بچوں تک) نہ پہنچے۔ یہ ان کے لیے باعث ایذا ہوگی یا اپنے اوپر لازم کرلو کہ اس کھانے کا کچھ حصہ پڑوسی کے گھر بھی بھیجو گے۔

پھر پڑوسیوں کی قسمیں بتائیں یعنی:

۱۔ غیر مسلم جس کے ساتھ رشتہ داری بھی نہیں نچلے درجے کا پڑوسی ہے یعنی اس کے بھی حقوق ہیں، مگر دوسروں سے کم۔
۲۔ مسلم پڑوسی جس کے ساتھ رشتہ داری نہ ہو، اس کا درجہ پہلے کے مقابلے میں بلند تر ہے۔
۳۔ رشتہ دار مسلم پڑوسی یعنی پڑوسی بھی، مسلم بھی اور رشتہ دار بھی، یہ سب سے اونچے درجے پر فائز ہے۔ آپ کو ان جزئیات کی کوئی مثال کسی دوسری جگہ مل سکے تو مہربانی فرما کر پیش کردیجیے۔ اور یہ صرف ایک مسئلے کے متعلق ہے۔ ہر مسئلے میں آپکو ایسی ہی جزئیات ملیں گی جو سامنے آجائیں تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ بھی واقعی جزئیات ہیں، ورنہ کسی کی نظر ان گہرائیوں پر جا ہی نہیں سکتی۔

بنیادی امر

یہ پاک دین تھا، جس کی دعوت کے لیے رسول اکرم ﷺ مبعوث ہُوئے۔ اسلام کا خدا رؤف و رحیم، اسلام کا رسول ﷺ رؤف ورحیم، اسلام کے پیرووں کو زیادہ سے زیادہ رحمت و محبت، شفقت اور عفوو درگزر کی تعلیم دی گئی تھی۔ عالم انسانیت کی اصلاح و درستی کا کارا ہم اسی طرح بوجہ احسن پُورا ہوسکتا تھا۔ بلاشبہ بدلے کی گنجائش رکھی گئی۔ کیونکہ تمام انسان عزم الامور کی ترازو میں پُورے نہیں اُتر سکتے، لیکن ترجیح عزم الامور ہی کو حاصل ہے اور مقاصد اصلاح و درستی کو جلد سے جلد پایہ تکمیل پر پہنچانا بھی عزم الامور ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔ اصلاح کے سلسلے میں بنیادی امر یہ ہے کہ جن کی اصلاح مقصود ہو، انھیں سب سے پہلے یہ یقین ہو جائے کہ ان کے ساتھ داعی اصلاح کو دلی ہمدردی ہے۔ یہ یقین داعی کے بلند طرز عمل ہی سے پیدا ہوسکتا ہے۔ جیسے جیسے دائرہ اصلاح پھیلتا جائے گا فتنہ وفساد کا ازالہ ہوتا جائے گا۔ نئے نئے داعی بروئے کار آئیں گے ۔ اس طرح رحمت خداوندی سے کیا بعید ہے کہ کروڑوں انسان تھوڑے ہی عرصے میں راہ حق پر لگ جائیں۔ "يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا" (النصر۔۲) کا ایک منظر وہ تھا

جس نے رسول ﷺ کی ذات بابرکات کے معبوث ہونے کی ضرورت پوری کر دی۔ "یَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا" کا آخری منظر ابھی باقی ہے۔ جب شش جہت سے اعتراف رحمۃ للعلمین کی صدائے حق بلند ہو گی اور کائنات انسانیت کے لبوں پر اللّٰھم صل علیٰ سیّدنا و مولانا محمدٍ وّ آلہ وسلم کا ترانہ ہو گا۔

عظیم ترین محسن انسانیت

آپ نے کبھی سوچا کہ خونی رشتے سے بڑھ کر سچی، پر خلوص اور مستحکم محبت پیدا کرنے کے مؤثر ترین وسائل کیا ہیں؟ حضور ﷺ کے بعض ارشادات پر ایک سرسری نظر ڈال لیجیے آپ کو یقین ہو جائے گا کہ انسانیت پر اس بنیادی اور دوامی احسان کے لیے جو طریقے حضور ﷺ نے اختیار فرمائے۔ ان سے بہتر اور حصول مقصد کے لیے مؤثر ذریعے کوئی نہیں ہو سکتے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا:

"بدگمانی سے دور رہو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، ایک دوسرے کے بھید نہ ٹٹولو، عیب جوئی نہ کرو، باہم بغض نہ رکھو اور بھائی بھائی ہو جاؤ۔ ❶

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

"آپس میں بغض نہ رکھو، باہم حسد نہ کرو، آپس کے تعلقات نہ توڑو اور خدا کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کے ساتھ تین روز سے زیادہ قطع تعلق رکھے"۔ ❷

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

"رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، جب تم میں سے کسی کے ہاں سالن پکے تو اسے چاہیے کہ شوربا زیادہ کر لے۔ پھر اس میں سے کچھ پڑوسی کو بھی بھیج دے"۔ ❸

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا (یعنی میری جماعت میں سے نہیں) جو ایسی حالت میں اپنا پیٹ بھر کر مزے سے سو جائے جب اس کے پہلو میں رہنے والا پڑوسی بھوکا ہو اور پیٹ بھر کر سو جانے والے کو علم ہو کہ پڑوسی بھوکا ہے"۔ ❶

---

❶ صحیح بخاری، کتاب النکاح باب لا یخطب علیٰ خطبۃ اخیہ۔
❷ صحیح بخاری، کتاب الادب باب ماینھیٰ عن التماس
❸ رواہ الطبرانی الاوسط۔
❶ رواہ الطبرانی فی الکبیر۔

آج رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے کتنے مدعی ہیں جو حقیقی ایمان کی اس میزان میں پورے اتر سکتے ہیں؟ جو لوگ محض اتفاقات کی بنا پر کچھ عرصے کے لیے امر و حکم میں شریک ہو جاتے ہیں، وہ اپنے عالی شان ایوانوں میں اس طرح پیٹ بھر کر سوتے ہیں کہ لاکھوں بھوکوں اور محتاجوں کا احساس تک انھیں نہیں رہتا۔ احساس ہو تو تڑپ کر باہر نہ نکل آئیں؟ احساس ذمہ داری ان کو تھا جو راتوں کو جگہ جگہ خفیہ خفیہ دورے کر کے اندازہ کیا کرتے تھے کہ کوئی ستم زدہ ان کے دائرہ علم سے باہر تو نہیں رہ گیا؟ پھر دیکھیے ارشاد کا مدعا جہاں یہ ہے کہ مختلف انسانی حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے وہاں یہ بھی ہے کہ ان میں وہ محبت وہ رحمت اور وہ شفقت بروئے کار آجائے، جو خونی رشتوں میں بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ اگر انسانیت کا کوئی محسن اس عظمت و شان کا ہے تو اس کا نشان بتایئے۔ یہ منصب ازل سے رحمتہ للعلمین ﷺ کے لیے خاص ہو گیا۔

اُسوۂ محمدی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

احتساب

احتساب ایک سنہری زنجیر ہے، جس میں تمدن، اخلاق، مذہب اور معاشرت کی تمام جزئیات جکڑی ہوئی ہیں۔ اگر اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے تو دفعتہً نظام عالم کی ایک ایک کڑی درہم برہم ہو جائے۔ اسی غرض سے دنیا نے احتساب کو مختلف صورتوں میں قایم رکھا۔ خاندانوں اور کنبوں نے مختلف رسم و رواج اختیار کیے، جن کی خلاف ورزی موجب ملامت، بلکہ بعض اوقات قوی جرم خیال کی جاتی ہے، سلطنتوں نے قوانین بنائے جو انسان کو ایک خاص نظام کے ماتحت ہر قسم کی مادی، اخلاقی اور مذہبی ترقی کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ حکماء نے فلسفہ اخلاق ایجاد کیا، جو اخلاقی قوانین کی پیروی پر جمعیتہ بشری کو مجبور کرتا ہے۔

ہمارا سرمایہ فخر

اگر یورپ کو اپنی تہذیب پر فخر ہے کہ وہ انسان کی ہر فروگزاشت پر سختی کے ساتھ گرفت کرتی ہے۔ اگر رومن لا (رومی قانون) کو اپنے اوپر ناز ہے کہ وہ دنیا کے قوائے متضادہ کو اپنے مرکز سے ہٹنے نہیں دیتا، اگر یونان کو اپنے فلسفہ اخلاق پر گھمنڈ ہے کہ وہ اخلاقی قویٰ کی تربیت کرتا ہے تو ہمیں ان کے بڑے بول سے مرعوب نہیں ہو جانا چاہیئے۔ ہم رسم و رواج کے غلام نہیں کہ یورپ کے قوانین معاشرت پر فریفتہ ہو جائیں۔ ہم قانونی سختیاں برداشت کرنے کے خوگر نہیں کہ اپنے ہاتھ کو ہر ہتھکڑی کے حوالے کر دیں۔ قیاسات عقلی ہماری غذائے روحانی نہیں کہ یونانیوں کے طلسم میں پھنس جائیں، بلکہ ہمارے رگ اور پٹھے ایک پاک مذہب کے سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے گوشت اور خون پر چمڑے کی جگہ مذہب کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ ہمارے قلب کو ایک غیر متزلزل مذہبی احساس حرکت دے رہا ہے، پس ہم کو ہر دلفریب رسم و رواج، ہر مرعوب کرنے والے قانون اور ہر متحیر کر دینے والے فلسفے کو چھوڑ کر اپنی باگ صرف اسلام ہی کے ہاتھ میں دینی چاہیے اور اس پر فخر کرنا چاہیے کہ:

رشتہ در گردنم افگندہ دوست

ے برد ہر جاکہ خاطر خواہ اوست

اسوۂ حسنہ

مذہب کی قوت احتساب ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر آنحضرت ﷺ کا اتباع فرض کر کے ہم کو پوری دنیا کی مادی و اخلاقی غلامی سے آزاد کر دیا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب: ۲۱)

"یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں پیروی و اتباع کا بہترین نمونہ رکھا گیا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: کہ تم رسول اللہ کی تقلید کرو، کیونکہ ایک کی تقلید کرنے سے دوسرے اشخاص کی تقلید کی نفی نہیں ہو جاتی۔ بلکہ یہ فرمایا کہ تمہاری تقلید صرف اسی پاک ذات ﷺ میں محدود ہے کیونکہ تمہیں اعمال صالحہ کا یہ خزانہ دوسری جگہ نہیں مل سکتا۔ اس طرز بیاں سے نہ صرف جناب رسول اللہ ﷺ کا اتباع لازم کر دیا گیا، بلکہ ساتھ ہی دوسرے تمام بڑے بڑے انسانوں کے اتباع کی نفی بھی کر دی۔ اس لیے کہ صرف ایک ہی آفتاب ہے جس کی روشنی، ظلمت زار دنیا کی ہر اندھیری اور ہر تیرہ و تاریک راہ میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہے!

جو غلام آفتا بم ہمہ ز آفتاب گو یم
نہ شبم نہ شب پر ستم کہ حدیث خواب گویم
(مولانا رومؒ)

آیات واحادیث

اسی آفتاب کی روشنی سے اور سیارے بھی نور حاصل کرتے ہیں، اس لیے ان کا اتباع بھی ہم پر واجب ہو جاتا ہے:

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم

"بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے اس کے بعد ان لوگوں کا دور جو اس کے بعد آئیں گے، پھر وہ لوگ جو اس کے بعد اسوہ حسنہ کی تقلید کریں گے۔"

اصحابی کالنجوم

"میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں"۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جناب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی اس خصوصیت کا بار بار ذکر کیا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾
۔(اعراف:۱۵۷)

”جو رسول اور نبی ﷺ امّی کی پیروی کریں گے، جس کی بعثت توراۃ وانجیل میں لکھی پائیں گے۔ وہ انہیں نیکی کے کاموں کا حکم دے گا۔ برائیوں سے روکے گا۔ پاک و مفید چیزوں کو ان پر حلال اور ناپاک و مضر چیزوں کو حرام کرے گا۔“

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ

(آل عمران:۱۱۰)

”تم لوگ بہترین امت ہو جسے خدا نے دنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نمایاں کیا۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان لاتے ہو۔“

لیکن ان آیتوں کی عملی تفسیر ہمیں صرف احادیث کی کتابوں میں ڈھونڈنی چاہیے جن کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مواقع احتساب کے ایک ایک جزیے کا پتا لگ سکتا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے ہدایت و ارشاد کے لیے جو آفتاب اور سیارے پیدا کیے تھے، وہ ہمیشہ ضیا گستر رہتے تھے۔

احتساب کی ترتیب اصلاح نفس سے شروع ہو کر بالترتیب محتسب کے قبیلے اور قوم تک منتہی ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرض احتساب اسی ترتیب کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔

اصلاح نفس

آنحضرت ﷺ کی ذات پاک جامع فضائل تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے تمام زلاّت کو معاف کر دیا تھا، بایں ہمہ آپ ﷺ اس کثرت سے نماز پڑھتے تھے کہ پاؤں پھول کر پھٹ جاتے تھے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس ریاضت شاقہ کو دیکھ کر عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ ! خدا نے تو آپ ﷺ کے تمام اگلے پچھلے گناہوں کو معاف کر دیا ہے، پھر آپ ﷺ کیوں اس قدر مصروف عبادت رہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

افلا اکون عبداً شکوراً [1]

[1] بخاری مطبوعہ بولاق ص: ۹۹ جز: ۸ کتاب التہجد باب قیام النبی ﷺ باللیل۔

"کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ ہونے کی کوشش نہ کروں۔"

چنانچہ جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آتے تھے، جو قلب کو خدا کی طرف سے پھیر دے سکتے تھے یا نفس میں غرور و تکبر پیدا کر سکتے تھے تو آپ ﷺ نہایت سختی کے ساتھ ان کا انکار فرماتے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے گھر میں ایک پردہ لٹکا لیا تھا جس میں تصویریں بنی تھیں آپ ﷺ کی نظر پڑی تو فرمایا:

أُمِيطِي عَنَّا قِرَامَكِ هٰذا فانّهُ لا تَزَالُ تَصَاوِيرُهُ تَعْرِضُ فِي صَلَاتِي۔ [1]

"ہمارے سامنے سے اپنا یہ پردہ ہٹا لو کیونکہ اس کی تصویریں میری نماز میں سامنے آتی رہتی ہیں یعنی خلل انداز ہوتی رہتی ہیں۔"

ایک صحابی نے بطور تحفہ کے آپ ﷺ کو حریر کا ایک جُبہ دیا، آپ ﷺ نے اسے پہن کر نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد نہایت ناگواری سے اتار کر پھینک دیا اور فرمایا:

لاینبغی هٰذا لِلْمُتَّقِيْن۔ [2]

"یہ پرہیز گاروں کے قابل نہیں۔"

غرور و کبر کا سرچشمہ

غرور و کبر کا سرچشمہ مدح و ستایش ہے۔ امرا و سلاطین کو اسی مرض نے دنیا کی تمام چیزوں سے بالاتر بنا دیا ہے۔ آنحضرت ﷺ اگرچہ خیر البشر تھے لیکن اگر کوئی شخص آپ ﷺ کو انبیاے سابقین پر ترجیح دیتا تھا تو آپ ﷺ اسے منع فرماتے تھے۔ ایک صحابی اور ایک یہودی میں جھگڑا ہو گیا۔ صحابی نے غصے میں قسم کھائی اور کہا: اس خدا کی قسم جس نے محمد ﷺ کو تمام دنیا سے افضل بنایا ہے۔ یہودی نے بھی قسم کھائی: "اس خدا کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام دنیا پر ترجیح دی ہے۔" صحابی نے اس پر غصے میں آکر یہودی کے منہ پر طمانچہ مارا، اس نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی۔ آپ نے حکم دیا کہ "مجھے موسیٰ پر ترجیح نہ دو" [3]

احتساب قبیلہ و خاندان

خیرات گھر ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا تھا: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ (اپنے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کے آگے حق پیش کرو اور عذاب الٰہی سے

---

[1] بخاری جز: ا ص: ۷۰ (کتاب الصلوٰۃ باب من صلی فی ثوب مصلب)
[2] بخاری جز: ا ص: ۸۰ (کتاب الصلوٰۃ باب من صلی فی فروجِ حریر)۔
[3] بخاری جز: ۸ ص: ۱۰۸ (تاب الخصوصات: لا تخیرونی علی موسیٰ)

ڈرا) (الشعرا:۲۱۴) جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنے پورے قبیلے اور خاندان کو جمع کرکے پیغمبرانہ لہجے میں یہ حکم الٰہی سنایا:

"یا معشر قریش! یا معشر بنی عبد مناف! یا معشر بنی قصی! یا معشر بنی عبد المطلب! اے فاطمہ رضی اللہ عنہا محمد ﷺ کی بیٹی، تم سب اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ کیونکہ میں تمہیں قیامت کے دن کچھ بھی نفع ونقصان نہ پہنچا سکوں گا: اے فاطمہ رضی اللہ عنہا تجھے مجھ سے صرف جسمانی تعلق ہے اور میں رشتے کی بیل کو صرف دنیا ہی میں سرسبز وشاداب رکھ سکوں گا"[1]

یہ ایک عام احتساب تھا، لیکن مخصوص مواقع پر بھی آپ ﷺ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور اہل و عیال کو نیکی کی ترغیب دیتے اور برائی سے روکتے رہتے تھے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ ایک رات اُٹھے اور فرمایا: "سبحان اللہ! آسمان سے فتنہ وفساد کی بارش ہو رہی ہے اور برکات وفضائل کے خزانے کھل گئے ہیں۔ حجروں میں سونے والیوں (ازواج مطہرات) کو جگادو کیونکہ دنیا کی بہت سے کپڑے پہننے والی عورتیں آخرت میں برہنہ نظر آئیں گی"۔[2]

صدقے سے اجتناب میں اہتمام

آپ ﷺ نے تنزہ نفس اور استغنا کی وجہ سے فقر وفاقہ کے باوجود اپنے اوپر اور اپنے تمام خاندان کے اوپر صدقہ حرام کر دیا تھا۔

امام حسین رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ بچپن میں صدقہ کی ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی آپ ﷺ کی نگاہ پڑی تو فوراً ٹوکا: "کخ کخ"، کیا تمہیں خبر نہیں کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا؟"[3]

آپ ﷺ ایک مرتبہ شب کو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور فرمایا: "تم لوگ اٹھ کر تہجد نہیں پڑھتے؟" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "یارسول اللہ ﷺ! ہماری نیند اور بیداری تو خدا کے اختیار میں ہے، اگر وہ جگائے گا تو جاگیں گے؟ آنحضرت ﷺ خاموش ہو گئے مگر اپنی ران پر افسوس کے ساتھ ہاتھ مارا اور یہ آیت پڑھی:

وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿٥٤﴾[4] (الکہف۔۵۴)

"آدمی بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔"

---

[1] ترمذی ص۵۲۶ کتاب التفسیر
[2] بخاری جز: ۲ص: ۳۰۔
[3] بخاری جز: ۲ص: ۱۲۸
[4] بخاری جز اول ص:۵۰

احتساب قوم

اگرچہ وہ تمام جزئی مواقع، جہاں آنحضرت ﷺ نے احتساب کا فرض ادا کیا ہے، احتساب قومی کے تحت میں داخل ہیں، لیکن آپ ﷺ نے دو موقعوں پر نہایت بلیغ تشبیہ کے ساتھ اپنی اس خصوصیت کا اظہار قوم کے سامنے فرمایا: ایک موقع پر فرمایا:

”میری اور میری شریعت کی مثال بعینہ اس شخص کی سی ہے، جس نے ایک قوم کے پاس آکر یہ وحشت انگیز خبر سنائی کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر تمہاری طرف آتے ہوئے دیکھا ہے، میں ایک ”نذیر عریاں“ ہوں،❶ پس تمہیں ہوشیار ہو جانا چاہیے چنانچہ ایک گروہ نے اس کا کہنا مانا اور وہ رات ہی رات بچ کر نکل گیا۔ دوسرے گروہ نے اسے جھٹلایا: نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر نے دھارا مارا اور اس گروہ کا استیعال کر دیا“۔

دوسرے موقعے پر فرمایا:

”میری اور تمام لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ بھڑکائی۔ جب آگ کی روشنی چاروں طرف پھیلی تو پروانے اس پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ اس نے پروانوں کو آگ میں جانے سے روکنا چاہا، لیکن وہ سب اس کے قابو میں نہ آسکے اور آگ میں گھس گئے۔

”اسی طرح میں تم لوگوں کی کمر پکڑ کر کھینچتا ہوں تا کہ آگ میں داخل ہونے نہ پاؤ، لیکن لوگ اس میں گھسے جاتے ہیں۔“❷

عقائد کی درستی

آنحضرت ﷺ کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد تصحیح عقاید تھا۔ عقائد میں بدترین چیز شرک فی اللہ تھی اور آنحضرت ﷺ نے صرف شرک ہی مٹانے کے لیے جہاد کیا، جو احتساب کی آخری منزل ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عقائد ہیں، جو عام دسترس سے باہر ہیں۔ اگر عام لوگوں کو ان میں غور و فکر کرنے کا موقع دیا جائے تو مذہبی عقائد میں بہت سے مفاسد پیدا ہو جائیں اور اسلامی عقائد کی سادگی فنا ہو جائے جو اسلام کا سب سے بڑا زیور ہے۔ اسی غرض سے آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی یہ خصوصیت قرار دی تھی کہ وہ غیر ضروری چیزوں میں وقت ضائع نہیں کرتے، چنانچہ عہد نبوت میں جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آئے ہیں، آنحضرت ﷺ نے سختی کے ساتھ صحابہ کو زجر و توبیخ کی ہے۔

مسئلہ قضا و قدر

---

❶ یعنی ننگا ڈرانے والا۔ عرب میں ہر اہم واقعے کی خبر ننگے ہو کر دیتے تھے۔

❷ بخاری جز: ۸ ص ۱۰۱۔ ۱۰۲۔

ایک مرتبہ صحابہ مسئلہ قضاوقدر کے متعلق مباحثہ کررہے تھے جس نے آگے چل کر مسلمانوں کے دو عظیم و حریف مقابل فرقے پیدا کردیے [1] آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو چہرہ مبارک غصے سے سُرخ ہو گیا اور فرمایا:

بھٰذا امرتم او لھذا خلقتم تضربون القراٰن بعضہٗ ببعض بھٰذا ھلکت الامم قبلکم [2]

”کیا تم لوگوں کو اس کا حکم دیا گیا ہے یا تم اس لیے پیدا کیے گئے ہو؟ تم لوگ قرآن کو گڈمڈ کررہے ہو، گزشتہ قوموں کو اسی قسم کے لایعنی مسائل نے برباد کردیا۔“

چاند سورج کا گہن

اگرچہ اسلام نے عرب جاہلیت کے تمام توہم آمیز عقائد مٹادیے تھے، تاہم بعض باتیں رہ گئی تھیں اور کبھی کبھی ان کا ظہور ہو جاتا تھا۔ عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے صاحب زادے ابراہیم رضی اللہ عنہ نے انتقال کیا تو اتفاق سے اسی دن سورج میں گہن بھی لگ گیا۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی موت کا اثر ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے فوراً اس خیال سے لوگوں کو روکا اور فرمایا: ”چاند اور سورج میں کسی کے مرنے اور جینے سے گہن نہیں لگتا۔“

عبادات

عبادات چونکہ روز کی چیزیں تھیں جن میں سہو و غفلت اور بے عنوانی کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ کو ان کے متعلق احتساب کی اکثر ضرورت پیش آتی تھی، [3] اسلام نے ادائے نماز کے لیے جماعت کو واجب کردیا تھا، لیکن اکثر لوگ اس میں غفلت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے جماعت میں چند اشخاص کو ڈھونڈا تو نہ پایا، نہایت برہم ہوئے اور فرمایا:

”جی میں آتا ہے کہ ایک شخص کو امام بنا کر خود ان لوگوں کے پاس چلا جاؤں اور لکڑیوں کا ڈھیر لگا کر ان کے گھر آگ میں پھونک دوں“۔ [4]

---

[1] یعنی جبری اور قدری

[2] سنن بن ماجہ ۱۶ (باب القدر)

[3] بخاری جز: ۲ ص ۳۴۔

[4] صحیح مسلم مطبوعہ مصر جلد: ۱ ص: ۲۴۳

نماز میں تخفیف کی تاکید

بعض لوگ جب امامت کرتے تھے تو نماز میں طول دیتے تھے، جس سے کاروباری اور ضعیف لوگ گھبرا جاتے تھے۔ ایک شخص نے اسی بنا پر امام کی شکایت کی، آپ ﷺ کو معمول سے زیادہ غصہ آگیا اور فرمایا:

"تم مذہب سے لوگوں کو متنفر کر رہے ہو۔ امام کو نماز میں تخفیف کرنی چاہیے کیونکہ ان میں مریض، ضعیف، کاروباری ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ [1]

خشوع فی الصلوٰۃ

نماز کا اصل مقصد خشوع و خضوع ہے لیکن جب کسی کے طرزِ عمل سے ان کا ظہور نہیں ہوتا تھا تو آنحضرت ﷺ اسے تنبیہ فرماتے تھے۔ ایک بار ایک شخص نے نہایت عجلت کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز پڑھ چکا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "نماز کو دہراؤ، تم نے نماز پڑھی ہی نہیں۔" اس نے تین بار نماز دہرائی اور آپ ﷺ نے تینوں بار ٹوکا، آخر میں اس نے کہا "اب میں اس سے بہتر نماز نہیں پڑھ سکتا۔" آپ ﷺ نے تکبیر، قرات، رکوع، سجود، قیام اور تعوذ کے وہ طریقے بتائے جن سے اطمینان، سکون و وقار اور اعتدال کا اظہار ہوتا تھا۔ [2]

جزئیات پر نظر

عبادات اور مقدمات، عبادات کے متعلق آپ ﷺ نہایت معمولی اور جزئی باتوں پر بھی گرفت فرماتے تھے۔ ایک بار سفر میں تھے، نماز عصر کا وقت آگیا، صحابہ نے پاؤں کا مسح کیا۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو دور سے بہ زور آواز دی۔

ویل للاعقاب من النار [3]

"ایڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔"

ابتدائے اسلام میں نماز کے قیام وادا کی حالت بالکل ابتدائی تھی اور تمام جزئیات و فروع ابھی واضح نہیں ہوئے تھے، اس طرح کا بتدریج ارتقاء مذہب کی ہر تعلیم میں ہوتا ہے۔ موجودہ حالت ایک مدت کے تغیرات کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ ابتدا میں اکثر لوگ مسجد کے اندر تھوک دیتے تھے۔ ایک مرتبہ

---

[1] بخاری جز: ۱ص: ۲۶

[2] بخاری جز: ۱۴۸

[3] بخاری جز: ۱ص: ۲۷

آپ ﷺ نے مسجد میں تھوک کا دھبا دیکھا، خود اٹھے اور ہاتھ مبارک سے اسے مٹا دیا۔ پھر فرمایا "نماز میں ہر شخص خدا سے سرگوشی کرتا ہے" اس لیے کسی شخص کو قبلہ کی طرف تھوکنا نہیں چاہیے، البتہ دائیں بائیں یا اپنے پاؤں کے نیچے تھوک سکتا ہے۔ [1]

یہاں یہ واضح رہے کہ اس وقت مسجد کا فرش پختہ نہ تھا، صحن مسجد اور عام سطح زمین میں سوائے حدود عمارت کے اور کوئی امتیاز قائم نہ تھا۔ ریتلی زمین تھی اور وہ ہر طرح کی رطوبت جذب کر لیتی تھی لیکن اب مسجدوں کا داخلی حصہ (ہی نہیں صحن کا فرش بھی) پختہ ہوتا ہے، پس وہاں تھوکنا مسجد کی صفائی اور نمازیوں کے حقوق نشست پر حملہ کرنا ہے۔

بدعت

نظام مذہبی کا سب سے زیادہ خطرناک مرض بدعت ہے۔ اگرچہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں مسلمان اس مرض میں مبتلا نہیں ہو سکتے تھے تاہم جاہلیت کے زمانے کی بہت سی بدعتوں کی جھلک کبھی کبھی نظر آ جاتی تھی، اس لیے آپ ﷺ ہمیشہ ان کے مٹانے میں مصروف رہتے تھے۔

پیدل چلنے کا حلف

بدعت کی مختلف قسمیں اور مختلف مظاہر ہیں لیکن اس کی بدترین شکل رہبانیت اور جوگ ہے، جو یہود و نصاریٰ کے مذہب کا جزو بن گئی ہے۔ وَرَهبَانية ابتدعوها۔ (اور رہبانیت انہوں نے خود نکالی۔ الحدید:۲۸) چونکہ عرب پر یہود و نصاریٰ کا مذہبی اثر غالب تھا اس لئے وہاں بھی اس قسم کی بدعات پیدا ہو گئی تھیں۔

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے جا رہا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے کہا: "اس نے پیدل چلنے کی نذر مانی ہے۔ ضعف کی وجہ سے بیٹوں کے سہارے چلتا ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "اس نے اپنے آپ کو کیوں عذاب میں مبتلا کر دیا ہے؟ خدا اس سے بے نیاز ہے۔"

ننگے پاؤں چلنے کی منت

عقبہ بن عامر کی بہن نے خانہ کعبہ تک ننگے پاؤں پیدل چلنے کی منت مانی اور عقبہ کو آنحضرت ﷺ

---

[1] بخاری جز: ا ص:۸۶۔

کے پاس بھیجا کہ پوچھ آئیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "سواری پر بھی جاسکتی ہے"۔ ❶

کھڑے رہنا اور بات نہ کرنا

ایک مرتبہ آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے اور لوگ نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر سن رہے تھے لیکن ایک شخص کھڑا تھا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا، اس نے نذر مانی ہے کہ ہمیشہ کھڑا رہے گا۔ سایے میں نہ بیٹھے گا۔ کسی سے بات چیت نہ کرے گا اور روزہ رکھے گا۔ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ اسے بیٹھنا چاہیے، سایے میں آنا چاہیے، گفتگو کرنی چاہیے اور روزے کو بھی پورا کرنا چاہیے۔ ❷

ناک میں نکیل

اسی طرح آپ ﷺ کو ایک شخص نظر آیا جسے ایک آدمی ناک میں نکیل ڈال کر خانہ کعبہ کا طواف کرارہا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کی ناک کی رسی کاٹ دی اور فرمایا: "اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ۔" ❸

تشدد آمیز مذہبی انہماک

لیکن ان بدعات سے زیادہ ان اصولوں کا مٹانا ضروری تھا جن کی بنا پر بدعات پیدا ہوتی ہیں۔ بدعات کا سب سے بڑا سرچشمہ، تشدد آمیز مذہبی انہماک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے نظام عبادات کو نہایت سہل و آسان طریقے پر قائم کیا ہے، اس لحاظ سے اگرچہ خود اسلام کے سنگ بنیاد پر بدعت کی عمارت قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ تاہم ابتدا میں صحابہ کا ایک پرجوش و مخلص گروہ نہایت شدت کے ساتھ عبادت میں مصروف رہنا چاہتا تھا۔ جب آنحضرت ﷺ نے ایک دن چھوڑ کے روزہ رکھنا شروع کیا تو اکثر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی اس کی تقلید کی، لیکن آپ ﷺ کو نظر آیا کہ یہی چیز بدعت کا پیش خیمہ بھی ہے۔ آپ ﷺ نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ اس پر بھی لوگ باز نہ آئے تو معمول کے خلاف متصل روزہ رکھنا شروع کر دیا کہ لوگ خود گھبرا کر باز آجائیں۔ ❹ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو کثرت صوم و صلوٰۃ سے

---

❶ صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۰۷۔
❷ بخاری جز ۸ ص ۱۴۳۔
❸ بخاری جز: ۸ ص ۱۴۳۔
❹ بخاری جز: ۸ ص ۱۷۴۔

اسی بنا پر روک دیا تھا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو بھی شدت زہد سے منع فرمایا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تائید کی تھی۔ ❶

رسم ورواج کا انسداد

رسم و رواج کو جب استحکام ہو جاتا ہے تو بدعات کی طرح ان کا چھوڑنا بھی نہایت شاق گزرتا ہے حالانکہ اکثر حالتوں میں وہ بدعات سے کم ضرر رساں ثابت نہیں ہوتیں اور بڑی قیامت یہ ہے کہ بعض اوقات مذہبی حیثیت پیدا کر لیتی ہیں۔

عرب میں بہت سی مضر رسمیں جاری ہو گئی تھیں، جن کی پابندی نہایت ضروری خیال کی جاتی تھی، اس لیے بدعات کے ساتھ ساتھ ان کا بھی انسداد کیا گیا۔

میت کا ماتم

عرب کے جذبات نہایت رقیق و لطیف تھے۔ اس لیئے وہ اعزہ و اقارب کی موت سے نہایت متاثر ہوتے تھے۔ جس کا اظہار مختلف حیثیتوں سے کیا جاتا تھا۔ عورتیں نہایت شدت کے ساتھ میت پر گریہ وبکا کرتی تھیں۔ منہ نوچنا، سر کے بال منڈوالینا، گریبان چاک کر دینا، شوہر کی موت پر برسوں تک خاص پابندیوں کے ساتھ گھر سے باہر رہ کر ماتم کرنا عرب کی عورتوں کا عام شعار تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام رسوم کو نہایت سختی سے مٹایا۔ شخصی حالتوں کے علاوہ میت پر قومی حیثیت سے بھی ماتم کیا جاتا تھا، یعنی قبیلے کی بہت سی عورتیں جمع ہو کر میت کے محاسن و فضائل بیان کرتیں اور باہم روتی تھیں۔ اسی رسم کا نام "نیاحہ" ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک یہ رسم قائم تھی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آئے تو اس طرح کی عورتوں کو سختی کے ساتھ تنبیہ کی۔

حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو جب اپنے شوہر کے انتقال کی خبر ملی تو بہ حسرت بولیں "مسافر مسافرت میں مرا۔ اس پر اس قدر گریہ وبکا کروں گی کہ یادگار رہے گا۔" چنانچہ اس غرض سے اٹھیں تو عرب کے دستور قدیم کے مطابق ایک عورت نے گریہ وبکا میں اس کا ساتھ دینا چاہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا: کیا اس گھر میں شیطان کو داخل کرنا چاہتے ہو، جس سے خدا نے اسے نکال دیا ہے؟"۔ ❶

---

❶ بخاری جز۸ ص ۳۲
❶ صحیح مسلم جلد اول ص ۳۴۰

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت

جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کی شہادت کی خبر آئی تو ان کی عورتوں نے اسی طریقے سے نوحہ کرنا شروع کیا۔ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کو خبر کی۔ آپ ﷺ نے منع کرنے کا حکم دیا، لیکن وہ ناکام واپس آیا۔ آپ ﷺ نے اسی غرض سے دوسری مرتبہ پھر اسے بھیجا، اس پر بھی کچھ اثر نہ ہوا تو تیسری بار فرمایا: "جا کر ان عوتوں کے منہ میں خاک جھونک دو۔"❷

جنازے کے مراسم

جنازے کے متعلق بھی اسی قسم کی متعدد رسمیں پیدا ہو گئی تھیں مثلاً اہل عرب جنازے کے ساتھ سواری پر جاتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے چند اشخاص کو دیکھا کہ وہ ایک جنازے کے ساتھ سوار ہو کر جارہے ہیں فرمایا: "کیا تم کو شرم نہیں آتی کہ فرشتے پیدل ہیں اور تم سواری پر جارہے ہوا۔"❸

جنازے کی مشایعت صرف کرتہ پہن کر کرتے تھے۔ اظہار غم کے لئے چادر اتار ڈالتے تھے۔ چادر عرب کا عام لباس تھا آنحضرت ﷺ نے اسی وضع میں چند اشخاص کو دیکھا تو فرمایا: "کیا جاہلیت کے طریقے پر عمل کر رہے ہو"۔❹

عورتوں کی شرکت جنازہ

جنازے میں عورتیں بھی عموماً شریک ہوتی تھیں، چنانچہ آپ ﷺ نے چند عورتوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو پوچھا: "کیوں بیٹھی ہو:" بولیں: "ایک جنازے کا انتظار ہے۔" فرمایا: "کیا اس کو غسل دو گی؟" ان سبھوں نے کہا: "نہیں" پھر فرمایا: "تو کیا لاش کو کندھا دو گی؟" ان سبھوں نے کہا: "نہیں۔" پھر فرمایا: "کیا لاش کو قبر میں اُتارو گی؟" بولیں: "نہیں"، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "پھر واپس جاؤ۔"❺

فخر و غرور کی ممانعت

عرب کی فخر پسند طبیعت ہمیشہ باپ دادا کے کارناموں کا ذکر نہایت بلند آہنگی سے علیٰ روس الاشہاد کرتی تھی۔ یہاں تک کہ زمانہ حج میں بھی یہ داستان پارینہ تازہ کی جاتی تھی۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ

---

❷ صحیح مسلم جلد اول ص ۳۴۵
❸ سنن ابن ماجہ ص: ۲۵۰
❹ سنن ابن ماجہ ص: ۲۵۱
❺ سنن ابن ماجہ ص: ۳۹۷

اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ (تو چاہیے کہ جس طرح پہلے اپنے آباواجداد کی بڑائیوں کا ذکر کرتے تھے، اب اسی طرح اللہ کا ذکر کیا کرو بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ البقرہ: ۱۹۹) ۔ اس کو "مناشرت" کہتے تھے۔ فخر و غرور کے اظہار کا یہ طریقہ اکثر بڑی بڑی نزاعین قائم کر دیتا تھا۔ اسلام نے اس رسم کو بالکل ہی مٹا دیا، لیکن اس کا اثر مختلف صورتوں میں پھیل گیا تھا منجملہ ان کے ایک صورت یہ تھی کہ باپ دادا کے نام کی قسم کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی قسم کھائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خدا باپ دادا کے نام کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے، صرف خدا کی قسم کھانی چاہیے، ورنہ خاموشی بہتر ہے"۔ [1]

اخلاقی اصلاح

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصلی مقصد اصلاح اخلاق و تزکیہ نفس تھا، جسے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر فرما دیا تھا:

انّما بعثت لاتمّم مکارم الاخلاق۔

"میں اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہُوا ہوں۔"

اور یہ مقصد ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر رہتا تھا۔ اصولی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق کے متعلق جو اصلاحیں کیں، وہ ان کے علاوہ ہیں، جزئی طور پر جب کسی شخص سے کسی قسم کی بداخلاقی کا ظہور ہوتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً اسے تنبیہ فرما دیتے تھے۔ چنانچہ احادیث میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں، جن کے جزئیات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

انسداد گداگری

اسلام نے زکوٰۃ کا ایک مستقل نظام قایم کر دیا تھا کیونکہ خاص خاص لوگ اس کے حقیقی مستحق تھے عام طور پر اسلام گداگری اور مفت خوری کو نہایت ذلیل پیشہ قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غیر مستحق لوگوں کو گداگری سے نہایت سختی کے ساتھ روکتے تھے۔

ایک انصاری کی مثال

ایک مرتبہ ایک انصاری نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "تمہارے گھر میں کچھ پونجی بھی ہے؟" اس نے کہا: ایک ٹاٹ ہے جسے اوڑھتا بچھاتا ہوں۔ ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا

---

[1] سنن ابن ماجہ ص:۳۹۷

ہوں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "جاکر اسے لے آؤ۔" وہ جاکر اٹھالایا، آپ ﷺ نے تمام صحابہ کے سامنے اسے بغرض فروخت پیش کیا۔ ایک صحابی نے ایک درہم پر لینا چاہا، دوسرے صحابی نے قیمت میں اضافہ کرکے دو درہم پر لے لیا۔ آپ ﷺ نے دونوں درہم اس انصاری کے حوالے کیئے اور فرمایا: ایک درہم کا غلہ لیکر گھر میں دے آؤ، دوسرے درہم کا ایک بسولا خرید کر میرے پاس لاؤ۔" وہ بسولا خرید لایا۔ آپ ﷺ نے خوددست مبارک سے اس میں دستہ لگایا اور حکم دیا "جنگل میں جاکر لکڑی کاٹو اور بیچو۔ پندرہ دن تک میں تمہاری صورت نہ دیکھوں۔" وہ لکڑی کاٹ لایا اور اسے فروخت کیا۔ دس درہم ہاتھ آئے یہ رقم لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اس رقم سے کُچھ غلہ اور کچھ کپڑا خرید کر کھاؤ پہنو، گداگری سے یہ بہتر ہے۔ وہ تو آدمی کے چہرے کا داغ ہے، صرف اپاہج لوگوں کے لیے جائز ہو سکتی ہے"۔ [1]

رشوت خوری

عدل و انصاف کی بربادی اور ظلم کی روح خبیث کا سب سے بڑا اسبب رشوت خوری ہے۔ عہد نبوت میں چونکہ آنحضرت ﷺ کے فیض محبت سے صحابہ کا معیار اخلاق نہایت بلند ہو گیا تھا اس لیئے رشوت خوری کی مثالیں نہیں ملتیں۔ تاہم جب کبھی کسی کے طرز عمل پر رشوت کا شبہ بھی ہوتا تھا تو آنحضرت ﷺ اس پر تنبیہ فرماتے تھے۔ حکام و عمال کو اکثر رشوتیں نذر و ہدیہ کے ذریعے سے دی جاتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا۔ آپ ﷺ نے قبیلۂ ازد کے ایک شخص کو صدقہ وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ اس نے واپس آکر آنحضرت ﷺ کے سامنے صدقے کا مال پیش کیا اور کہا: "اتنا مسلمانوں کا مال ہے اور اس قدر مجھے ہدیہ ملا ہے۔" چونکہ اس قسم کا ہدیہ رشوت کا ذریعہ بن سکتا تھا اور اگر علانیہ اس کا انسداد نہ کیا جاتا تو اور لوگ بھی اس طریقے سے فائدہ اٹھاتے، اس لیے آپ ﷺ نے ایک خطبہ دیا اور فرمایا: اس عامل کو دیکھو جو کہتا ہے کہ یہ مال مسلمانوں کا اور یہ مال میرا ہے۔ ذرا وہ اپنے گھر میں تو بیٹھ کے دیکھے کہ اس کے پاس ہدیہ آتا ہے یا نہیں؟ [2]

خیانت کا انسداد

معاملات میں خیانت، چالاکی اور خدع و فریب کا سب سے زیادہ موقع تجارتی کاروبار میں مل سکتا ہے، اس لیے آنحضرت ﷺ خاص طور پر اس کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بازار میں سے گزرے اور ایک شخص کے غلے کے ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈال کے دیکھا تو نمی محسوس ہوئی چونکہ بھیگنے

---

[1] سنن ابن ماجہ ص:۳۹۷

[2] صحیح مسلم جلد: ۲ ص: ۱۱۳

سے غلے کا وزن بڑھ جاتا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص دھوکا دیتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"[1]

چونکہ عرب میں غلہ بہت کم آتا تھا اس لیے جب باہر سے سوداگر غلہ لاتے تھے تو لوگ شہر سے باہر ہی تخمیناً خرید لیتے تھے، لیکن اس سے کئی طرح کے نقصانات پیدا ہوتے تھے۔ اول تمام شہر محروم رہ جاتا تھا، دوسرے یہ ایک غیر معین وغیر معلوم بیع تھی، اس لیے آنحضرت ﷺ نے اس سے روکا۔ آپ ﷺ لوگوں کو عموماً اس پر سزا دیتے تھے۔[2]

حفظ الید و حفظ اللسان

اسلام نے ایک عظیم الشان اخلاقی اصول یہ قائم کیا تھا۔

المسلم من سلم المسلمون من یدہ و من لسانہ۔

"مسلمان وہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو ایذا نہ پہنچے۔"

اگرچہ اس اصول کی خلاف ورزی کا اثر ہر موقع پر بُرے نتائج پیدا کرتا ہے، تاہم برابر کے درجے کے لوگ انتقام لیکر اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں، کمزور انسانوں کو تو اس کا بھی موقع نہیں مل سکتا چنانچہ اس قسم کے موقعوں پر جب کوئی شخص اس اخلاقی جرم کا مرتکب ہوتا تھا تو آپ ﷺ فوراً ٹوک دیتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے غلام کو ماں کی گالی دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تم اس کو گالی دیتے ہو؟ تم میں زمانہ جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں، جنہیں خدا نے تمہارے سپرد کر دیا ہے، جو تم کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ، جو تم پہنو، وہی ان کو پہناؤ اور ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ لو۔ اگر لیتے ہو تو ان کی اعانت کرو۔[3]

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ انصاری کہتے ہیں: "میں اپنے غلام کو مار رہا تھا۔ یکایک پیچھے سے ایک آواز آئی، اے ابو مسعود رضی اللہ عنہ! ہوشیار! خدا کو تم پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے"۔ میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو آنحضرت ﷺ تھے۔ حضرت مسعود رضی اللہ عنہ پر اس کا یہ اثر پڑا کہ انہوں نے غلام کو آزاد کر دیا۔[1]

مداحی اور عیش پروری کا انسداد

---

[1] سنن ابن ماجہ ص: ۴۰۳

[2] بخاری جز: ۳ص: ۶۸

[3] بخاری جز: ۱ص ۱۱

[1] ابوداؤد ص: ۳۴۸ جلد: ۲(باب فی حق المملوک)

انسان خوشامد پسند ہے اور مداحی اس دبی ہوئی چنگاری کو اور بھی ابھار دیتی ہے امراو سلاطین کو اسی نے تباہ کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کو خود مدح سے نفرت تھی اور لوگوں کو بھی اس سے منع فرماتے تھے، چنانچہ ایک آدمی نہایت مبالغہ آمیز طور پر ایک شخص کی مدح کر رہا تھا۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا۔ "تم نے اسے ہلاک کر دیا❷"

عیش پرستی بظاہر تمدن کا زیور ہے، لیکن در حقیقت اس کے اندرونی نظام کا اصلی گھن یہی چیز ہے۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ آپ ﷺ تمام لوگوں کو اسی سادگی کی تعلیم دیتے تھے اور جب کبھی کوئی چیز اس کے خلاف نظر سے گزرتی تو اس سے بیزاری ظاہر فرماتے تھے۔

ضرورت سے زائد عمارت

ایک مرتبہ آپ ﷺ راستے سے گذرے تو ایک بلند عمارت نظر آئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کس کا مکان ہے؟ لوگوں نے ایک انصاری کا نام لیا۔ آپ ﷺ خاموش ہو گئے، لیکن دل میں بات رکھ لی۔ وہ انصاری آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا۔ آپ ﷺ نے منہ پھیر لیا۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے آنحضرت ﷺ کی ناراضگی کا سبب پُوچھا تو لوگوں نے واقعہ بیان کیا۔ وہ فوراً گئے اور اس مکان کو مہندم کر دیا۔ آپ ﷺ دوسری بار اس طرف سے گزرے تو فرمایا کہ وہ عمارت کیا ہو گئی: لوگوں نے کہا یارسول اللہ ﷺ صاحب خانہ نے آپ ﷺ کی ناراضگی کے خوف سے اس کو گرادیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر وہ گھر جو ضرورت سے زائد ہو، صاحب خانہ پر وبال ہے۔ ❸

آرائشی پردے

ایک مرتبہ آپ ﷺ کسی لڑائی سے واپس آئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے شوق و محبت کے ساتھ گھر کو ایک نہایت رنگین پردے سے سجایا۔ آپ ﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سلام کیا، لیکن آپ ﷺ کے چہرے سے ناراضگی کے آثار ظاہر ہوئے اور سلام کا جواب تک نہ دیا۔ پھر خود دست مبارک سے پردے کے دو ٹکڑے کر دیے اور فرمایا کہ خدا نے ہمیں مٹی اور پتھر کو آراستہ کرنے کا حکم نہیں دیا۔ ❶
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی اس قسم کے مواقع پیش آئے ہیں۔

---

❷ بخاری جز: ۳ص:۱۷۷

❸ ابوداؤد جلد: ۲ص ۳۵۶(کتاب الادب، باب ماجاءفی النہا)

❶ ابوداؤد ص: ۲۱۶ جلد:۲

عفت و عصمت

اسلام پاکبازی اور عفت کی تعلیم دینے کے لیئے آیا تھا:

وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿۵﴾ (المؤمنون۔۵)

"کامیاب مسلمان وہ ہیں جو عفیف اور پاکباز ہیں۔"

اس بناپر جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آتے تھے جن سے مسلمانوں کی اس خصوصیت پر حرف آسکتا تھا، تو آنحضرت ﷺ فوراً اس سے تعرض فرماتے تھے۔

حضرت فضل رضی اللہ عنہ بن عباس رضی اللہ عنہ نہایت وجیہ آدمی تھے۔ زمانہ حج میں آنحضرت ﷺ نے انہیں اپنے ساتھ سوار کرلیا تھا۔ ایک خوش رو عورت آنحضرت ﷺ کی طرف فتویٰ پوچھنے کے لیے بڑھی۔ فضل رضی اللہ عنہ نے اس کو پر شوق نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ آنحضرت ﷺ نے خوددست مبارک سے ان کی ٹھوڑی پکڑ کر منہ اس کی طرف سے پھیر دیا۔ ❷

ستر عورت کی تاکید

یورپ کو آج تہذیب و تمدن پر بڑا ناز ہے۔ اگرچہ یورپ کی اخلاقی حالت کے اصلی مناظر نہایت نفرت انگیز ہیں۔ بظاہر ہر انگریز کو ستر عورت کا خیال رہتا ہے اور کسی نے کسی انگریز کو راہ میں برہنہ تن بہت کم دیکھا ہو گا۔ لیکن اسلام کی تہذیب اس بارے میں صرف نمائشی لباس آرائی ہی کو کافی نہیں سمجھتی۔ ایک بار آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو میدان میں برہنہ نہاتے ہوئے دیکھا، فوراً منبر پر تشریف لائے اور ایک عام خطبہ دیا:

"خدا صاحبِ حیا کو پسند کرتا ہے پس تم میں سے جو کوئی غسل کرے، چاہیئے کہ پردہ ڈال لیا کرے"۔ آنحضرت ﷺ کو ستر عورت کا اس قدر خیال تھا کہ ایک مرتبہ مِسوَر بن مَخرَمہ نے ایک بھاری پتھر اٹھایا۔ اس حالت میں ان کا کپڑا گر گیا۔ آپ ﷺ نے فوراً ٹوکا کہ کپڑا اٹھاؤ۔ برہنہ نہ ہو۔ ❸ لیکن یورپ کی ستر پوشی کا یہ حال ہے کہ غسل خانوں، حماموں، بحری ساحلوں اور تیراکی کے حوضوں میں صدہا متمدن انسان برہنہ ہو کر ایک دُوسرے کے سامنے نہاتے ہیں!

اصلاح شؤن النساء

اس معاملے میں عورتوں کی حالت مختلف حیثیتوں سے قابل توجہ اور محتاج اصلاح تھی۔ عرب میں مخنثوں کا ایک گروہ موجود تھا، جو علانیہ گھروں میں آتا جاتا تھا۔ ایک بار ایک مخنث نے ازواج مطہرات

---

❷ بخاری جز: ۸ ص: ۵۱

❸ ابوداؤد جلد: ۲ ص:۲۰۱

رضی اللہ عنہن کے سامنے ایک عورت کے محاسن بلکل ایک مرد کی نظر و ذوق سے بیان کیے۔ آنحضرت ﷺ نے فوراً حکم دیا کہ یہ لوگ گھر میں نہ گھسنے پائیں۔ [1]

عرب کی عورتوں میں جو بد اخلاقیاں پھیل گئی تھیں ان میں ایک بداخلاقی یہ بھی تھی کہ بعض عورتیں مردوں کی وضع اختیار کرتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان پر عموماً لعنت بھیجی ہے۔ جب کبھی کسی عورت کی وضع کو مردوں سے بلاقصد بھی مشابہت ہو جاتی تو آپ ﷺ فوراً ٹوک دیتے۔ ایک مرتبہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا دوپٹہ اوڑھ رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا:

لیۃ لالیتین "ایک تہہ کر کے اوڑھو، دو تہہ نہ کرو۔"

کیونکہ دو تہہ کرنے سے عمامہ کے ساتھ مشابہت پیدا ہو جاتی، جو مردوں کی خاص وضع ہے۔ آپ ﷺ کو اس پر اس قدر اصرار تھا کہ ایک عورت نے پردے سے آپ ﷺ کو ایک خط دینا چاہا۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی نہ تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ مرد کا ہاتھ ہے یا عورت کا؟" اس نے کہا "میں عورت ہوں۔" فرمایا: "اگر تم عورت ہو تو مہندی لگاؤ۔"

غیر محتاط لباس کی ممانعت

اکثر عورتیں نہایت غیر محتاط لباس پہنتی تھیں۔ اس کے متعلق قرآن حکیم میں آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ خود آنحضرت ﷺ جب کبھی اس قسم کی بے احتیاطی ملاحظہ فرماتے تھے تو فوراً روک دیتے تھے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بن ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس ایک کپڑا پہن کے آئیں تو آپ ﷺ نے منہ پھیر لیا پھر فرمایا۔ "عورت بلوغ کے بعد صرف منہ اور ہاتھ کھلا رکھ سکتی ہے۔ [2]"

عورتیں عموماً راستوں میں مردوں کے دوش بدوش چلتی تھیں۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ مسجد سے نکلے تو دیکھا کہ مرد عورت دونوں ساتھ ساتھ راہ میں چل رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "تم کو درمیان راہ چلنے کا کوئی حق حاصل نہیں، راستے کے کنارے چلنا چاہیے"۔ اس کے بعد سے عورتیں دیواروں سے لگ کر چلنے لگیں۔

اس قسم کے بیسیوں واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں۔

اصلاح ذات البین

اسلام نے مسلمانوں پر سب سے بڑا احسان الٰہی یہ جتایا ہے:

فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا (آل عمران:۱۰۳)

---

1. مسلم جلد: ۲ص: ۲۴۴
2. ابو داؤد جلد ۲ص:۲۱۱

"خدا نے تم کو باہم دشمنی کے بعد بھائی بنادیا۔"

لیکن باہمی اختلاف و تنازع سے یہ رشتہ اخوت ٹوٹ سکتا تھا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ کے فرائض احتساب میں سب سے اہم فرض رفع نزاع تھا۔ چنانچہ جب کبھی آپ ﷺ کو کسی شر وفساد خانگی کی خبر ملتی تو آپ ﷺ جاتے اور اصلاح فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ کو خبر ملی کہ قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں باہم کچھ ناچاقی پیدا ہوگئی ہے۔ آپ ﷺ چند صحابہ کے ساتھ تشریف لے گئے اور معاملے کے سلجھانے میں اس قدر دیر لگی کہ نماز کا وقت آگیا۔ چنانچہ حضرت بلالؓ کے درخواست کرنے پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی۔ ❶

عبد اللہ بن ابیّ بن سلول ایک بار نہایت گستاخانہ پیش آیا۔ یہاں تک کہ صحابہ سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ لڑنے بھڑنے پر تیار ہوگئے، اس پر عبد اللہ بن ابیّ کے حامی بھی اُٹھے اور فریقین باہم دست و گریبان ہوگئے، لیکن آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو سمجھا بُجھا کر الگ کیا اور فرمایا کہ "صلح فساد سے بہتر ہے۔ ❷"

واقعہ افک کے متعلق خود مسلمانوں کے دو قبیلوں اوس و خزرج میں سخت نزاع قائم ہوگئی اور دونوں فریق آمادہ جنگ ہوگئے لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔

مراعات ادب

آنحضرت ﷺ کو بڑوں کے ادب و تعظیم کا نہایت خیال رہتا تھا۔ معمولی باتوں پر بھی گرفت کرتے تھے۔ ایک موقع پر جب حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود کے چھوٹے بیٹے نے گفتگو میں سابقت کرنی چاہی تو آپ ﷺ نے فوراً ٹوک دیا:

الکبر الکبر "یعنی پہلے بڑے کو بولنے دو۔ ❸"

اخلاقی احکام

سچ یہ ہے کہ اخلاقی احکام کا تعلق جہاں تک تعلیم محض سے ہے، وہ کوئی ایسی متاع غریب نہیں جس کے پیش کرنے پر اسلام فخر کرے۔ اخلاقی احکام ہمیں ہر جگہ مل سکتے ہیں اور قریباً ہر مذہب نے اپنا مقصد یہی بتلایا ہے کہ انسان کو اخلاق کا وعظ سنائے۔ اگر قرآن حکیم تعلیم دیتا ہے کہ عہد و مواثیق کی پابندی کرو

---

❶ ابو داؤد جلد ۲ ص: ۲۱۸

❷ ابو داؤد جلد ۲ ص:۲۱۱

❸ ابو داؤد جلد ۲ ص ۳۶۰

تو قوانین موسوی اور ضابطہ ناصری بھی یہ نہیں کہتا کہ عہد باندھ کر توڑ ڈالو۔ حتیٰ کہ آریائی نسل کی وہ فلسفیانہ روحانیت بھی جس نے ہندوستان اور ایران میں ظہور کیا، اپنی ہر ادنیٰ سے ادنیٰ شاخ کے اندر اخلاقی تعلیمات واحکام سے لبریز ہے۔

پس اصلی چیز تعلیم نہیں بلکہ تعلیم کے نتائج اور اس کا عمل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو کچھ کہا، اس نے عملی شکل میں کیسی صورت اختیار کی؟ انسان کی رُوح اس لیے بیمار نہیں کہ زبانوں نے تعلیم کم کر دی اور کاغذوں پر زیادہ نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا اصل دُکھ زندگی کی عملی مشکلات میں ہے اور صرف وہی تعلیم فتحمند ہو سکتی ہے، جو ایک مستحکم عملی نمونہ اپنے ساتھ رکھتی ہو۔

عملی حقیقت کے لحاظ سے اوّلین نمونہ حامل قرآن واوّلین داعی اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا ہے:

لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب۔۲۱)

یہاں ہم صرف اسی حیثیت سے اسلامی مواثیق وعہد پر نظر ڈالیں گے۔

جنگ و صلح کی متضاد حالتیں

جنگ و صلح کی متضاد حالتوں میں انسان کا نظام اخلاق دفعتہ بدل جاتا ہے۔ ایک شخص بہ ذاتِ خود نہایت رحم دل ہے لیکن میدان جنگ میں جا کر نہایت بے رحم ہو جاتا ہے۔ ایک شخص ذاتی معاملات میں نہایت حلیم الطبع ہے، لیکن کسی فوج میں شامل ہو کر سخت مشتعل اور مغلوب الغضب ہو جاتا ہے۔ ایک شخص امن و صلح کے زمانے میں نہایت صادق العقول اور پابند عہد ہے، لیکن زمانہ جنگ میں اتنا ہی خراع اور عہد شکن بن جاتا ہے۔ ایک جماعت، ایک قوم، ایک ملک، امن و سکون کے دور میں انسانیت کا بہتر سے بہتر نمونہ ہوتا ہے لیکن جنگی اغراض، طامعانہ اقدامات اور حربی مصالح کے عہد فساد میں آکر چارپایوں سے زیادہ وحشی اور درندوں سے زیادہ خونخوار ہو جاتا ہے۔ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِىۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ ۞ ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِيۡنَ ۞[1] اسی بنا پر بعض حکماء کا قول ہے کہ "سیاست اپنے پہلو میں دل نہیں رکھتی"۔

لیکن دنیا میں صرف "اسلام" ہی ایک ایسی زندہ ہستی ہے جو اپنے پہلو میں دل اور دل میں ایک غیر ممکن التغیر اخلاقی طاقت رکھتی ہے۔ اس پر عوارض خارجیہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا، ظاہر و باطن، شخصیت و جمہوریت، افتراق واجتماع، جنگ و صلح، اس کے لیے تمام حالتیں یکساں ہیں۔ اس کا معیار اخلاق جس طرح امن و صلح کی حالت میں قائم رہا، اسی استحکام واستواری کے ساتھ جنگ کے سیلاب اور آتش وخون کے طوفان میں بھی قائم و ثابت نظر آیا۔

---

[1] بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین حالت عدل پر پیدا کیا، پھر اسے بد سے بدتر حالت میں پھینک دیا۔ (التین: ۴۔۵)

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ

پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی زندگی اعمال انسانیت کی ہر شاخ پر حاوی تھی۔ اس میں حق و صداقت کے آغاز کی غربت و مظلومی بھی تھی اور تمام کی فتح مندی و کامرانی کا جاہ و جلال اور سطوت و جبروت بھی تھا۔ انہوں نے امن و صلح کے ایّام بھی کاٹے اور امن و صلح کے لیے جنگ کی تلوار باندھنے کا حکم بھی دیا۔ اس لیے عہد و میثاق اور ان کے نتائج و عواقب کے واقعات عہد نبوت کی تاریخ میں بے شمار نظر آتے ہیں اور ان کے اندر اخلاق قرآنی کی عملی صورت دیکھی جاسکتی ہے۔

ظالم دشمنوں سے سلوک

سب سے پہلی چیز اس سلسلے میں وہ اخلاقی سلوک ہے جو آنحضرت (ﷺ) نے غیر قوموں اور حریفانِ جنگ سے کیا۔ ان قوموں نے معاہدوں کو اکثر توڑا ہے اور نہایت شرمناک طریقے سے غداریاں کی ہیں۔

رعل، ذکوان، عُصّیہ اور بنولحیان کے قبائل نے آنحضرت ﷺ سے کسی دشمن کے مقابلے کے لیے فوجی مدد کی درخواست کی۔ [1] آنحضرت ﷺ نے قراء صحابہ میں سے ستّر صحابی ساتھ کر دیے لیکن بئر معونہ پر لے جاکر ان لوگوں نے بیوفائی کی اور مسلمانوں کو بے دریغ قتل کر دیا۔

جب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی فوج کو قبیلہ بنولحیان کے دوسو تیر اندازوں نے گھیر لیاتو ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ نیچے اتر آئیں تو کچھ تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اس پر ایک جماعت اتر آئی، لیکن بعض صحابہ کو اسی جگہ قتل کر دیا گیا اور بعض کو غلام بنا کر بیچ ڈالا گیا۔ [2]

ذاتی وفائے عہد

بہ ایں ہمہ غدرو بے وفائی، آنحضرت ﷺ کا جو معیار اخلاق شخصی حالتوں میں تھا، وہی میدانِ جنگ میں بھی قائم رہا۔ شخصی حالت میں آپ ﷺ کے وفائے عہد کا یہ حال تھا:

---

[1] واقعہ یوں ہے کہ قبیلہ کلاب کے رئیس نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ چند لوگ میرے ساتھ کر دیجیے جو میری قوم کو اسلام کی دعوت دیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نجد کی طرف سے مطمئن نہیں۔ رئیس کلاب نے نجد کی طرف سے ذمہ داری اٹھالی اور رسول اللہ ﷺ نے صحابی بھیج دیے۔ رئیس کلاب نے بئر معونہ پہنچ کر غداری کی۔ آس پاس کے قبائل مثلاً رعل، عصیہ، ذکوان کے پاس آدمی دوڑائے کہ تیار ہو کر آؤ۔

[2] یہ واقعہ رجیع ہے جس میں عضل اور قارہ کے قبیلوں نے تعلیم اسلام کی غرض سے چند آدمی طلب کیے تھے اور دس آدمی بھیجے گئے تھے جن کا رئیس حضرت عاصمؓ بن ثابت کو مقرر کیا گیا۔ ان قبیلوں نے بھی غداری کی۔

عن عبد اللہ بن ابی الحمساء قال بایعت النبی ﷺ ببیع قبل ان بعث، و بقیت له بقیة فوعدته ان اٰتیه بها فی مکانه فنسیت فذکرت بعد ثلاث فجئت، فاذا هو فی مکانه، فقال یافتی لقد شققت علیّ انّا هٰهنا منذ ثلاث انتظرك۔ ❶

”عبد اللہ بن حمساء کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ہاتھ ان کے مبعوث ہونے سے پہلے میں نے ایک چیز فروخت کی، جس کا کچھ حصہ آپ ﷺ کے حوالے نہیں کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ آپ ﷺ ٹھہریے۔ میں اسی جگہ لے کے آتا ہوں مگر میں گھر جا کر بُھول گیا اور تین دن کے بعد اپنا وعدہ یاد آیا، پلٹ کے آیا تو دیکھا کہ آپ ﷺ اسی جگہ ہیں۔ آپ ﷺ نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ تم نے مجھے بڑی تکلیف دی۔ میں تین دن سے اسی جگہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

مجاہدین کو وصّیت

جہاد اسلامی کی وسعت نے آپ ﷺ کی اخلاقی طاقت کو اور بھی مستحکم و استوار کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ جب مجاہدین جہاد کے لیے روانہ ہوتے تو آپ ﷺ ان کو مخاطب کر کے ایک عام وصّیت فرماتے جو متعدد اخلاقی ہدایات کا مجموعہ ہوتی تھی۔ انھی ہدایات میں ایک حکم پابندی عہد کا بھی تھا:

کان رسول اللہ ﷺ اذا امّر امیرا علی جیش اوسریة اوصاه خاصة بتقوی اللہ عزوجل و من معه من المسلمین خیرا، ثم قال اغزوا باسم اللہ فی سبیل اللہ۔ قاتلوا من کفرَ باللہ اغزوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیدا۔ ❷

”آنحضرت ﷺ جب کسی شخص کو کسی فوج کا سپہ سالار مقرر فرماتے اسے خدا سے ڈرنے اور مسلمانوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت کرتے۔ پھر فرماتے کہ خدا کی راہ میں خدا کا نام لے کر لڑو! جن لوگوں نے خدا کا انکار کیا ہے ان سے جہاد کرو لیکن مال غنیمت میں کسی قسم کی خیانت نہ کرنا، عہد کی پابندی کرو، بیوفائی نہ کرو، کسی کے ہاتھ، پاؤں، کان، ناک نہ کاٹو! بچوں کو قتل نہ کرو۔“

مجاہدین عموماً ان احکام پر عمل کرتے تھے اور یہی اخلاقی ہدایت تھی جو ان کو ہر قسم کے بے اعتدالانہ جنگی افعال سے روکتی تھی۔

حضرت خُبیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ

لیکن ان ہدایات میں پابندی عہد پر مسلمانوں نے جس شدت کے ساتھ عمل کیا، اس کی نظیر دنیا کی

---

❶ (ابو داؤد جلد: ۲ صفحہ: ۳۲۶ کتاب الادب)

❷ (صحیح مسلم جلد: ۲ ص: ۶۲ کتاب الجهاد)

اخلاقی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ حضرت خُبَیب رضی اللہ عنہ اور ابن دثنہ کو قبیلہ بنی لحیان نے امان دے کر پہاڑ سے اتروایا،[1] پھر بد عہدی کی اور انہیں غلام بنا کر بیچ ڈالا، عام طور پر جب نقض عہد میں ایک فریق کی طرف سے پیش قدمی کی جاتی ہے تو دوسرا فریق ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور تمام معاہدوں کو توڑ سکتا ہے۔ اس لیے خُبیب رضی اللہ عنہ اگر اس وقت ان ہدایات کی پابندی نہ کرتے تو وہ معذور سمجھے جا سکتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام جبری احکام نہیں ہوتے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی اثر ان کو مجاہدین کے رگ وپے میں ساری کر دیتا تھا۔ جب خُبیب رضی اللہ عنہ کو حارث بن عامر نے خرید لیا اور حرم کے باہر قتل کرنا چاہا تو انہوں نے حارث کی لڑکی سے استرا طلب کیا۔

لڑکی نے استرا ان کے ہاتھ میں دینا چاہا تو حضرت خُبَیب رضی اللہ عنہ نے اسے گود میں بٹھالیا۔ اتفاقیہ بچی کی ماں آگئی ڈری کہ جو شخص جان سے ہاتھ دھو چکا ہے اسے کسی کی جان پر حملہ کرنے میں کیا تامل ہو سکتا ہے؟ حضرت خُبیب رضی اللہ عنہ جان سے ہاتھ دھو چکے تھے اور ہاتھ میں ایک ہتھیار (استرا) بھی تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کے قتل نہ کرنے کا جو عہد ان سے لے لیا تھا، وہ انہیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھا چنانچہ ماں کی سراسیمگی دیکھ کر اس سے کہا: کیا تم کو ڈر ہے کہ میں اس بچی کو قتل کر دوں گا! نہیں، تم ایسا نہ سمجھو۔ میں ایک بچے کا خون اپنی گردن پر نہیں لے سکتا۔[2]

ان اخلاقی احکام سے زیادہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو پابندی عہد کی تعلیم دی تھی۔ یہود خیبر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دے دیا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قسم کا انتقام نہ لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہودیوں نے جادو کیا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدے کی بنا پر انہیں معاف کر دیا۔

حُدیبیہ کے بعد کا ایک واقعہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کفارِ مکہ سے بمقام حُدیبیہ صلح کر لی تو صلح کے بعد مسلمانوں اور کافروں میں باہم میل جول ہو گیا۔ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہما کا بیان ہے:

میں اس حالت اطمینان میں ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ گیا۔ اتفاق سے میرے پاس چار مشرک آگئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مذمت کرنے لگے۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو نہ سن سکا اور اٹھ کر دوسرے درخت کے سایے میں چلا گیا۔ وہ سب درخت کی شاخ میں ہتھیار لٹکا کر لیٹ گئے، اس حالت میں دفعتہً غل ہوا کہ ابن زنیم قتل کر دیا گیا۔ میں نے تلوار میان سے کھینچ لی اور انھی چاروں پر حالتِ خواب میں حملہ کیا

---

[1] یہ واقعہ رجیع کا ایک حصہ ہے۔ رجیع عسفان اور مکہ مکرمہ کے وسط میں ایک مقام ہے۔

[2] بخاری جزو: ۵

پہلے ان کے ہتھیاروں پر اچھی طرح قبضہ کر لیا پھر ان سے کہا کہ اس ذات کی قسم جس نے محمد ﷺ کو برگزیدہ کیا ہے تم میں سے جو شخص سر اٹھائے گا اس کی گردن اڑادوں گا۔ پھر ایک طرف سے میں ان چاروں کو اور دوسری طرف سے میرے چچا عامر ایک دوسرے کافر کو جس کا نام مِکرز تھا، گھسیٹتے ہُوئے آنحضرت ﷺ کے پاس لائے، لیکن آنحضرت ﷺ نے انہیں بالکل معاف کر دیا اور فرمایا: انہیں چھوڑدو، برائی کی ابتدا انہی کی طرف سے ہونی چاہیئے۔ ❶

اگر آنحضرت ﷺ انہیں قتل کر دیتے تو در حقیقت اس بدعہدی کے ذمہ دار خود وہی لوگ ہوتے، لیکن آپ ﷺ نے نقضِ عہد کی اس ظاہری شکل کو بھی گوارا نہ کیا، جو ان کے اقدام قتل سے پیدا ہوتی تھی۔

احکام شریعت کے تین درجے

اسلام نے احکامِ شریعت کے تین درجے قرار دیے ہیں:

الحلال بیّنٌ والحرام بیّنٌ وما بینھما مشتبھات۔ (الحدیث)

”حلال بھی کھلا ہُوا ہے اور حرام بھی، البتہ ان کے درمیان چند مراتب ایسے ہیں جو حلت و حرمت دونوں کا احتمال رکھتے ہیں۔“

یہی مشتبہات در حقیقت زہد و تقویٰ کی آزمایش ہیں۔ ایک خداترس شخص ایک کھلی ہوئی نیکی پر عمل کر سکتا ہے، ایک فریبی دکھلاوے کے لیے کسی صریح برائی سے اجتناب کر سکتا ہے، لیکن نیتوں کا کھوٹ وہاں نہیں چھپ سکتا جہاں حلال و حرام کے نہایت نازک درمیانی مقامات ہیں۔ تمام حِیَل شرعی انھی کے محور پر گردش کرتے ہیں۔

ذاتی انتقام کبھی نہ لیا

آنحضرت ﷺ زہر دینے والے اور سحر کرنے والے یہودیوں کو قتل کر سکتے تھے۔ آپ ﷺ ان کفار سے بھی انتقام لے سکتے تھے جنھوں نے صُلح حُدیبیہ کے بعد ہجو و غیبت بلکہ کُشت و خون کی طرف قدم بڑھایا۔ بہ ایں ہمہ آپ ﷺ نے انہیں معاف کر دیا، کیونکہ ان بدعہدیوں پر اشتباہ کے متعدد پردے پڑے ہوئے تھے۔ ان سے ذاتی انتقام کی بُو آتی تھی اور خلق عظیم کے تمام ابوابِ اخلاق میں سب سے زیادہ نمایاں باب یہ ہے کہ:

لم ینتقم لنفسہ۔ (صحیحین) ”آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلا نہ لیا۔“

---

❶ صحیح مسلم جلد:۲

ایسا کرنے سے اگرچہ حقیقی طور پر نقض عہد نہیں ہو سکتا تھا، تاہم بظاہر نقض عہد کا شبہ پیدا ہو سکتا تھا۔ اسلام اپنے دامن پر اس قسم کا ظاہری دھبہ بھی نہیں دیکھ سکتا!

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اتباع

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے بھی پابندی عہد کا ایک بلند تر معیار قائم کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے زمانے میں ہمیشہ اسے قائم رکھا۔

عہد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں جب کبھی نقض عہد کا ظاہری احتمال بھی پیدا ہوا تو لوگوں نے علانیہ اس کا انکار کیا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومیوں سے ایک مدت کے لیے معاہدہ صلح کر لیا تھا۔ وہ اگرچہ نقض عہد کرنا نہیں چاہتے تھے، تاہم انہوں نے زمانہ صلح ہی میں رومیوں سے لڑنے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں اور فوج لے کر ان کی طرف بڑھے کہ مدت صلح گزر جانے کے ساتھ ہی جنگ شروع کر دیں گے۔ اسی حالت سفر میں ایک شخص گھوڑا دوڑاتا ہوا پہنچا اور کہا: اللہ اکبر! اللہ اکبر! کیا یہ بد عہدی تمہارے شایان شان ہے؟ تم کو وفائے عہد کرنا چاہیے۔ لوگوں نے تعجب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ عمر رضی اللہ عنہ بن عنبسہ ہیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی تو بلا بھیجا اور ان سے گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

من کان بینه و بین قوم عهد فلا یشدّ عقدة ولا یحلها حتّٰی ینقضی احدها او ینبذ الیهم علٰی سواء۔

”اگر کوئی شخص کسی قوم سے معاہدہ کرے تو اس معاہدے کی گرہ نہ باندھے اور نہ کھولے (یعنی اس سے کسی قسم کا تعرض نہ کرے اور اسے اپنے حال پر قائم رہنے دے، یہاں تک کہ معاہدہ صلح کی پوری مدت گزر جائے یا باہمی معاہدہ کے توڑنے کا عام اعلان کر دیا جائے۔“

چنانچہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ راستے ہی سے لوٹ آئے (ابوداؤد)

پابندی عہد کا کمال

سلطنتوں میں باہم معاہدے ہوتے ہیں اور وہ قائم بھی رکھے جاتے ہیں، لیکن کوئی سلطنت اپنے معمولی مقاصد کی کامیابی کو بھی عہد وفا کی اخلاقی پابندی پر قربان نہیں کر سکی۔ یورپ کا موجودہ اخلاق اس کے لیے کافی شہادت ہے۔ اٹلی نے اپنے عالم آشکار عہد کو چند لمحوں کے اندر فراموش کر دیا[1] اور جرمنی پیرس کی طرف بڑھنے کو اس قدر ضروری سمجھتا ہے کہ اس کے سامنے بیلجیم کی ناطرفداری کوئی شے نہیں۔[1] اسلام کا مقصد پیرس کے قلعوں کی برجیوں سے زیادہ بلند تھا، لیکن اس نے پابندی عہد پر اپنے عظیم

---

[1] مطلب یہ کہ اٹلی کا معاہدہ جرمنی اور آسٹریا سے تھا مگر پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء ۱۹۱۸ء) میں وہ اپنے حلیفوں کو چھوڑ کر برطانیہ و فرانس سے مل گیا۔

[1] پہلی عالمی جنگ میں فرانس پر حملے کے لیے جرمنی کو بیلجیم میں سے گزرنا مناسب معلوم ہوا اور اس نے بیلجیم کی غیر

الشان مقصد کو بارہا قربان کر دیا ہے۔ اسلام کا مقصد حقیقی اشاعت حق تھا، اسی کے لیے وہ لڑتا تھا، اسی کے لیے صلح کرتا تھا، اسی کے لیے معاہدہ کرتا تھا، یہ مقصد کبھی کبھی بغیر کسی قسم کی جدوجہد کے بھی حاصل ہو جاتا تھا اور تلوار کی جگہ صرف داعی اسلام کی روحانی طاقت ہی اس میدان کو فتح کر لیتی تھی، لیکن آنحضرت ﷺ نے ایسے اعلیٰ مقصد کو بھی، جو نہایت آسانی سے حاصل ہو سکتا تھا، معاہدے کی اخلاقی پابندی پر ترجیح نہ دی۔ قریش نے ایک شخص کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں قاصد بنا کر بھیجا۔ وہ آپ ﷺ کی صورت مبارک دیکھتے ہی اسلام کی طرف مائل ہو گیا اور بے اختیار پکار اٹھا "اب اس چوکھٹ کو چھوڑ کر قیامت تک نہ جاؤں گا" لیکن چونکہ قاصدوں کے ساتھ کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جاتا اور ان کے ساتھ ایک خاص معاہدے کی پابندی لازمی ہے اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: میں عہد شکنی نہیں کر سکتا۔ تم سر دست تو واپس جاؤ۔ اگر تمہارے دل میں اسلام کی محبت ہے تو پھر واپس آ سکتے ہو۔ وہ پیغام لے کر گیا، پھر پلٹ کر آیا اور اسلام لایا۔ (ابو داؤد)

صلح حدیبیہ

مشرکین نے صلح حدیبیہ میں جو شرطیں پیش کی تھیں، ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ "کفار مکہ میں سے جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ بھاگ جائے گا، اسے مسلمان واپس کر دیں گے۔" اس شرط پر باہم سخت اختلاف ہُوا۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا کہ ایک مسلمان کو کیونکر کفار کے حوالے کیا جا سکتا ہے؟ ابھی اس شرط کا کوئی فیصلہ نہیں ہُوا تھا کہ ابو جَندل رضی اللہ عنہ ابن سہیل بیڑیاں گھسیٹتے ہوئے مکہ تک پہنچے اور اپنے آپ کو مسلمانوں کے پاؤں پر ڈال دیا۔ ابو جَندل رضی اللہ عنہ کا باپ سہیل تھا اور وہی اس وقت قریش کی طرف سے معاہدے کے لیے آیا تھا۔ سہیل نے کہا کہ میں اپنے بیٹے کی واپسی پر صلح کروں گا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابھی تک معاہدہ صلح مکمل نہیں ہُوا۔ اس لیے اس کی پابندی ہمارے لیے ضروری نہیں، مگر اس نے کہا کہ اس کے سوا کسی دوسری بات پر صلح ناممکن ہے۔ آپ ﷺ نے مکرر اصرار کیا کہ کم از کم ابو جندل رضی اللہ عنہ کو تو اس شرط سے مستثنیٰ کر دو، مگر سُہیل نے صاف انکار کر دیا۔ ابو جندل رضی اللہ عنہ نے تمام مسلمانوں سے نہایت درد انگیز لہجے میں کہا کہ "مسلمانو! میں مسلمان ہو کر آیا ہوں۔ کیا اب پھر مشرکین کی طرف واپس کیا جاؤں گا؟ ان الفاظ نے صحابہ کے مذہبی جذبات میں آگ لگا دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے اختیار انہ اٹھ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ کیا آپ پیغمبر خدا اور آپ کے ساتھی برسرِ حق نہیں؟ آپ ﷺ نے

جانبداری کی کوئی پروانہ کی۔ دوسری عالمی جنگ میں بھی جرمنی نے بیلجیم، ڈنمارک، ہالینڈ کی غیر جانبداری کو خس برابر بھی وقعت نہ دی۔ اتحادیوں کو ایران کے راستے روس سامان بھیجنا مناسب نظر آیا تو ایران کی غیر جانبداری ان کے لیے سدّ راہ نہ ہوئی۔

فرمایا کہ بے شک حق پر ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر ہم کیوں اس قدر دب رہے ہیں اور ذلت گوارا کر رہے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اللہ کا حکم ایسا ہی ہے۔

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس سوال و جواب سے تسکین نہ ہُوئی اور انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی قسم کی گفتگو کی۔ تاہم کچھ نتیجہ نہ نکلا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی تمام شرطیں منظور کر کے صلح نامہ مرتب کر دیا اور دستخط ہو گئے۔

ابُو بَصیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کو روانہ ہُوئے تو ساتھ ساتھ ابو بَصیر [1] بھی مسلمان ہو کر مکہ سے نکل آئے۔ قریش نے انکی جستجو میں دو آدمی بھیجے اور شرائط صلح یاد دلائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو واپس کر دیا۔ وہ ان کو لے کر چلے تو مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر کھجوریں نکالیں اور کھانے پینے میں مشغول ہوئے۔ ابو بَصِیر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر بلطائف الحِیل ان کے پھندے سے نکلنا چاہا۔ وہ کھجور کھانے میں مصروف تھے۔ ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کی تلوار کی طرف دیکھ کر کہا: کتنی اچھی تلوار ہے۔ اس نے داد پا کر تلوار کھینچ لی اور کہا بے شبہ، میں اس کا بارہا تجربہ کر چکا ہوں۔ ابو بَصِیر رضی اللہ عنہ نے ہاتھ بڑھا کر دیکھنے کے بہانے لے لی اور سب سے پہلے اسی شخص کی گردن قلم کر دی۔ دوسرا شخص یہ حالت دیکھ کر بھاگا اور دوڑتا ہُوا مدینہ پہنچا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پیشانی دیکھی تو فرمایا: اس پر کوئی مصیبت آگئی ہے۔ اس نے کہا: میرا ساتھی تو قتل کر دیا گیا ہے اور میں بھی قتل کے قریب پہنچ گیا تھا۔"

ایک جمیعۃ کی فراہمی

اسی حالت میں ابو بَصِیر رضی اللہ عنہ بھی پہنچے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا عہد پورا کر کے مجھے واپس کر دیا۔ اب خدا نے مجھے نجات دی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ذمہ دار نہیں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ شخص تو لڑائی کا شعلہ معلوم ہوتا ہے۔" ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ مجھے واپس کر دیں گے۔ چنانچہ وہ مدینہ سے بھاگ کر سمندر کے کنارے مقیم ہو گئے۔ ابو جندل رضی اللہ عنہ کو خبر ہُوئی تو وہ بھی ان سے جا ملے، یہاں تک کہ قریش کا جو شخص مسلمان ہوتا تھا وہ بھاگ کر ابو بصیر رضی اللہ عنہ کے دامن میں پناہ لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے ایک اچھی خاصی جمیعۃ قائم کر لی اور قریش کے کاروان تجارت کو جو شام کی طرف جاتا تھا، عام طور پر لوٹنا شروع کر دیا۔ بالآخر

---

[1] ان کا نام عتبہ بن اَسید تھا۔

قریش نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی اور آنحضرت ﷺ نے ابو بصیر رضی اللہ عنہ وغیرہ کو بلا لیا۔ (بخاری)

جنگ میں بھی عہد کی پابندی

عموماً زمانہ جنگ میں معاہدوں کی پابندی نہیں کی جاتی اور اشخاص کے باہمی معاہدے تو صلح کی حالت میں بھی کوئی جمہوری وقعت نہیں رکھتے، لیکن اسلام کی جمہوریت اور شخصیت دونوں ایک ہی روحانی طاقت کے تابع تھیں۔ اس لیے زمانہ جنگ میں اشخاص کے مجبورانہ معاہدوں کو بھی نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رکھا جاتا تھا۔ حذیفہ بن یمان کا بیان ہے کہ "میں غزوہ بدر میں صرف اس لیے نہیں شریک ہو سکا کہ میں اور ابو جندل رضی اللہ عنہ ساتھ چلے تو کفار قریش نے ہمیں گرفتار کر لیا اور کہا کہ تم محمد ﷺ کے پاس جاتے ہو۔ ہم دونوں نے کہا کہ نہیں، ہم صرف مدینہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے عدم شرکت جہاد کا معاہدہ لے کر ہمیں چھوڑ دیا۔ ہم آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شریک جہاد ہونا چاہا لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ مدینہ کو واپس جاؤ، ہم کفار کے معاہدوں کو پورا کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں صرف خدا سے مدد چاہتے ہیں۔ [1]

فراخ دلی اور فیاضی

ایفائے عہد کے متعلق سب سے بڑی بحث یہ ہے کہ کس کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہیے اور کس کے ساتھ قائم رکھنا چاہیے؟ یونان کے مقنن اعظم سولن نے اس کا نہایت مختصر جواب دیا ہے اور وہی تمام دنیا کے سیاسیات کی روح ہے یعنی "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے، جو اپنے سے کمزور کو تو اُلجھا لیتا ہے اور اپنے سے قوی کے مقابلے میں ٹوٹ جاتا ہے۔" لیکن اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے، جس کے اخلاقی معاہدوں نے سولن کے اس تار عنکبوت کو توڑ دیا۔ اسلام ضعیفوں کے ساتھ فیاضانہ معاہدہ کرتا ہے اور اسے نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رکھتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے کفار قریش سے بہ مقام حدیبیہ جو صلح کی تھی، وہ بظاہر نہایت عاجزانہ و مجبورانہ صلح معلوم ہوتی ہے۔ خود صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کا احساس کیا تھا اور آپ ﷺ نے بھی نہایت صراحت کے ساتھ فرما دیا تھا:

لا یسالون خطة یعظمون فیها حرمات الله الا اعطیتهم۔

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۸۹

"میرے سامنے وہ جو شرط پیش کریں گے میں اسے قبول کرلوں گا، بشرطیکہ اس سے شعائر الٰہی کی توہین نہ ہو۔ ❶"

چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے گوہر مقصود یعنی ان مسلمانوں کو جو نورِ ایمان سے لبریز ہو کر آتے تھے، واپس کرنے کا عہد کرلیا۔ آنحضرت ﷺ نے صلح نامہ پر "بسم اللہ" لکھنا چاہا۔ کفار نے اس سے انکار کیا، لیکن آپ ﷺ نے باوجود صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اصرار کے کفار کی خواہش پوری کردی اور "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کی جگہ "باسمك اللھم" لکھا۔ آپ ﷺ نے اپنے نام کے ساتھ "رسول اللہ" لکھنا چاہا۔ کفار نے کہا: اگر ہم آپ ﷺ کو رسول اللہ مانتے تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا؟ صرف محمد بن عبداللہ لکھیے۔ "معاہدہ پر رسول اللہ کا لفظ لکھا جاچکا تھا لیکن آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ "اسے مٹادو" ان کے جوش ایمان نے اسے گوارا نہ کیا تو آپ ﷺ نے خود مٹادیا۔

اس سے زیادہ کمزوری اور کیا ہوسکتی ہے؟ لیکن کیا درحقیقت آپ ﷺ مجبور تھے؟ کیا قریش کی عظیم الشان طاقت نے آپ ﷺ کو بالکل بے دست وپا کردیا تھا؟

صلح وامن

تمام سلطنتیں نقض عہد کے لیے ضعف کا بہانہ ڈھونڈتی ہیں اور صلح تو ہمیشہ قوی ہی کے ساتھ کی جاتی ہے، لیکن اسلام کی امن پسندی نے ایک نہایت ضعیف گروہ کے مقابلے میں یہ فیاضانہ صلح کی اور اسے نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رکھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خود فرمایا:

انا لم تجئ لقتال احد ولکنّا جئنا معتمرین وان قریشاً قد تھلکھم الحرب واخرت بھم فان شاؤ اشاورتھم مدۃ۔

"ہم کسی سے لڑنے بھڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں صرف عمرہ کے لیے آئے ہیں۔ قریش کو متواتر لڑائیوں نے چور چور کردیا ہے اور ان کی طاقت کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ بہ ایں ہمہ وہ چاہیں تو ہم ایک مدت کے لیے ان سے صلح کرسکتے ہیں۔"

دنیوی سلطنتوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ اس بہترین موقع سے کیا کام لیتیں؟ انعقاد صلح کا یا اشتعال جنگ کا؟ دنیا کی قدیم وجدید تاریخ اس کا نہایت آسانی کے ساتھ جواب دے سکتی ہے۔ اگر اس حالت میں کوئی سلطنت صلح بھی کرتی تو اس کا نتیجہ جنگ سے زیادہ درد انگریز ہوتا۔

---

❶ حقیقت یہ ہے کہ قریش لڑائیوں کے ذمہ دار تھے جو اسلام کو بہ جبر و قوت مٹانے کے درپے تھے۔ صلح حدیبیہ میں وہ جنگ سے دستبردار ہورہے تھے۔ یہ اسلام کے لیے فتح مبین تھی۔ لہٰذا اس بنیادی اور اساسی فتح کے سلسلے میں ہر شرط قبول کی جاسکتی تھی۔ البتہ شعائر الٰہی کی حرمت کا لحاظ لازم تھا۔

اہل نجران سے معاہدہ

لیکن یہ جزئی طرز عمل صرف اختلافی حیثیت رکھتا تھا۔ اسلام کی وسعت ایک مستقل اور جامع ہدایت کی محتاج تھی، جو اس اخلاقی طرز عمل کے ساتھ اپنے اندر ایک قانونی طاقت بھی رکھتی تھی اور جب پچھلوں کی اخلاقی طاقت آنحضرت ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو بھلا دیتی تو وہ اپنی جزئی طاقت سے اس کو یاد دلاتی۔ آنحضرت ﷺ نے غیر قوموں کے ساتھ جو تحریری معاہدے کیے ہیں وہ بالکل قانونی اور سیاسی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس باب میں اسلام کا قانون کس قدر فیاضانہ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے بخران کے عیسائیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا، اس کے الفاظ یہ ہیں:

علی اهل نجران الفی حلة النصف فی صفر والنصف فی رجب یردونها الی المسلمین وعاریة ثلاثین درعا و ثلاثین بعیرا و ثلثین من کل صنف من اصناف السلاح یغزون بها و المسلمون ضامنون لها حتی یردوها علیهم ان کان بالیمن کید ذات غدر علی ان لا تهدم لهم بیعه ولا یخرج لهم قس ولا یفتنوعن دینهم۔ (ابو داؤد جلد: ۲ ص:۷۵)

"اہل بخران کو دو ہزار حلے باقساط دینا پڑیں گے۔ ایک ہزار ماہ صفر میں اور ایک ہزار ماہِ رجب میں اور ان کو تیس زرہیں، تیس گھوڑے، تیس اونٹ اور ہر قسم کے ہتھیار بطور عاریت کے بھی دینے ہوں گے۔ اگر یمن میں کوئی جنگ ہو گی تو وہ لوگ ان چیزوں کو واپس کر دیں گے اور اس معاہدہ کی بنا پر نہ تو ان کے گرجے گرائے جائیں گے، نہ ان کے کسی پادری کو جلاوطن کیا جائے گا اور نہ ان کے مذہب سے کوئی تعرض ہو گا۔"

اخلاقی نصائح

لیکن اسلام کا ہر قانون اپنے اندر اخلاقی رُوح بھی رکھتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اخلاقی نصائح سے اس کو اور بھی موثر بنا دیا:

الا من ظلم معاهدا او انتقصه او کلفه فوق طاقتة او اخذ منه شیئا بغیر طیب نفس فانا حجیجته یوم القیامة۔ (ابو داؤد جلد:۲ ص: ۷۷)

"خبر دار، اگر کسی نے کسی غیر مذہب رعیت پر ظلم کیا، یا اس کی تنقیص کی یا اس کی کوئی چیز بہ جبر لے لی۔ اگر ایسا ہوا تو میں اس کی طرف سے قیامت کے دن خدا کے سامنے جھگڑوں گا۔"

ایک قبطی کا واقعہ

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آنحضرت ﷺ کے بعد اس فیاضانہ طرز عمل کو نہایت بے تعصبی کے ساتھ قائم رکھا چنانچہ ہشام ابن حکیم نے حمص کے عامل کو دیکھا کہ قبطیوں کو دھوپ میں بٹھا کر جزیہ وصول کر رہا

ہے۔ انہوں نے اسی وقت آنحضرت ﷺ کی یہ اخلاقی نصیحت یاد دلائی۔

ان اللہ یعذب الذین یعذبون الناس فی الدّنیا۔

"خدا قیامت میں ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں انسانوں کو دُکھ پہنچاتے ہیں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیّت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت اسی اخلاقی قانون کی تجدید کی تھی:

واوصیت بذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ ﷺ ان یوفی لھم لعھدھم وان یقاتل من ورائھم ولا یکلّفوا الا طاقتھم۔ (بخاری جزو: ۴ ص: ۶۹)

"میرے بعد جو خلیفہ ہو گا میں اس کو خدا اور خدا کے رسول ﷺ کے معاہدے کی حفاظت کے لیے وصیت کرتا ہوں، وہ وصیت یہ ہے کہ غیر مذہب رعایا سے جو معاہدہ کیا جائے وہ پورا کیا جائے۔ ان کی جان ومال کی حفاظت کے لیے لڑائی کی جائے اور ان پر اتنا ہی بوجھ ڈالا جائے جس کے وہ متحمل ہوں۔"

فاتح اور پیغمبر کا فرق

جہاد اسلامی کی حقیقت جن مقاصد پر مشتمل ہے، اس کے لحاظ سے وہ دنیوی لڑائیوں سے بالکل مختلف ہے اور یہ اختلاف اس قدر بدیہی ہے کہ ہم کو اس کی ظاہری شکل کے ایک ایک خط وخال کے اندر نمایاں طور پر نظر آسکتا ہے۔

ایک فاتح جب ملک گیری کے ارادہ سے میدان جنگ کا رخ کرتا ہے تو طبل و دہل کے غلغلے اور قرناء دبوق کے ترانے خیر مقدم بجالاتے ہیں، سر پر پرچم لہراتا ہے۔ چتر شاہی آفتاب کی شعاعوں کو بھی اس کی طرف نگاہِ گرم سے دیکھنے نہیں دیتا۔ جاہ وجلال کا یہ دیوتا میدان جنگ میں ایک مجسمہ کی طرح کھڑا کر دیا جاتا ہے اور تمام فوج اسی مرصّع بت کے گرد طواف کرنے لگتی ہے۔ عظمت وجبروت کا یہ منظر دنیا کو دفعتہ مرعوب کر دیتا ہے اور اس رعب وداب کے احساس سے اس دنیوی فتح کا سر بادئہ کبر ونخوت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خاک وخون میں مل کر بھی یہ نشہ نہیں اترتا۔ اگر کوئی اس سر پر غرور کو ٹھکرا دیتا ہے تو اس سے مغرورانہ صدا بلند ہوتی ہے۔

پیغمبر کا سفر

لیکن ایک پیغمبر کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ گھر سے جب نکلتا ہے تو اگرچہ مخلصین و مومنین کی ایک جماعت اس کے ساتھ ہوتی ہے لیکن وہ اپنا رفیق سفر صرف خدا کو بناتا ہے:

كان رسول الله ﷺ اذا سافر قال اللهم انت الصاحب فی السفر و الخليفة فی الاهل ! اللهم إنی اعوذبك من وعثاء السفر وكابة المنقلب و سؤ المنظر فی الاهل والمال اللهم اطولنا الارض وهون علينا السفر !

"آنحضرت ﷺ جب بغرض جہاد روانہ ہوتے تھے تو یہ دعا کرتے تھے، خدایا! توہی ہمارا رفیق سفر ہے، توہی ہمارے بال بچوں میں ہمارا قائم مقام ہے۔ خدایا! سفر کے شدائد اور پلٹ کر اہل و عیال کو بُرے حال میں دیکھنے کی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں۔ خدایا مسافت سفر کو کم کردے اور ہمارے لیے آسان بنادے۔"

سواری

وہ سواری کی پشت پر قدم رکھتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ﴿۱۳﴾ (الزخرف:۱۳)

"کیا پاک و برتر ہے وُہ خدا جس نے اس سواری کو ہمارا فرمانبردار بنادیا ورنہ ہم اس کی قدرت نہیں رکھتے تھے"

سفر سے واپسی

وُہ سفر سے پلٹتا ہے تو راہ میں خدا کی حمد کا ترانہ گاتا ہوا چلتا ہے:

آئبون تائبون عابدون لِرَبِّنا حامدون! [1]

"ہم لوٹ کر آنے والے ہیں۔ ہم توبہ کرنے والے ہیں ہم خدا کے عبادت گزار بندے ہیں اور ہم اپنے رب کی حمد ثنا کرتے ہیں۔"

پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھتا ہے تو غلغلۂ تکبیر بلند کرتا ہے، نیچے اترتا ہے تو ترنم ریز تسبیح و تہلیل ہوتا ہے۔

---

[1] یہ بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگ یا حج یا عمرہ سے لوٹتے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہہ کر فرماتے:
لاالٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریك لہٗ لہُ الملك ولہُ الحمد و ھو علیٰ کل شیٔ قدیر، آئبون، تائبون، عابدون، ساجدون، لربنا حامدون صدق اللہ وعدہٗ و نصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ۔
"خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی اس کا شریک نہیں۔ ملک اسی کا ہے، ستایش اسی کے لیے ہے اور وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے ہم لوٹ کر آنیوالے ہیں، تائب ہیں، عبادت گزار ہیں۔ اپنے پروردگار کی حمد کرتے ہیں اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اپنے بندے کی مدد کی اور اکیلے ہی تمام احزاب یعنی گروہوں اور لشکروں کو شکست دی۔ (کتاب المغازی، باب غزوہ احزاب)

فوج کی روانگی

فوج کو روانہ کرتا ہے تو اسے نہ غرور وطاقت کی یاد دلاتا ہے، نہ اس کے جوش کو دو آتشہ کرتا ہے، نہ قدیم کارنامہ ہائے شجاعت کا تذکرہ کرکے اس کے دل کو گرماتا ہے، بلکہ اس کے دین کو، اس کی امانت کو، اس کے تمام نتائج اعمال کو خدا کے سپرد کرکے رخصت کردیتا ہے:

استودع اللہ دینکم و امانتکم و خواتیم اعمالکم۔

"میں تمہارے دین، تمہاری امانت اور تمہارے نتائج اعمال کو خدا کے سپرد کرکے تمہیں خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے بھیجتا ہوں۔"

منزل پر نزول

وہ منزل پر اترتا ہے تو نہ سلاطین کی طرح اس کے لیے خیمے قائم کیے جاتے ہیں، نہ فرش وبساط شاہانہ سے زمین آراستہ ہوتی ہے اور نہ میدان کا نشیب و فراز ہموار کیا جاتا ہے۔ وہ خدا کا نام لے کر فرش خاک پر لیٹ جاتا ہے اور اس نام کی عظمت کے سہارے پر زمین ہی کو اپنی حفاظت کی خدمت سُپرد کردیتا ہے:

یا ارض ربّی و ربک اللہ اعوذ باللہ من شرك و شرِ ما فیك و من شرّ ما یدبّ علیك۔

"اے زمین! میرا اور تیرا، دونوں کا خدا ایک ہی ہے۔ میں تیرے شر سے، تیری سطح باطنی کے شر سے اور تجھ پر چلنے والوں کے شر سے، پناہ مانگتا ہوں۔"

جہاد سے مراجعت

وہ سفر جہاد سے پلٹ کر گھر پہنچتا ہے تو سب سے پہلے اسے خدا کا گھر یاد آتا ہے اور مسجد میں جاکر دو رکعت نماز ادا کرتا ہے، جب اسے فتح و ظفر کی خبر ملتی ہے تو نہ تو اس کے سامنے شادیانے بجائے جاتے ہیں، نہ جشن شاہانہ کی تیاریاں کی جاتی ہیں، نہ عیش و طرب کے گانے گائے جاتے ہیں۔ وہ صرف اپنے خدا کے آگے سر بہ سجود ہو جاتا ہے اور سجدۂ شکر بجالاتا ہے۔ اسے جب مشیت ایزدی سے شکست ہوتی ہے تو وہ فوج کو بالکل جوش و غیرت نہیں دلاتا، بلکہ خدا ہی کی غیرت کی سلسلہ جنبائی کرتا ہے کیونکہ وُہ اپنی فوج کو خدا کی فوج یقین کرتا ہے:

کان یقول یوم احد: اللّٰھمّ انّك ان تشاء لا تعبد فی الارض۔

"آپ ﷺ معرکہ احد کے دن کہتے تھے: خدایا کیا تو چاہتا ہے کہ اب زمین میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو؟"

میدانِ جنگ میں خدا سے التجا

وہ اپنی فوج کی قلت اور دشمن کے لشکر کی کثرت دیکھتا ہے تو صرف رحمت آسمانی ہی سے مدد طلب کرتا ہے اور کسی دنیوی طاقت کے آگے دستِ سوال نہیں پھیلاتا:

لما کان یوم بدر نظر رسول اللہ ﷺ الی المشرکین وھم الف و اصحابہ ثلاثماۃ وتسعۃ عشر رجلا، فاستقبل القبلۃ ثمّ مدّیدیہ فجعل یھتف بربہ، اللھم انجزلی ماوعدتنی، اللھم اٰت ماوعدتنی اللّٰھمّ ان تھلک ھٰذہ العصابۃ من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض۔ فما زال یھتف بربّہ مادأ یدیہ مستقبل القبلۃحتی سقط رداءہ عن منکبیہ فاتاہ ابوبکر فاخذ رداءہ فالقاہ علی منکبیہ، ثم التزمہ من ورائہ وقال یانبی اللہ! کفاك منا شدتك ربّك فانہٗ سینجزلك ما وعدك۔ (مسلم)

"بدر کے دن جب آنحضرت ﷺ نے مشرکین کی طرف دیکھا اور آپ ﷺ کو نظر آیا کہ ان کی جمعیت ایک ہزار کی ہے اور مسلمان صرف تین سو انیس ہیں تو آپ ﷺ قبلہ کی طرف متوجہ ہوگئے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر خدا کو پکارنا شروع کیا: خدایا تو نے مجھ سے فتح و ظفر کا جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کر! خدایا اگر مسلمانوں کا یہ مختصر سا گروہ فنا ہو گیا تو تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ وہ اسی طرح ہاتھ پھیلا کر متصل پکارتے رہے، یہاں تک کہ جوشِ استغراق میں دوش مبارک سے چادر گر گئی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے اس تضرع والحاح کو دیکھا تو پاس آئے اور چادر اٹھا کر آپ ﷺ کے کاندھے پر ڈال دی۔ پھر پیچھے سے آکر آپ ﷺ سے لپٹ گئے اور کہا: "یارسول اللہ! آپ ﷺ اپنی مناجات ختم کیجیے، خدا نے آپ ﷺ سے جو وعدہ کیا ہے اسے بہت جلد پورا کرے گا"۔

میدان جنگ میں زخم

میدان جنگ میں اسے شدید زخم لگتا ہے، تو اس حالت میں صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے:

رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون۔ (مسلم)

"خدایا! میری قوم کو معاف فرما، کیونکہ وہ لوگ حق کو نہیں جانتے۔"

لیکن جب کبھی اس کے ہاتھ سے جہاد کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے تو وہ از فرق تابقدم غضب و قہر الٰہی کا پیکر جلال و جبروت بن جاتا ہے:

ملاء اللہ قبورھم نارا قد شغلونا عن الصلوٰۃ الوسطی۔

"خدا کفار کی قبروں کو آگ سے بھر دے کیونکہ انھوں نے ہماری نماز عصر قضا کرا دی۔"

بادشاہ اور پیغمبر کا فرق

قصہ مختصر، ایک فاتح میدان جنگ میں "سر پر غرور" مگر ایک پیغمبر "جبین نیاز" ہوتا ہے۔ ایک بادشاہ میدان جنگ میں "زبان خودستا"، مگر ایک داعی حق "زبان شکر سنج" ہوتا ہے۔ ایک بادشاہ میدان جنگ میں "غیظ وغضب" کا آتش کدہ مگر ایک مناد توحید "رحم وکرم کا سرچشمہ" ہوتا ہے۔ ان دونوں متضاد حالتوں کا انجام بھی نہایت مختلف اور عبرت خیز ہے۔ بادشاہوں کے سر پر غرور بارہا ٹھکرا دیے گئے، لیکن کسی موید من اللہ کی جبین نیاز خاک مذلت سے آلودہ نہ ہوئی۔ بادشاہوں کی زبان خودستا بارہا ذلت کے ساتھ خاموش کر دی گئی، لیکن کسی داعی الٰہی کا نغمہ حمد وشکر کبھی چپ نہ ہوا۔ بادشاہوں کے غیظ وغضب کے شعلے بارہا بجھا دیے گئے ہیں مگر کسی پیغمبر کے دریائے کرم کو دنیا کے خس وخاشاک نہ روک سکے:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧١﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿١٧٢﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿١٧٣﴾ [1]

(الصّٰفّٰت: ۱۷۱۔۱۷۳)

مساوات

مساوات قانونی کو چھوڑ کر عام طرز مساوات پر غور کرنا چاہیے۔ آنحضرت ﷺ تمام مسلمانوں کے آقا و سردار تھے، تاہم آپ ﷺ نے عام مسلمانوں سے اپنے لیے کبھی کوئی امتیاز نہ چاہا۔ ایک سفر میں کھانا پکانے کے لیے صحابہ نے کام تقسیم کر لیے تو جنگل سے لکڑیاں لانے کی خدمت سرور کائنات ﷺ نے خود اپنے ذمے لے لی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ دس برس خدمت نبوی میں رہے لیکن ان کا بیان ہے کہ اس مدت میں جتنی خدمت آپ ﷺ کی میں نے کی' اس سے زیادہ آپ ﷺ نے میری کی۔ مساوات کا یہ عالم تھا کہ "ماقال لی فی شیٔ لما فعلت" یعنی تحکمانہ کام لینا یا جھڑک دینا تو بڑی بات ہے، کبھی آپ ﷺ نے اتنا بھی نہ فرمایا کہ فلاں کام یوں سے یوں کیوں کیا؟

غلام اور آقا

ایک صحابی نے اپنے غلام کو مارا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارے بھائی ہیں، جنہیں خدا نے تمہارے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ جو خود کھاؤ، وہ انھیں کھلاؤ، جو خود پہنو، وہ انھیں پہناؤ۔

---

[1] اور ہمارا حکم ہمارے بندوں کے حق میں پہلے سے ہو چکا ہے جو رسول ہیں کہ بیشک انھی کو مدد دی جائے گی۔ بے شک ہمارا لشکر غالب رہے گا۔

اسلام نے نہایت شدت کے ساتھ اس سے روکا کہ کوئی انسان دوسرے انسان کو، خواہ وہ کیسا ہی ادنیٰ درجے کا کیوں نہ سمجھا جاتا ہو، "غلام" اور "باندی" کہے۔ کیونکہ سب خدا ہی کے غلام ہیں۔ اسی لیے غلاموں کو فرمایا: "اپنے مربیوں کو" آقا" نہ کہیں کیونکہ اس سے مساوات اسلامی میں فرق آتا ہے۔"

ایک بار ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ کو ان الفاظ میں خطاب کیا: "اے آقائے من" آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے آقا نہ کہہ، آقا تو ایک ہی ہے یعنی خدا۔

ایک یگانہ مثال

قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری میں ماخوذ ہوئی۔ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے سفارش کرنے کے لیے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو آمادہ کیا، جنہیں آپ ﷺ بہت عزیز رکھتے تھے۔ لیکن جب اس واقعے کے متعلق اسامہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے سفارش کی تو آپ ﷺ نے لوگوں کو جمع کرکے فرمایا:

انما اهلك الذين قبلكم انهم كانوا اذا سرق فيهم الشريف تركوه و اذا سرق فيهم الضعيف اقاموا عليه الحدود، ايم الله لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها۔ (بخاری، الشفاعته الحدود)

"لوگو! تم سے پہلی قومیں اس لیے ہلاک کی گئیں کہ جب ان میں سے کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو لوگ اسے چھوڑ دیتے پر جب کوئی عام آدمی چوری کرتا تو اسے سزا دیتے لیکن خدا کی قسم! اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو اس کے ہاتھ ضرور کاٹے جاتے۔"

چوری کا ذکر صرف خصوصیت واقعہ کی بنا پر ہے ورنہ اس سے مراد عام جرائم ہیں۔

پیغمبر اسلام کی دعوت

عالمگیر دعوت

پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت کسی خاص قوم اور ملک کے لیے نہیں تمام نوع انسانی کے لیے ہے۔ سورۂ اعراف کی آیت [1] ۱۵۷ جوامع آیات میں سے ہے، جس نے دعوت اسلام کی پوری حقیقت واضح کر دی:

۱۔ یہ دعوت یکساں طور پر تمام نوع انسانی کے لیے ہے۔

۲۔ یہ ایک خدا کے آگے سب کے سروں کو جھکا ہوا دیکھنا چاہتی ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

۳۔ ایمان باللہ و کلمات اس کا شعار ہے، یعنی خدا پر اور اس کے تمام کلمات وحی پر ایمان۔

فرمایا: خدا نے مجھے تم سب کی طرف بھیجا ہے وہ خدا کہ آسمان و زمین کی بادشاہت اسی کے لیے ہے یعنی جب تمام کائنات ہستی میں ایک ہی خدا کی فرمانروائی ہے تو ضروری ہوا کہ اس کا پیغام ہدایت بھی ایک ہی ہو اور سب کے لیے ہو۔

پیام زندگی

پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت اس لیے ہے کہ تمہیں زندہ کر دے [2] یعنی وہ انسانیت اعلیٰ کے

---

[1] سورۃ اعراف کی آیت ۱۵۷ ہے۔
قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾
(اے پیغمبر) کہو اے افراد نسل انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کہ آسمانوں کی اور زمین کے بادشاہت اسی کے لیے ہے، کوئی معبود نہیں مگر اسی کی ایک ذات، وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امی پر کہ اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں پر) ایمان رکھتا ہے۔ اس کی پیروی کرو تاکہ کامیابی کی راہ تم پر کھل جائے۔

[2] اشارہ ہے سورۃ انفال کی آیت: ۲۴ کی طرف یعنی يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ
مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو جب وہ پکارتا ہے تاکہ تمہیں (روحانی موت کی حالت سے نکال کر) زندہ

انبعاث و قیام کی دعوت ہے۔ غور کرو اس دعوت نے وقت کی تمام مردہ جماعتوں کو کس طرح قبروں سے اٹھا کر زندگی کے میدانوں میں متحرک کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر مردوں کو جلانا کیا ہوگا۔ عرب کے سار بانوں میں ابو بکر، عمر، علی، عائشہ، خالد، ابن ابی وقاص، ابن العاص (رضی اللہ عنہم) جیسے اکابر پیدا ہو گئے اور پچاس برس کے اندر عرب کے وحشی، کرۂ ارضی کی سب سے بڑی اور مہذب قوم تھے۔

توحید

خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ مالک الملک ہے، حی و قیوم ہے۔ اس کی حکومت سے کوئی گوشہ باہر نہیں اس کے علم سے کوئی شے مخفی اور اوجھل نہیں۔ وہ غفلت سے منزہ اور نسیان سے پاک ہے۔ جس ہستی کی ایسی صفتیں ہوں، اس کے سامنے کسی کی سعی و سفارش کی کیا گنجائش ہے اور اس کے احکام و قوانین کے نفاذ میں کون ہے جو دخل دینے کی جرأت کر سکتا ہو؟

بعض ضروری نکتے

قرآن مجید میں توحید فی الذات کے ساتھ توحید فی الصفات بھی کمال پر پہنچا دی گئی۔ انسان کے لیے دینی عقاید و اعمال کا جو تصور قائم کیا، اس کی بنیاد تمام تر رحمت و محبت پر رکھی۔

سورۂ فاتحہ میں ربوبیت و رحمت کی صفتوں کے بعد "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳" (جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئے گا) کہہ کر صفت عدالت کا ذکر کیا اور تمام صفات جلال کو عدالت ہی کے تابع رکھا۔

۱۔ فطرت کائنات میں ربوبیت و رحمت کے ساتھ مجازات بھی ہیں۔ انسان نے مجازات کو قہر و غضب پر محمول کر لیا۔ اس طرح خدا کی صفات میں خوف و دہشت کا تصور پیدا ہو گیا، حالانکہ جن مظاہر کو قہر و غضب پر محمول کیا گیا، وہ عین مقتضائے رحمت ہیں، تعمیر کی تحسین و تکمیل کے لیے تخریب نہ ہوتی تو میزان عدل قایم نہ رہتی اور نظام ہستی درہم برہم ہو جاتا۔

۲۔ صفات الٰہی میں قہر و غضب کے لیے کوئی جگہ نہیں، البتہ عدالت ضرور ہے اور صفات قہریہ جس قدر بیان کی گئی ہیں دراصل اسی (عدالت ہی) کے مظاہر ہیں۔

(توحید فی الصفات میں صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی تمام راہیں بھی بند کر دیں)۔

(الف) عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا کی ذات ہے۔ اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی

کر دے۔

دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔

(ب) صرف خدا ہی کی ذات انسانوں کی پکار سنتی اور دعائیں قبول کرتی ہے۔ اگر تم نے دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کر لیا۔

(ج) اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص رہنا چاہیے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے پیدا کر لیا تو توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔

(د) یہی وجہ ہے کہ سورۃ فاتحہ میں "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿٣﴾" میں اول عبادت کے ساتھ استعانت کا ذکر بھی کیا گیا۔ پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا، جو مفید حصر ہے یعنی "صرف تیری ہی عبات کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔"

(ہ) سب سے زیادہ اہم مسئلہ شخص نبوت کی حد بندی کا تھا۔ پیغمبر اسلام کی بشریت اور بندگی پر زور دیا اور اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ یہ قرار دیا، اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ۔ "یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں"۔ اس میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا اسی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی اور رسالت کا بھی اعتراف ہے (اور بندگی کا اقرار رسالت کے اقرار پر مقدم ہے)۔

نبوت کی روشن ترین دلیل

سورۂ یونس میں ہے:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٦﴾

(آیت: ۱۶)

"تم کہو، اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمہیں سناتا ہی نہیں اور تمہیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا (مگر اس کا چاہنا یہی ہوا کہ تم میں اس کا کلام نازل ہو اور تمہیں اقوام عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملے سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں، کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟"

صداقت نبوت کی سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں، جس کے فضائل و حالات کی تمہیں خبر نہ ہو، تمہیں میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک عمر تم میں بسر کر چکا ہوں یعنی چالیس سال کی مدت تک یہ عمر انسان کی پختگی کی خاص مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری

زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی، بتلاؤ اس تمام عرصے میں کوئی ایک بھی بات تم نے سچائی اور امانت کے خلاف دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملے میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لیے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں کہ مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم نہیں پاسکتے؟

تمام علمائے اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اس کے اخلاق و فضائل کے ابھرنے اور بننے کا اصل زمانہ ہوتا ہے، جو سانچا اس عرصے میں بن گیا، وہ بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا پھر فرمایا:

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾ (یونس: ۱۷)

”بتلاؤ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے، جو اپنے جی سے جھوٹ بنا کر اللہ پر افترا کرے اور اس آدمی سے جو اللہ کی سچی آیتیں جھٹلائے؟ یقیناً جرم کرنے والے کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے“۔

دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے جو شخص اللہ پر افترا کرے اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں، جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر ہے۔ اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام و نامراد ہونا پڑے گا۔ اگر تم سچائی کے مکذب ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ جو مکذب تھے ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ جو صادق تھا، اس کا کلمۂ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی صداقت

پیغمبر اسلام کی صداقت کی اس سے بڑھ کر دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے سخت سے سخت معاند بھی اس عجیب و غریب کشش و تاثیر سے انکار نہیں کر سکتے تھے، جو آپ کی شخصیت اور آپ کی تعلیم میں پائی جاتی تھی، چونکہ اعتراف حقیقت کے لیے تیار نہ تھے اس لیے مجبور ہو جاتے تھے اسے جادو سے تعبیر کریں

۔

”الانبیا“ کی آیت [1] میں فرمایا: وہ پیغمبر اسلام کے پاس جانے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

---

[1] سورۃ انبیاء کی آیت ۳ یہ ہے:
لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖۗ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖۗ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۳﴾ ”دل ہیں کہ یک قلم غافل اور (دیکھو) ظلم کرنے والوں نے چپکے سرگوشیاں کیں۔ یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک آدمی ہے؟ پھر کیا تم جان بوجھ کر ایسی جگہ آتے ہو جہاں جادو کے سوا اور کچھ نہیں؟“

تم ان کے پاس گئے اور جادو میں پھنسے، یہ ہماری طرح ایک آدمی ہے، پس جو کچھ اس کا اثر و نفوذ ہے، وہ جادو ہی کی وجہ سے ہے۔

سچائی کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ اسے سچائی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر اور کچھ کہنا چاہو گے تو کتنا ہی زور لگاؤ، بات بنے گی نہیں، بنے گی اسی وقت جب سر جھکا دو گے کہ ہاں یہ سچائی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ نفس انسانی کی گمراہی و سرکشی پر حقیقت کا اعتراف ہمیشہ گراں گزرتا ہے۔ وہ بغیر لڑے کبھی ہتھیار نہیں رکھے گی۔ وہ مانے گی (کیونکہ سچائی منوائے بغیر رہ نہیں سکتی) مگر اس وقت جب ماننے پر مجبور ہو جائے۔

پیغمبر اسلام نے جب کلام حق کی منادی شروع کی تو قریش مکہ کا یہ حال ہوا۔ وہ سچائی دیکھ رہے تھے، مگر اسے سچائی سمجھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ کبھی کہتے یہ مجنون ہو گیا ہے، خواب و خیال کو وحی و نبوت سمجھتا ہے۔ پھر تاثیر نفوذ دیکھتے تو کہتے جادوگر ہے۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش دارالندوہ میں جمع ہوئے اور یہ ساری باتیں آپس میں کہیں۔ (ابن ہشام)

دین میں جبر نہیں

اس اصل عظیم کا اعلان کہ دین و اعتقاد کے معاملے میں کسی طرح کا جبر و استکراہ جائز نہیں۔ دین کی راہ دل کے اعتقاد و یقین کی راہ ہے اور اعتقاد دعوت و موعظت سے پیدا ہوتا ہے۔ نہ کہ جبر و استکراہ سے۔

قریش مکہ کا فتنہ کیا تھا؟ یہ کہ ظلم و تشدد سے دین و اعتقاد کا فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے اس کے خلاف جنگ کا حکم دیا، پس جس بات کے خلاف اس نے جنگ کا حکم دیا خود اسی بات کا منکر کیونکر ہو سکتا ہے۔

دعوت کی راہ تلقین و ہدایت کی راہ ہے، جدل و خصومت کی راہ نہیں۔ داعی حق کا طریقہ یہ نہیں ہوتا کہ مخاطب کو دلیلوں کے الجھاؤ میں پھنسا دے یا کسی خاص دلیل پر اڑ کر اس کا ناطقہ بند کر دے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کے دل میں سچائی اتار دے۔

خدا پرستی اور نیک عملی

خدا پر، خدا کے فرشتوں پر، خدا کی کتابوں پر، خدا کے تمام رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنا سچا اور کامل ایمان ہے۔ خدا کی ہستی، اس کی وحدانیت، اس کی صفات اور آخرت دین کے بنیادی حقائق ہیں۔

”خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اولاد کو مفلسی کے ڈر

سے قتل نہ کرو۔ ہم تمہیں روزی دیتے ہیں، انہیں بھی دیں گے۔ بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، کھلے طور پر ہوں یا چھپی ہوں۔ کسی جان کو قتل نہ کرو جسے خدا نے حرام ٹھہرا دیا ہے۔ یتیموں کے مال کی طرف نہ بڑھو۔ جب کبھی کوئی بات کہو، انصاف کی کہو، اگرچہ معاملہ اپنے قرابت دار ہی کا کیوں نہ ہو۔ اللہ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا ہے، اسے پورا کرو۔

خدا پرستی اور نیک عملی کی یہی راہ میری (خدا کی) ٹھہرائی ہوئی سیدھی راہ ہے، اسی پر چلو، اور راہوں پر نہ چلو کہ خدا کی راہ سے بھٹکا کر تمہیں تتر بتر کر دیں۔ جو کوئی اللہ کے حضور نیکی لائے گا تو اس کے لیے اس عمل نیک سے دس گنا زیادہ ثواب ہو گا اور جو کوئی برائی لائے گا تو اس کے بدلے ہی سزا پائے گا۔ مجھے تو میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، وہی درست اور صحیح دین ہے۔ ابراہیمؑ کا طریقہ کہ ایک خدا کے لیے ہو جانا۔ میری نماز، میرا حج، میرا جینا، میرا مرنا صرف اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں پہلا فرمانبردار (یعنی مسلم) ہوں۔" (القرآن)

اوامر و نواہی

۱۔ توحید فی العبادت کی تلقین، کیونکہ نفس توحید کا اعتقاد تو تمام پیروان مذاہب میں موجود تھا، لیکن توحید فی العبادت کی حقیقت مفقود ہو گئی تھی۔

۲۔ پھر والدین کے حقوق پر توجہ دلائی گئی۔ انسان کے لیے والدین کی ربوبیت، ربوبیت الٰہی کا پرتو ہے۔ والدین کی خدمت و اطاعت کی آزمائش کا اصلی وقت ان کے بڑھاپے میں آتا ہے، جب کمزوریاں انہیں دوسروں کی خدمت کا محتاج بنا دیتی ہیں۔
انسان کی احتیاج کے دو ہی وقت ہیں: طفولیت اور بڑھاپا۔ طفولیت میں ماں باپ نے خدمت کی تھی، بڑھاپے میں اولاد کو خدمت کرنی چاہیے۔

۳۔ ماں باپ کے بعد ان سب قرابت داروں کے حقوق ہیں، جو ہماری خبر گیریوں کے محتاج ہوں، ساتھ ہی "تبذیر" یعنی بے محل خرچ کرنے سے روکا۔ فرمایا: مال و دولت بے محل خرچ نہ کرو، خرچ کرنے کا صحیح محل ارباب حقوق ہیں۔

۴۔ مال و دولت خرچ کرنے میں اور ہر بات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو، کسی ایک طرف نہ جھک پڑو کہ خرچ کرنے پر آئے تو سب کچھ اڑا دیا۔ احتیاط کرنی چاہی تو کنجوسی پر اتر آئے۔

۵۔ اولاد کو افلاس کے ڈر سے ہلاک نہ کرو۔ ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

۶۔ زنا سے دور رہو، یہ بڑی بے حیائی کی بات اور بڑی برائی کا چلن ہے۔

۷۔ کسی جان کو ناحق قتل نہ کرو۔ جسے قتل نہ کرنا اللہ نے حرام ٹھہرا دیا ہے، ہم نے مقتول کے وارث (یا وارثوں) کو مطالبہ قصاص کا اختیار دے دیا ہے۔ پس چاہیے کہ خونریزی میں زیادتی نہ کی جائے۔

۸۔ یتیموں کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ (یعنی اسے خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو) مگر ایسے طریقے پر جو ان کے لیے بہتر ہو، جب یتیم جوان ہو جائیں تو امانت ان کے حوالے کر دو۔

۹۔ عہد پورا کرو، اس کے بارے میں تم سے باز پرس کی جائے گی۔

۱۰۔ جب کوئی چیز ماپو تو پیمانہ بھرپور رکھا کرو۔ تولو تو صحیح ترازو سے (یعنی نہ ماپ میں کمی کرو اور نہ تول میں ڈنڈی مارو)۔

فرمانبرداروں کے نشان

ان لوگوں کے اعمال و اوصاف (کی مجمل سی کیفیت) جنہوں نے احکام حق قبول کیے اور دنیا کے لیے نافع بن گئے۔

الف۔ اللہ کی بندگی کا عہد پورا کرتے ہیں اور اپنی عبودیت میں سچے اور کامل ہیں۔

ب۔ اللہ نے جو رشتے جوڑ دیے، انہیں ظلم و ناانصافی سے توڑتے نہیں بلکہ رشتے کا پاس کرتے اور ہر علاقے کا حق ادا کرتے ہیں۔ اس عمل میں تمام حقوق العباد آ گئے جس طرح الف میں حقوق اللہ آ گئے۔

ج۔ آخرت کی فکر سے بے پروا نہیں ہوتے۔ جو کچھ کرتے ہیں، اس میں خوف آخرت کی کھٹک موجود ہوتی ہے۔ یقین رکھتے ہیں کہ ایک روز کسی کے آگے پیش ہونا ہے اور حساب کی سختی سے بچنا ممکن نہیں۔

د۔ اللہ کی محبت میں ہر طرح کی ناخوشگوار حالتیں صبر و ثبات کے ساتھ جھیل لیتے ہیں، شدتوں اور محنتوں سے منہ نہیں موڑتے، آزمائشوں کو پیٹھ نہیں دکھاتے۔

ہ۔ نماز اس کی ساری شرطوں کے ساتھ قائم کرتے ہیں۔

و۔ جو کچھ کماتے ہیں، اسے صرف اپنے ہی نفس پر خرچ نہیں کرتے، دوسروں پر بھی خرچ کرتے ہیں اور ہر حال میں خرچ کرتے ہیں، کھلے طور پر بھی اور پوشیدہ طور پر بھی۔

ز۔ بدی کے بدلے بدی کرنا ان کا شیوہ نہیں۔ کوئی ان کے ساتھ کتنی ہی برائی کرے، وہ بھلائی ہی سے پیش آئیں گے۔

ایمان والوں کے پانچ وصف

مومنوں کے پانچ وصف خصوصیت سے بیان کیے گئے۔ گویا قرآن کے نزدیک ایمان و عمل کے مرقع میں سب سے زیادہ نمایاں خط و خال یہی ہیں۔ جس زندگی میں یہ خصائص نہ ہوں وہ مومن کی زندگی نہیں ہو سکتی۔

الف۔ نماز کی محافظت اور اس کا خضوع و خشوع سے ادا کرنا۔ کسی با ہیبت و جلال مقام پر کھڑے ہو جاؤ، تمہارے ذہن و جسم پر کیسی حالت طاری ہو جائے گی؟ ایسی ہی حالت کو عربی میں "خشوع" کہتے ہیں ۔

ب۔ ہر اس بات سے مجتنب رہنا جو نکمی ہو، صرف انہی باتوں کا اشتغال رکھنا جو دین و دنیا میں نافع ہوں۔

ج۔ کمائی میں سے اپنے محتاج بھائیوں کے لیے خرچ کرنا۔

د۔ زنا سے کبھی آلودہ نہ ہونا۔

ہ۔ امانت دار ہونا اور اپنے عہدوں کو پورا کرنا۔

راہ حق کے پیشرو

راہ حق میں سب سے آگے نکل جانے والے وہ ہیں:

الف۔ جو اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے ہیں اور اس کی نشانیوں پر یقین رکھتے ہیں۔

ب۔ جو پروردگار کے ساتھ کسی ہستی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔

ج۔ جو اس کی راہ میں جتنا کچھ دے سکتے ہیں، بلا تامل دے دیتے ہیں۔ ان کے دل ترسان رہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے حضور انہیں لوٹنا ہے۔

طریق خیر و سعادت

ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ قرابت داروں کے حقوق سے غافل نہ ہو۔ یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور پڑوسیوں کی خبر گیری کرتے رہو۔ پڑوسی خواہ قرابت دار ہو، خواہ اجنبی، ہر حال میں اچھے برتاؤ کا مستحق ہے۔ اسی طرح جو لوگ تمہارے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ہوں لونڈی غلام جو تمہارے قبضے میں ہیں، ان سب کے بھی تم پر حقوق ہیں۔ ضروری ہے کہ سب کے ساتھ محبت اور احسان سے پیش آؤ۔

بخل نہ کرو، خدا نے جو کچھ عطا فرمایا ہے اس کے بندوں کی خدمت میں خرچ کرو۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس کا ہاتھ انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) سے کبھی رک نہیں سکتا۔ البتہ جو کچھ خرچ کرو اللہ کے لیے کرو، نام و نمود کے لیے نہ کرو۔

نظم و فلاح میں اصل اصول

اجتماعی زندگی میں نظم و فلاح کے لیے اصل اصول یہ ہے کہ جو جس بات کا حقدار ہو، اس کے حق کا اعتراف کرو اور جو چیز جسے ملنی چاہیے، وہ اس کے حوالے کر دو۔ وارث کا حق ہو، یتیم کا مال ہو، قرضدار کا قرض ہو، امانت رکھنے والے کی امانت ہو، اہلیت رکھنے والے کے لیے منصب اور عہدہ ہو۔ جو جس کا اہل ہو، اسے ملنا چاہیے۔

جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو صرف عدل و انصاف پیش نظر ہو، کسی حالت اور کسی صورت میں بھی یہ جائز نہیں کہ فیصلہ انصاف کے خلاف کیا جائے۔

مسلمانوں کے لیے اصل دین

مسلمانوں کے لیے اصل دین یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کریں۔ اللہ کے رسول کی اطاعت کریں اور جو لوگ ان میں سے صاحب حکم و اختیار ہوں ان کی اطاعت کریں (بشر طیکہ اصحاب حکم و اختیار کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش نہ ہو جو اللہ اور رسول کی اطاعت کے خلاف ہو) بہ صورت نزاع اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی طرف رجوع کیا جائے اور جو فیصلہ ملے، اس کے آگے سب سر تسلیم خم کر دیں۔

قوامون بالقسط

مسلمانوں کو چاہیے کہ "قوامون بالقسط" ہوں یعنی حق و راستی پر اس مضبوطی سے قائم رہنے (اور جم جانے والے) کہ کوئی بات بھی انہیں جگہ سے ہلا نہ سکے۔ چاہیے کہ وہ اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہوں۔ دنیا کی کوئی چیز انہیں سچ کہنے سے روک نہ سکے۔ اگر کسی معاملے میں سچائی خود ان کی ذات کے خلاف ہو یا ان کے ماں باپ اور اعزہ و اقربا کے خلاف ہو، جب بھی انہیں سچی ہی بات کہنی چاہیے، وہ صرف سچائی ہی کے لیے دل و زباں رکھتے ہیں۔ [1]

بنیادی دستور العمل

مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ خدا کے شعائر کی بے حرمتی روا نہ رکھیں۔ دوسروں کے معاملے میں ان کا دستور العمل یہ ہونا چاہیے کہ نیکی کے کاموں میں سب کی مدد کریں۔ کوئی ظلم کرے تو یہ برائی

---

[1] سورۂ مائدہ ۸ میں صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ:
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ "ایسا نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات کے لیے ابھار دے کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو وہ اس کی خبر رکھنے والا ہے"۔

ہے، اس سے بچیں۔ کوئی حج وزیارت کو جائے تو یہ بھلائی ہے اس کے معاون بنیں (گویا نیکی اور پرہیز گاری کی ہر بات میں تعاون، گناہ اور ظلم کی ہر بات میں لاتعاون ہر مسلمان کے لیے بنیادی اصل کا رہے)۔

دین کی تکمیل اور نعمت کا اتمام چاہتا ہے کہ ہم اپنی سیرت میں سر تا سر حق وصداقت کے پیکر بن جائیں۔

انسانی مساوات

نسل انسانی کی مساوات کا اعلان اور نسل و شرف کے تمام امتیازات سے انکار جو لوگوں نے بنا رکھے تھے اور جن کی وجہ سے انسانی حقوق پامال ہو رہے تھے۔ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، بڑا ہو یا چھوٹا، وضیع ہو یا شریف، انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں قریش کو خطاب کرتے ہوئے یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکار فرمادی تھی۔ فرمایا:

"اے جماعت قریش! خدا نے تمہاری جاہلانہ نخوت اور آباواجداد پر اترانے کا غرور آج توڑ دیا (سچ تو یہ ہے) سب لوگ آدم کے فرزند ہیں اور آدم مٹی سے بنایا گیا تھا۔ خدا فرماتا ہے: "لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد وعورت سے پیدا کیا ہے۔ گو کہ قبیلے سب پہچان کے لیے بنادیے ہیں اور خدا کے ہاں تو اس کی زیادہ عزت، جس میں تقویٰ زیادہ ہے"[1]

جب تمام انسان ایک ہی ماں باپ (آدم وحوا) کی اولاد ہیں تو انسان ہونے میں امتیازات کی کون سی وجہ ہے۔ پھر خدا کے ہاں عزت کا جو معیار قرار پایا یعنی تقویٰ، وہ ایسا ہے کہ اس میں انسانوں کے درمیان حسد ورقابت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ منافی تقویٰ ہوگی۔ باقی ہر معیار یعنی دولت، عہدہ، رنگ وغیرہ میں حسد ورقابت کے سوا اور کسی بات کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔"

دین کی اصل عظیم

دین کی اصل عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ سچی خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔ اصل شے دل کی پاکی اور عمل کی نیکی ہے۔ شریعت کے ظاہری احکام ورسوم بھی اسی لیے ہیں کہ یہ مقصود حاصل ہو۔

نزول قرآن کے وقت دنیا کی ایک عالمگیر مذہبی گمراہی یہ تھی کہ لوگ سمجھتے تھے، دین سے مقصود

---

[1] متین جلد اول ص ۱۵۶۔ جس آیت کا ترجمہ دیا گیا ہے وہ سورۃ حُجرات کی تیرھویں آیت ہے یعنی: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ

محض شریعت کے ظواہر ورسوم ہیں اور انہیں کے کرنے ،نہ کرنے پر نجات وسعادت موقوف ہے۔ پس جہاں تک دین کا تعلق ہے، ساری طلب مقاصد کی ہونی چاہیے ،نہ کہ وسائل کی۔

ابراہیم علیہ السلام کی راہ

دین کی جو راہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کی تھی، وہ کیا تھی؟ ان کے بعد ان کی اولاد جس طریقے پر چلتی رہی، وہ کون سا طریقہ تھا؟ خود حضرت یعقوب علیہ السلام نے بستر مرگ پر جس دین کی وصیت کی تھی وہ کونسا دین تھا؟ وہ یہودیت اور مسیحیت کی گروہ بندی نہ تھی (اس وقت تک یہودیت اور مسیحیت کا تو وجود بھی نہ تھا) وہ صرف خدا پر ایمان لانے اور اس کے قانون سعادت کی فرمانبرداری کرنے کی فطری اور عالمگیر سچائی تھی۔ اسی کی دعوت قرآن نے دی۔

دین الٰہی کو "الاسلام" کے نام سے تعبیر کیا گیا، جس کے معنی اطاعت کرنے کے ہیں یعنی ہر طرح کی نسبتوں اور گروہ بندیوں سے الگ ہو کر صرف اطاعت حق کی طرف انسانوں کو دعوت دی جائے۔ [1]

عمل کی کمائی

قانون الٰہی یہ ہے کہ ہر فرد کو وہی پیش آتا ہے۔ جو اس نے اپنے عمل سے کمایا ہے۔ نہ تو ایک کی نیکی دوسرے کو بچا سکتی ہے اور نہ ایک کی بد عملی کے لیے دوسرا جواب دہ ہو سکتا ہے۔

انسان کے لیے قدامت پسندی کا پھندا بڑا ہی سخت ہے، اس کے پیچ سے وہ نکل نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ ماضی کے افسانوں میں گم رہے گا۔ ہندو ہزاروں برس سے مہابھارت اور پرانوں کے افسانوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے دو فرقے آج تک اس نزاع سے فارغ نہیں ہوئے کہ تیرہ سو برس پہلے سقیفہ (بنوساعدہ) میں خلافت کا جو انتخاب ہوا تھا وہ صحیح تھا یا غلط؟ قرآن کہتا ہے، "تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ" (البقرہ۔ ۱۳۴) اب اس کے پیچھے پڑے رہنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ تم اپنی خبر لو۔ ان کے اعمال ان کے لیے تھے اور تمہارے، تمہارے لیے ہیں۔

دنیا پرستی کا غرور

دین حق دنیا کا نہیں، دنیا پرستی کے غرور و سرشاری کا مخالف ہے۔ یہی دنیا کا غرور انسان کو خدا پرستی

---

[1] ملاحظہ فرمایئے اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۔ بلاشبہ اصل دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ (آل عمران۔ ۱۹) وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (جو کوئی اسلام کے سوا دوسرے دین کا خواہش مند ہو گا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ آل عمران۔ ۸۵) وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۔ تمہارے لیے پسند کیا دین اسلام کو۔ (مائدہ۔ ۳)

اور راست بازی سے بے پروا کر دیتا ہے۔ جب اسے طاقت اور حکومت مل جاتی ہے تو غرض و نفس کی پرستش میں وہ سب کچھ کر گزرتا ہے، جو دنیا میں انسان کا ظلم و فساد کر سکتا ہے۔ جو لوگ سچے خدا پرست ہیں ،وہ دنیا میں کتنے ہی مشغول ہوں، مگر ان کے پیش نظر نفس پرستی نہیں، صرف رضائے الٰہی ہوتی ہے۔

آخرت کی نجات

آخرت کی نجات کا دارومدار تمام تر ایمان و عمل پر ہے۔ وہاں نہ تو نجات کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے نہ کسی کی دوستی اور آشنائی کام دے سکتی ہے، نہ کسی کی سفارش سے کام نکالا جا سکتا ہے۔ (کسی نیک اور بزرگ ہستی سے حسن عمل کا سبق لیا جا سکتا ہے۔ اس کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ اہل علم سے مسائل پوچھے جا سکتے ہیں، لیکن نجات کا انحصار اپنے ہی ایمان و عمل پر یا اللہ کی رحمت پر ہے۔ کسی کی سعی و سفارش کچھ اعانت نہیں کر سکتی۔ ایسا تصور ہی سراسر غیر اسلامی ہے۔)

حق و باطل کا معیار

حق و باطل کے معاملے میں انسانوں کی قلت و کثرت معیار نہیں۔ گمراہی و حق فراموشی کے ایسے اوقات بھی آجاتے ہیں کہ نوع انسانی کی اکثریت حق و یقین کی روشنی سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی دور نزول قرآن کے وقت بھی دنیا پر چھایا ہوا تھا۔ گمراہوں کی کثرت نہ دیکھو یہ دیکھو کہ کون سی راہ یقین اور بصیرت کی راہ ہے اور کون سی جہل و گمان کی۔ حق کی راہ یقین و بصیرت ہی کی راہ ہے نہ کہ جہل و گمان کی۔ اگرچہ بہت تھوڑے آدمی اس راہ پر کاربند ہوں۔ آج دنیا کی آبادی میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، نہ کہ مسلمانوں کی۔ پھر کیا اس بنا پر اکثریت کے مطابق حق کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے؟ ابتدائی دور میں مسلمان بہ مشکل چند لاکھ ہوں گے لیکن انہوں نے حیرت انگیز سعی و ہمت اور نادیدہ جوش فداکاری سے چند سال کے اندر روئے زمین کے گوشے گوشے میں نور حق کا اجالا کر دیا۔ آج ان کی بھیڑ ساٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو باطل کی ظلمت کاریوں سے محفوظ رکھنے میں بے بس نظر آتے ہیں اور وہ گروہ در گروہ ایسے طور طریقے اختیار کیے بیٹھے ہیں، جنہیں حق نہیں، باطل کے شاخسانے ہی کہا جا سکتا ہے۔

منکرین آخرت

جو لوگ منکرین آخرتہیں یعنی محاسبہ اعمال پر اعتقاد نہیں رکھتے، ان کی ذہنیت چار حال سے خالی نہیں:

۱۔ انہیں خدا سے ملنے کی توقع نہیں۔

ب۔ وہ صرف دنیوی زندگی میں خوشنود ہوتے ہیں۔

ج۔ اس حالت کے خلاف ان کے اندر کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی، اسی پر وہ مطمئن ہو گئے ہیں۔

د۔ ان کے ذہن وادراک میں اس درجہ تعطل پیدا ہو گیا ہے کہ قدرت کی تمام نشانیاں جو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں، انہیں بیدار نہیں کرسکتی۔

ان میں سے ہر بات نہ صرف بیان حال ہے بلکہ بجائے خود ایک دلیل بھی ہے اور یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔

مشکلیں اور آزمائشیں

کتاب وحکمت کی تعلیم، شخص نبوت کی پیغمبرانہ تربیت (تزکیہ)، مرکز ہدایت کا قیام (کعبہ مکرمہ) اور بہترین امت (خَيۡرَ أُمَّةٍ أُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ۔ آل عمران۔ ۱۱۰)۔ ہونے کا نصب العین، یہی وہ بنیادی عناصر تھے جو موعودہ امت کی نشوونما کے لیے ضروری تھے۔ یہ تمام مراتب ظہور میں آگئے تو پیروان دعوت قرآنی کو سرگرم عمل ہو جانے کا حکم مل گیا۔ سرگرم عمل ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مشکلیں اور آزمایشیں پیش آتیں، اس لیے صبر واستقامت اور جاں فروشی کی بھی دعوت دی گئی۔

صبر وثبات

فرمایا: ”صبر اور نماز کی قوتوں سے مدد لو“۔ صبر کی حقیقت یہ ہے کہ مشکلات ومصائب کو جھیلنے اور نفسیاتی خواہشوں سے مغلوب نہ ہونے کی قوت پیدا کی جائے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر وفکر سے روح کو تقویت ملتی ہے۔ جس جماعت میں یہ دو قوتیں (صبر اور نماز) پیدا ہو جائیں گی، وہ کبھی ناکام نہیں ہوسکتی۔

دوسرا جو جماعت موت سے ڈرتی ہے وہ کبھی زندگی کی کامرانیاں حاصل نہیں کرسکتی، راہِ حق میں موت، موت نہیں، سرتاسر زندگی ہے۔ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر غالب ہیں اور کتنی بڑی جماعتیں ہیں جو چھوٹی جماعتوں سے شکست کھا جاتی ہیں۔ فتح وشکست کا مدار افراد کی قلت وکثرت پر نہیں، دلوں کی قوت پر ہے۔ اللہ کی مدد انہیں لوگوں کا ساتھ دیتی ہے جو صابر اور ثابت قدم ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کا نصب العین

مسلمانوں کا جماعتی نصب العین یہ نہیں قرار دیا گیا کہ وہ طاقتور قوم بنیں یا سب سے برتر گروہ ہوں کیونکہ طاقت وبرتری میں جماعتی گھمنڈ اور قومی حرص وآز کا لگاؤ تھا اور یہ بات انسانیت کے امن وسلام اور

مساوات و اخوت کے منافی تھی۔ پس صرف "خیر" اور "بہتر" ہونے پر زور دیا گیا۔ (كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) جس کی تمام تر روح اخلاقی اور معنوی محاسن پر مبنی ہے۔ جس جماعت کا نصب العین یہ ہوگا کہ وہ سب سے اچھی اور نیک ہو، وہ طاقتوں کے غرور اور قومی نخوت و برتری کے مفاسد سے آلودہ نہیں ہوسکتی۔ (اور حق یہ ہے کہ خیر و سعادت میں سب سے بڑھ کر ہونے کے بعد کسی جماعت کی معنوی قوت میں کون سی چیز کی کمی رہ سکتی ہے اور معنوی قوت سے بڑھ کر کون سی قوت ہے جو امن وسلام کی ضامن ہو؟)

وحدت دعوت

قرآن مجید نے دین حق کے اس اصل عظیم کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ تمام نبی صرف ایک ہی دین کے داعی تھے۔ جب اللہ کا دین ایک ہے تو تمام رہنما ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جو ان میں تفریق کرتا ہے، وہ پورے سلسلہ ہدایت ہی کا منکر ہے۔ اللہ کا دین اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کے ٹھہرائے ہوئے قوانین فطرت کی اطاعت کی جائے اور آسمان وزمین میں جس قدر مخلوق ہے، سب قوانین الٰہی کی اطاعت کر رہی ہے۔ پھر اگر تمہیں اللہ کے قوانین فطرت سے انکار ہے تو اللہ کے قانون کے سوا کائنات ہستی میں اور کون سا قانون ہوسکتا ہے؟

ایمان اور محبت

اللہ پر ایمان اور اللہ کی محبت دونوں لازم ملزوم ہیں۔ اگر کوئی اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کو بھی ویسی ہی چاہت سے ماننے لگے، جیسی چاہت سے ماننا صرف اللہ کے لیے ہے تو یہ اللہ کے ساتھ دوسرے کو ہم پلہ بنا دینا ہوا اور توحید الٰہی کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔ مومن وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ کی محبت رکھنے والا ہو۔ (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ البقرہ۔ ۱۶۵)

جو کوئی اللہ سے محبت رکھنے کا دعویدار ہے اسے چاہیے کہ اللہ کے رسول کی پیروی کرے۔ اللہ کی محبت کا دعویٰ اور اس کی راہ بتلانے والے کی پیروی سے انکار ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتے۔

قرآن مجید کے چار وصف

سورہ یونس میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(آیت:۵۷)

”لوگو تمہارے پاس پروردگار کی جانب سے ایک ایسی چیز آگئی ہے، جو موعظت ہے۔ دل کی بیماریوں کے لیے شفاہے اور ہدایت اور رحمت ہے، ان لوگوں کے لیے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔“

اس میں قرآن کے چار وصف بیان کیے:

ا۔ ”مَّوۡعِظَةٌ“ ہے یعنی دل میں اتر جانے کی دلیلوں اور روح کو متاثر کرنے والے طریقوں سے ان تمام باتوں کی ترغیب دیتاہے، جو خیر و حق کی باتیں ہیں۔ ان تمام باتوں سے روکتاہے جو شر وبطلان کی باتیں ہیں۔ کیونکہ عربی میں وعظ کا مفہوم صرف نصیحت نہیں بلکہ ایسی نصیحت ہے جو موثر دلائل اور دل نشیں دلیلوں سے کی جائے۔

ب۔ ”شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوۡرِ“ دل کی تمام بیماریوں کے لیے نسخہ شفاہے، جو فرد یا جو گروہ اس نسخے پر عمل کرے گا، اس کے قلوب ہر طرح کے مفاسدور ذائل سے پاک ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ عربی میں قلب، فواد اور صدر کے الفاظ جب کبھی ایسے موقع پر بولے جائیں، جیسا یہ موقع ہے تو ان سے مقصود انسان کی معنوی حالت ہوتی ہے۔ یعنی ذہن و فکر کی قوت، عقلی ادراک، جذبات وعواطف، اخلاق و عادات، اندرونی حسیات۔ وہ عضو مقصود نہیں ہوتا، جو فن تشریح کا دل اور سینہ ہے۔

ج۔ ”هُدًى“ ہے یعنی یقین کرنے والوں کے لیے ایک ہدایت۔

د۔ ”رَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ“ یقین کرنے والوں کے لیے پیام رحمت ہے، یعنی ظلم و قساوت اور بغض و تنفر سے دنیا کو نجات دلاتاہے۔ رحم و محبت اور امن و سلامتی کی روح سے معمور کرتاہے۔

اعلان ہی نہیں دلیل بھی

یہ محض قرآن کے اوصاف کا مدعیانہ اعلان ہی نہ تھا، بلکہ اس کی صداقت کی سب سے زیادہ موثر دلیل بھی تھا۔ اگر ایک شخص دعویٰ کرے کہ وہ طبیب ہے تو اس کے دعوے کی جانچ کا سب سے زیادہ سہل اور قطعی طریقہ یہ ہوگا کہ دیکھا جائے اس کے علاج سے بیماروں کو شفاملتی ہے یا نہیں؟ قرآن نے بھی جابجایہی جانچ منکروں کے سامنے پیش کی ہے۔ اس نے کہا، میں نسخہ شفاہوں۔ ثبوت میں مومنوں اور متقیوں کی جماعت پیش کردی، جو اس کے دارالشفامیں تیار ہوئی تھی۔ آج بھی اس کی دلیل اسی طرح قاطع ہے، جس طرح عہد نزول میں تھی۔ اگر اس نے عرب جاہلیت کے مریضان روح و دل میں سے ابوبکر، عمر، علی، خالد، سلمان، ابوذر رضی اللہ عنہم وغیرہ جیسی تندرست روحیں پیدا کردی تھیں تو کیا اس کے نسخہ شفامیں شک کیا جاسکتاہے؟

صراط مستقیم اور دین قیم

سورۃ بنی اسرائیل آیت ۹ میں فرمایا:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ

"بلاشبہ یہ قرآن اس راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے۔"

قرآن نے اپنے جس قدر اوصاف بیان کیے ہیں، ان میں جامع ترین وصف یہی ہے کہ زندگی اور سعادت کے ہر گوشے میں اس کی رہنمائی سیدھی سے سیدھی بات کے لیے ہے۔ کسی طرح کی کجی، کسی طرح کا پیچ و خم، کسی طرح کا الجھاؤ، کسی طرح کی افراط و تفریط اس کی رہنمائی میں نہیں ہو سکتی۔ یہی حقیقت دوسری جگہ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" اور "الدِّيْنُ الْقَيِّمُ" (التوبہ۔۳۵) سے تعبیر کی گئی۔

دین حق کے تین بنیادی اصول

سورۂ اعراف آیت ۲۹ میں ہے:

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۗ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ

"تم کہو! میرے پروردگار نے جو حکم دیا ہے وہ تو یہ ہے کہ بات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ اپنی تمام عبادتوں میں خدا کی طرف توجہ درست رکھو اور دین کو اس کے لیے خالص کر کے اسے پکارو۔"

اس آیت میں دین حق کے تین بنیادی اصول واضح کر دیے:

۱۔ عمل میں اعتدال، ۲۔ عبادت میں توجہ اور ۳۔ خدا پرستی میں اخلاص۔ یہ آیت باب توحید میں اصل اصول ہے۔ دین کو خدا کے لیے خالص کر کے پکارو یعنی دین کی جتنی باتیں ہیں وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص کر دو۔ "خلق" اور "امر" دونوں اللہ ہی کی ذات سے ہیں یعنی وہی کائنات ہستی کا پیدا کرنے والا ہے اور اسی کے حکم و قدرت سے اس کا انتظام ہو رہا ہے۔

دکھاوے کی خیرات

دکھاوے کی خیرات اکارت جاتی ہے۔ جو شخص نیکی کے لیے نہیں، نام و نمود کے لیے خیرات کرتا ہے اور خدا کی جگہ انسانوں میں بڑائی چاہتا ہے وہ یقیناً خدا پر سچا ایمان نہیں رکھتا۔ ایسی خیرات سے روکا گیا ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب تک چوری چھپے خیرات نہ کر سکو، خیرات کرو ہی نہیں یا پوشیدگی کا تعلق بجائے خود عمل خیر سے مانع ہو جائے (چھپائے رکھنا ممکن ہو تو نہ چھپانا رفتہ رفتہ ریا و نمائش کا باعث بن سکتا ہے۔ نیت پاک ہو اور خدا کی رضا کے سوا کچھ منظور نہ ہو تو کسی کے سامنے بھی خیرات کر دینا نامناسب نہیں بلکہ بعض اوقات کھلم کھلا خیرات دوسروں کے لیے وسیلہ ترغیب بن جاتی ہے۔ مقصود حقیقی یہ ہے کہ نمود و نمائش سے نیت کا آئینہ آلودہ نہ ہونے پائے)۔

نکمی اور بیکار چیزیں خیرات کے نام سے محتاجوں کو نہ دو، سوچو کہ اگر تمہیں کوئی ایسی چیز دے تو لینا پسند کرو گے؟

محبت و ہمدردی کے تقاضے

نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی استعداد نشو و نما نہیں پا سکتی تھی، اگر اس کا حکم دیتے ہوئے ایسی باتوں سے روک نہ دیا جاتا جو ٹھیک ٹھیک اس کی ضد ہیں۔ پس انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) کے ساتھ ساتھ سُود کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

دین حق انسانوں میں محبت و ہمدردی پیدا کرنا چاہتا ہے اسی لیے خیرات کا حکم دیا کہ ہر انسان دوسرے کی احتیاج، اپنی احتیاج سمجھے۔ سود خوار کی ذہنیت بالکل اس کی ضد ہے، وہ چاہتا ہے دوسرے کی احتیاج سے خود انتہائی فائدہ اٹھائے اور محتاج کو دولت جمع کرنے کا ذریعہ بنائے (گویا سود خور کے دل میں ہم جنسوں کے لیے محبت و ہمدردی کا کوئی احساس باقی ہی نہیں رہتا۔)

مومن اور امید و یقین

قرآن نے ہر جگہ حقیقت واضح کی کہ ایمان، امید اور یقین ہے، کفر، شک اور مایوسی ہے۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ مایوس نہ ہوں۔ امید کا چراغ روشن رکھو، ہر حال میں امید وار فضل و سعادت رہو، یہی مقتضائے ایمان ہے، یہی سرچشمہ زندگی ہے۔ اسی سے تمام دنیوی اور اخروی کامرانیوں کی دولت حاصل ہو سکتی ہے۔

جس انسان نے امید و یقین کی جگہ شک و مایوسی کی راہ اختیار کی، خواہ دنیا کی زندگی کے لیے ہو، خواہ آخرت کے لیے، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اب اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ایسے آدمی کے لیے صرف یہی چارہ کار رہ جاتا ہے کہ گلے میں پھندا ڈالے اور زندگی ختم کر دے۔

ایمان نام ہی امید کا ہے اور مومن وہ ہے جو مایوسی سے کبھی آشنا نہیں ہو سکتا۔ اس کا ذہنی مزاج کسی چیز سے اتنا بیگانہ نہیں، جس قدر مایوسی سے۔ زندگی کی مشکلیں اسے کتنا ہی ناکام کریں لیکن وہ پھر سعی کرے گا۔ لغزشوں اور گناہوں کا ہجوم اسے کتنا ہی گھیرے لیکن وہ پھر توبہ کرے گا۔ نہ تو دنیا کی کامیابی سے وہ مایوس ہو سکتا ہے، نہ آخرت کی نجات سے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا کی مایوسی موت ہے اور آخرت کی مایوسی شقاوت۔ وہ دونوں جگہ رحمت الٰہی کو دیکھتا اور اس کی بخششوں پر یقین رکھتا ہے کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ سبھی گناہ بخش دیتا ہے۔ ہاں، وہ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔ (سورہ زمر: ۵۳)

قبول حق کی استعداد

بارش سے صرف وہی زمین فائدہ اٹھا سکتی ہے جس میں اس کی استعداد ہو۔ شور زمین پر کتنی ہی بارش ہو سرسبز نہ ہو گی۔ اسی طرح قرآن کی ہدایت سے بھی وہی روحیں شاداب ہوں گی جن میں قبولیت حق کی استعداد ہے۔ جنہوں نے استعداد کھو دی، ان کے حصے میں محرومی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

قبول حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ آباءواجداد کی اندھی تقلید، گھڑی ہوئی بزرگیوں اور روایتی عظمتوں کی پرستش ہے۔ ابتدا میں جہل و فساد سے کوئی عقیدہ گھڑ لیا جاتا ہے، ایک مدت تک لوگ اسے مانتے رہتے ہیں۔ جب ایک عرصے کے اعتقاد سے اس میں شان تقدیس پیدا ہو جاتی ہے تو اسے شک و شبہ سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں اور عقل و بصیرت کی کوئی بھی دلیل اس کے خلاف تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن اسی کو "اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡهَآ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُكُمۡ" (نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباواجداد نے گھڑ لیے ہیں) سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ بنائے ہوئے ناموں کے سوا وہ کوئی حقیقت اور معقولیت پیش نہیں کر سکتے۔

پیغمبر اسلام کی دعوت کی تین خصوصیتیں

سورۂ اعراف کی آیت [1] میں پیغمبر اسلام کی دعوت کی تین خصوصیتیں بیان کیں:

۱۔ نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے۔

۲۔ پسندیدہ چیزوں کا استعمال جائز ٹھہراتا ہے، ناپسندیدہ چیزوں کے استعمال کو روکتا ہے، قرآن نے اس معنی میں "طیبات" اور "خبائث" کا لفظ اختیار کیا ہے۔

۳۔ جو بوجھ اہل کتاب پر پڑ گیا تھا اور جن پھندوں میں وہ گرفتار ہو گئے تھے، ان سے نجات دلاتا ہے۔

یہ بوجھ کیا تھا اور یہ پھندے کیا تھے، جن سے قرآن نے نجات دلائی؟ قرآن نے دوسرے مقامات پر اسے واضح کر دیا ہے: مذہبی احکام کی بیجا سختیاں، مذہبی زندگی کی ناقابل عمل پابندیاں، ناقابل فہم عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، عالموں اور فقیہوں کی تقلید کی بیڑیاں، پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں۔ پیغمبر اسلام کی دعوت نے ان سب سے نجات دلا دی۔ سچائی کی ایسی سہل و آسان راہ دکھا دی جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ اور عمل کے لیے کوئی سختی نہیں۔

درخشاں حقائق

---

[1] اس آیت ۱۵۷ کا متعلقہ حصہ یہ ہے:
یَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡهٰهُمۡ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ كَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ (پیغمبر اسلام، جس کی شفاعت تورات وانجیل میں یوں مکتوب تھیں کہ) وہ نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا۔ پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا۔ گندی چیزیں حرام ٹھرائے گا اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس تلے وہ دبے ہوں گے۔ ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے۔

چند حقائق ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ قرآن کے نزدیک کسی جماعت کے مسلمان ہونے کی عملی شناخت دو باتیں ہیں: نماز کا اہتمام اور زکوٰۃ کا نظام، جو جماعت یہ دو عمل ترک کر دے گی (وہ عملاً) مسلمان متصور نہ ہو گی۔ زکوٰۃ کے نظام سے مراد ہے کہ حکومت یہ انتظام نہ کر سکے یا کسی جگہ مسلمان خدا نخواستہ محکوم ہو جائیں تو وہ خود زکواۃ کا نظام سنبھالیں۔

اس آیت کا متعلقہ حصہ یہ ہے:

۲۔ شرف و بزرگی کے رسمی مناصب کوئی چیز نہیں۔ بزرگی اسی کے لیے ہے جو عمل و ایمان کی بزرگی رکھتا ہے۔

۳۔ قرآن کے نزدیک سب سے بڑا درجہ ان انسانوں کا ہے جو ایمان و حق پرستی کی راہ میں قربانیاں کرنے والے ہیں، نہ کہ ان لوگوں کا جو رواجی نیکیوں اور رسمی نمائشوں میں سرگرم نظر آتے ہیں۔

۴۔ مومن وہ ہے جس کی حب ایمانی پر دنیا کی کوئی محبت غالب نہ آسکے۔

۵۔ جماعت کی زندگی اور فتح و کامرانی کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خطرہ نہیں کہ مذبذب اور ورد لے آدمی اس میں موجود ہوں۔

۶۔ کاروبار حق میں دارومدار شخصیتوں پر نہیں۔ شخصیت اس لیے ہے کہ بیج بو دے۔ باقی رہے برگ و بار، تو ہو سکتا ہے کہ اس کی زندگی ہی میں سب نمودار ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ زندگی میں، کچھ اس کے بعد ہوں۔ اس تاخیر سے کاروبار حق پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

۷۔ حلت و حرمت اشیاء میں قرآن کے اصول اربعہ:

الف۔ اصل اباحت ہے نہ کہ حرمت، الا یہ کہ وحی الٰہی نے کسی چیز کو حرام ٹھہرا دیا ہو۔

ب۔ کسی چیز کو حرام ٹھہرا دینے کا حق خدا کی شریعت کو ہے۔

ج۔ محض اپنی رائے اور قیاس سے کوئی چیز حرام ٹھہرانا افترا علی اللہ یعنی خدا پر بہتان باندھنا ہے۔

د۔ انسان کے عقائد و اعمال کی بنیاد علم و یقین پر ہونی چاہیے، نہ کہ وہم و گمان پر۔

تذکیر و توکیل

پیغمبر کا کام "تذکیر" و "تبلیغ" ہے "تبشیر" و "تنذیر" ہے۔ وہ داعی اور مذکر ہے۔ "وکیل" یعنی نگہبان نہیں جو زبردستی کسی راہ میں کھینچ لے جائے، پھر اس سے نکلنے نہ دے۔ سورۂ یونس میں ہے: وَمَآ اَنَا عَلَيۡكُمۡ بِوَكِيۡلٍ (میں تم پر نگہبان نہیں۔ یونس:۱۰۷)۔ دوسری جگہ پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے یہی مطلب

یوں ادا کیا: وَ مَآ اَنۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِجَبَّارٍ (تو ان لوگوں پر حاکم جابر کی طرح مسلط نہیں کہ جبراً و قہراً بات منوا دے ق:۴۵) نیز فرمایا: لَسۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِمُصَّیۡطِرٍ (تجھے ان پر داروغہ بنا کر نہیں بٹھا دیا ہے کہ مانیں یا نہ مانیں لیکن تو انہیں راہ حق پر چلا دینے کا ذمہ دار ہو۔ غاشیہ :۲۳) پھر فرمایا: فَاِنَّمَا عَلَیۡكَ الۡبَلٰغُ وَعَلَیۡنَا الۡحِسَابُ (جو کچھ تیرے ذمے ہے یہی ہے کہ پیغام پہنچا دیا جائے۔ ان سے ان کے کاموں کا حساب لینا ہمارا کام ہے۔ رعد:۴۰)

قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ خدا کے رسولوں کا منصب تذکیر و تبلیغ کے اندر محدود تھا حالانکہ وہ خدا کی طرف سے مامور تھے۔ پھر ظاہر ہے کہ کسی دوسرے شخص کے لیے وہ کب گوارا کر سکتا ہے کہ وکیل، مصیطر اور جبار بن جائے۔

تذکیر و تبلیغ اور پسند و قبول

دراصل اعمال انسانی کے تمام گوشوں میں اصل سوال حدود ہی کا ہے اور ہر جگہ انسان نے اسی میں ٹھوکر کھائی ہے، یعنی ہر بات کی جو حد ہے اس کے اندر نہیں رہنا چاہتا۔ دو حق ہیں۔ دونوں کو اپنی اپنی حدود کے اندر رہنا چاہیے۔ ایک حق ہے تذکیر و تبلیغ کا، ایک پسند و قبولیت کا۔ ہر انسان کو اس کا حق ہے کہ جس بات کو درست سمجھتا ہے، اسے دوسروں کو بھی سمجھائے لیکن اس کا حق نہیں کہ دوسروں کے حق سے انکار کر دے۔ یعنی یہ بات بھلا دے کہ جس طرح اسے ایک بات کے ماننے نہ ماننے کا حق ہے، ویسا ہی دوسرے کو بھی ماننے نہ ماننے کا حق ہے اور ایک فرد دوسرے کے لیے ذمہ دار نہیں۔

تاریخ کو بارہ صدیوں تک اس بات کا انتظار کرنا پڑا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو محض اختلاف عقائد کی بنا پر ذبح نہ کرے۔ اتنی بات سمجھ لے کہ "تذکیر" و "توکیل" میں فرق ہے۔ اب ڈیڑھ سو برس سے یہ بات دنیا کے عقلی مسلمات میں سے سمجھی جاتی ہے، لیکن اسے معلوم نہیں کہ اس کے اعلان کی تاریخ امریکہ اور فرانس کے "اعلان حقوق انسانی" سے شروع نہیں ہوئی۔ اس سے بارہ سو برس پہلے (نزول قرآن کے ساتھ) شروع ہو چکی تھی۔

خوف و حزن

قرآن نے اہل ایمان کی نسبت جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بھی بات اس قدر نمایاں نہیں جس قدر یہ کہ "وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ" (اور یہ قرآن میں کئی مقامات پر ارشاد ہوا ہے۔ البقرہ۔ ۶۲) یعنی وہ خوف اور غم دونوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اس کی

شقاوت کی ساری سر گزشت انہی دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے: خوف اور دکھ۔ جونہی ان دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی، اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آگئیں۔ زندگی کے جتنے کانٹے بھی ہو سکتے ہیں سب کو ایک ایک کر کے چنو، خواہ جسم میں چبھے ہوں، خواہ دماغ میں، خواہ موجودہ زندگی کی عافیت میں خلل ڈالتے ہوں، خواہ آخرت کی۔ تم دیکھو گے کہ ان دو باتوں سے باہر نہیں، یا خوف کا کانٹا ہے یا غم کا۔ قرآن کہتا ہے کہ ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے، جس کے قدم اس راہ میں جم گئے اس کے لیے دونوں کانٹے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہو گا، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

عقل اور ماورائے عقل

قرآن اس بات کی بھی مذمت کرتا ہے کہ علم و بصیرت کے بغیر کوئی بات مان لی جائے اور اس کی بھی کہ محض عدم ادراک کی بنا پر کوئی بات جھٹلا دی جائے۔ اگر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ یہی بات ہے۔ یا تو وہ عقل و بینش سے اس قدر کورا ہو جاتا ہے کہ ہر بات بے سمجھے بوجھے مان لیتا ہے اور ہر راہ میں آنکھیں بند کیے چلتا رہتا ہے، یا پھر سمجھ بوجھ کا غلط استعمال کرتا ہے۔ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالاتر ہوئی، جھٹلا دی۔ اس طرح حقیقت کے اثبات و وجود کا مدار صرف ایک خاص فرد کی سمجھ پر رہ گیا۔

صورتیں دو ہیں اور دونوں کا حکم ایک نہیں۔ ایک یہ کہ کوئی بات عقل کے خلاف ہو۔ ایک یہ کہ تمہاری عقل سے بالاتر ہو۔ بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں، جن کا احاطہ تمہاری سمجھ نہیں کر سکتی، لیکن تم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ سرے سے خلاف عقل ہیں۔ اس لئے کہ اول تو افراد کی عقلی قوت یکساں نہیں، ثانیاً عقل انسانی برابر نشو و ارتقا کی حالت میں ہے۔ ایک عہد کی عقل جن باتوں کا اثبات نہیں کر سکتی دوسرے عہد کے لیے وہ عقلی مسلمات بن جاتی ہیں۔ ثالثاً انسانی عقل کا ادراک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور عقل ہی کا فیصلہ ہے کہ حقیقت اسی حد پر ختم ہو جاتی ہے۔

مرد عورت کی اخلاقی مساوات

قرآن نے مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فضائل و خصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی تفریق نہیں کرتا۔ سورۂ نساء میں جہاں ازدواجی زندگی کے احکام کی تشریح ہے وہاں صاف صاف تصریح کر رہی ہے کہ فضائل و محاسن کے لحاظ سے دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی

راہیں رکھتے ہیں اور دونوں کے لیے ایک ہی طرح پر فضیلتوں کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔[1] چنانچہ جس طرح وہ نیک مردوں کے فضائل و مدارج بتلاتا ہے اسی طرح نیک عورتوں کے بھی بتلاتا ہے یعنی جس طرح مردوں میں مسلم و مومن ہیں اسی طرح ایمان والی عورتیں ہیں۔ جس طرح اطاعت گذار مرد ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی قانت عورتیں ہیں، جس طرح مردوں میں صادق مرد ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی صادقہ عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں اللہ کا خوف رکھنے والے اور بہ کثرت اس کا ذکر کرنے والے ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی اللہ کا خوف رکھنے والیاں اور بہ کثرت ذکر کرنے والیاں ہیں۔

قرآن کریم کی شہادت

مردوں کے لیے فرمایا:

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (سورۃ توبہ: ۱۱۲)

"(اپنی لغزشوں اور خطاؤں سے) توبہ کرنے والے، عبادت میں سرگرم رہنے والے، اللہ کی حمد و ثنا کرنے والے، سیر و سیاحت کرنے والے، رکوع و سجود میں جھکنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں کی حفاظت کرنے والے۔"

عورتوں کے لیے بھی فرمایا:

مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ (سورہ تحریم:۵)

"مسلم عورتیں، مومن عورتیں، فرمانبردار، توبہ کرنیوالیاں، عبادت کرنے والیاں، سیر و سیاحت کرنے والیاں۔"

منافقوں کا ذکر کیا تو دو جنسوں کا کیا"

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ (سورہ توبہ: ۶۷)

"منافق مرد اور منافق عورتیں، سب ایک دوسرے کے ہم جنس، برائی کا حکم دیتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں۔"

پھر فرمایا:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ

---

[1] اشارہ ہے اس آیت کی طرف: لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ (النساء۔ ۳۲) "مردوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصہ ہے۔ اور عورتوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصہ ہے"۔

وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

(سورۃ احزاب: ۳۵)

"مسلم مرد اور مسلم عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور صدق پر کاربند مرد اور صدق پر کاربند عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنیوالی عورتیں اور فروتنی کرنے والے مرد اور فروتنی کرنے والی عورتیں اور اپنی حفاظت کرنے والے پاکباز مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی پاکباز عورتیں اور اللہ کا بہت ذکر کرنے والے مرد اور بہت ذکر کرنے والی عورتیں۔ ان کے لیے اللہ کے ہاں مغفرت اور بڑا درجہ ہے۔"

غور کرو کسی وصف میں تفریق نہیں، کسی فضیلت میں امتیاز نہیں، کسی بڑائی میں عدم مساوات نہیں۔ پھر کیا ممکن ہے کہ جس قرآن نے مردوں اور عورتوں کی اخلاقی مساوات اس درجہ ملحوظ رکھی ہو، اسی قرآن کا یہ فیصلہ ہو کہ عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلے میں زیادہ بد اخلاق ہے؟

صبر اور شکر

"صبر" کے معنی ہیں مشکلوں اور مصیبتوں کے مقابلوں میں جمے رہنا۔ "شکر" کے معنی ہیں اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں (اور نعمتوں) کی قدر کرنا اور انہیں ٹھیک ٹھیک کام میں لانا۔ خدا کا یہ مقررہ قانون ہے کہ جو قوم (مشکلوں اور مصیبتوں کے مقابلے میں ثبات و استقامت پر استوار رہتی ہے اور) خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر بجالاتی ہے اور ان سے ٹھیک طور پر کام لیتی ہے۔ خدا اسے اور نعمتیں عطا فرماتا ہے، لیکن جو کفران نعمت کرتی ہے یعنی قدر شناسی نہیں کرتی، محرومی و نامرادی کے عذاب میں گرفتار ہو جاتی ہے اور یہ اللہ کا سخت عذاب ہے، جو کسی انسانی گروہ کے حصے میں آتا ہے۔

غور کرو یہ حقیقت حال کی سچی تعبیر ہے کہ جو فرد یا گروہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر کرتا ہے مثلاً خدا نے اسے فتحمندی و کامرانی عطا فرمائی ہے وہ اس نعمت کو پہچانتا، اسے ٹھیک طور پر کام میں لاتا اور اس کی حفاظت سے غافل نہیں ہوتا، وہ اور زیادہ نعمتوں کے حصول کا مستحق ہو جاتا ہے یا نہیں؟ جو ایسا نہیں کرتا، اس کی نامرادی و تباہی میں کوئی شک ہو سکتا ہے؟

اکتساب مال اور انفاق مال

ہر انسان کی ذہنی و جسمانی استعداد یکساں نہیں ہوتی، اس لیے وسائل معیشت کے حصول کے اعتبار سے بھی سب کی حالت یکساں نہیں ہوتی۔ کسی کو کمانے کے زیادہ مواقع حاصل ہو گئے کسی کو تھوڑے۔ پہلے

قوت میں مقابلہ ہوا، طاقتور نے کمزور کو مغلوب کر لیا۔ پھر ذہن و جسم کا مقابلہ شروع ہوا اور ذہنی قوت نے جسمانی قوت کو مقہور کر لیا۔

قرآن اس صورت حال سے تو تعرض نہیں کرتا کہ حیثیت کے اعتبار سے تمام انسانوں کی حالت یکساں نہیں، لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ حصول و رزق کے اعتبار سے لوگوں کی حالت یکساں نہ ہو اور کسی کو ملے، کسی کو نہ ملے۔ وہ کہتا ہے ہر انسان جو دنیا میں پیدا ہوا، دنیا کے سامان رزق سے حصہ پانے کا یکساں طور پر حقدار ہے۔

دراصل قرآن کی اس تہ میں یہ بنیادی اصل کام کر رہی ہے کہ وہ نوع انسانی کے مختلف افراد اور جماعتوں کو ایک دوسرے سے الگ اور منقسم تسلیم نہیں کرتا، بلکہ سب کو ایک ہی گھرانے کے مختلف افراد قرار دیتا ہے۔ ایسے افراد جو آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، ایک دوسرے کے شریک حال ہیں۔

(قرآن) کہتا ہے کمائی کے حق کا دامن انفاق کی ذمہ داری سے بندھا ہوا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ تم انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہاں کمائی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خرچ کرنے کی ذمہ داری اٹھائی جائے۔ تم جس قدر کما سکتے ہو کماؤ، لیکن یہ نہ بھولو کہ زیادہ سے زیادہ کمانا، زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کو کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے افراد کے ہاتھ کمائی کے لیے ہیں، لیکن جماعت کا حق خرچ کرانے کا ہے۔

غرض جہاں تک نظام معیشت کا تعلق ہے۔ قرآن نے اکتساب مال کا معاملہ، انفاق مال کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اس لئے کوئی کمائی جائز نہیں تسلیم کی جا سکتی، اگر انفاق سے انکار کرتی ہو۔ ہر وہ کمائی جو محض اکتناز کے لیے ہو اور انفاق کے لیے دروازہ کھلا نہ رکھے، قرآن کے نزدیک ناجائز، ناپاک اور مستحق عقوبت ہے۔

بد عملی کا بڑا مرکز

انفرادی زندگی میں بد عملی کا بڑا مرکز دنیوی خوشحالی کی زندگی ہے۔ خوشحالی و ثروت کی حالت ایک ایسی حالت ہے کہ اگر کسی جماعت میں پھیلی ہوئی ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی برکت نہیں اور اگر صرف چند افراد میں سمٹی ہوئی ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں۔ کیونکہ جب دولت صرف چند افراد کے قبضے میں آگئی، باقی افراد جماعت محروم رہ گئے تو قدرتی طور پر ہر طرح کا غلبہ و تسلط چند افراد کے ہاتھ آ جائے گا اور ایسے غلبہ و تسلط کا نتیجہ غرور باطل اور استکبار عن الحق ہے (اس صورت حال کی الم انگیز مثالیں ہر طرف موجود ہیں)۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن جس جماعتی خوشحالی کو اللہ کا سب سے بڑا فضل قرار دیتا ہے، اسی کو انفرادی

حالت میں "فتنہ" اور "متاع غرور" بھی کہتا ہے۔

آج تمام دنیا میں شور مچ رہا ہے کہ انفرادی سرمایہ داری دنیا کے لیے مصیبت ہے، لیکن قرآن چودہ سو برس پہلے اسے "فتنہ" قرار دے چکا اور اس کے لیے اکتناز کا لفظ بول چکا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا (سورۃ توبہ: ۳۴)

"اور جو لوگ چاندی اور سونا اپنے ذخیروں میں جمع کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے۔"

مشکل یہ ہے کہ جب تک قرآن کی صدا قرآن کی صدا ہے تمہاری نظروں میں چبھتی نہیں، جب وہی بات وقت کے ذہن و فکر سے اٹھنے لگتی ہے تو فوراً اس کی پرستش شروع کر دیتے ہو۔

فضیلت و کامرانی کے طریقے

سورہ اعراف میں ہے:

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۚ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ (آیت ۱۹۸۔ ۱۹۹)

"(اے پیغمبر) اگر تم ان لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف بلاؤ تو ہرگز تمہاری پکار نہ سنیں۔ تمہیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمہاری طرف تک رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دیکھتے نہیں (بہر حال) نرمی و گزر سے کام لو، نیکی کا حکم دو، جاہلوں کے طرف متوجہ نہ ہو۔"

(دیکھیے) چند لفظوں کے اندر زندگی کی اخلاقی مشکلات کا پورا حل اور فضیلت و کامرانی کے تمام طریقے واضح کر دے۔ "خُذِ الْعَفْوَ"، "امر بالمعروف" اور "اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ" یعنی ناسمجھوں کی ناسمجھی بخش دینا، نیکی کی دعوت میں سرگرم رہنا اور جاہلوں کے پیچھے نہ پڑنا۔ سرسری نظر میں پتا نہیں لگے گا، اچھی طرح اور بار بار غور کرو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کون سا گوشہ ہے جس کی ساری عملی مشکلات ان تین اصلوں سے حل نہیں ہو جاتیں؟

آیت ۱۹۸ میں فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ تجھے دیکھتے نہیں کیونکہ اگر دیکھتے تو کبھی انکار نہ کرتے۔ سو ایک دیکھنا سلمان رضی اللہ عنہ فارسی کا تھا، جو پہلی ہی نگاہ میں پکار اٹھا: واللہ ما ھذا الوجہ وجہ الکذاب (خدا کی قسم یہ صورت جھوٹے آدمی کی ہو نہیں سکتی) اور ایک دیکھنا ابو جہل کا تھا کہ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ (یہ کیسا نبی ہے کہ آدمیوں کی طرح غذا کا محتاج ہے اور بازاروں میں پھرتا ہے؟ الفرقان: ۷)

وفائے عہد اور قرآن

عہد جاہلیت کے عرب وفاے عہد کی اخلاقی قدر و قیمت سے بے خبر نہ تھے، ان میں ایسے لوگ بھی تھے، جو اپنے اور اپنے قبیلے کے مفاخر میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ وفائے عہد کو دیتے تھے، لیکن جہاں تک جماعتی معاہدوں کا تعلق ہے، وفائے عہد کا عقیدہ کوئی عملی قدر و قیمت نہیں رکھتا تھا۔ آج ایک قبیلہ ایک قبیلے سے معاہدہ کرتا تھا، کل دیکھتا تھا کہ اس کے مخالف زیادہ طاقتور ہو گئے ہیں تو بے دریغ ان سے جاملتا تھا اور معاہد و حلیف پر حملہ کر دیتا تھا۔ اگر کسی دشمن فریق سے (عہد جاہلیت کے عرب) امن کا معاہدہ کرتے، پھر دیکھتے کہ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع پیدا ہو گیا ہے تو ایک لمحے کے لیے بھی معاہدے کا احترام انہیں حملہ کر دینے سے نہیں روکتا تھا اور بے خبر دشمن پر جا گرتے تھے۔

قرآن راستبازی کی جو روح پیدا کرنا چاہتا تھا وہ ایک لمحے کے لیے بھی ایسی بد اخلاقی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے وفائے عہد اور احترام پیمان کا جو معیار قائم کیا ہے وہ اس درجہ بلند، قطعی، بے لچک اور عالمگیر ہے کہ انسانی اعمال کا کوئی بھی گوشہ اس سے باہر نہیں رہ سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ فرد ہو یا جماعت، ذاتی معاملات ہوں یا سیاسی، عزیز ہوں یا اجنبی، ہم قوم و مذہب ہوں یا غیر ہم قوم و مذہب، دوست ہوں یا دشمن، امن کی حالت ہو یا جنگ کی، لیکن کسی بھی حال میں عہد شکنی جائز نہیں، وہ ہر حال میں جرم ہے، معصیت ہے۔ اللہ کے ساتھ ایک بات کر کے اسے توڑ دینا ہے عذاب عظیم کا اپنے کو مستحق ثابت کرنا ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جابجا وفائے عہد پر زور دیا ہے اور جہاں کہیں مومنوں کے ایمانی فضائل کی تصویر کھینچی ہے، یہ وصف سب سے زیادہ ابھرا ہوا نظر آتا ہے:

ا۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا (البقرۃ: ۱۷۷)

"اور جب قول و قرار کر لیتے ہیں تو اس کا پاس کرتے ہیں۔"

۲۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۸﴾ (المؤمنون ۔۸)

"نیز جن کی حالت یہ ہے کہ اپنی امانتوں اور عہدوں کا پاس رکھتے ہیں۔"

احادیث میں منافق کی یہ پہچان بتلائی گئی ہے: اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ: "جب وعدہ کرے گا پورا نہ کرے گا۔"

سورۃ نحل آیت ۹۲ میں فرمایا:

تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَكُمْ دَخَلًا بَیْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ اِنَّمَا یَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ

"تم آپس کے معاملے میں اپنی قسموں کو مکر و فساد کا ذریعہ بناتے ہو، اس لیے کہ ایک گروہ کسی دوسرے گروہ سے (طاقت میں) بڑھ چڑھ گیا ہے (یاد رکھو) اس معاملے میں اللہ تمہاری (راستبازی اور استقامت کی)

آزمائش کرتا ہے۔"

پھر اس طرح کی بدعہدی کی مثال کیا ہے؟ فرمایا:

كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا (اس عورت کی سی ہے جس نے بڑی جانفشانی سے سوت کاتا، پھر خود ہی اسے ٹکڑے کرکے برباد کر دیا۔ النحل۔ ۹۲) یعنی جب ایک شخص یا ایک گروہ کوئی معاہدہ کرتا ہے تو اس کی پختگی کے لیے بڑی باتیں کرتا ہے۔ ہر طرح دوسرے فریق کو یقین دلاتا ہے۔ پھر اگر ایک بات اتنی کوشش کے بعد پختہ کی گئی ہے تو کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ جس نے کل پختہ کی تھی، وہی آج اسے اپنے ہاتھوں سے توڑ کر رکھ دے۔

رسول اکرم ﷺ کی شان رافت ورحمت

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾ (توبہ: ۱۲۸۔۱۲۹)

"تمہارے پاس اللہ کا رسول آ گیا ہے جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہشمند ہے۔ وہ مومنوں کے لیے شفقت اور رحمت رکھنے والا ہے اگر اس پر بھی یہ لوگ سرتابی کریں تو ان سے کہہ دو میرے لیے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے کوئی معبود نہیں مگر اس کی ذات، میں نے اسی پر بھروسا کیا وہ تمام عالم ہستی (کی جہانداری) کے عرش عظیم کا خداوند ہے۔"

ان دو آیتوں میں عرب کی اس نسل سے خطاب ہے جو اس وقت مخاطب تھی۔ فرمایا: اللہ کا رسول تم میں آ گیا اس نے اپنا فرض رسالت ادا کر دیا۔ وہ کسی دوسری جگہ سے تم میں نہیں آ نکلا تھا۔ سنت الٰہی کے مطابق خود تمہیں میں پیدا ہوا اور چونکہ تمہیں میں سے ہے، اس لیے اول سے آخر تک اس کی ساری باتیں تمہاری نگاہوں کے سامنے رہی ہیں۔ اس کا لڑکپن بھی تم میں گزرا اس کی جوانی کے دن بھی تم میں بسر ہوئے۔ پھر اس نے نبوت کا اعلان کیا تو اس نے تم سے کہیں چھپ کر زندگی بسر نہیں کی، اس کی ساری باتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے پھر جو کچھ گزرنا تھا، گزرا۔ تم نے مظلومی و بیکسی کے اعلان بھی سن لیے۔ فتح وکامرانی میں ان کی تصدیق بھی کر لی۔ تم میں کوئی نہیں جو اس کی بے داغ زندگی کا شاہد نہ ہو اور کوئی نہیں جس نے اس کی ایک ایک بات کی سچائی آزمانہ لی ہو۔

پھر (رسول ﷺ کے) ایک ایسے وصف پر زور دیا، جو منصب رسالت کے لیے اور ہر اس انسان کے لیے جو قوم کی رہنمائی و قیادت کا مقام رکھتا ہو، سب سے زیادہ ضروری ہے، یعنی ابنائے جنس کے لیے شفقت و رحمت۔ فرمایا: اس سے زیادہ کوئی بات تمہارے لیے یقینی نہیں ہو سکتی کہ وہ سرتاپا شفقت و

رحمت ہے۔ وہ تمہارا دکھ برداشت نہیں کر سکتے۔ تمہاری ہر تکلیف خواہ جسم کے لیے ہو، خواہ روح کے لیے، اس کے دل کا درد و غم بن جاتی ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کی خواہش سے لبریز ہے۔ وہ اس کے لیے ایسا مضطرب قلب رکھتا ہے کہ اگر اس کی بن پڑتی تو ہدایت وسعادت کی ساری پا کیاں پہلے ہی دن گھونٹ بنا کر پلا دیتا۔ پھر اس کی یہ شفقت ومحبت تمہارے ہی لیے نہیں وہ تو تمام مومنوں کے لیے خواہ عرب کے ہوں یا عجم کے "رؤف رحیم" ہے۔

"رؤف" "رافت" سے ہے اور اس کا اطلاق ایسی رحمت پر ہوتا ہے جو کسی کی کمزوری اور مصیبت پر جوش میں آئے۔ پس رافت رحمت کی ایک خاص صورت ہے اور رحمت عام ہے۔ دونوں کے جمع کر دینے سے رحمت کا مفہوم زیادہ قوت و تاثیر کے ساتھ واضح ہو گیا۔

خدا نے یہ دونوں وصف جابجا اپنے لیے فرمائے ہیں اور یہاں اپنے رسول کے لیے بھی فرمائے۔

پیام موعظت کی ضرورت

اس کے بعد مجمع مخاطبین یہ سب کچھ دیکھ لینے اور تجربہ کر لینے کے بعد بھی ادائے فرض سے اعراض کرے تو اسے پیغمبر تم آخری اعلان کرو کہ میرے لیے اللہ بس کرتا تھا اور اب بھی بس کرتا ہے۔ وہ اپنے کلمہ حق کا محافظ ہے اس کی مشیت نے جو فیصلہ کر دیا ہے بہر حال ہو کر رہنے والا ہے۔ اس کا قیام و عروج کسی خاص ملک اور قوم کی پشت پناہی پر موقوف نہیں۔ میرا بھروسہ اللہ ہی پر تھا، اسی پر ہے، میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔

یہ پیام موعظت یہاں کیوں ضروری ہوا؟ اس کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ دو باتیں سامنے رکھ لی جائیں: سورۃ (یعنی سورۃ توبہ) کے نزول کا وقت اور سورۃ کے مطالب۔ یہ سورۃ اس وقت نازل ہوئی جب تمام عرب میں کلمۂ حق سربلند ہو چکا تھا اور گو قرآن کی عالمگیر فیروز مندیوں کی خبر دے دی تھی، تاہم ان لوگوں کے لیے جو کل تک غربت و بیکسی کی انتہائی مصیبتوں میں رہ چکے تھے۔ تمام عرب کا مسلمان ہو جانا بڑی سے بڑی کامرانی تھی اور اس لیے ناگزیر تھا کہ ایک طرح کی فارغ البالی اور بے پروائی طبیعتوں میں پیدا ہو جائے۔ غزوۂ تبوک کی تیاریوں میں بعض سے جو تساہل ہوا اس کی تہ میں بھی اس حالت کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۃ میں اس تفصیل اور شدت کے ساتھ استعداد کار اور عزم وہمت کی گئی ہے کہ اس کی نظیر کسی دوسری سورۃ میں نہیں ملتی۔

تاریخ انسانیت کے نوادر

کوئی شخص کتنے ہی مخالفانہ ارادے سے مطالعہ کرے، لیکن تاریخ اسلام کے چند واقعات اس درجہ

واضح اور قطعی ہیں کہ ممکن نہیں کہ ان سے انکار کیا جاسکے۔ ازاں جملہ یہ کہ جو جماعتیں پیغمبر اسلام صلعم کی مخالف تھیں، ان کے تمام کام اول سے آخر تک ظلم و تشدد، دغا و فریب اور وحشت و تشدد پر مبنی رہے اور پیغمبر اسلام صلعم اور ان کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا اس کا ایک ایک فعل، صبر و تحمل، راستی و دیانت اور عفو و بخشش کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ تھا:

۱۔ مظلومی میں صبر۔

۲۔ مقابلے میں عزم۔

۳۔ معاملے میں راستبازی۔

۴۔ طاقت و اختیار میں درگزر۔

تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں، جو کسی ایک زندگی کے اندر اس طرح کبھی جمع نہیں ہوئے (جس طرح رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکت کے اندر جمع ہوئے اور پورا عہد مبارکہ نبوت ان نوادر کی درخشانیوں سے جگمگا رہا ہے۔ گویا سیرۃ طیبہ کا نچوڑ یہی ہے جو حقیقت میں انسانیت عالیہ و عظمیٰ کا سدرۃ المنتہیٰ ہے)۔

"نذیر" و "بشیر"

انسان کی ایک عالمگیر گمراہی یہ رہی ہے کہ جب کوئی انسان روحانی عظمت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو چاہتے ہیں کہ اسے انسانیت و بندگی کی سطح سے بلند کرکے دیکھیں۔ لیکن قرآن نے پیغمبر اسلام ﷺ کی حیثیت صاف اور قطعی لفظوں میں واضح کردی کہ ہمیشہ کے لیے اس گمراہی کا ازالہ ہوگیا۔ صرف یہی ایک بات ان کی صداقت کے اثبات کے لیے کفایت کرتی ہے۔

جو دنیا پیشواؤں کو خدا اور خدا کا بیٹا بنانے کی خواہشمند تھی، اسلام کے پیغمبر ﷺ نے اس سے اتنا بھی نہ چاہا کہ کاہنوں کی طرح مجھے غیب دان تسلیم کرلو۔ زیادہ سے زیادہ اپنی نسبت جو بات سنائی، یہ تھی کہ میں انکار و بد عملی کے نتائج سے خبر دینے والا "نذیر" اور ایمان و نیک عملی کی برکتوں کی بشارت دینے والا "بشیر" ایک بندہ ہوں، اگر غیب داں ہوتا تو زندگی کا کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا:

کیا ایسے انسان کی زبان سے سچائی کے سوا کوئی بات نکل سکتی ہے؟

چہ عظمت دادہ ای یا رب بخلق آں عظیم الشاں
کہ "انی عبدہ" گوید بجائے قول "سبحانی"

رحمت وشفقت کا ابر گہربار

آدمیت احترام آدمی

ہدایت کے لیے لامتناہی تڑپ

رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک میں مخلوق کے لیے بے پایاں شفقت ورحمت کا جو سمندر موجزن تھا، اس کا ذکر کتاب میں پے درپے آتا رہا ہے، ساتھ ساتھ مثالیں پیش ہوتی رہی ہیں۔ باقی رہی شفقت ورحمت کی مفصل کیفیت تو اگر میں بیان کرنا بھی چاہوں تو الفاظ اور بیان مطالب کی صلاحیت کہاں سے لاؤں؟ وہی ایرانی شاعر کا معاملہ ہے:

کتاب فضل ترا آب بحر کافی نیست
کہ تر کنم سر انگشت وصفحہ بشمارم

ہمارے لیے کلام الٰہی سے بڑھ کر قاطع، فیصلہ کن اور دل پذیر شہادت کوئی نہیں ہوسکتی۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ (کہف:٦)

"(اے پیغمبر تری حالت تو یہ ہو رہی ہے کہ) اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائیں تو عجب نہیں تو ان کے پیچھے افسوس کے مارے اپنی جان ہلاکت میں ڈال دے۔"

کیا خلق خدا کی دنیوی اور اخروی بہبود کے لیے انتہائی محبت و شیفتگی کی کوئی روشن تر شہادت ہو سکتی ہے۔ جس کا دائمی ذکر اس کتاب مقدس میں محفوظ ہو گیا۔ جو ذکرٌ للعٰلمین ہے؟ یہ غمگینی اور اندوہنا کی روئے زمین کے تمام انسانوں اور پوری نوع بشر کے لیے تھی، خواہ ان کا تعلق کسی نسل، کسی خطے اور کسی قوم سے تھا۔

انبیائے کرام ہدایات اصلاح کے طالب ہی نہیں، عاشق ہوتے ہیں۔ انسانوں کی گمراہی ان کے دلوں کا ناسور ہوتی ہے اور ہدایت کا جوش ان کے دل کے ایک ایک ریشے کا عشق۔ اس سے بڑھ کر ان کیلیے

کوئی غمگینی نہیں ہو سکتی کہ ایک انسان سچائی سے منہ موڑ لے اور اس سے بڑھ کر ان کے لیے کوئی شادمانی نہیں ہو سکتی کہ ایک گمراہ قدم راہ راست پر آجائے۔ قرآن میں اس صورت حال کی شہادتیں جابجا ملتی ہیں
۔

غور طلب حقائق

آپ نے اس صورت حال کے اسباب پر بھی کبھی غور فرمایا؟ یہ خیال کر لینا تو انتہا درجے کی سخافت و کم عقلی کا ثبوت ہو گا کہ داعی حق ایک انسان نما مشین ہوتا ہے جو اوپر سے نازل شدہ ہدایات کو خلق خدا کے سامنے دہراتا رہتا ہے، حاشا وکلا۔

۱۔ مشیت ایزدی جن مقدس ہستیوں کو دعوت حق کے لیے چنتی رہی ان کی فطرتیں ہم جنسوں کی اصلاح و فلاح اور سود و بہبود کے غم میں سراپا سوز و درد ہوتی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی داعی حق روزگار کی حد درجہ حوصلہ فرسا مشکلات کے باوجود اپنے وظیفے کی بجا آوری پر چٹان کی طرح جما کیونکر رہ سکتا تھا؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ انتہائی ناساز گار حالات میں یہ کیوں فرماتے کہ خدا کی قسم' اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں، تب بھی میں اپنے فریضۂ دعوت سے باز نہ آؤں گا، یہاں تک کہ خدا اس کام کو پورا کر دے یا خود میں اس پر نثار ہو جاؤں۔

۲۔ قرآن مجید اس حقیقت کی پے درپے گواہی دے رہا ہے کہ ہر داعی حق نے آغاز دعوت کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا کہ میں اس کام کے لیے کسی سے اجر کا طلبگار نہیں۔ میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے۔ اگر ہر داعی حق کے قلب مقدس میں ہم جنسوں کو راہ راست پر لانے کے لیے انتہائی تڑپ نہ ہوتی تو ہر قسم کی ذاتی اغراض سے کامل برات کا دعویٰ کیوں بار بار زبان پر لایا جاتا؟

۳۔ پھر ہر داعی حق پر ایک ایک فعل اور ایک ایک حرکت کے نتائج و عواقب برای العین آشکارا ہوتے ہیں۔ انجام بد کا تصور ایک شے ہے، انجام بد کی تلخیوں اور ناخوشگواریوں کا مشاہدہ بالکل دوسری شے ہے۔

۴۔ اگر کسی کا قدم گمراہی میں بڑھتا جائے تو عام لوگ سمجھیں گے کہ وہ از روئے شریعت عذاب کا سزاوار ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بخش دے تو دوسری بات ہے، لیکن داعی حق پر معاملہ جزا اسی طرح عیاں ہوتا ہے جس طرح سلیم البصارت آدمی کو دن کے وقت آفتاب نظر آتا ہے۔ پھر ہم جنسوں کے لیے بے پایاں شفقت و رحمت کی بناء پر سب کو تعزیر و عقوبت کی حوصلہ فرسائیوں اور شکیب گدازیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے داعی حق جس غمگینی و اندوہناکی اور جس اضطراب و بے تابی کا تختہ

مشق بنتا ہو گا، اس کی شدت اور وسعت حدود ہمارے محدود اور آلودہ اغراض ذہنوں میں کیونکر سما سکتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے خود ایک موقع پر فرمایا کہ میں تمہیں دامن پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں مگر تم آگ میں گر پڑتے ہو۔

۵۔ رسول اللہ ﷺ تمام مکارم و فضائل نبوت کے جامع تھے، کیونکہ آپ ﷺ پورے عالم انسانیت کی ہدایت کے لیے معبوث ہوئے تھے، اس لیے تمام خصوصیات میں بھی سب سے افضل تھے۔ سورۃ کہف کی محولہ بالا آیت کے دو پہلو ہیں اور دونوں بہ ہر حال ہر اس فرد کے پیش نظر ہونے چاہئیں جو رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات سے انتساب کا مدعی ہو:

الف: یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے جوش دعوت و اصلاح اور نوع بشر کے لیے بے پایاں شفقت کا صحیح نقشہ پیش کر رہی ہے۔

ب۔ ہر مدعی اسلام کا فرض ہے کہ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" کی پیروی میں حضور ﷺ کی ان خصوصیتوں (جوش دعوت و اصلاح اور بے پایاں شفقت و رحمت) کا بھی بہتر عملی پیکر بنے۔

واقعہ طائف

حضور ﷺ کے سفر طائف کا ذکر کرتے ہُوئے عرض کیا جا چکا ہے کہ دعوت حق کی جو سرگزشت دُنیا کے مذہبی دفتروں اور سفینوں میں محفوظ ہے، اس میں سے کوئی ایسا واقعہ دکھایا نہیں جا سکتا جو طائف میں حضور ﷺ کی دعوت حق کا مثیل بن سکے، دیکھیے:

۱۔ سفر طائف کا مقصد اس کے سوا کیا تھا کہ اہل طائف ہدایت کی راہ پر لگ جائیں؟ اس میں انہی لوگوں کی بھلائی اور بہتری تھی، دنیوی بھی اور اخروی بھی، حضور ﷺ نے صرف فریضۂ تبلیغ ادا کرنے میں ہر زحمت گوارا فرمائی تھی۔

۲۔ طائف کے گمراہ اور حق ناشناس رئیسوں نے حضور ﷺ سے جو سلوک روا رکھا وہ ہر زاویہ نگاہ سے ظلم و تعدی کا ایک نہایت افسوسناک مظاہرہ تھا۔ عرب کے دورِ جاہلیت میں ایسے مظاہروں کی کہیں بھی کمی نہ تھی۔

۳۔ ان رئیسوں کی انگیخت پر اوباشوں نے رسول اللہ ﷺ کو سنگ باری کا ہدف بنایا، یہاں تک کہ پیشانی مبارک کا خون بہ بہ کر پائے مبارک تک پہنچ گیا اور آپ ﷺ نے ایک باغ میں پناہ لی۔

۴۔ اس دردناک حالت میں بھی آپ ﷺ کے قدوسی تحمل پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اس موقع پر بارگاہ باری تعالیٰ میں جو دُعا کی، وہ اپنے محل پر منقول ہے۔ اس میں سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکالا جا سکتا جس سے

تلخی وناخوشگواری کی بُو سُو نگھی جاسکے۔ اللہ کی لگن کے سوا حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے قلب صافی میں اور کسی چیز کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔

۵۔ پھر یہ بھی فرمایا: میں ان لوگوں کی تباہی کے لیے کیوں دُعا مانگوں؟ اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو کیا ہُوا، ان کی آئندہ نسلیں ضرور ایک خدا پر ایمان لائیں گی۔

کیا اپنے پیغام کی صداقت پر بے پایاں یقین اور ہم جنسوں کے لیے بے پایاں رحمت کی ایسی کوئی مثال مل سکتی ہے؟ کیا ہدایت کی لامتناہی امید کا کوئی ایسا نقشہ آپ کو کسی دوسری جگہ نظر آسکتا ہے؟

تاریخ گواہ ہے کہ آئندہ نسلیں نہیں، خود وہ نسل بھی حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے دست مبارک پر ایمان لائی، جس کے ہاتھ چند سال پیشتر حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو سنگ باری کا نشانہ بنا چکے تھے۔ یقین رکھیے واقعہ طائف اپنی معنوی بے مثالی ہی کی بن پر سیرۃ طیبہ کا ایک اہم موڑ بن گیا، جہاں سے ہجرت کے مقدمات شروع ہو گئے اور دین حق کی دعوت اس منزل کے دروازے پر پہنچ گئی، جس میں ”یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۝۲“ (النصر۔ ۲) کا نظارہ مہر وماہ کی آنکھوں کے لیے جشن عید بننے والا تھا۔

عہد نبوی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی جنگیں

ہم جنسوں کے لیے بے پایاں شفقت ورحمت کی ایک روشن دستاویز عہد نبوی کی جنگیں بھی ہیں، جن کی حقیقی حیثیت اور معنوی خصوصیت پر اب تک بہت کم توجہ فرمائی گئی ہے۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کسی بھی دور میں جنگ کے خواہاں نہ تھے جو دین عالم انسانیت کے لیے صلح وامن، محبت واخوت اور فلاح وبہبود کا پیغام تھا، اس میں رزم وپکار کے لیے کون سی گنجائش ہو سکتی تھی؟ لیکن قریش مکہ کے غرور وتکبر اور ظلم وجور نے شریف وحق پرست انسان کے لیے جینا دوبھر کر دیا، حالانکہ ان کی نکوکاری حق پرستی اور شرافت کسی کے لیے بھی باعث تکلیف نہیں ہو سکتی تھی، مجبور ہو کر پہلے ایک جماعت کو حبش جانے کی اجازت دے دی گئی۔ قریش مکہ نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا، پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا انتظام ہُوا۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور صحابہ کرام پشتوں کے گھر بار چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے گئے لیکن یہ بُعد مکانی بھی قریش کی آتش اشتعال روک نہ سکا۔ بلکہ ان کی پیش دستیوں اور آزار رسانیوں کا سلسلہ تیز تر ہو گیا۔ ان حالات میں حفظ ودفاع اور پیش بندیوں کے سوا چارہ نہ رہا اور حفظ ودفاع اس دنیا میں ہر فرد وجماعت کا اولین فطری حق ہے، جس پر امن عالم کا انحصار ہے۔

غزوات وسرایا

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو جن مہموں سے سابقہ پڑا انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن مہموں کی

قیادت حضور ﷺ نے بہ نفس نفیس فرمائی انھیں غزوات کہتے ہیں، جن مہموں کی سر عسکری پر دوسرے اصحاب مامور ہُوئے انہیں سرایا (جمع سریہ) کہا جاتا ہے۔

قاضی محمد سلیمان مرحوم منصور پوری نے "رحمۃ للعٰلمین" کی دوسری جلد میں بیاسی غزوات، سرایا کا ذکر نام بنام کیا ہے اور ان کی تفصیلات بتائی ہیں ا۔ بعض کتابوں میں اس سے بہت کم تعداد کا ذکر ہوا ہے لیکن اصل سوال تعداد کا نہیں بلکہ نوعیت کا ہے۔ ان سب کو عموماً غزوات یا سرایا ہی قرار دے لیا گیا ہے حالانکہ ان میں سے اکثر ایسی تھیں، جنھیں کسی بھی زاویہ نگاہ سے جنگیں سمجھنا یا جنگیں قرار دینا صحیح نہ ہو گا۔ مثلاً ابن حزمؒ نے حدیبیہ کو بھی غزوہ قرار دیا ہے حالانکہ نہ رسول اللہ ﷺ جنگ کے ارادے سے نکلے تھے، نہ جنگ کی نوبت آئی۔ آپ ﷺ صرف عمرہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ جس کے دروازے سب کے لیے کھلے تھے اور حضور ﷺ کا یہ سفر ذی قعدہ میں ہوا تھا، جو اشہر الحرم میں سے تھا یعنی جس میں کشمکش یا روک تھام قریش کے لیے جائز ہی نہ تھی۔ قاضی سلیمان مرحوم نے انھیں مہمیں بھی نہیں کہا بلکہ محض "نقل و حرکت" قرار دیا ہے اور یہ تعبیر ان میں سے اکثر کی حقیقی کیفیت کی صحیح آئینہ دار ہے۔

مہموں کی نوعیت

قاضی سلیمان مرحوم کی بیان کردہ بیاسی مہموں میں سے بیشتر کی کیفیت خلاصتہً ذیل میں درج کی جاتی ہے:

ا۔ ان میں سے بعض کو جنگیں قرار دینا واقعتہً غلط ہے۔ مثلاً رجیع اور بئر معونہ کی طرف جو لوگ بھیجے گئے وہ نہ فوجی دستے تھے نہ اس غرض سے بھیجے گئے تھے کہ لڑیں۔ وہ محض مبلغ اور مقرری تھے، اس وجہ سے بھیجے گئے تھے کہ لوگوں نے قرآن اور اسلام سیکھنے کی غرض سے ان کے ارسال پر اصرار کیا تھا۔ بئر معونہ بھیجے جانے والے لوگوں کے لیے ایک رئیس قبیلہ نے ذاتی ضمانت بھی قبول کرلی تھی۔ یہ کل اسی (۸۰) افراد تھے۔ ستر بئر معونہ اور دس رجیع بھیجے گئے۔ ان دونوں جماعتوں کو اچانک غداری سے سابقہ پڑا۔ اسی (۸۰) میں سے صرف ایک محفوظ رہا، باقی سب نے شہادت پائی، ان کا نقصان بھی جنگی نقصانات میں محسوب نہیں ہو سکتا۔

۲۔ پھر ان میں سے خاصی مہمیں ایسی تھیں جن میں بہت کم آدمی بھیجے گئے، اتنے کم کہ انھیں جنگوں میں شامل کرنا مضحکہ خیز ہو گا۔ مثلاً:

آدمی	مہمیں
ایک ایک	۵
پانچ پانچ	۲

دس دس	۲
بارہ بارہ	۲
پندرہ پندرہ	۳
بیس بیس	۴
پچیس پچیس	۲
تیس تیس	۵
چالیس چالیس	۲

گویا ستائیس مہموں میں اتنے تھوڑے آدمی بھیجے گئے کہ انھیں جنگیں کہا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ دراصل طلایہ گرد دستے تھے، جو اس وجہ سے وقتاً فوقتاً اطراف میں بھیجے گئے کہ دشمن کی نقل و حرکت کے متعلق معلومات حاصل کریں تاکہ اس کے مفسدانہ منصوبوں سے آگاہ ہو کر مناسب دفاعی تدبیریں عمل میں لائی جا سکیں یا کہیں کوئی فتنہ انگیز فرد قتل و غارت کے عادی قبیلوں کو برانگیختہ کر کے مدینہ منورہ پر چھاپا مارنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ایک جانباز گیا اور اس فتنہ انگیز کو "وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ" (البقرہ۔۲۱۷) کے اصول پر ختم کر کے چلا آیا اور وہاں لوگ امن چین سے بیٹھ گئے۔

۳۔ حدیبیہ کا ذکر پہلے آ چکا ہے، وہ جنگ تھی ہی نہیں، اس کا مقصد ادائے عمرہ تھا۔ آخر قریش سے دس سال کے لیے صلح ہو گئی نیز قرار پا گیا کہ مسلمان آئندہ سال آ کر عمرہ ادا کر لیں۔ قریش تین روز کے لیے شہر مکہ سے نکل کر آس پاس کے پہاڑوں میں جا بیٹھیں گے۔

۴۔ بعض مہمیں اس وجہ سے تیار ہوئیں کہ دشمن کے چھاپا مار دستے اچانک حملہ کر کے چند امن پسند شہریوں کو خاک و خون میں تڑپا چکے تھے، ان کا تعاقب کیا گیا۔ ایسی مہمیں بھی عرفاً جنگ نہیں سمجھی جا سکتیں۔

۵۔ بعض مہمیں اطراف مدینہ کے قبیلوں کے پاس گئیں اور ان سے معاہدہ ہائے صلح و امن کر لیے۔ ان معاہدوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ دشمن کی فتنہ انگیزی کا دائرہ محدود کر دیا جائے اور قبیلوں کو دشمن کی عیاریوں کا تختہ مشق نہ بننے دیا جائے۔

۶۔ ایک مثال ایسی بھی ہے کہ کچھ لوگ باہر سے آئے جو بیمار تھے انھیں رحم کھا کر مدینہ کی چراگاہ میں ٹھہرا دیا گیا تاکہ کھلی آب و ہوا میں رہیں اور اونٹنیوں کا دودھ پیئیں۔ وہ تندرست ہو گئے لیکن دورِ جاہلیت کے احسان ناشناسوں کی طرح انہوں نے چراگاہ کے رکھوالے کو شہید کر ڈالا اور اونٹ ہنکا لے گئے۔ ان کا بھی تعاقب کر کے انہیں پکڑا اور مناسب سزا دی گئی۔ اسے کون جنگ کہنا پسند کرے گا؟

۷۔ ایک مرتبہ بعض قبائلیوں نے اچانک چراگاہ پر حملہ کر دیا تھا اور کچھ اونٹ ہنکا لے گئے تھے۔ ان کا بھی

تعاقب کیا گیا اور اونٹ واپس لے لیئے گئے، یہ بھی جنگ نہ تھی۔

جانی نقصان

سیرت نگاروں نے ان تمام مہموں کو باقاعدہ جنگیں قرار دے لیا اور اس طرح تعداد خاصی بڑھ گئی حالانکہ ان میں سے ایک بھی مہم ایسی نہ تھی جسے جنگ کہا جا سکے۔ بلاشبہ بعض مہمیں ایسی ہیں کہ اطلاع ملی، فلاں مقام پر لوگ اس غرض سے جمع ہو رہے ہیں کہ مدینہ منورہ پر حملہ کر کے اول لوٹ مار کا شوق پورا کریں دوم قریش مکہ کی نظروں میں اعتبار پائیں، جو ہر اس گروہ کو سر پر بٹھانے کے لیے تیار رہتے تھے' جس کے ذریعے سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے، ایسے بعض گروہوں کے خلاف اچانک اقدام کر کے انھیں منتشر کر دیا گیا۔ ایسی مہموں میں مسلمانوں کو بھی جانی نقصان پہنچا اور غیر مسلموں کے آدمی بھی قتل ہوئے۔ غرض میں نے قاضی سلیمان مرحوم کی درج کی ہوئی فہرست میں سے کم و بیش ستر مہمیں الگ کر لیں، جنہیں کسی بھی اعتبار سے جنگ نہیں کہا جا سکتا اور ان کے جانی نقصان کے اعداد بھی قاضی صاحب مرحوم ہی کی فہرست کے مطابق جمع کیے تو نتیجہ یہ نکلا:

فریق	نقصان جان
مسلمان	۹۶
مخالفین	۱۸۸

بعض مہموں میں مخالفوں کے مقتولوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی اور قاضی صاحب مرحوم بھی انکا کوئی سراغ نہ لگا سکے۔ وہ اعداد قیاساً شامل کر لینے چاہئیں تاہم وہ پندرہ بیس سے زیادہ نہ ہوں گے۔ ان اعداد میں بنو قریظہ کے ان افراد کا جانی نقصان شامل نہیں، جنھیں سعد رضی اللہ عنہ بن معاذ کے فیصلہ ثالثی کی بنا پر موت کی سزا دی گئی تھی، یہ سزا موسوی شریعت کے عین مطابق تھی اور سعد رضی اللہ عنہ کو بنو قریظہ نے خود ثالث بنایا تھا۔ ان مقتولین میں ایک عورت بھی تھی، جسے اس لیے سزائے موت ملی کہ اس نے قلعے کی چھت پر سے ایک مسلمان پر چکی کا پاٹ گرا کر شہید کر دیا تھا، حالانکہ وہ دیوار کے سایے صرف ستانے کے لے بیٹھ گیا تھا۔ یہ لوگ میدان جنگ کے مقتولین نہ تھے۔ اسی طرح رجیع اور بئر معونہ کے مسلمان شہدا بھی مسلمانوں کے جانی نقصان میں شامل نہیں۔

باقاعدہ جنگیں

جن مہموں کو باقاعدہ جنگیں قرار دیا جا سکتا ہے، وہ بھی مسلمانوں کو بالکل ناخواستہ پیش آ گئی تھیں اور ان میں بھی پیش دستی مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوئی تھی۔ مثلاً

۱۔ غزوہ بدر یوں پیش آگیا: رسول اللہ ﷺ یہ اطلاع پا کر مدینہ منورہ سے نکلے کہ قریش کا وہ قافلہ تجارت شام سے لوٹ رہا ہے، جس کا پورا نفع مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری میں صرف ہونیوالا تھا' اس قافلے کو روکنا ضروری تھا۔ لیکن سالار قافلہ مختلف اطلاعات کی بنا پر پہلے ہی عام راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے نکل گیا' جو دس بارہ میل مغربی جانب تھا۔ اس اثنا میں یہ اطلاع مل گئی تھی کہ قریش ایک ہزار کے قریب سواروں اور پیادوں کے ساتھ بدر پہنچ گئے ہیں' نیز ان کا ارادہ وہاں ٹھہرنے اور جشن منانے کا ہے۔ مسلمانوں کے لیے لڑنا اس وجہ سے ناگزیر ہو گیا کہ اگر طرح دبے جاتے تو اول قریش ان قبیلوں پر دباؤ ڈالتے، جن سے مسلمانوں کے معاہدے ہو چکے تھے اور ان قبیلوں کے لیے دوبارہ مسلمانوں سے معاہدہ کرنے کی کیا صورت رہتی؟ دوم قریش مدینہ منورہ پر چڑھائی کر دیتے تو نتائج مسلمانوں کے لیے بدر جہا زیادہ خطرناک ہوتے، جتنے بدر میں لڑنے سے ہو سکتے تھے۔ لہٰذا بدر کو مشیت ایزدی نے حق و باطل کی جنگ کا پہلا میدان بنا دیا۔

۲۔ غزوہ احد اس لیے پیش آیا کہ قریش مکہ نے بدر کے انتقام میں مدینہ منورہ پر حملہ کیا تھا۔ قریش مکہ کی فوج کم از کم تین ہزار تھی۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ ساڑھے سات سو تھے۔ تیر اندازوں کے ایک گروہ کی غلطی کے باعث مسلمانوں کا سخت نقصان ہوا تاہم میدان انہی کے ہاتھ رہا۔

۳۔ غزوہ احزاب بھی قریش مکہ اور یہود خیبر کی مشترکہ سازش کا نتیجہ تھا، جس میں قریش و یہود مختلف قبائل کو گونا گوں لالچ دے کر ساتھ لے آئے اور کم از کم دس ہزار افراد نے مدینہ منورہ پر ہجوم کیا اور دفاع کے لیے ایک طویل خندق کھودی گئی۔

۴۔ غزوہ خیبر اس وجہ سے پیش آیا کہ یہود خیبر نے احزاب میں ناکامی کے بعد غطفان اور دوسرے قبائل کو مدینہ منورہ پر؛ حملے کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ اس وجہ سے ناگزیر ہو گیا کہ اقدام کر کے فتنے کی یہ آگ ہمیشہ کے لیے بجھا دی جائے۔

۵۔ موتہ کی مہم اس سبب سے پیش آئی کہ موتہ کے مسیحی حاکم شرجیل نے رسول اللہ ﷺ کے سفیر کو ناحق قتل کرا دیا تھا۔ سفیر کا قتل اس دور میں بھی ایک قبیح بین الاقوامی جرم تھا۔ تین ہزار مجاہدین اس خون ناحق کا انتقام لینے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ انھوں نے کم از کم ایک لاکھ فوج غنیم کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

۶۔ مکہ مکرمہ پر یورش اس وجہ سے ناگزیر ہو گئی کہ قریش نے معاہدہ حدیبیہ کے باجود اپنے ایک حلیف قبیلے کو شہ اور مدد دے کر مسلمانوں کے قبیلے پر حملہ کرایا۔ رسول اللہ ﷺ نے تلافی مافات کی دو صورتیں پیش کر دیں۔ یعنی یا تو ان لوگوں کا خون بہا دیا جائے جو حملے کے باعث ناحق مارے گئے۔ یا قریش اپنے حلیف قبیلے کی پاسداری سے خود ہاتھ اٹھالیں۔ مسلمان بطور خود مناسب فیصلہ کر لیں

گے۔ قریش نے دونوں میں سے کسی بھی صورت پر عمل نہ کیا اور مکہ مکرمہ پر پیش قدمی کے سوا چارہ نہ رہا۔

۷۔ غزوہ حنین اس وجہ سے پیش آیا کہ فتح مکہ کے بعد بنو ہوازن اور بنو ثقیف مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے اور اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ حدود حرم میدان جنگ بنیں گے۔ محاصرہ طائف غزوہ حنین ہی کا شاخسانہ تھا۔

۸۔ تبوک کا سفر اس لیے اختیار کیا گیا کہ قیصر کی طرف سے عرب پر حملے کی تیاریوں کے متعلق متواتر خبریں موصول ہوئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ تیس ہزار جانبازوں کی معیت میں کٹھن منزلیں طے کر کے عرب کی شمالی سرحد پر پہنچ گئے تاکہ لڑائی غنیم کے علاقے میں ہو، بیس روز قیام فرمایا۔ کوئی لڑائی پیش نہ آئی اور حضور ﷺ مختلف گروہوں کو امان نامے دے کر لوٹ آئے۔

باقاعدہ جنگوں کے نقصانات

ان باقاعدہ جنگوں کے جانی نقصانات کا اندازہ قاضی محمد سلیمان مرحوم کے فراہم کردہ اعداد کے مطابق درج ذیل ہے:[1]

جنگ	مسلمانوں کا جانی نقصان	مخالفوں کا جانی نقصان	کیفیت
بدر	۲۲	۷۰	عام روایتوں کے مطابق صرف چودہ مسلمان شہید ہوئے تھے۔
اُحد	۷۰	۳۰	عام روایت کے مطابق قریش کے صرف ۲۳ افراد قتل ہوئے تھے۔
خندق یا احزاب	۶	۱۰	عام روایت کے مطابق مخالفوں کے صرف چار آدمی قتل ہوئے تھے۔
خیبر	۱۸	۹۳	
موتہ	۱۲	نامعلوم	
حنین	۶	۷۱	ابن حزم نے شہدائے حنین کی تعداد چار بتائی ہے۔ (جوامع السیرۃ ص۲۴۱)

[1] اس نقشے میں فتح مکہ کے نقصانات شامل نہیں وہ سابقہ اعداد میں شامل کر لیے گئے ہیں یعنی دو مسلمان اور گیارہ غیر مسلم۔

محاصرۂ طائف	۱۳	نامعلوم	
تبوک	x	x	
میزان	۱۴۷	۲۷۴	

مخالفین کے جانی نقصان میں موتہ اور طائف کے اعداد شامل نہیں، وہ بہت زیادہ نہ ہوں گے۔

غرض تمام چھوٹی بڑی مہموں اور باقاعدہ جنگوں میں مسلمانوں اور مخالفوں کا کل جانی نقصان یہ ہوا:

مسلمان= ۶+۱۴۷ ۹ =۲۴۳

مخالفین=۱۸۸+ ۲۷۴ =۴۶۲

ان میں رجیع اور بئر معونہ کے شہدا کو شامل نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ تبلیغ کے سوا کسی دوسرے مقصد کے لئے بھیجے ہی نہیں گئے تھے اگر آپ انہیں بھی جانی نقصان میں شامل کرلیں تو پوری تعداد اناسی کے اضافے سے تین سو بتیس بن جائے گی۔ اسی طرح مخالفوں کے اعداد نقصان میں جنگ، موتہ اور محاصرہ طائف کے مقتولیں شال نہیں کیے گئے۔ ان کے شمول سے مخالفوں کی تعداد میں بھی کسی قدر اضافہ ہو جائے گا اگرچہ وہ زیادہ سے زیادہ چند سو ہی کا ہو سکتا ہے۔

قاضی صاحب مرحوم کا نقشہ

قاضی محمد سلیمان مرحوم نے پہلے غزوات وسرایا کا ایک مفصل نقشہ دیا ہے، جس میں ایک ایک مہم اور ایک ایک جنگ کے متعلق الگ الگ بتایا گیا ہے کہ فریقین کے کل کتنے آدمی شریک تھے اور ان میں سے کتنے مقتول یا شہید، کتنے مجروح اور کتنے اسیر ہوئے۔[1] پھر انھوں نے تمام اعداد کا ایک جامع نقشہ تیار کیا جو درج ذیل ہے[2]:

فریق	شہید یا مقتول	مجروح	اسیر	میزان	کیفیت
مسلمان	۲۵۹	۱۲۷	۱	۳۸۷	قاضی صاحب مرحوم نے تصریح فرمادی کہ فریقین کے زخمیوں کی تعداد صحیح نہیں، اسیروں اور مقتولوں کی تعداد صحیح ہوگی۔ انشاء اللہ

---

[1] رحمۃ اللعالمین جلد دوم (ص ۲۴۴، ۲۶۴)

[2] ایضاً ایضاً (ص ۲۸۰)

مخالفین	۷۵۹	۔	۶۵۶۴	۷۳۲۳	=
میزان	۱۰۱۸	۱۲۷	۶۵۶۵	۷۷۱۰	=

توجہ طلب حقیقت

خاص توجہ کی محتاج یہ حقیقت ہے کہ رمضان ۱ھ (مارچ ۶۲۳ء) سے ۹ ھ (۶۳۰) تک جتنی جھڑپیں، یا کشمکشیں یا جنگیں ہوئیں، ان میں مسلمانوں اور مخالفوں کا نقصان جانی زیادہ سے زیادہ ایک ہزار اٹھارہ نکلتا ہے اور یہ اتنا بے حقیقت نقصان ہے کہ جب میں نے مختلف احباب سے اس کا ذکر کیا تو انھیں ابتدا میں یقین ہی نہ آیا کہ جو کچھ عرض کیا جارہا ہے، وہ حقیقت ہے۔ اچھا، آپ فرض کرلیں کہ یہ نقصان حقیقی کا صحیح مرقع نہیں۔ اس عدد کو دگنا یا تگنا کرلیجیے۔ پھر بھی نقصان زیادہ سے زیادہ تین ہزار جانوں کا ماننا ہوگا۔ یاد رہے کہ اس حساب میں ہم نے غزوات و سرایا کی نوعیتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ہر جھڑپ کے نتائج یکجا کرلیے ہیں، انھیں آٹھ سال پر پھیلا لیا جائے تو فی سال کے حساب سے پونے چار سو آدمیوں کا نقصان ہوا اور یہ ان جنگوں کا نقصان ہے جن کے نہ رسول اللہ ﷺ خواہاں تھے اور نہ حضور نے کسی میں پیش دستی کی۔ معاملہ محض پیغام حق کی تبلیغ کا تھا، جو صلح و امن کے ساتھ رزم و پیکار سے قطع نظر کرتے ہوئے برابر جاری رہا۔ کس طرح اور کیونکر؟ اس کے مفصل حالات ہمیں معلوم نہیں۔ یہاں تک کہ ہجرت کے آٹھویں سال عرب کی اندرونی کشمکشیں ختم ہوگئیں اور تبلیغ نے پہلی منزل کامیابی سے طے کرلی، یعنی عرب جوق در جوق، گروہ در گروہ اور قبیلہ در قبیلہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے، جو وجود اقدس حق و باطل کی پہلی امتحان گاہ یعنی غزوہ بدر میں صرف تین سو تیرہ جانباز لاسکا تھا، وہ تبوک کی جانب روانہ ہوا تو اس کا پرچم حق تیس ہزار سرفروشوں پر لہرا رہا تھا۔ اللہ اور دین حق کی راہ میں سب کچھ نثار کردینے والا اتنا بڑا لشکر پہلے عرب کی سرزمین سے اٹھا تھا۔

کیا حقیقۃً ہزار سوا ہزار یا زیادہ سے تین ہزار جانوں کے نقصان کے ساتھ اتنا عظیم القدر کارنامہ انجام دینے کی کوئی مثال روئے زمین کی سرگزشت کے کسی بھی حصے سے پیش کی جاسکتی ہے؟ اس سرگزشت میں ظہور اسلام سے پیشتر کا دور بھی شامل ہے اور بعد کا دور بھی، پھر یہ روشن حقیقت بھی ہر لحاظ سے سامنے رہنی چاہیے کہ یہ صرف زمین کی تسخیر نہ تھی، یہ تخت حکومت اور سریر سلطنت آراستہ کرنے کا معاملہ نہ تھا۔ اس دور میں ایک نئی قوم وجود پذیر ہوچکی تھی۔ کیسی قوم؟ قرآن مجید گواہ ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران:۱۱۰)

"مسلمانو! تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو عالم انسانیت کے ارشاد و اصلاح کے لیے ظہور میں آئی۔ تم نیکی کا حکم دینے والے برائی سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔"

ان تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں سب کچھ فرمادیا گیا، جو کسی انسانی گروہ کی مدح و ستایش میں کہا جاسکتا تھا۔ اللہ پر ایمان، معروف کا حکم اور منکر کی روک تھام کے بعد کون سی چیز باقی رہ گئی، خواہ اس کا دائرہ کوئی ہو؟

پھر عربوں کی حالت ظہور اسلام سے پیشتر کیا تھی؟ جنگل کے وحشیوں اور درندوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ تمام قبیلوں اور گروہوں کے چلن وحشیانہ تھے۔ لوٹ مار کے سوا ان کا کوئی پیشہ نہ تھا۔ ان کی زندگیاں فتنہ و فساد میں کٹتی تھیں۔ دو شخصوں میں معمولی سی بات پر جھگڑا ہو جاتا تو قبیلوں کے قبیلے اس آگ میں کود پڑتے تھے۔

قرآن مجید ہی گواہ ہے کہ اس قوم کو جو شیوہ ہائے انسانیت کے اعتبار سے شاید رُوئے زمین کی پست ترین قوم تھی، بلند ترین مسند پر لا بٹھایا اور امامت روئے زمین کا منصب سونپ دیا:

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا (آل عمران:۱۰۳)

”اللہ نے تمھیں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو تمہارا حال یہ تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے۔ (لیکن اللہ کے فضل و کرم سے ایسا ہُوا کہ) بھائی بھائی بن گئے۔ تمہارا حال تو یہ تھا کہ آگ سے بھری خندق کے کنارے کھڑے تھے (ذرا پاؤں پھسلتا اور شعلوں میں جا گرتے) اللہ نے تمھیں اس خطرناک حالت سے نکال لیا۔“

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ (انفال: ٦٣)

”اور (اللہ ہی ہے جس نے) مومنوں کے دلوں میں باہم اُلفت پیدا کر دی، اگر تو وہ سب کچھ صرف کر ڈالتا جو روئے زمین میں ہے۔ جب بھی ان کے دلوں میں باہمی الفت نہ جوڑ سکتا یہ اللہ ہے جس نے ان میں باہمی الفت پیدا کر دی۔“

اسی مختصر سی مدت میں جس میں تسخیر ارض کی پہلی منزل طے ہُوئی، نئی قوم معرض وجود میں آگئی۔ ایک نیا نظام بھی پوری کامیابی سے جاری ہو گیا جو روئے زمین کے انسانوں کی تقدیریں پلٹ دینے والا تھا اور کیسی قوم؟

اگر تاریخ میں ایسی دوسری قوم کی مثال ملتی ہے تو تلاش کر لیجیے۔ اتنے معمولی سے جانی نقصان کی بناء پر جس کی حقیقی مقدور سوا ہزار سے زیادہ نہ تھی، صرف آٹھ نو سال میں یہ سب کچھ عملی صورت میں دنیا کے سامنے آگیا۔ کیا اس وجود اقدس کے ”رحمتہ للعٰلمین“ ہونے میں کسی کو دم بھر کے لیے تامل ہو سکتا ہے؟ لوگ معجزوں میں کلام کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ پُر تاثیر اور یقینی طور پر ناقابل انکار معجزہ کون سا

ہو سکتا ہے؟

تصویر کا دوسرا رُخ

یہاں تقابل مقصود نہیں، کیونکہ تقابل بہ ہر حال کسی نہ کسی مناسبت کی بناء پر کیا جا سکتا ہے اور یہاں مناسبت کا ملاًنا پید ہے۔ ہاں، عبرت کی غرض سے کچھ اعداد و شمار ان قوموں اور ملکوں کے پیش کیے جاتے ہیں، جو بہ زعم خویش تہذیب و شائستگی کے سدرۃ المنتہٰی پر بیٹھے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے ابتدائی دور میں انگریزوں کو اپنی اور فرانسیسیوں کی فوجیں ڈنکرک سے نکالنی پڑی تھیں تو آدمیوں کو بچالانا مقدم قرار دے دیا گیا اور بھاری سامان جنگ دشمن کے حوالے کیے بغیر چارہ نہ رہا۔ چرچل نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ سازوسامان جنگ مشینوں میں ڈھالا جا سکتا ہے لیکن آدمی مشینوں میں نہیں ڈھالے جا سکتے۔ تاہم آپ خوب چھان بین کر لیں کہ مہذب یورپ نے باہمی جنگوں میں اور خصوصیت سے ان جنگوں؛ میں جو ایشیائی اور افریقی خطوں میں کی گئیں، انسانی خون کو پانی سے بڑھ کر ارزاں بنائے رکھا یا نہیں اور یہ سلسلہ مشرق وسطیٰ یا ہند چینی میں آج بھی انتہائی بے پروائی سے جاری ہے۔ گویا وہاں انسان نہیں بستے جن کے خون کا احترام اہل مغرب میں سے کسی کے لیے قابل توجہ ہو۔

مرقع عبرت

آپ نے رحمۃ للعٰلمین ﷺ کی ناخواستہ جنگوں کے اعداد ملاحظہ فرمالیے، جنھیں زیادہ سے زیادہ بڑھا کر بھی آٹھ نو سال میں تین ہزار تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اب داعیان تہذیب کی رزم آرائیوں کا پورا مرقع نہیں، بلکہ اس کی صرف چند جھلکیاں دیکھ لیجیے۔

۱۔ ”سی سالہ جنگ“ ۱۶۱۸ء سے ۱۶۴۸ء تک تیس سال جاری رہی، جس میں جرمنی، فرانس، آسٹریا، سویڈن وغیرہ نے حصہ لیا۔ اس میں صرف جرمنی کے ایک کروڑ بیس لاکھ آدمی مارے گئے۔ [1]

۲۔ امریکی خانہ جنگی ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک جاری رہی۔ اس میں ایک فریق شمالی ریاستیں اور دوسرا فریق جنوبی ریاستیں تھیں اور جنگ کا سبب غلامی کا مسئلہ تھا۔ اس میں تین لاکھ آدمی شمالی ریاستوں کے اور پانچ لاکھ جنوبی ریاستوں کے مارے گئے۔ چوہتر کروڑ پونڈ خرچ ہُوئے۔ اس رقم سے دنیا بھر کے غلام ایک قطرۂ خون بہائے بغیر آزاد کرائے جا سکتے تھے۔ امریکہ میں غلامی قانوناً ختم ہو چکی

---

[1] Book of Facts ص ۶۱۴

ہے۔ لیکن اس کی تمام لعنتیں آج بھی وہاں مکروہ ترین صورت میں موجود ہیں۔

۳۔ پہلی عالمی جنگ میں ایک کروڑ آدمی مارے گئے تھے اور دو کروڑ مجروح ہوئے تھے۔ خدا جانے؛ ان میں سے کتنے لُولے، لنگڑے، اندھے اور اپاہج ہوئے اور کتنوں نے ہسپتالوں میں جانیں دیں۔ پھر اس جنگ ہی سے انفلوئنزا شروع ہُوا، جس میں مزید ایک کروڑ آدمی مر گئے۔ ایک انسانیت دوست صاحب علم کا اندازہ ہے کہ اس جنگ پر اسی (۸۰) ارب پونڈ خرچ ہُوئے۔ اس رقم سے فرانس اور بلجیم کی نہ صرف زمین بلکہ ہر چیز پانچ پانچ مرتبہ خریدی جاسکتی تھی۔

دوسری عالمی جنگ

۴۔ دوسری عالمی جنگ کے صرف مقتولین کی فہرست پر ایک نظر ڈال لیجیے:

چین	۱۳،۱۰،۲۲۴
فرانس	۲،۰۰،۰۰۰
جرمنی	۶۳،۰۰۰،۰۰
صرف فضائی بمباری	۵،۰۰،۰۰۰
جاپان	۵،۳۵،۷۹۵
بمباری سے	۴۱،۲،۳۰۹
یونان	۴،۱۵،۰۰۰
برطانیہ	۳،۵۳،۶۵۲

ان اعداد کی میزان قریباً ایک کروڑ بنتی ہے لیکن ان میں بہت سے شرکائے جنگ کے مقتولین شامل نہیں۔ مثلاً چیکو سلواکیا، پولینڈ، روس، فن لینڈ، یوگوسلاویا، بلغاریا، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ، اٹلی وغیرہ، پھر مختلف ملکوں کے ان گروہوں کا جانی نقصان معلوم نہ ہوسکا، جنہیں ہٹلر کی فوجیں جبری مزدوری کے لیے جرمنی لے گئی تھیں۔ اور جنگ کے اختتام تک وہ لوگ واپس نہ ہوسکے۔ یہ تمام اعداد جمع کیے جائیں تو دوسری عالمی جنگ کا نقصان دو کروڑ افراد سے بھی بڑھ جائے گا۔

آتش ریز اور آتش خیز بموں سے شہر، قصبے، کارخانے، کھیتیاں، زمینیں، گاؤں، بندرگاہیں، بجلی اور پانی کے مرکز جس طرح تباہ ہُوئے ان کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟ ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹمی بموں سے جو قیامت برپا ہُوئی، اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔

ربانی سیاست اور شیطانی سیاست

رحمۃ للعلمین ﷺ ربانی سیاست پر کاربند تھے اور اسی سیاست کو اولاد آدم کا دائمی مسلک بنادینے کا پیغام پہنچا گئے۔ جو اعداد اوپر پیش ہو چکے ہیں، وہ ان گروہوں، جماعتوں اور قوموں کے کارنامے ہیں، جنھیں ربانی سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں، ان کا مدار شیطانی سیاست ہے۔ ربانی سیاست کا پورا نظام ربانی صفات کے مرکز پر گھوم رہا ہے۔ جس میں رحمت، شفقت، رافت کار فرما ہوتی ہیں۔ انسانوں کی مادی اور معنوی تربیت صحیح اصول پر کی جاتی ہے۔ شیطانی سیاست عالم انسانیت کے لیے شدید طوفان برق و باد یا نہایت خوفناک بھونچال کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے جزوی مظاہرے جابجا ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تخریب در تخریب اور اعدام در اعدام کے سوا کچھ نہیں۔

سوچیے کہ اگر نوع بشر کے ہوش و حواس سلامت ہیں تو وہ کس سیاست کو اپنی بہتری اور بہبود کے لیے چنے گی؟ وہ سیاست جسے تھوڑی مہلت مل جائے تو روئے زمین کے بہترین خطوں کو جلا کر خاک سیاہ کر ڈالے اور انسانوں کی عظیم صفوں کی مہلت حیات آگ اور خون کے طوفانوں میں ڈبو دے؟ انسانیت کی بہتری صرف ربانی سیاست ہے، جسے عرب کی چھوٹی جماعتیں لے کر نکلیں تو جہاں پہنچیں تاریکیوں میں اجالا کر دیا۔ صلح و امن اور محبت و مواخات کے سلسلے قائم کر دیے اور انسانوں میں جب باری تعالیٰ، حب رسول اللہ ﷺ اور حب انسانیت کی لگن پیدا کر دی۔ آج حضور رحمۃ للعلمین ﷺ کے کروڑوں نام لیوا موجود ہیں مگر کہیں کوئی ایسا منظر نہیں ملتا جو قلب و روح کے لیے وجہ اطمینان یا حضور ﷺ کی ذات بابرکات سے انتساب کے پیش نظر زیبا ہو:

نہ داغ تازہ مے کا رد نہ زخم کہنہ مے خارد
بدہ یا رب دے کایں صورت بے جاں نمے خواہم

عالمی اصلاح وامن کی محکم بنیادیں

آں کتاب زندہ قرآن حکیم حکمت او لایزال است و قدیم
نوع انساں را پیام آخریں حامل او ر رحمۃ اللعلمین ﷺ

عالمی اور بین الاقوامی زاویہ نگاہ

اسلام کا زاویہ نگاہ یک قلم عالمی اور بین الاقوامی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ پوری کائنات انسانیت کی ہدایت کے لیے معبوث ہوئے تھے اور حضور ﷺ نے جب تبلیغی دعوت نامے ارسال فرمائے تھے تو وہ صرف رُوسائے عرب کے لیے نہ تھے بلکہ ایران کے کسریٰ، مشرقی روم کے قیصر، مصر کے مقوقس اور حبش کے نجاشی کے لئے بھی تھے۔ یہ ملک عرب کے ارد گرد واقع تھے، ان کے ساتھ عربوں کے تجارتی روابط تھے اور وہ ان ملکوں میں جاتے آتے تھے۔ یہ عالمی دعوت اسلام کی طرف پہلا قدم تھا۔ مسلمانوں کا فرض تھا کہ حضور ﷺ کے اسوہ حسنہ کی پیروی میں دعوت و تبلیغ کے دائرے کو تدریجاً وسیع تر کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ اسلام دنیا بھر میں پھیل جاتا اور رسول اللہ ﷺ جس غرض سے معبوث ہوئے تھے۔ وہ پایہ تکمیل پر پہنچ جاتی۔ افسوس کہ تھوڑا ہی عرصہ گزرنے کے بعد ایسی حکومتیں وجود میں آ گئیں، جو وضع وہیئت ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ بڑی حد تک معنوی اعتبار سے بھی ویسی ہی بادشاہیاں تھیں، جیسی ظہور اسلام سے پیشتر موجود تھیں۔ کہیں کوئی اچھا فرمانروا بروئے کار آتا رہا تو اس نے اپنے ماحول کے اعتبار سے مربیانہ سیاست کے مطابق کام کیا لیکن فی الجملہ حالت بگڑتی گئی، یہاں تک کہ وہ بادشاہیاں بھی رفتہ رفتہ اسی حالت کو پہنچ گئیں، جو ان کے لیے مقدر تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر تھی البتہ بعض نیک اور سعید ہستیوں نے جابجا تربیتی اور تبلیغی مرکز قائم کیے، جن کی برکات وحسنات کے ذکر کا یہ محل نہیں۔

یہاں قرآن مجید کے چند انقلاب انگیز اصول پیش کیے جاتے ہیں، جو عالمی صلح وامن اور خیر و بہبود

کے زبردست عوامل تھے۔ تعجب ہے کہ خود مسلمان بھی ان پر ٹھیک عمل پیرا نہ ہو سکے۔ اس حالت میں دوسروں سے عمل پیرائی کی کیا امید رکھی جاسکتی تھی۔

بین الاقوامی امن کے تقاضے

بین الاقوامی اصلاح وامن کے سلسلے میں سب سے پہلا اور بنیادی امر یہ ہے کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانی گروہوں، جماعتوں اور قوموں کو اصولی اعتبار سے مساوی تسلیم کیا جائے اور اس مساوات کو عملی لباس پہنانے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی جائے۔ اگرچہ کسی کا عقیدہ کچھ ہو جو کتاب رحمۃ للعلمین ﷺ پر نازل ہوئی، اس میں انسانی مساوات کا غیر مشتبہ اعلان موجود ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ﴿۱۳﴾ (حجرات: ۱۳)

"لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم پہچان لیے جاؤ۔ یقیناً تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے، جو زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے۔ خدا دانا اور واقف کار ہے۔"

تمام انسان ایک مرد اور ایک عورت یعنی آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کی اولاد ہیں۔ جس طرح ایک ماں باپ کے بچوں میں فرق وامتیاز کی کوئی وجہ نہیں، اسی طرح تم کیوں امتیازات قائم کرتے ہو؟ وہ بھی ایسے جن کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں مثلاً رنگ اور نسل کا اختلاف، دولت وحشمت کا اختلاف، مختلف جغرافیائی خطوں کا اختلاف، یہ تمام اختلافات سراسر باطل اور بے اصل ہیں، جن میں الجھ کر تم ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی دیواریں کھڑی کرتے ہو، حالانکہ تمہیں چاہیے ان سے قطع نظر کرتے ہوئے بنیادی یکسانی اور یکجہتی کو مرکز توجہ بناؤ یعنی تم سب انسان ہو۔

حضور ﷺ نے فتح مکہ کے بعد حرم پاک میں جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا ان میں مخاطب وہ تھے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف اکیس برس تک ظلم وتعدی کا کوئی بڑے سے بڑا طوفان بپا کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اور شاید ہی کوئی ایسا چہرا ہو، جو مخاطبین کی برچھیوں، تلواروں اور تیروں سے جراحت زار نہیں بن چکا تھا۔ تاہم حضور ﷺ نے فرمایا آج تم پر کوئی الزام نہیں اور تم سب آزاد ہو۔

نیز فرمایا: اے قریش! جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدمؑ کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ پھر سورہ حجرات کی یہی چودھویں آیت تلاوت فرمائی جو اوپر منقول ہے۔ اس سے مزید توثیق ہو گئی کہ یہ آیت مساوات انسانی کی بنیاد ہے۔

واضح رہے کہ اسے وقتاً فوقتاً پڑھ دینا کافی نہیں، اس پر اسی طرح عمل ہونا چاہیے، جس سے

مطلوب مساوات کی تکمیل ہو۔ تمام قوموں اور گروہوں کے درمیان ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے رشتے استوار ہوتے جائیں۔ امن عالم ایک حقیقت ثابتہ کی شکل اختیار کرلے۔ ایسا ہی ماحول پیغام حق کی اشاعت کے لیے بہ حیثیت مجموعی سازگار ہوگا۔ توپوں کے آتشیں گولوں یا طیاروں کی تباہی خیز بمباریوں کو پیغام پہنچانے اور حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے منصب اصلاح انسانیت کو لباس عمل پہنانے کا اچھا ذریعہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

اکثریت کی بنیاد

پھر دیکھیے، اس آیہ مبارکہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسانوں کی عزت واکرمیت کی بنیاد دولت، رنگ، خون، نسل، قوم یا کوئی خاص جغرافیائی خطہ نہیں صرف تقویٰ اور حسن عمل ہے۔ ہر انسان اس بنا پر عزت کا مستحق نہیں سمجھا جاسکتا کہ کروڑ پتی یا ارب پتی ہے، اس کا رنگ گورا ہے، اس کا تعلق آریائی نسل سے ہے جیسا کہ روئے زمین کے بعض فاترالعقل گروہ سمجھ رہے ہیں اور ان میں چھوت چھات کوئی نہ کوئی شدید افتراق انگیز شکل اختیار کیے ہوئے موجود ہے۔ صرف نیک عملی انسانی اکرمیت کی اساس ہے۔ اس باب میں سکندروں اور نپولینوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ موجدوں، فلسفیوں، سیاست دانوں، عالموں اور خطیبوں کو ان کے محض پیشوں اور مشغولیتوں کے اعتبار سے بھی لایق توجہ نہیں سمجھا جاتا۔ وہاں محض نکوکاری، راست بازی، حق پرستی اور خلق دوستی درکار ہے۔ اس کے سوا ہر سکۂ عمل کھوٹا اور ہر سرگرمی کار بے حقیقت ہے۔

اس کی حقیقت پر آپ نے غور فرمایا؟ اس دنیا میں حسن عمل کے سوا ہر معیار عظمت حسد، رقابت اور کشمکش کا موجب ہوتا ہے۔ دولت کو معیار بنایا جائے تو جسے جائز ذریعے سے حاصل نہ ہوگی، وہ ہر ناجائز ذریعے سے حاصل کرے گا اور خلق خدا کے لیے لعنت بن جائے گا۔ فن حسب وسیاست میں کمال کو معیار بنایا جائے گا تو مختلف لوگ روئے زمین کو انسانوں کے خون سے رنگنے میں اپنی زندگیاں تمام کردیں گے اور دنیا ان کو صرف نفرین کا مستوجب ٹھہرائے گی لیکن حسن عمل میں رقابت یا حسد راہ ہی نہیں پاسکتے کیونکہ وہ منافی حُسنِ عمل ہوں گے۔ یوں تمام انسانوں کی انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ حسنِ عمل کی فراوانی سے روئے زمین امن وسلامتی کا بہشت زار بن جائے۔

دین میں کوئی جبر نہیں

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۖ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ

الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (بقرہ:۲۵۶)

"دین کے بارے میں کوئی جبر نہیں۔ بلاشبہ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہوگئی ہے۔ پھر جو کوئی طاغوت سے انکار کردے (یعنی سرکشی، فساد اور گمراہی سے یک قلم بیزار ہو جائے) اور اللہ پر ایمان لائے تو بلاشبہ اس نے فلاح و سعادت کی مضبوط ٹہنی پکڑلی جو ٹوٹنے والی نہیں (جس کے ہاتھ آگئی وہ گرنے سے محفوظ ہو گیا) اور یاد رکھو اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔"

انسانی ظلم و ستم کے جو خونچکاں واقعات تاریخ کے صفحات پر منقوش ہیں، ان میں سے تین چوتھائی واقعات صرف جبر و تشدد کا نتیجہ ہیں، جو ایک گروہ نے دوسرے گروہ کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے بے دریغ روا رکھے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہر سلیم العقل انسان پر، روز روشن کی طرح آشکارا تھی کہ دین کی راہ دل کے اعتقاد و یقین کی راہ ہے اور اعتقاد دعوت و موعظت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ جبر و استکراہ سے انسانی جسم کو اپنی مرضی کے مطابق جھکایا جا سکتا ہے، مگر دل میں اعتقاد و ایمان کا چراغ روشن نہیں کیا جا سکتا اور جب تک چراغ یقین روشن نہ ہوگا، وہ اعمال ظہور پذیر نہیں ہو سکتے، جو ازروئے دین مطلوب و منظور ہیں بلکہ جبر سے دلوں میں نفرت و کراہت کی آگ مشتعل ہوگی اور جب جابر قوت میں ضعف آئے گا تو رد عمل کو کوئی طاقت روک نہ سکے گی اور وہی صورت حال نمودار ہو جائے گی جس کا ذکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے:

كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا (نحل:۹۲)

"اس عورت کی مثال، جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔"

حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم کے مترجمہ قرآن کے فوائد میں اس آیت کے متعلق لکھا گیا ہے:

جب دلائل توحید بخوبی بیان فرما دی گئیں، جس سے کافر کا کوئی عذر باقی نہ رہا تو اب زور سے کسی کو مسلمان کرنے کی کیا حاجت ہو سکتی ہے؟ عقل والوں کو خود سمجھ لینا چاہیے۔ نہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ زبردستی کسی کو مسلمان بناؤ۔ [1]

پھر اس آیت کے مطالب کی توثیق بعض دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً

وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس:۹۹)

"اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں، وہ سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تو ان پر جبر کرے گا کہ جب تک ایمان نہ لاؤ میں چھوڑنے والا نہیں؟"

اس آیۂ مبارکہ سے ایک طرف یہ نمایاں ہے کہ مخلوق کی ہدایت کے لیے رسول اللہ کے قلب مبارک کی تڑپ کا کیا عالم تھا۔ دوسری طرف یہ واضح ہے کہ اس معاملے میں جبر کی کوئی گنجایش نہیں۔ اللہ

[1] قرآن مجید مترجمہ، حضرت شیخ الہند ص ۵۴ حاشیہ

کی مشیت یہی ہوئی کہ لوگوں کی طبیعتیں خود سوچ سمجھ کر اس طرف متوجہ ہوں اور بقدر استعداد سعادت کی منزلیں طے کریں۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں:

آپ کو (رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو) یہ قدرت نہیں کہ زبردستی کسی کے دل میں ایمان اتار دیں۔ خدا چاہتا تو بے شک سب آدمیوں کے دلوں میں ایمان ڈال سکتا تھا' مگر ایسا کرنا اس کی تکوینی حکمت و مصلحت کے خلاف تھا۔ اس لیے نہیں کیا گیا۔[1]

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۔ (کہف:۲۹)

"(اے پیغمبر) کہہ دو، یہ سچائی تمہارے پروردگار کی جانب سے ہے اب جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے۔ ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپٹیں چاروں طرف سے انھیں گھیر لیں گی۔"

غرض جس طرح مساوات کا اعلان شرف انسانی کے اعتراف کا ایک جزو ہے، اسی طرح عقیدہ و ایمان کے سلسلے میں جبر کی نفی بھی انسانی شرف ہی کا ذریعہ ہے، لیکن اسلام ہر انسان میں جہاں اشرفیت کا زیادہ سے زیادہ گہرا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے، وہاں یہ توقع بھی رکھتا ہے (اور رکھنی چاہیے) کہ انسان اپنے شرف ہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسن عمل کا مصدر بنیں گے اور خدا پر ان کا ایمان زیادہ سے زیادہ مستحکم و استوار ہو گا کیونکہ اشرفیت کا احساس سلیم العقل انسان کو کسی اور طرف لے جا ہی نہیں سکتا۔

عدل پر استواری

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸ (مائدہ:۸)

"اے ایمان والو! اللہ کے لیے انصاف کی گواہی دینے کو مضبوطی سے کھڑے ہو جایا کرو اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ اس سے انصاف نہ کرو۔ (ہر حال میں) انصاف کرو۔ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو اللہ کو خوب خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔"

حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم کے مترجمہ قرآن میں ہے کہ قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ میں حقوق اللہ کی طرف اور

---

[1] قرآن مجید مترجمہ، حضرت شیخ الہند ۲۴۸۔۲۸۵ حاشیہ

"شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ" میں حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے:

"عدل" کا مطلب ہے کسی کے ساتھ بدونِ افراط و تفریط وہ معاملہ کرنا، جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح اور برابر ہونی چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت اس کے دونوں پلڑوں میں سے کسی پلے کو جھکا نہ سکے معلوم ہوتا ہے کہ "عدل و قسط" یعنی دوست دشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا اور حق کے معاملے میں جذبات محبت و عداوت سے قطعاً مغلوب نہ ہونا، یہ فضیلت حصول تقویٰ کے موثر ترین اور قریب ترین انصاف میں سے ہے۔ [1]

ہر سلیم العقل انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ اسلام کن خصوصیات والے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ کسی فرد یا جماعت سے کتنی ہی عمیق محبت یا کتنی ہی شدید دشمنی ہو۔ جب گواہی دینے کا مرحلہ سامنے آئے گا، مسلمان کی زبان سے ایک حرف بھی ایسا نہ نکلے گا، جو حق و انصاف کے عین مطابق نہ ہو۔

یاد ہوگا کہ فتح خیبر کے بعد وہاں کی زمین نصف پیداوار کی بنا پر یہودیوں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ عبد اللہ رضی اللہ عنہ بن رواحہ کو بٹائی کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ وہ پیداوار کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دو انبار لگوا دیتے اور یہودیوں سے کہتے کہ جو حصہ چاہو، اٹھالو۔ یہودی کہتے: "زمین اور آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں۔" مسلمانوں کا وظیفۂ حیات روئے زمین پر یہی تھا اور ایسے ہی اصول حیات عالمی امن کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ وہ افراد یا گروہ اس وظیفے کی بجا آوری سے کیونکر عہدہ بر آ ہو سکتے ہیں، جن کی زبانوں سے الفاظ نکلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، پھول جھڑ رہے ہیں لیکن ان کے دل، ان کی طبیعتیں اور ان کی ذہنیتیں نہایت پست اور امن بر انداز اغراض سے یک قلم آلودہ ہیں۔ یہ وہی شیوہ ہے جس پر مدینہ منورہ کے یہودی عربوں کے تعلق میں کاربند تھے اور کہا کرتے تھے:

لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّنَ سَبِيلٌ ۚ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ (آل عمران:۷۵)

"امیوں (یعنی عربوں) کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے ہم پر کچھ مواخذہ نہیں (یعنی ان کے ساتھ دیانت داری برتنا ضروری نہیں) اور یہ کہہ کر وہ اللہ پر تہمت باندھتے ہیں حالانکہ اچھی طرح جانتے ہیں حقیقت حال کیا ہے؟"

یعنی جس گروہ سے ذاتی اغراض وابستہ ہیں، ان کے متعلق ایک نظام اخلاق اور ایک ضابطہ نیک و بد ہے لیکن جن سے کوئی خاص علاقہ نہیں، ان کے باب میں بالکل دوسری روش اور دوسرے اصول پیش کیے جاتے ہیں۔

نیکی میں تعاون بدی سے گریز

---

[1] قرآن مجید مترجمہ، حضرت شیخ الہند ص ۱۴۰ حاشیہ

قرآن نے ایک انقلاب انگیز اصول مندرجہ ذیل آیت میں پیش کیا ہے۔
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲﴾ (مائدہ:۲)
”جس گروہ نے تمھیں مسجد حرام سے روک دیا تھا، اس کی دشمنی تمھیں اس بات پر نہ ابھار دے کہ اس کے ساتھ زیادتی کرنے لگو (تمہارا دستورالعمل تو یہ ہونا چاہیے کہ) نیکی اور پرہیز گاری کی ہر بات میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ گناہ اور ظلم کی کسی بات میں تعاون نہ کرو اور اللہ (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو۔ وہ (پاداش عمل میں) سخت عذاب دینے ولا ہے۔“
قریش مکہ نے حدیبیہ میں مسلمانوں کو ادائے عمرہ سے روک دیا تھا، جب اختیار کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں آئی تو انھیں پر یہ واضح کر دینا ضروری تھا کہ قریش کی سابقہ زیادتی تمہارے لیے زیادتی کا موجب نہ بن جائے۔ اگرچہ تمہارے خیال کے مطابق وہ ان کی زیادتی کا جواب ہی ہو۔ مسلمان کا دستورالعمل یہ ہے کہ جہاں نیکی اور اچھائی دیکھتا ہے، اس کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھاتا ہے تاکہ بر و تقویٰ زیادہ سے زیادہ فروغ پائیں۔ البتہ ظلم و گناہ سے دور رہنا لازم ہے۔ انھیں بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع نہ دینا چاہیے۔

انسان اور راستبازی

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۠ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ (نسا:۱۳۵)
”اے ایمان والو! تم انتہائی مضبوطی اور پختگی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے ہو جاؤ کہ اگر وہ گواہی خود تمہارے خلاف یا تمہارے ماں باپ اور قرابت داروں کے بھی خلاف ہو تو ہرگز نہ جھجکو۔ اگر کوئی مالدار یا مفلس ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان پر مہربانی رکھنے والا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہوائے نفس کی پیروی تمہیں انصاف سے باز رکھے۔ اگر تم (گواہی دیتے وقت) بات کو گھما پھرا کر پیش کرو گے یا گواہی دینے سے پہلو بچا جاؤ گے تو (یاد رکھو) اللہ تمہارے کاموں سے پوری طرح آگاہ ہے۔“
انسان کے لیے ایک اہم مرحلہ یہ ہے کہ وہ ہر حال میں سچ پر قایم واستوار رہے اور سچی گواہی دینے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرے، اگرچہ سچ بولنے سے خود اسے یا اس کے والدین اور قرابت داروں کو نقصان پہنچے۔ یہ بھی ممکن ہے کسی کو مالدار کے مال کا لالچ یا اثر ورسوخ کا خوف سچ کہنے سے تمہیں باز رکھے یا

کوئی مفلس ہو جس کی مفلسی پر ترس کھا کر تھوڑی سی غلط بیانی گوارا کرلی جائے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ کوئی مالدار ہو یا غریب، اللہ تعالیٰ کی مہربانی ان کے لیے گواہی دینے والے سے کہیں زیادہ سود مند اور نفع بخش ہوگی۔ غرض انصاف کے معاملے میں ہوائے نفس کی پیروی ہرگز نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی نہیں کہ بیان میں ہیر پھیر کا طریقہ اختیار کیا جائے یا گواہی نہ دینے ہی سے گریز کو پناہ گاہ بنالیا جائے۔ اس طرح انسانوں کو چکما دیا جاسکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو دلوں اور نیتوں کے بھید بھی جانتا ہے۔ جو لوگ اپنے خلاف یا اپنے انتہائی قریبی رشتہ داروں کے خلاف بھی سچ کہتے ہوئے نہ جھجکیں، وہ مخلوق کی بھلائی اور بہبود کے لیے جو گراں بہا کام انجام دے سکتے ہیں، ان کی توقع ایسے لوگوں سے کیونکر رکھی جاسکتی ہے جو ایک لفظ زبان سے نکالتے وقت دس مرتبہ سوچتے ہیں کہ اس سے ہمارے موافقوں پر تو زد نہ پڑے گی اور ہمارے مخالف تو فائدہ نہ اٹھالیں گے اس کا نام ان کے ہاں "سیاستدانی" اور "تدبر" ہے۔ امن عالم کے ضامن وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو حق وانصاف کے معاملے میں راست بازی کے اس انتہائی بلند مرتبے پر فائز ہوں۔

برائی کے جواب میں بھلائی

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾ (حم سجدہ:۳۴)

"اور نیکی اور بدی برابر نہیں۔ (بدی کو) اس طریق سے دور کر جو اچھا ہے (یعنی نیکی کے ذریعے سے) پھر تم دیکھو کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان دشمنی ہے وہ تمہارا گرم جوش دوست بن جائے گا۔"

حضرت شیخ الہند مرحوم کے مترجمہ قرآن مجید کے فوائد میں ہے:

خوب سمجھ لو بدی نیکی اور نیکی بدی کے برابر نہیں ہوسکتی، دونوں کی تاثیر جداگانہ ہے۔ بلکہ ایک نیکی دوسری نیکی سے اور ایک بدی دوسری بدی سے اثر میں بڑھ کر ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک مومن قانت خصوصاً ایک داعی الی اللہ کا مسلک یہ ہونا چاہیے کہ برائی کا جواب برائی سے نہ دے بلکہ جہاں تک گنجائش ہو برائی کے مقابلے میں بھلائی سے پیش آئے۔ اگر کوئی اسے سخت بات کہے یا برا معاملہ کرے تو اس کے مقابل وہ طرز عمل اختیار کرنا چاہیے جو اس سے بہتر ہو اس طرز عمل کے مقابلے میں تم دیکھ لوگے سخت سے سخت دشمن بھی ڈھیلا پڑ جائے گا اور جو دل سے دوست نہ بنے تاہم ایک وقت آئے گا جب وہ ظاہر میں ایک گہرے اور گرم جوش دوست کی طرح تم سے برتاؤ کرنے لگے گا بلکہ ممکن ہے کچھ دنوں کے بعد سچے دل سے دوست بن جائے۔

غرض یہ اصول ایسا ہے کہ ہر ہمتور اور مخلص انسان اس پر عمل پیرا ہوسکتا ہے۔ پھر مسلمان تو

حقیقتہً ایک مستقل داعی الی اللہ ہے۔ مزید بر آں خود رسول اللہ ﷺ کا دستور یہی رہا اور حضور ﷺ کی پیروی سے بڑھ کر کسی کے لیے راہ سعادت کیا ہو سکتی ہے؟

عدل و احسان

قرآن مجید کی ایک اور جامع انقلابی دعوت پر غور فرمایئے، ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَ الۡاِحۡسَانِ وَ اِیۡتَآیِٔ ذِی الۡقُرۡبٰی وَ یَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ وَ الۡبَغۡیِ ۚ یَعِظُکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۹۰﴾ (نحل:۹۰)

"اللہ حکم دیتا ہے کہ (ہر معاملے میں) انصاف کرو۔ (سب کے ساتھ) بھلائی سے پیش آؤ۔ قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرو اور تمہیں روکتا ہے بے حیائی کی باتوں سے، ہر طرح کی برائیوں سے اور ظلم و زیادتی کے کاموں سے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ (سمجھو) اور نصیحت پکڑو۔"

اللہ کا فرمان مسلمانوں کے لیے یہ ہے کہ عدل کو اپنا شیوہ بناؤ، نیک کرداری میں سرگرم رہو۔ قرابت والوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ فحش کاموں سے بچو، ہر طرح کی برائیوں سے اجتناب کرو ۔ ظلم و زیادتی سے کبھی آلودہ نہ ہو۔

جو لوگ مسلمان ہو چکے تھے، ان کے لیے اب آزمایش عقاید میں نہ تھی، اعمال میں تھی۔ اس لیے اس آیت میں عملی زندگی کی تمام مہمات بیان کر دیں اسی لیے مفسرین نے اسے جوامع آیات میں شمار کیا ہے۔

عدل، تمام محاسن اعمال کی اصل ہے۔ جس انسان کے اندر یہ بات پیدا ہو گئی کہ جو بات کرنی چاہیے انصاف کے ساتھ کرنی چاہیے، اس نے سب کچھ پا لیا۔ احسان سے یہاں مقصود حسن و عمل ہے۔ جو بات کرو' حسن و خوبی کی کرو۔ نیکی اور بھلائی کی کرو یعنی بنیاد عمل بھلائی ہو، برائی نہ ہو جو ہم سے قریب کا رشتہ رکھتے ہیں ،وہ ہمارے حسن سلوک کے زیادہ حقدار ہیں، اس لیے ایتائی ذی القربیٰ کی رعایت بھی ضروری ہوئی۔ پھر فحشا، منکر اور بغی سے روک کر نواہی کے سارے مقاصد پورے کر دیے۔ فحش سے مقصود وہ برائیاں ہیں جو حد درجے کی برائیاں تسلیم کر لی گئی ہیں، منکر میں ہر طرح اور ہر قسم و درجہ کی برائیاں آ گئیں۔ بغی میں ہر طرح کی زیادتی آ گئی، خواہ کسی گوشے اور کسی شکل میں کی گئی ہو۔

جو کتاب ایسے سانچے لے کر آئی ہو، جس سے ایسے اعمال ڈھلتے ہوں، جو ایسی زندگیاں بناتی ہو، اگر وہ ہدایت، رحمت اور بشارت نہیں تو اسے اور کس نام سے پکارا جا سکتا ہے؟

یہ بالکل درست ہے جس شخص کو نیکی، بدی اور اچھائی برائی کا کچھ بھی احساس و شعور ہو اور وہ دنیا کو بہتر سے بہتر حالت میں دیکھنے کا واقعی آرزو مند ہو، اسے ان باتوں سے ایک لمحے کے لیے بھی اختلاف نہیں

ہو سکتا۔ کیونکہ حقیقی اور پایدار فلاح کی راہ وہی ہے جس کی طرف قرآن دعوت دے رہا ہے اور اس کا صحیح اندازہ ہر انسان کو محض تدبر و تفکر صحیح سے ہو سکتا ہے، اگرچہ وہ اسلام کا معتقد نہ ہو۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی تو نظر انداز نہ ہونی چاہیے کہ جس وجود اقدس کو اس تعلیم و دعوت کا اکمل و اتم پیکر بنا کر ہدایت عالم کے لیے مبعوث فرمایا گیا۔ اس کے "رحمۃ اللعلمین" ہونے میں کسی کے لیے کیا گنجائش کلام باقی رہ سکتی؟ قرآن یقیناً "ذکرا للعلمین" ہے اور حضور ﷺ لاریب "رحمۃ اللعلمین" ہیں۔

عہد ماضی کے مناقشات

دنیا کا بڑا حصہ عہد ماضی کے مناقشات میں الجھا ہوا ہے۔ جھگڑے جاری ہیں، بحثوں کی گرم بازاری ہے حالانکہ جس دور پر سیکڑوں یا ہزاروں سال بیت چکے ان کے متعلق آج کوئی فیصلہ ہو بھی جائے تو گزشتہ حالات کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔

سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ایک مکالمے کا مختصر ساذکر ہے۔ فرعون نے سوال کیا کہ موسیٰ علیہ السلام! تمہارا پروردگار کون ہے؟ جواب ملا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شے کو اسکی خلقت بخشی، پھر اس پر زندگی اور عمل کی راہ کھول دی۔ فرعون کو خیال آیا کہ بے شمار گروہ گزر چکے ہیں۔ جو ایسے پروردگار کے معتقد نہ تھے۔ چنانچہ سوال کیا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہونا ہے، جو گزر چکے اور ایسے پروردگار کے تصور سے بھی ناآشنا تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا:

عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿٥٢﴾ (طٰہٰ:۵۲)

"اس کا علم میرے پروردگار کے پاس لکھا ہوا موجود ہے۔ میرا پروردگار ایسا نہیں کہ کھویا جائے یا بھول میں پڑ جائے۔"

یعنی اس کاوش میں پڑنے اور بحث و نزاع میں الجھنے سے ہمیں کیا حاصل ہو گا؟ بہتر ہے کہ گزرے ہوئے لوگوں کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں اور اپنی توجہ صرف ذاتی درستی پر جما دیں، کیونکہ نہ پہلوں کی گمراہیاں ہمیں کچھ نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ ان کی نیکیوں سے ہمیں کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ہمارا اچھا یا برا انجام ہمارے ہی اچھے یا برے اعمال کی بناؤ پر ہو گا، پھر کیوں انہی کی فکر نہ کریں؟ قرآن مجید نے یہی اصول دوسرے مقام پر ان الفاظ میں پیش کیا:

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٤﴾ (بقرہ:۱۳۴)

"یہ ایک امت تھی، جو گزر چکی۔ اس کے لیے وہ تھا، جو اس نے اپنے عمل سے کمایا۔ تمہارے لیے وہ ہو گا جو تم اپنے عمل سے کماؤ گے، تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ ان کے (یعنی گزری ہوئی قوموں اور جماعتوں کے)، اعمال کیسے تھے؟"

کتنا پاکیزہ اور امن پرور اصول ہے، جو ہمارے بے شمار جھگڑوں اور بحثوں کو ختم کر سکتا ہے۔ جب یہ مسلم ہے کہ نہ گزرے ہوئے لوگوں کی نیکیاں ہمارے بحثوں سے کم یا زیادہ ہو جائیں گی اور نہ ان کی بُرائیوں میں ہمارے جھگڑوں کی وجہ سے کوئی فرق پڑے گا۔ آخر ان بحثوں سے اس کے سوا کیا حاصل ہو سکتا کہ اپنا وقت بیجا صرف کریں، باہمی روابط کو بگاڑیں حالاں کہ ہماری یہ گرم جوشیاں نہ خود ہمارے نامہ اعمال میں کوئی اچھا اضافہ کرتی ہیں، نہ گزرے ہوئے لوگوں کے لیے کسی بھی درجے میں مفید و سود مند ہیں۔ اگر دنیا اس اصول کو اپنا لے تو غور کیجیے کہ اس کی ناخوشگوار اور بے نتیجہ سرگرمیوں میں کتنی کمی آجائے اور تعاون وخوشگواری کی فضا کتنی اچھی ہو جائے؟

بھائیوں کے درمیان مصالحت

قرآن مجید کا ایک اصول یہ ہے:

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (حجرات: ۹۔۱۰)

”اور اگر مسلمانوں کے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ پس اگر ان میں سے ایک زیادتی پر تلا رہے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی کا مرتکب ہو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پس اگر وہ لوٹ آئے تو دونوں فریقوں کے درمیان عدل کے مطابق صلح کرا دو اور انصاف پر استوار رہو۔ یقیناً اللہ کو پسند آتے ہیں انصاف کرنے والے۔ مومن باہم بھائی بھائی ہیں۔ پس اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔“

دیکھیے، قتل وخونریزی کو روکنے کی کتنی عمدہ، منصفانہ اور مؤثر عملی تدبیر ہے۔ ممکن ہے دو بھائیوں کے درمیان غلط فہمی کی بناء پر کشمکش کی نوبت آجائے تو اس صورت میں دوسرے بھائیوں کا فرض ہے کہ ان میں صلح کرا دیں۔ اگر کوئی فریق صلح سے انکار کرے یا زور و قوت کے بل پر دوسرے فریق کو پامال کر دینے پر تُل جائے تو سب کا فرض ہے کہ متحد ہو کر مظلوم کی حفاظت کے لیے کھڑے ہو جائیں اور ظالم کو رُک جانے پر مجبور کر دیں۔ جب زیادتی کرنے والا بھی صلح پر آمادہ ہو جائے تو بیچ بچاؤ کرنے والوں کا فرض ہے کہ صلح کرا دیں مگر وہ صلح عدل و انصاف کی بنا پر ہونی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ بعض لوگ قوی اور زبردست فریق کی کوئی بات اس بنا، پر قبول کر لیں کہ وہ زبردست ہے حالانکہ وہ بات عدل کے خلاف ہو۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم۔ عرض کیا گیا کہ مظلوم کی مدد تو کی جا سکتی ہے ظالم کی مدد کیونکر ہو گی؟ فرمایا: اس کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے روکو۔

یہ اصول مسلمانوں کے تعلق میں بیان ہُوا ہے، لیکن یہی اصول دنیا کے ہر بین الاقوامی ادارے کا ایک بنیادی اصول بن سکتا ہے اور جس حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے، انجمن اقوام متحدہ کا پورا نظام اسی پر قائم ہے، اگرچہ مختلف اقوام یا حکومتوں نے ذاتی اغراض کی وجہ سے اس پر عدل و انصاف کے ساتھ عملی پیرا ہونے کی صحیح صورت پیدا نہیں ہونے دی۔ ذاتی اغراض ہی کی آلودگی اب تک انجمن اقوام متحدہ کی کمزوری اور بے اثری کا باعث ثابت ہوئی ہے۔ قرآن مجید کے اس اصول سے جتنا انحراف کیا جائے گا یا اس پر عمل کی زیادہ سے زیادہ اچھی صورت اختیار کرنے میں جتنا تامل ہو گا، اتنا ہی امن عالم میں اختلال کا دروازہ کھلا رہے گا۔

موجبات اختلال کا انسداد

پھر قرآن مجید نے قوموں کے خوشگوار تعلقات میں خلل ڈالنے والا ایک ایک رخنہ بند کیا۔ مثلاً:

۱۔ لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ (حجرات: ۱۱)

”ہنسی نہ اڑائیں ایک قوم کے لوگ دوسری قوم کے لوگوں کی شاید وہ ان سے بہتر ہوں۔“

۲۔ لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ (حجرات: ۱۱)

”عیب نہ لگاؤ ایک دوسرے کو۔“

۳۔ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۔ (حجرات: ۱۱)

”چڑانے کی غرض سے ایک دوسرے کے نام نہ رکھو۔“

۴۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (حجرات: ۱۲)

”اے ایمان والے لوگو! بہت بدگمانیوں سے اجتناب کرو، کیونکہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔“

۵۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ۝۶ (حجرات: ۶)

”اے ایمان والے لوگو! اگر کوئی فاسق آدمی تمہارے پاس خبر لائے تو (اسے صحیح سمجھنے سے پیشتر) تحقیق کرلیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ (خبر سنتے ہی) تم نادانی سے دوسری قوم پر جاپڑو۔ پھر کل اپنے کیے پر پچھتانے لگو۔“

آخری گذارش

یہ صرف چند اصول بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں، جن سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا زاویہ نگاہ عالمی اور بین الاقوامی ہے۔ ساتھ ہی بین الاقوامی ادارہ ہائے امن و سلامتی کے بنیادی اصول بھی سامنے

آجاتے ہیں اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ ایسے اداروں کو زیادہ سے زیادہ مؤثر و کامیاب بنانے کے لیے کن کن اوصاف وخصائص کی اشد ضرورت ہے۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ ان اوصاف وخصائص کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کئے بغیر کوئی اجتماعی ادارہ خصوصًا بین الاقوامی ادارہ کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔

تمت بالخیر

اشارات
سیرت پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم



حکیم الاسلام امام انقلاب
مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ

اشارات سیرت پیغمبر انقلاب ﷺ

نبی کس کو کہتے ہیں؟

جاننا چاہئے کہ مفہمین (یعنی وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی کی حقیقت سمجھائی ہے) کے بہت سے اقسام ہیں اور ان کی لیاقتیں اور قابلیتیں بھی جدا جدا ہیں۔ انہی میں سے اللہ تعالیٰ نوعِ انسان کے لئے رہبر اور رہنما مقرر کرتا رہتا ہے۔ جب اللہ کی حکمت یہ چاہتی ہے کہ ان میں سے ایک کو اپنی مخلوق کی طرف بھیجے اور اس کو لوگوں کے تاریکی میں سے نکال کر روشنی کی طرف آنے کے لئے سبب بنائے تو لوگوں پر یہ فرض کرتا ہے کہ دل اور جان سے اس کی تابعداری کریں۔ اور اسی کے لئے اس دنیا سے باہر کی مخلوق یعنی ملائکہ کی اُونچی جماعت میں یہ تجویز پاس کی جاتی ہے کہ جو آدمی اس کی تابعداری کرے گا اس سے ملائکہ راضی ہوں گے اور جو اس کی مخالفت کرے گا اس کے دشمن ہو جائیں گے اور اس پر لعنت کرتے رہیں گے۔ جب اللہ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے تب اللہ تعالیٰ اس دنیا کے رہنے والے انسانوں کو اس بات کی خبر دیتا ہے اور ان پر اس بھیجے ہوئے انسان کی تابعداری کرنا لازم ٹھہراتا ہے۔ اس بھیجے ہوئے بزرگ کو جس کی تابعداری کرنا لوگوں پر لازم ہے نبی کہا جاتا ہے۔

اللہ والوں کے اقسام

اوپر گزر چکا ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی کی حقیقت سمجھائی ہے ان کے بہت سے اقسام ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی کامل ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کی حقیقت سمجھنے میں کمال کو پہنچ چکا ہے۔ یہی نبی کی شان ہے)، کوئی حکیم ہے (یعنی اللہ کی بادشاہی میں جو حکمت رکھی ہوئی ہے وہ اس کو سمجھتا ہے) کوئی "مؤیّد بروح القدس" ہے (یعنی انسانیت کو کمال تک پہنچانے کے لئے جو کام اس پر رکھا ہوا ہے یا اس نے اپنے اوپر لیا ہے اس میں اس کی مدد روح القدس سے ہوتی رہتی ہے)، کوئی لوگوں کو راستہ دکھانے والا "ہادی" اور ان کو پاک کرنے والا "مزکی" ہے، کوئی امام (یعنی قوموں کا رہنما) ہے۔ کوئی مُنذِر (یعنی کاموں کے نتائج کی پہلے سے خبر دینے والا) ہے۔

سب سے بڑا نبی کون ہے؟

انبیاء میں سب سے بڑی شان والا وہ نبی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی قوم کے ساتھ دوسری اقوام کی طرف بھی نبی بنا کر بھیجا ہو۔ پھر وہ نبی اپنی قوم کو اندھیروں میں سے روشنی کی طرف نکالنے کا سبب ہو گا اور اس کی قوم دوسرے اقوام کی رہنما بنے گی۔ یہ دونوں باتیں محمد رسول اللہ ﷺ میں موجود ہیں۔ پہلی بات کی طرف سورۂ جمعہ کی دوسری اور تیسری آیت میں ارشاد ہے۔ ان دونوں آیتوں کے معنی یہ ہیں "اللہ وہ ہے جس نے ان پڑھوں میں ان میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور بیشک وہ اس سے پہلے ظاہر گمراہی میں تھے اور ان میں سے دوسروں کے لئے بھی (اس کو بھیجا ہے) جو اب تک اُن (پہلوں) سے نہیں ملے اور وہ زبردست حکمت والا ہے۔" دوسری بات کی طرف سورۃ آل عمران کی ایک سو دسویں آیت میں اشارہ ہے، اس آیت کے معنی یہ ہیں "تم اچھے کام کا حکم کرتے ہو اور برے کام سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔ اگر کتاب والے ایمان لاتے تو ان کے لئے بہتر تھا۔ کچھ ان میں سے ایمان والے ہیں اور بہت سے ان میں سے نافرمان ہیں۔" اور مندرجہ ذیل احادیث میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے۔

☆ حدیث: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (لوگوں کے لئے) آسانی پیدا کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور ان پر تنگی کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا (یعنی اُمتِ محمدی کے افراد بھی انسانوں کی ہدایت کے لئے اس طرح بھیجے ہوئے ہیں جس طرح انبیاء علیہم السلام کو بھیجا جاتا ہے)

علاوہ اس کے رسول اللہ ﷺ میں علم کے وہ سب اقسام موجود تھے جو جدا جدا ان لوگوں میں موجود ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی کی حقیقت سمجھائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے جو انبیاء تھے ان میں سے کسی کو ایک قسم کا علم تھا۔ کسی کو دو قسموں کا۔ لیکن علم کے تمام اقسام رسول اللہ ﷺ کے سوا دوسرے کسی میں بھی نہ تھے (یعنی انبیائ، حکماء اور جن کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی ہے۔ رہنما اور اماموں کے جتنے بھی جدا جدا علم ہیں، علم کے وہ سب اقسام ہمارے نبی کو حاصل ہیں)۔

نبیوں کو انبیاء بنا کر کیوں بھیجا جاتا ہے؟

یہ بھی جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت رسولوں کو بھیجنے کی تب خواہش کرتی ہے جب رسولوں کے بھیجنے میں کسی قسم کی بھلائی ہو۔ اس بھلائی کو اللہ غیب دان کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔ لیکن بعض اسباب ایسے بھی ہیں جن کو ہم بھی جانتے ہیں۔ وہ اسباب رسولوں کے بھیجنے کے وقت ضرور پائے جائیں گے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ وقت کسی نئی حکومت (یعنی نئے نظام حکومت) کے ظاہر ہونے اور پہلی حکومت کے برباد ہونے کا ہو گا۔ پھر اس وقت اللہ تعالیٰ ایسا رسول بھیجے گا جو اس نئی حکومت کا دین یا قانون قائم

کرے گا۔ اور پرانی حکومت برباد ہو گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سردار محمد ﷺ کو اس کام کے لئے نبی بنا کر بھیجا ہے۔ کہ قیصر و کسریٰ کی سرمایہ دارانہ (یعنی سرمایہ پرستانہ) اور ظالمانہ حکومتوں کو مٹا کر خلافت الٰہی کی عادلانہ حکومت قائم کی جائے۔

رسول اللہ ﷺ کو نبی بنا کر بھیجنے کی حکمت

جب ہر قوم (ملت) کا دین اور دھرم جدا ہو گیا اور ہر ایک قوم نے خاص طریقے اختیار کر لئے اور ان رسومات اور طریقوں کو قائم رکھنے کے لئے دوسری قوموں کے ساتھ پہلے زبان کے ساتھ انہوں نے جھگڑے کئے اور اس کے بعد اپنے مخالفین پر غالب آنے کے لئے اپنے ہتھیار اُٹھا کر ان سے جنگ بھی کی اور ان میں ظلم پھیل گیا۔ اور کتنے کام جو ان کو کرنے تھے ان کو انہوں نے چھوڑ دیا۔ اور ہر جماعت نے دوسری جماعت پر لعنت کی۔ اور ان کو برا سمجھ کر ان کے ساتھ جنگ جاری رکھی اور قوموں کے آپس میں جھگڑے کے سبب حق چھپ گیا۔ تب ایک راہِ راست پر چلنے والے امام یا پیشوا کی ضرورت پڑی جو تمام جماعتوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرے جیسا حق پر چلنے والا خلیفہ (اللہ کا نائب) ظالم بادشاہوں کے ساتھ کرتا ہے (یعنی یہ پیشوا مختلف جماعتوں کو ملا کر ان کو ایک جماعت بنائے گا)۔ یہ امام (پیشوا) جو جدا جدا جماعتوں کو ملا کر ایک جماعت بنائے گا اس کو چند اصولوں پر چلنا ہو گا۔ ان اصولوں میں سے پہلا اصول یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہِ راست کی طرف بلائے گا۔ اور اُن (کے اخلاق) کو پاک کرے گا اور ان کی حالت درست کرے گا۔ اس کے بعد ان سے ایسا کام لے گا جیسا اپنے اعضاء سے لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ ان کو لوگوں کی ہدایت کے لئے جدا جدا ملکوں میں بھیج دے گا۔ اور سیدھے راستے پر نہ چلنے والی دُنیا سے جنگ بھی کرے گا۔ یہ تیسرے فائدہ میں بیان کی ہوئی آل عمران کی آیت ۱۱۰ کے معنٰی ہیں۔

اس پہلے اصول پر امام کو اس لئے چلنا پڑے گا کہ اس اکیلے امام (پیشوا) سے دنیا کی بے شمار جماعتوں کے ساتھ مقابلہ نہ ہو سکے گا۔ اور گمان بھی یہ ہے کہ سیدھے راستے پر چلانے کے لئے جنگ کے بڑے ساز و سامان اور پوری فوج کے سوا (جن کے حاصل کرنے کے لئے نبی (امام) کی عمر کافی نہیں ہے) وہ دوسری جماعتوں کی تابعداری قبول نہیں کرے گی جیسے کہ اس وقت کے موجودہ ادیان والوں (یہود، عیسائی اور مسلمانوں) کے شروع زمانہ میں ہوا۔ کیونکہ ان میں سے جو لوگ ابتدا میں اپنے اپنے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائے۔ وہ بالکل تھوڑے تھے۔ اس نبی کے بعد وہ آہستہ آہستہ طاقت ور ہوئے اور اقوام کی ہدایت کا سبب بنے اور حق کے لئے انہوں نے لڑائیاں کیں۔

رسول اللہ ﷺ کے وقت میں ملک کی حالت اور آپ نے اُسے کیسے بدلا؟

جن ملکوں کی آب وہوا معتدل ہے (جس کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کا مزاج بھی معتدل ہے) وہ ملک رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے کے وقت دو بڑے بادشاہوں کے قبضہ میں تھے۔

۱۔ کسریٰ (ایران کا بادشاہ) جس کا عراق۔ یمن۔ خراسان اور ان ملکوں کے ارد گرد والے ملکوں پر قبضہ تھا، ماوراء النہر سندھ اور ہندوستان کے بادشاہ بھی اس کے ماتحت تھے اور ہر سال اس کو خراج دیتے تھے۔

۲۔ قیصر (روم یا یورپ کا بادشاہ) جس کا شام، روم اور ان ملکوں کے ارد گرد والے علاقوں پر قبضہ تھا۔ مصر، مغرب اور افریقہ کے ملک بھی اس کے ماتحت تھے اور ہر سال اس کو خراج دیتے تھے۔ پس ان دونوں بادشاہوں کو شکست دینے اور ان کے ملکوں پر غالب آنے کے یہ معنیٰ ہوں گے کہ جس نے ان کو شکست دی اس کا تمام پر غلبہ ہو گیا (اُمتِ اسلامیہ نے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان دونوں حکومتوں کو فتح کر کے گویا روئے زمین کو اپنے قبضہ میں کر لیا)۔ اس کے علاوہ ان دونوں بادشاہوں کی عیش و عشرت کی عادات ان کے ماتحت ملکوں میں پھیل گئی تھیں پس ان عادات کے بدلنے اور ان عادات سے لوگوں کو روکنے کے یہ معنیٰ ہوں گے کہ گویا تمام ملکوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ ان عادات کو چھوڑ دیں (ورنہ ان پر تباہی آئے گی)۔

لیکن جن ملکوں کی آب و ہوا اور وہاں کے لوگوں کا مزاج معتدل نہیں ہے ان کا انسانی نوع کی اصلاح میں کوئی خیال نہیں کیا گیا ہے۔

پس جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ اس ٹیڑھے راستہ کو سیدھا کرے اور لوگوں کے لئے ایک ایسی جماعت (امتِ اسلامیہ) پیدا کرے جو ان کو اچھے کام کا حکم کرے اور بُرے کام سے روکے اور ان کے بگڑے ہوئے رسم و رواج کو بدلے تب یہ بات اس پر موقوف ہوئی کہ قیصر و کسریٰ کی حکومت برباد کی جائے۔ اور ان کی پیدا کی ہوئی بُری عادتوں کو درست کیا جائے کیونکہ ان کی پیدا کردہ حالت نے معتدل مزاج ملکوں میں گہرا اثر کیا تھا۔ اس لئے ان دونوں بادشاہوں کے برباد ہونے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے خبر دی کہ کسریٰ برباد ہو گا اور اس کے بعد کوئی بھی کسریٰ پیدا نہ ہو گا اور قیصر برباد ہو گا اس کے بعد کوئی دوسرا قیصر پیدا نہ ہو گا۔ اور تمام دنیا کے باطل کو مٹانے والا (قرآن کریم) اللہ کی طرف سے نازل ہوا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عرب کے باطل عناصر کو رسول اللہ ﷺ اور اس کے صحابہ کے ہاتھوں سے مٹائے گا۔ اور پھر اسی عرب کے ہاتھوں سے قیصر اور کسریٰ کے باطل کو مٹائے گا اور باقی ملکوں کے باطل کو ان دونوں بادشاہتوں کے رہنے والوں کے ہاتھوں سے مٹائے گا۔

مہاجرین اولین اور انصار سبب بنے قریش اور قریش کے ارد گرد رہنے والوں کے اسلام میں داخل ہونے کا پھر ان کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے عراق اور شام فتح کرایا۔ اس کے بعد عراق اور شام والوں کے

ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے فارس اور روم فتح کرایا۔ پھر ان کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے ہندوستان و ترکستان اور سوڈان فتح کرایا۔ گویا کہ یہ کام ایک مکان کی طرح ہے جو دیواروں پر کھڑا ہوتا ہے اور دیواریں بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا چھ فوائد سے رسولوں کے بھیجنے کی حکمت بھی سمجھ میں آگئی اور یہ بات بھی کہ رسول اللہ ﷺ کے آنے سے جو نتیجہ ظاہر ہوا وہ قرآن پر عمل کرنے سے ہوا۔ پس اس تمام نتیجہ کو قرآن کی تعلیم کا نتیجہ سمجھنا چاہئے اور اس نتیجہ کے پیدا کرنے کے لئے قرآن کو نازل کیا گیا ہے۔ (یہ چھ فوائد امام ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے لئے گئے)۔

☆

۱۔ رسول اللہ ﷺ کی شریعت کا اصل مول متہ کیا تھا؟

رسول اللہ ﷺ نے یہ دعویٰ کیا کہ آپ خود ابراہیمی ملت کو ان کے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام کے طریقہ پر زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام گزر چکے تھے اور وہ بھی ابراہیمی ملت کو زندہ کرنا چاہتے تھے لیکن اسرائیل (یعقوب) بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کی نظر ہمیشہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر پڑتی ہے جیسا کہ قرآن میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (سورہ مزمل۔ ۱۵)

(یعنی بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک گواہی دینے والا رسول بھیجا ہے جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا) اس آیت میں مذکورہ بالا بات کی طرف اشارہ کیا ہوا ہے۔

تمام شریعتوں کا اصل، حظیرۃ القدس (اس جہان کا انتظام کرنے والی مقدس مجلس) میں موجود ہے۔ پس جن بزرگوں کا تعلق حظیرۃ القدس سے ہے وہ ہر شریعت کو وہاں سے معلوم کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ بھی موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو وہاں سے معلوم کرتے تھے۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے دنیا کی اقوام تک دین حنیفی کی کیسے تبلیغ فرمائی؟

رسول اللہ ﷺ نے عرب کے سوا تمام دنیا کو اس طرح دعوت دی اور ارشاد فرمایا کہ توراۃ اور قرآن کی تعلیم ایک ہی ہے۔ اگر تم کو ان دونوں کتابوں میں سے کسی کتاب کی تعلیم پر اعتراض ہے تو تم ان دونوں کتابوں جیسی تعلیم پیش کرو۔ اگر تمہاری تعلیم توراۃ اور قرآن کی تعلیم سے زیادہ رہنما ثابت ہوئی تو میں اس کی تابعداری کروں گا۔ لیکن خاص عرب قوم کو صرف اکیلے قرآن کی تعلیم کی دعوت دیتے تھے

۔ قرآن اور توراۃ کی تعلیم کے بارے میں قرآن نے جو اعلان کر رکھا ہے اس کو سورۃ المائدہ کی آیات ۴۴ سے ۵۰ تک دیکھنا چاہیے۔

۳۔ دینِ حنیفی کی دوسرے ادیان سے برتری

اس وقت مسلمانوں کے سوا زمین پر جتنی بھی جماعتیں موجود ہیں ان میں سے ایک حنیفی (یعنی یہودی اور عیسائی) ہیں جن کے پاس تورات ہے، دوسرے صابی ہیں پھر صابی مذہب والوں کے کئی اقسام ہیں: (۱) ایران کے مجوسی، جن کے پاس زردشت کی کتاب ہے (۲) ہندو۔

ہندو دھرم والوں کی پھر دو جماعتیں ہیں: (۱) برہمن، جن کے پاس وید ہیں (۲) سمنی، جن کے پاس بُدھ کی نصیحتیں اور احکام ہیں۔ برہمنوں کی مثال ہمارے پاس یہودیوں جیسی ہے اور بُدھ دھرم والوں کی مثال عیسائیوں کی طرح ہے۔

حنیفی اور صابی مذہب والوں کے سوا تیسرے وہ لوگ ہیں جو عقل اور فکر سے سوچی ہوئی باتوں پر چلتے ہیں جن کے مراکز یونان اور روم ہیں۔ انہوں نے جب کبھی کوئی بادشاہی قائم کر کے قوم کو اکٹھا کیا ہے اواس لئے ان کو دنیا کے قوانین سے کسی اونچے قانون کی ضرورت پڑی ہے تو انہوں نے اہلِ کتاب کے قانون میں سے جو قانون ان کی رائے کے مناسب ہوا ہے اس کو لیا ہے اور اس کے بعد یا تو کسی (ڈکٹیٹر) بادشاہ کی طاقت سے مدد لی ہے یا آسمانی ادیان میں سے کسی دین کی طرف انہوں نے رجوع کیا۔ اس طرح انہوں نے اپنی عقل سے کام لیا ہے۔

زردشت ایرانیوں کی کتاب، وید اور بدھ دھرم والوں کی کتاب یہ سب کتابیں توراۃ کے درجہ کو کبھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اس بات کو مذکورہ بالا مذاہب والے بھی مانتے ہیں۔

حاصل مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا جماعتوں میں سے کسی جماعت کے پاس بھی تورات جیسی کتاب نہیں ہے جس میں انبیاء سے لیا ہوا قانون جمع کیا ہوا ہو۔

۴۔ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے امام کا خطاب کیوں ملا؟

ابراہیم علیہ السلام کا دین کسی زمین یا کسی قوم کے ساتھ خاص نہ تھا بلکہ روئے زمین کے تمام نوع انسانی کے لئے تھا۔ ابراہیم علیہ السلام کے بعد کوئی بھی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا جس نے ابراہیم علیہ السلام کی طرح تمام نوع انسانی کے فائدہ کے لئے کوئی عام فکر پیش کی ہو۔ یہ معنیٰ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ہیں اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرہ۔۱۲۴) (یعنی اے ابراہیم علیہ السلام ! میں تجھ کو لوگوں کے لئے امام بنانے والا ہوں)۔

۵۔ حنیفی مِلّت کی اصلی روح

ابراہیم علیہ السلام کے دین کی اصل روح یہ تھی کہ کسی بھی جماعت پر کسی شخص کی بادشاہی نہ ہو اور کوئی چیز بھی مخلوقات میں سے خدا نہیں بن سکتی۔ اس عقیدہ کو ہی توحید کہا جاتا ہے۔ یہ ایسا فکر ہے کہ جس کو ہر ایسا شخص پسند کرے گا جس کی انسانیت اور عقل سلامت ہوں گے کیونکہ کوئی بھی انسان نہیں چاہتا کہ اپنے جیسے انسان سے دھوکا کھاجاوے اور اس کا زیر دست ہو کر رہے۔ بلکہ ہر انسان کسی ایسی بات کو پسند کرتا ہے جس میں مشورہ لیا جائے اور اس مشاورت میں اس کو بھی دخل ہو۔ یہ گویا کہ انسانی فطرت ہے۔

اس کے علاوہ بڑے حکماء کے یہاں یہ بھی ثابت ہے کہ اس جسمانی دنیا کے پردہ کے پیچھے ایک اور ذات بھی ہے جس کے لازمی صفات کی بناپر یہ جہان پیدا ہوا ہے۔ وہ ذات انسانی حواس کے سمجھنے سے بالکل دور ہے۔ چنانچہ ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کو اپنے حواس سے معلوم کر سکے، اس کو اللہ کا درجہ نہ دے۔ کیونکہ اللہ کی ذات حواس کے دائرہ کار سے بالکل باہر ہے۔

پس جو انسان آنکھوں اور دیگر حواس سے معلوم کی ہوئی مخلوق کو اللہ کے مترادف نہیں سمجھتا وہ اللہ کے خاص بندوں میں سے ہے۔

۶۔ یہودی اور عیسائی اگرچہ حنیفی ملت کی شاخیں ہیں لیکن انہوں نے اس کی پوری تبلیغ نہیں کی۔

پانچویں فائدہ میں بیان تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعوت تمام روئے زمین کے انسانوں کے لئے تھی لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دعوت آپ کی زندگی میں انسانیت کے تمام اقسام تک نہ پہنچ سکی۔ پس آپ نے دعا مانگی کہ کاش: اللہ تعالیٰ اُسے اولاد دے اور ان کے لئے ایک مرکز قائم ہو! اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد کی طرف سے آپ کے فکر (یعنی دعوت توحید) کو انسانوں کے تمام اقسام تک پہنچایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول کی اور اسمٰعیل علیہ السلام اور اسحٰق علیہ السلام دو فرزند عطا فرمائے۔ ان کے لئے آپ نے دو تبلیغی مرکز قائم کئے۔ اسحٰق علیہ السلام کے لئے بیت المقدس کی مسجد اور اسمٰعیل علیہ السلام کے لئے مکہ شریف کی مسجد الحرام۔

پھر جو بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے بلند خیال والا انسان پیدا ہوا ہے اس نے کوشش کی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے فکر کو انسانوں کے تمام اقسام تک پہنچادے۔ اور خود قوموں کا امام (پیشوا) بنے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی ان بلند خیال والے انسانوں میں سے ایک بڑے پیغمبر تھے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں کوشش کی لیکن وہ بھی کام کو پورا نہ کر سکے کیونکہ ان کی قوم نے، جسے آپ نے ابراہیمی ملت کی اشاعت کیلئے اپنا مددگار بنایا تھا، اس کی پوری تابعداری نہ کی۔ اس لئے کام ادھورا رہ گیا۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی یہ مرضی تھی کہ اپنی قوم کو مصر کے ملک سے نکال کر بیت المقدس میں بسائیں اور وہاں اپنا مقصد پورا کرنے

کے لئے ایک ادارہ قائم کریں لیکن آپ بیت المقدس تک پہنچے ہی نہیں کہ راستے میں فوت ہو گئے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام جیسا اولعزم دوسرا کوئی بھی پیدا نہیں ہوا جو ان کے چھوڑے ہوئے کام کو پورا کر سکے۔

موسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسیٰ علیہ السلام آئے اور انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کا قائم مقام بن کر ابراہیمی دعوت کو انسانوں کے تمام اقسام تک پہنچا دیں! لیکن یہود نے اس بات کو قبول نہیں کیا۔

اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام نے فقط ایک "تبلیغی جماعت" تیار کی جو ابراہیمی دعوت کو تمام اقوام تک پہنچاتی رہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی تیار کردہ تبلیغی جماعت کی کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ مشرقی رومی سلطنت نے، جو اسرائیلی قوم سے بالکل الگ قوم تھی عیسائی مذہب قبول کیا اور اس نے وہ کام کر دکھایا جس کی یہود کو توفیق نہ ہوئی۔

یہودیوں نے بھی ابراہیمی طریقہ پر ایک ادارہ قائم کیا لیکن وہ محض اپنی قوم کے لئے تھا دے گر انسانوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کا مقصد فقط یہ تھا کہ وہ خود ابراہیم علیہ السلام کے دین پر چلیں گے اور جو شخص بھی ابراہیم علیہ السلام کے دین کی دوسری اقوام میں تبلیغ کرتا اسے دشمن سمجھتے اور اس کو طرح طرح کی تکالیف پہنچاتے تھے۔

عیسیٰ علیہ السلام نے پہلے یہود کو ابراہیمی ملت کی روح سمجھائی لیکن جب ان سے نااُمید ہو گئے تو اپنے حواریوں کی ایک جماعت تیار کی اور ان سے یہ عہد لیا کہ وہ ابراہیمی ملت کی روح کو تمام اقوام میں پھیلا دیں گے۔

اب ابراہیمی ملت پر چلنے والوں کے دو مذاہب قائم ہو گئے: (۱) یہودی جنہوں نے ابراہیمی دعوت کو بنی اسرائیل کے لئے مخصوص کر دیا (۲) عیسائی جنہوں نے ابراہیمی دعوت کو دیگر اقوام تک بھی پہنچایا لیکن سالہاسال کے بعد انہوں نے نہ صرف یہ کہ ابراہیمی ملت کی روح کو چھوڑ دیا، بلکہ اس کی صورت کو ہی بگاڑ دیا۔

۷۔ حنیفی ملّت کی پوری پوری تبلیغ کون کرے گا؟

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ان کی اولاد میں سے ایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہو گا جو ان کی تعلیمات کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلائے گا۔ ابراہیم علیہ السلام کو اس وعدہ پر پورا بھروسہ تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ وہ نبی اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے پیدا ہو گا۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کے حکم سے ایسی زمین میں بسایا جہاں کوئی کھیتی نہیں ہوتی کیونکہ کھیتی کرنے والے لوگوں کو ہمیشہ اپنے سرسبز وطن پر فخر رہتا ہے اور وہ اپنے وطن والوں کو منفرد قوم سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد اگر وہ اس وطن

والے کسی خاص آدمی کی اولاد ہوں گے تو وہ اپنی نسل پر بھی اترائیں گے اور دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھیں گے اور ان میں اپنے خیالات کی تبلیغ کرنے سے رُک جائیں گے۔ کھیتی والے ملکوں کے باشندوں کو دیکھا گیا ہے کہ ان کے باپ دادا کی اولاد اگر دوسرے ملک میں بستی ہے اور ان کے ساتھ کسی بات پر جھگڑا ہو جائے تو وہ اپنے بھائیوں کے فائدہ کو اپنے وطن کے مفاد پر کبھی ترجیح نہیں دیں گے۔

اسی طرح اگر ایک جماعت کی بنیاد چند سچے اعتقادات پر قائم ہو اور اس جماعت کا ایک حصہ جدا ہو کر کسی بڑے خوشحال ملک میں آباد ہو جائے تو وہ حصہ اپنے مذہب والوں کی مصلحت کا اس وقت کبھی خیال نہیں کرے گا، جب ان کے مذہب کی مصلحت ان کے وطن کی مصلحت سے مخالف ہو گی۔ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو ایک بیابان میں بسانے سے یہی مقصد تھا کہ اس کی اولاد میں وطن کی (فاخرانہ) محبت پیدا نہ ہو بلکہ اپنے مذہب کو ہر حالت میں مقدم رکھتے آئیں۔

آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ جس بیٹے کا اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ وعدہ کیا تھا جو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہو گا۔ وہی ان کی ملت کو تمام دنیا میں پھیلانے میں کامیاب ہو گا۔ اسی لئے اسماعیل علیہ السلام کو حجاز کے بیابان میں رہنے کا حکم دیا۔ اس کے علاوہ ابراہیم علیہ السلام یہ بھی جانتے تھے کہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے سوا بہت سے لوگ اس مقصد کے لئے کوشش کریں گے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوں گے کیونکہ وہ خوشحال ملکوں کے باشندے ہوں گے۔ پس ان میں کسی نہ کسی قسم کا تمدن آئے گا۔ پھر دوسرے لوگ جن کا تمدن بھی اگرچہ انہی کی طرح ہو گا لیکن وہ یہ کبھی برداشت نہ کریں گے کہ ان کے تابعدار ہو کر رہیں اور وہ ان سے برتر و بلند رہیں۔ اسی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام اپنے ہدف تک پہنچ نہ سکے۔

۸۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کہ حنیفی دین کی پوری تبلیغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے

عیسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ یہودی، ابراہیمی ملت کو تمام اقوام میں پھیلانے کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتے تو وہ ان سے نااُمید ہو گئے لیکن پہلی کتابوں سے ان کو معلوم تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے جو مردِ خدا اس کے دین کو تمام اقوام میں عام کرے گا وہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے پیدا ہو گا۔ اس لئے انہوں نے ایک پیغمبر کے پیدا ہونے کی خوشخبری سنائی اور فرمایا کہ جس کام کے کرنے کا میں نے ارادہ کیا تھا اس کو وہ آکر پورا کرے گا۔ اور اپنے حواریوں کو بھی وصیت فرمائی کہ جب اس کا ظہور ہو تو تم اس کی تابعداری کرنا۔ لیکن عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کی مخالفت کے پیشِ نظر اس بات کو صاف اور واضح الفاظ میں بیان نہیں فرمایا بلکہ مختلف اوقات میں علیحدہ علیحدہ موقعوں پر حسبِ ذیل طور پر ارشاد فرمایا:

۱۔ میں اپنے رب سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے کہ اب تک تمہارے ساتھ رہے (یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶) یعنی یہ میری قوم تمام اقوام انسانیت میں پھیل جائے۔

۲۔ میں تمہیں یتیم نہ چھوڑوں گا۔ میں تمہارے پاس آؤں گا۔(یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۸) یعنی میری تعلیم توحید کی تکمیل ہو گی۔

۳۔ میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں لیکن مدد گار (یعنی روح القدس اسے بھیجے گا) وہی تمہیں تمام باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔(یوحنا باب ۱۴ آیت ۲۵)

۴۔ اب میں اپنے بھیجنے والے کے پاس جاتا ہوں اور تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا تو کہاں جاتا ہے، بلکہ اس لئے میں نے یہ باتیں تم سے کہیں کہ تمہارا دل غم سے بھر گیا لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مدد گار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم انکی برداشت نہیں رکھ سکتے، لیکن جب وہ (توحید) سچائی کا روح آئے گا تو تم کو پوری سچائی کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سُنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا کہ کامیابی تمہاری ہے۔

وہ میرا جلال ظاہر کرے گا اس لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا جو کچھ رب کا ہے وہ سب میرا ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے حاصل کرتا رہے گا اور تمہیں خبر دے گا۔ تھوڑی دیر تم مجھے نہ دیکھو گے اور پھر تھوڑی دیر میں تم مجھے دیکھ لو گے۔(انجیل یوحنا باب ۱۶ آیت ۵)

عیسیٰ علیہ السلام کی ان تمام بشارتوں سے یہ بات ظاہر ہے کہ یہ تمام بشارتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے متعلق ہیں۔ ان بشارتوں کے علاوہ انبیاء سابقین کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بارے میں بہت سی بشارتیں موجود ہیں۔ یہود ان بشارتوں کو دیکھ نہیں سکتے اس لئے کہ انہوں نے ان پیشگوئیوں کی غلط معنیٰ بیان کر کے بگاڑ دیا ہے تاکہ لوگ ان کے صحیح معنیٰ نہ سمجھ سکیں۔ لیکن وہ اللہ کی صحیح بات کو بدل نہیں سکتے۔ جو شخص بھی توراۃ اور اناجیل کو غور و فکر سے پڑھے گا وہ حق کو سمجھ جائے گا۔ اور جو کچھ ان سرکشوں نے لکھا ہے اسے چھوڑ دے گا۔

۹۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصلی مقصد

ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا یقین تھا اور عیسیٰ علیہ السلام نے بھی آپ کے آنے کی خوش خبری دی تھی۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا مقصد

متعین ہو جاتا ہے وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ دنیا میں ایک زبردست حکومت قائم کریں گے جس کا مقابلہ دوسری کوئی بھی حکومت نہیں کر سکے گی۔ اور اس حکومت میں تمام اقوام کو حنیفی ملّت پر جمع کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ اپنے اس مقصد میں یقینا کامیاب ہوئے لیکن آپ کے اس مقصد کی تکمیل میں آپ کے خلفاء ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ کی کوششوں کو بھی شریک اور شمار کیا جائے۔ ان چاروں بزرگوں نے اس مقصد کو یقیناً پورا کیا۔ ان چاروں کے بعد پھر قدم پیچھے ہٹنے شروع ہوئے۔

۱۰۔ رسول اللہ ﷺ کا اپنے مقصد میں کامیاب ہونا

قرآن کریم رسول اللہ ﷺ کی کامیابی کی خوش خبری ایک مثال کے ذریعے سناتا ہے وہ یہ ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ (سورۂ فتح۔۲۹) اس مثال میں ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی روح دیکھنے میں آتی ہے۔ دوسری طرف رسول اللہ ﷺ نے وہ کام کیا ہے جو دوسرے کسی بھی انسان نے نہیں کیا۔ قرآن اس تمام کام کو اکیلے رسول اللہ ﷺ کا کام نہیں ٹھہراتا بلکہ آپ کی ذاتِ مبارک کے ساتھ اس کام کو آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کا کام بھی ٹھہراتا ہے۔ چنانچہ کسی کو بھی جائز نہیں ہے کہ آپ کی ذاتِ مبارک کو غیبی طاقت کا مالک مانے اور قانون کا مالک (بادشاہ) ٹھہرائے۔ اور یہ فکر تورات، انجیل اور قرآن سے ثابت ہوتی ہے۔ اس فکر کے ساتھ مندرجہ ذیل باتیں بھی یاد رکھنی چاہئیں۔

(پہلی بات) وہ حکماء اور عقلمند جنکی سمجھ پر بھروسہ کیا جاتا ہے ان میں سے کسی نے بھی انسانی اجتماع کے لئے قرآن جیسا پروگرام پیش نہیں کیا۔ سورہ اسراء کی آیت ۲۸ کے معنٰی یہ ہیں:

(اے رسول کہہ دو: اگر انسان اور جن اس پر جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا کوئی کتاب آئیں تو اس جیسا نہیں لا سکیں گے اگرچہ بعض ان کے مددگار بھی بن جائیں)

(دوسری بات) صابی مذہب کی جو شاخیں ایران، چین اور ہندوستان میں ہیں ان سب کا مقصد وہی تھا جو رسول اللہ ﷺ اور قرآن نے پیش کیا اور ان مذاہب میں بلند مرتبہ آدمی بھی پیدا ہوئے لیکن انہوں نے بھی تمام انسانی جماعتوں کے لئے ابراہیم علیہ السلام کے دین جیسا مقصد پیش نہیں کیا۔ جو مذہبی کتابیں ہندوستانیوں، ایرانیوں، چینیوں اور یونانیوں کے پاس ہیں ان کی اللہ کے فضل سے ہم کو سمجھ ہے لیکن اس (تکمیل توحید کے) مقصد کو کیسے پورا کیا جائے اس میں وہ بھی قرآن سے بہت پیچھے ہیں۔

ان مذاہب کے بعض آدمیوں میں ایسے افکار اور خیالات موجود ہیں لیکن وہ بھی کوئی جماعت نہ بنا سکے۔ جماعت ایک آدمی سے نہیں بنتی بلکہ اس وقت وجود میں آتی ہے جب بہت سارے آدمی ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں اور اس مقصد پر اتفاق کریں۔

ہندوستان کی تاریخ میں امام ولی اللہ اور آپ کے اتباع سے پہلے کوئی بھی ایسی جماعت نہیں ملتی جس نے ایسی تحریک پیدا کی ہو جو مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کو اکٹھا کرسکے! شاہ صاحب کا فلسفہ جس طرح مسلمانوں میں اپنا اثر ظاہر کرتا ہے اسی طرح ہندوؤں پر بھی۔ اثر کرسکتا ہے۔ کیونکہ امام صاحب کے فلسفہ کی بنیاد ہندوؤں کے فلسفہ کے موافق ہے، اس لئے ہم ولی اللہ کی امامت ہندوؤں سے بھی منوا سکتے ہیں (یعنی ہندوؤں سے بھی اس نام کی حقانیت قبول کرا سکتے) ہندوستان کی قومیں مجتمع ہوگئیں تو پھر پوری دنیا کی اقوام اکٹھی ہو جائیں گی۔

(تیسری بات) رسول اللہ ﷺ اگرچہ عام انسانیت کے رہبر اور انکو پاک کرنے والے تھے لیکن آپ کی پہلی توجہ اور فکر اپنی قومِ قریش کو کمال تک پہنچانے کیلئے تھی کیونکہ:

۱۔ عام عرب بیت اللہ شریف کی عزت کرتے تھے۔ پس بیت اللہ شریف اور ابراہیم علیہ السلام کی وجہ سے وہ قریش کو اپنا دینی سردار سمجھتے تھے۔ بنی اسرائیل کو عرب اگرچہ عزت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے علم و فضیلت کے قائل بھی تھے اور ان کو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد بھی سمجھتے تھے لیکن چونکہ ان کا تعلق بیت اللہ شریف سے کچھ نہیں تھا اس لئے وہ ان کو اپنا دینی رہبر نہیں سمجھتے تھے۔

ابراہیم علیہ السلام اصل میں عراق عجم سے تھے تو ان کی اولاد اسمٰعیل اور اسرائیل سب عجمی النسل ہوتے ہیں۔ اور چونکہ سارہ لفظ بمعنیٰ حمیدہ خالص سندھی ہے تو سندھ سے تعلق زیادہ قوی ہے۔ قریش اور یہود کے اخلاق سندھ میں اب تک موجود ہیں۔

۲۔ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد خالص عربوں میں رہ کر عرب بن گئی۔ اس لیے عرب قریش کو اپنا سمجھتے تھے لیکن بنی اسرائیل کو اپنا نہیں سمجھتے تھے۔

۳۔ قریش تجارت کرتے تھے۔ تجارت پیشہ طبقہ انسانیت کا درمیانہ درجہ ہے اس لئے ان کو جس طرح عوام سے واسطہ پڑتا تھا اسی طرح بادشاہوں سے بھی تعلق تھا۔ وہ بادشاہوں اور انکے حالات کو سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے تھے کہ وہ ان سے خوش ہو جائیں اور اپنے بیوپار کو ترقی دینے کے لئے عام لوگوں کو بھی اپنی طرف کھینچنا جانتے تھے۔ یہ بات عام عربوں میں نہ تھی وہ بدو اور اجڈ تھے۔

۴۔ قریش رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے سے تقریباً ایک سو برس پہلے اکٹھے ہو کر مکہ شریف میں بیت اللہ شریف کے اردگرد آکر رہنے لگے تھے۔ ان کو رسول اللہ ﷺ کے دادا قصی نے کوشش کرکے اکٹھا کیا تھا۔ اس لئے بھی عام عرب ان کی عزت کرتے تھے۔ ان سو برس سے پہلے وہ عرب کے مختلف قبائل میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور وہ قبائل قریش کی ایسی عزت کرتے تھے جس طرح آج کل پیروں اور بزرگوں کی اولاد کی ہوتی ہے۔ پس اگر قریش رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و

تبلیغ سے راہِ راست پر آجائیں گے اور عام لوگوں کے فائدہ کے لئے کام کرنا چاہیں گے تو عوام آسانی سے ان کی تابعداری قبول کریں گے!

۵۔ عرب کے شمال میں مختلف یہودی قبائل بستے تھے جو تجارت پیشہ تھے۔ حجاز کے اقتصادی حالات کا دارومدار اکثر انہی پر تھا۔ پس جیسا کہ قریش اور یہودی دونوں تجارت پیشہ تھے اس لئے یہودی ایک تو بیوپار کی وجہ سے دوسرا اس وجہ سے کہ دونوں قومیں ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھیں، قریش سے دوستی اور میل ملاپ کی رسمیں جاری رکھتے تھے۔

قریش کی مذکورہ پانچ حالات رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے سے پہلے تھیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے جب اپنی شروع عمر میں اپنے مبعوث ہونے سے پہلے قریش کے بڑوں سے سُنا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی اولاد میں سے ایک ایسا رسول پیدا کرے گا جو اس کی ملت کو دنیا میں شائع کرے گا تب آپ نے ابراہیمی ملت کو زندہ کرنے اور قریش کو بلندی کے درجہ تک پہنچانے کا خیال کیا کیونکہ یہ کام کرنے کا آپ کی فطرت و طبیعت خواہش کرتی تھی اور اس کام کے صحیح ہونے کی شہادت ایک تو آپ کا دل دیتا تھا دوسری وہ روایت تھی جو ابراہیم علیہ السلام سے نقل ہوتی چلی آرہی تھی۔

نبوت حاصل ہونے کے بعد یہ کام آپ پر آسان ہو گیا کیونکہ وحی کے ذریعہ سے اس کام کے صحیح ہونے کا آپ کو زیادہ یقین ہو گیا۔ نبوت سے پہلے اور بعد کے حالات میں فرق صرف یہ تھا کہ نبوت سے پہلے آپ نہ نبوت کو جانتے تھے اور نہ اس درجہ کے ملنے کی آپ کو اُمید تھی۔ آپ صرف ابراہیمی ملت کے زندہ کرنے سے قریش کو بلند درجہ پر پہنچانا چاہتے تھے۔ نبوت کے بعد آپ کا پروگرام (دستور العمل) یہ تھا کہ آپ قریش اور قریش کے ارد گرد بسنے والے قبائل کی اصلاح میں مصروف ہوں گے پھر جب اس کام سے فارغ ہوں گے اور آپ کی قوم میں آپ کی طاقت بڑھے گی تو دوسری اقوام بنی آدم کی درجہ بدرجہ اصلاح کریں گے تا آں کہ تمام دنیا کی اصلاح کو کمال تک پہنچائیں گے۔

۱۱۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا خلاصہ

امام شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی قدس اللہ سرہ کی تعلیم کے موجب انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور رسول اللہ اکی ہدایت (جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوگوں کو پاک کرنے کے لئے بھیجا ہے) کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں میں چار خصلتیں پیدا ہوں۔

۱۔ طہارت: طہارت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت سے کچھ چیزوں کو ناپاک ٹھہراتا اور اپنے بدن کو ان پلید چیزوں سے بچاتا ہے جیسے پیشاب، پاخانہ وغیرہ۔ پھر چونکہ یہ بات اس کے دل میں رکھی گئی ہے اور اسی سے ایک گھڑی بھی غافل نہیں رہ سکتا اس لئے اس خصلت کو کمال تک پہنچانا اس کے لئے آسان ہے پھر وہ ہر کلام، ہر فکر اور ہر عادت، جسے وہ پیشاب اور پاخانہ کی طرح بُرا سمجھے

گا، اس سے بھی اپنے آپ کو بچائے گا! امام شاہ صاحب کے نزدیک یہ خصلت دین کا چوتھا حصہ ہے۔

۲۔ اخبات: تواضع و عجز اختیار کرنا۔ اس خصلت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان جب اپنے باپ دادا یا مرشدوں، استادوں یا نیک بخت حاکموں اور بادشاہوں میں سے کسی کی عزت کرتا ہے تو جب کسی وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوگا تو اپنے دل میں اس وقت ایک قسم کی عاجزی محسوس کرے گا۔ اور یہ خواہش کرے گا کہ کاش! وہ اسے کسی کام کے کرنے کا حکم دیں اور یہ اس کام کو خوشی سے پورا کر کے اپنی تابعداری کے ذریعے ان کے نزدیک ہو جائے۔ اس آدمی کو اس بزرگ کے نزدیک ہونے میں ایک قسم کی لذت محسوس ہوگی۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ کوئی آدمی اس کو سکھائے یا نہ سکھائے لیکن یہ بات اس کے دل میں رکھی ہوئی ہے۔

اس کے بعد جب وہ اپنے دل کی ہدایت سے یا کسی نیک بخت کے ہدایت کرنے سے اللہ پر ایمان لائے گا اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی کرنے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی خواہش اس درجہ کو پہنچے گی جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے کسی کو بھی شریک نہیں کرے گا۔ تب کہا جائے گا کہ اسے اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی کرنے کی خصلت حاصل ہوگئی ہے۔ اس وقت اگر وہ کسی کے آگے عاجزی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کرے گا۔ جس کے آگے عاجزی کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی نہیں دیکھے گا اس کے آگے عاجزی کبھی نہیں کرے گا۔ اس کا باپ بھی اگر اس کو کوئی حکم دیگا تو اس لئے اس کی تابعداری کرے گا کہ وہ سمجھے گا کہ باپ کی تابعداری کرنے سے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہو جاؤں گا۔

۳۔ سماحت (سخاوت): اس خصلت کی حقیقت یہ ہیکہ انسان بہت سی چیزوں کو پسند کرتا ہے، اس کا دل چاہتا ہے کہ اچھا کھانا کھائے۔ اچھے کپڑے پہنے اچھے مکان میں رہے۔ اس کی خوبصورت عورت ہو اور قوم میں عزت والا ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اس کو قرب حاصل ہو۔ پھر اگر کسی انسان کی طبیعت ایسی ہو جائے کہ اچھا کھانا کھائے اور عورتوں سے صحبت کر کے ان لذتوں کو یاد کرتا ہے تو یہ طبیعت اس کو دوسری ضروریات میں مشغول ہونے اور پورے کرنے سے روکتی رہے گی۔

لیکن اگر اس کی طبیعت ایسی ہوگی کہ کھانا کھانے اور عورتوں کے نزدیک ہونے کے مزہ حاصل کرنے کے بعد جب فارغ ہو تو اس کو بھلادے اور اس کی طرف کوئی خیال نہ کرے تو یہ انسان اپنے دوسرے کام بھی پورے کر سکے گا۔ اور اپنے اخلاق کو بھی کمال تک پہنچا سکے گا۔ یہ شخص اگر کتاب اٹھا کر پڑھے گا یا مسجد میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرے گا تو وہ اپنے دماغ کو دنیا کے تمام افکار سے پاک کر کے پھر یہ کام کرے گا۔ اس شخص کی طبیعت کی مثال پانی کی طرح ہوگی۔ پانی میں اگر انگلی داخل کرو تو اس میں انگلی

چلی جاتی ہے اور جب باہر نکالو تو پانی میں کسی قسم کا بھی سوراخ دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح یہ انسان جب نفسانی کام کرے گا تو اس کو اچھی طرح سے کرے گا اور جب اس سے فارغ ہو گا تو اسکو بھلا دے گا۔ اسی عادت کو ہم سخاوت کہتے ہیں۔

۴۔ عدالت۔ اس خصلت کی انسانی جماعت کو کس قدر ضرورت ہے یہ بات ہر ایک جانتا ہے۔ کوئی بھی اجتماع عدالت کے بغیر قائم نہیں ہوتا۔ پس عدالت یا تو انسانیت کے برابر ہے یا ایک دوسرے کو لازم وملزوم ہیں۔ جس انسان، گھر، قبیلہ یا قوم میں انصاف نہ ہو گا اس میں کسی قسم کی بھی انسانیت نہ ہو گی۔

حضرت امام شاہ صاحب ان چار خصلتوں کو تمام احکام کا اصل اور جو ان چار خصلتوں کے مخالف خصلتیں ہیں انہیں ان بُرے کاموں میں شمار کرتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں روکا ہے۔

ان چار خصلتوں کے علاوہ ایک اور چیز ہے جسے امام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس اللہ سرہ شعائر اللہ (یعنی اللہ کو پہچاننے کی نشانیاں) کہتے ہیں۔ حضرت امام ولی اللہ صاحب شعائر اللہ کی عزت کرنے کو اللہ تعالیٰ کی ذات کی عزت کے برابر رکھتے ہیں۔ پس جس الٰہی دین کو رسول اللہ ﷺ لائے ہیں اس کا خلاصہ امام شاہ صاحب کے پاس یہ ہے کہ انسان اپنے اندر مذکورہ بالا چار خصلتوں کے مخالف خصلتوں کو چھوڑنے کی کوشش کرے اور شعائر اللہ کی عزت کرے۔

۱۲۔ شعائر اللہ کی حقیقت

شعائر اللہ کی عزت کیسے کی جائے؟ اس کے لئے خدا شناس عارف اور حکماء اس بات پر متفق ہیں کہ اس جہان کے پیدا کرنے والے اور اس میں تغیرات کرنے والے کی حقیقت تک انسانوں کی سمجھ پہنچ نہیں سکتی۔ کچھ خاص طریقے ہیں جن سے لوگ اللہ کے وجود کو سمجھ سکتے ہیں۔

ایک طریقہ جسے تمام انبیاء علیہم السلام پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جیسے سورج کی تجلی (عکس) آئینہ پر پڑتی ہے اور سورج آئینہ کے اندر دیکھنے میں آتا ہے پس اگر وہ آئینہ بھی سورج کے عکس جتنا ہو گا (نہ اُس سے بڑا اور نہ چھوٹا) تو لوگ حقیقی سورج میں اور سورج کے اس عکس میں اپنی گزشتہ معلومات ملانے کے بغیر فرق معلوم نہیں کر سکیں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تجلی اس کی مخلوق میں سے بعض چیزوں پر پڑتی ہے اور وہ چیزیں منفرد نظر آتی ہیں پس اگر انسان ان چیزوں کی طرف دیکھنے کے وقت یہ سمجھے گا کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں اور ان چیزوں کی طرف کچھ بھی خیال نہ کرے گا تو سمجھنا چاہئے کہ اس نے اللہ کی تجلی کو دیکھا اور وہ تجلی اس کو اس لئے دکھائی گئی ہے کہ اس کو اللہ کی صفات میں سے کوئی صفت معلوم ہو جائے۔ انسان کو جب بھی سمجھ میں آجائے کہ یہ اللہ کی تجلی ہے تو اس پر لازم ہو گا کہ وہ اس تجلی کے آگے اپنی

انتہائی طاقت سے جھکے اور اس کی تعظیم کرے۔ اس تجلی کی عزت اللہ تعالیٰ کی عزت کے قائم مقام ہوگی۔ کیونکہ جن چیزوں پر وہ تجلی پڑی انکی طرف کوئی بھی خیال نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کو اس تجلی کے دیکھنے کے وقت اس شیشے جیسا سمجھا گیا ہے جس پر صورت کا عکس پڑتا ہے یا ان چیزوں کو عینک کی طرح سمجھا گیا ہے جس سے انسان دور کی چیز کو دیکھ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک تجلی عرشِ عظیم پر پڑتی ہے۔ اس تجلی کو رحمٰن کہا جاتا ہے۔ یہ وہ آخری تجلی ہے جس تک انسان کی سمجھ خود کو پہنچانے میں ترقی کر کے پہنچتی ہے اس کے بعد جو تجلی عرش عظیم پر پڑتی ہے اس سے نیچے اس تجلی کی پھر کتنی ہی تجلیاں آسمان اور زمین میں ہیں۔

اگر انسان ان چیزوں کو دیکھتے وقت یہ سمجھے کہ میں اللہ کی تجلی کو دیکھ رہا ہوں اور ان چیزوں کی طرف بھی خیال کرے تو اس وقت ان چیزوں کو شعائر اللہ کہا جائے گا۔

شعائر اللہ کی تعظیم ایمان کے اجزاء میں سے ایک بڑا جزو ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں ایک ایسی طاقت رکھی ہے جس کی وجہ سے اس کو بلاواسطہ اللہ کے معلوم کرنے میں مزہ آتا ہے اور انسان اپنے تمام مقاصد میں سے اس مقصد کو بڑا مقصد کہتا ہے اور شعائر اللہ کی تعظیم بلاواسطہ اللہ تک پہنچاتی ہے۔ پس جس کے دل میں شعائر اللہ کی تعظیم ہوگی اس کے دل میں ایمان کے تمام اجزاء میں سے بڑا جزء موجود ہوگا۔

مذکورہ بالا چار خصلتوں کو حاصل کرنے اور شعائر اللہ کی تعظیم کرنے سے انسان ان ملائکہ جیسا ہو جاتا ہے جو اللہ کی تجلی کے آگے حاضر رہتے ہیں۔

امام ولی اللہؒ ان چار خصلتوں اور شعائر اللہ کی تعظیم کو دو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

(۱) التطلع الی الجبروت (یعنی اللہ تعالیٰ کی ان صفات کی طرف دیکھنا جن کا تعلق اس جہان کے نظام سے ہے۔)

۲۔ التشبہ بالملکوت (یعنی ان ملائکہ جیسا ہونا جو اللہ تعالیٰ کی تجلی کے آگے رہتے ہیں۔)

امام ولی اللہ دہلوی کے نزدیک التطلع الی الجبروت اور التشبہ بالملکوت دونوں وصفوں کا اپنے میں پیدا کرنا انسان کا انتہائی کمال ہے۔ انسان کی پیدائش میں اس کی فطرت کے موافق جو مخفی لطائف اور پاک طاقتیں رکھی ہوئی ہیں ان کی وجہ سے یہ دونوں صفتیں اپنے میں پیدا کرنا اس غرض سے لازم ہے۔

۱۳۔ عدالت کی وضاحت

یہاں کچھ باتیں جاننا ضروری ہیں اس کے بعد عدالت کی حقیقت اور ضرورت وضاحت سے سمجھ میں آجائیں گی۔

پہلی بات انسان کی حقیقت کیا ہے؟

حکماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ یعنی وہ بڑھنے والا۔ حس رکھنے والا اور ارادہ سے حرکت کرنے اور فکر کرنے والا جسم ہے۔ فکر کرنے کے معنٰی یہ ہیں کہ وہ اپنے افکار کو ترتیب دے سکتا ہے، انکے بہت سے اقسام بنا سکتا ہے اور ان کو اپنے فصیح کلام سے دوسروں کے آگے ظاہر بھی کر سکتا ہے۔

انسان کی اس تعریف کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے کہ انسان میں التطلع الی الجبروت اور التشبہ الی الملکوت کی دو طاقتیں رکھی ہوئی ہیں۔ اس لئے انسان کو یہ دونوں صفتیں اپنے میں پیدا کرنی چاہئیں۔

ا۔ وہ تمام حیوانات کی طرح اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے ایسی چیزوں کا محتاج ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے۔ ان چیزوں کے پیدا کرنے میں نہ تو انسان کی طاقت کام کر سکتی ہے نہ اس کی عقل اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ مثلاً: انسان پانی پیتا ہے پھل کھاتا ہے پانی اور پھل کو اللہ کی قدرت کے سوا دوسرے کسی نے پیدا نہیں کیا۔

۲۔ دوسری بات انسان میں یہ رکھی گئی ہے کہ وہ کسی چیز کو پسند کرتا ہے لیکن اس تک نہ اس کے ہاتھ پہنچ سکتے ہیں نہ اس کی طبعی طاقت اس کو حاصل کر سکتی ہے پس وہ اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے کسی دوسری چیز کو اس چیز کے حاصل کرنے کا ذریعہ بناتا ہے مثلاً وہ درخت کی چوٹی پر پھل دیکھتا ہے جس تک اس کے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے۔ پس وہ پھل کو حاصل کرنے کے لئے پتھر مارتا ہے تاکہ پھل ٹوٹ کر نیچے گر پڑے یا درخت کی کسی ٹہنی کے ذریعے اس کو نیچے اُتار لیتا ہے، یہ ہے آلات کا استعمال۔ اس طرح جوں جوں اس کی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں آلات کے استعمال کا شوق بھی بڑھتا جاتا ہے۔ آلات کو حاصل کرنے اور تیار کرنے کے لئے انسان کوشش کرتا رہتا ہے کسی اوزار کے تیار کرنے میں اس کو تھوڑا وقت لگتا ہے اور کسی کی تیاری میں زیادہ تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اس لحاظ سے مالدار اس کو سمجھنا چاہئے جس کے پاس اوزار بہت ہوں اور غریب اس کو جس کے پاس اوزار نہ ہوں۔ غریب لوگ مالدار لوگوں کے اس لئے تابع ہوتے ہیں کہ مالداروں کے پاس اوزار ہوتے ہیں اور غریب لوگ اپنی طبعی طاقت سے وہ کام نہیں کر سکتے جو اوزاروں کے ذریعے تھوڑے وقت اور کم طاقت سے ہو سکتے ہیں۔ اس لئے وہ مالداروں کے پاس جاتے ہیں تاکہ ان کی طرف سے ان کی طبعی طاقت ہو اور مالداروں کی طرف سے اوزار، دونوں کو ملا کر کوئی کام کریں اور فائدے میں شریک ہوں۔ پھر اگر مالدار آدمی طاقتور بھی ہے تو وہ ترقی کر کے بادشاہ بن جائے گا۔ اور اگر اس کی طاقت دوسروں کی طاقت کے برابر ہے تو اس کو جماعت کا بڑا بنائیں گے۔

انسان اگرچہ بہت سے حیوانوں سے ضعیف ہے لیکن اس پر اللہ کی یہ مہربانی ہے کہ اس کو عقل دی ہے۔ عقل حیوانی طاقت ہے جس پر اس کا ملکی فکر اثر کرتا ہے پس عقل سے انسان اوزار بناتا ہے اور اوزاروں کے واسطہ سے وہ اپنی ضعیف طاقت سے تھوڑے وقت میں وہ کام لے سکتا ہے جن سے بڑے سے بڑے جانور بھی عاجز ہیں۔ اس کی عقل تمام حیوانی طاقتوں کی امام ہے۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اوزاروں (آلات) کے استعمال کو اور ان کے واسطہ سے تھوڑی طاقت سے چیزوں کے حاصل کرنے کو ارتفاق کہتے ہیں۔

پھر ارتفاق کی کئی قسمیں ہیں:

۱۔ وہ ارتفاق جس سے کوئی بھی انسان خواہ کہیں ہو، چھوٹ نہیں سکتا۔
۲۔ آداب المعاش (زندگی گذارنے کے طریقے)
۳۔ تدبیر المنزل (گھریلو زندگی کے طریقے)
۴۔ فن المعاملات (لوگوں کے آپس میں معاملات کے طریقے)
۵۔ سیاستہ المدنیہ (شہری نظم ونسق اور زندگی کے طریقے)
۶۔ سیاست (یعنی شہروں کو ملا کر ان کو کس طرح چلایا جائے)

پھر شہروں کو ملا کر چلانے کے کئی اقسام ہیں۔ ان میں سے ایک قسم وہ ہے جس کو امام ولی اللہ الدہلوی قدس اللہ سرہٗ خلافت کہتے ہیں۔ جب تک ایسی زبردست خلافت جس کا مخالف جماعتیں مخالفت کرنے کے باوجود مقابلہ نہ کرسکیں اور جب تک وہ قائم نہ ہو جائے کسی آدمی کے لئے بھی سستی کر کے بیٹھ رہنا جائز نہیں۔ یہ بات اُس وقت ممکن ہو سکتی ہے جب وہ اوزاروں کے استعمال میں درجۂ کمال کو پہنچ جائے۔

۱۴۔ رسول اللہ کی کوئی بھی تعلیم انسانی فطری صفات کے خلاف نہیں

امام ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ مذکورہ بالا ارتفاقات کو انسانی فطرت سے باہر کی چیز نہیں کہتے جو انسان کے ساتھ چمٹا دی گئی ہو۔ بلکہ فرماتے ہیں کہ انسانی فطرت ان تمام ارتفاقات کی خواہش کرتی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی انسان شہروں سے دور کسی جنگل یا بیابان میں پیدا ہو اور کسی سے بھی کوئی رسم ورواج نہ سیکھے تب بھی اس کو بھوک پیاس لگے گی، عورت کی خواہش ہو گی اور شادی کرنے کے بعد اس کے بال بچے پیدا ہوں گے جس کے بعد بہت سے گھر بن جائیں گے اور ان میں خرید وفروخت اور ان کے لین دین ہوں گے۔ اس طرح پہلا ارتفاق ترتیب وار موجود ہو جائے گا۔ پھر جب آبادی بڑھے گی۔ تو ضرور ان میں بلند اخلاق آدمی

پیدا ہوں گے اور ان کے سامنے ایسے معاملات پیش آئیں گے جن کی وجہ سے سب ارتفاقات موجود ہو جائیں گے۔ اس لئے کسی قوم میں انصاف کی بادشاہی کا پیدا ہونا اور بہت سی قوموں میں انصاف کی خلافت (یعنی بین الاقوامی حکومت) کا پیدا ہونا انسانی نوع کی خواہش کے مطابق ہے۔

اب سمجھنا چاہئے کہ انسان میں (۱) التطلع الی جبروت (۲) التشبہ بالملکوت (۳) ارتفاقات کو کمال تک پہنچانے کی تمام صفات ہیں اور رسول اللہ الوگوں کو تطلع الی الجبروت کا سبق اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے، شعائر اللہ کی تعظیم کرنے اور التشبہ بالملکوت کا سبق آپس میں ایسے بلند اخلاق کے پیدا کرنے سے سکھاتے ہیں جن کا فائدہ خاص انہی کو نہیں پہنچتا بلکہ عام انسانی نوع کو پہنچتا ہے اور اس کے بعد ان کی ذات کو بھی پہنچے گا کیونکہ وہ بھی تو انسانی نوع کے افراد میں سے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ ارتفاقات کی تعلیم بھی دیتے ہیں (یعنی جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے دنیا اور آخرت میں پیدا کی ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ فائدے کم سے کم وقت اور تھوڑی طاقت خرچ کر کے کیسے حاصل کئے جائیں، اس طرح کہ ملائکہ ان کے کام کو دیکھ کر تعجب کریں) یہ تینوں باتیں تفصیل سے کسی بھی شریعت میں بیان نہیں کی گئیں۔

۱۵۔ انسان کی تشریح اور اس کے مختلف مقامات میں مختلف مرتبے اور اس کے اچھے اعمال کا بیان

ترتیب وار رکھی ہوئی چیزوں میں جب کوئی چیز اثر کرے گی تو اس چیز کا اثر، ترتیب وار تمام چیزوں میں ان کی استعداد اور لیاقت کے موافق ظاہر ہو گا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے مختلف رنگدار شیشوں کو ترتیب وار رکھا جائے اور پھر ایک شیشے کے سامنے موم جلائی جائے۔ اس موم کی روشنی تمام شیشوں میں ان کے رنگوں کے موافق ظاہر ہو گی۔ ظاہر میں تمام شیشوں میں جدا جدا روشنی نظر آئے گی لیکن ہر عقلمند ایسا ہی کہے گا کہ جو روشنی پہلے شیشے میں ظاہر ہوئی وہ ہی تمام شیشوں میں نظر آتی ہے۔

اس بات کے سمجھنے کے بعد انسان کی حقیقت کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ انسان چار چیزوں سے بنا ہوا ہے: (۱) بدن (۲) ہوائی روح (۳) نفسِ ناطقہ (۴) ملکوتی روح (یعنی الٰہی روح۔ ملکوتی روح اور الٰہی روح ایک ہی چیز کے نام ہیں) حظیرۃ القدس میں انسانی نوع کا امام ہے جس کو النوع یا انسان کبیرِ یعنی بڑا انسان کہا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو نوع انسانی کے امام کے بے شمار عکس ظاہر ہوئے جس طرح آئینہ میں ہمارے عکس ظاہر ہوتے ہیں۔ ان عکسوں میں ان تمام صفات کے عکس بھی آ گئے جو اس بڑے انسان میں ہیں۔ ان میں حظیرۃ القدس کے ملائکہ کی روحانی طاقت اور نیچے طبقہ والے ملائکہ کی روحانی طاقت کے عکس بھی آ گئے اور جو ستارے اس دنیا کی چیزوں پر اپنا اثر پیدا کرتے ہیں ان کی طاقت کے عکس بھی آ گئے۔ اسی طرح بڑے انسان کے دل پر جو اللہ تعالیٰ کی تجلی پڑتی ہے اس کا

عکس بھی ان عکسوں میں آ گیا۔ ان عکسوں کو ملکوتی روح کہا جاتا ہے۔ یہ ملکوتی روحیں ہر انسان کی جدا جدا ہیں۔ پھر ایک طویل عرصہ کے بعد ملکوتی روحوں کے عکس عالم مثال کے تختہ پر آئے۔ دونوں عکسوں میں اتنا ہی فرق ہے جیسے چھوٹی تصویر کو بڑا اور بڑی تصویر کو چھوٹا کیا جائے۔ باقی کوئی چیز جو ان میں بڑھائی یا کم کی گئی ہو وہ دیکھنے میں نہیں آئے گی۔ دونوں عکس ایک جیسے نظر آئیں گے۔ ان کا آپس میں ایسا ہی تعلق ہے جیسے روح اور جسم کا۔ یہ عالم مثال کا عکس ملکی روح کا جسم ہو گا اور ملکی روح اس کی روح ہو گی۔ اس کے بعد جب ماں کے رحم میں منی اور حیض کا خون اکٹھا ہوتا ہے اور ماں کا نفس اس کی تدبیر کرتا ہے تب اس میں دل اور دماغ اور جگر ظاہر ہوتے ہیں پھر بچے میں بدن کے واسطے سے ایک قسم کی لطیف ہوا تیار ہوتی ہے۔ یہ لطیف ہوا بدن کے لطیف اخلاط سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ انسان میں جو سننے، دیکھنے اور دوسرے کاموں کی طاقتیں ہیں وہ اسی لطیف ہوا کی طاقتیں ہیں۔ اس لطیف ہوا کے ساتھ وہ عالمِ مثال میں پیدا شدہ نورانی روح چمٹ جاتی ہے جیسے سورج کی صورت آئینے کے ساتھ چمٹ جاتی ہے۔ اب وہ نورانی روح لطیف ہوا میں اثر کرے گی اور وہ لطیف ہوا اس نورانی روح میں اثر کرے گی۔ اس وقت اس نورانی روح کو نفسِ ناطقہ (یعنی فکر کرنے والا نفس) کہا جاتا ہے اور اس لطیف ہوا کو اس نورانی روح کا جسم اور اس نورانی روح کو اس کی روح سمجھنا چاہئے۔ یہ دونوں کبھی بھی نہ اس دنیا میں اور نہ ہی جنت اور جہنم میں ایک دوسرے سے جدا ہوں گی۔ اس کے بعد یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ یہ لطیف ہوا جو انسان کے دل میں لطیف خلطوں سے پیدا ہوتی ہے اس کی طاقتیں جب کام کرتی ہیں تب کم ہوتی رہتی ہیں پھر اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بدن لطیف ہوا کو تیار کرتا رہتا ہے۔ اس وقت اس لطیف ہوا کو نسمہ یا ہوائی روح یا برقی روح کہا جاتا ہے۔ انسان کے بدن کو لطیف ہوا کا جسم اور لطیف ہوا کو اس کی روح سمجھنا چاہئے۔ انسان کی یہ ہوائی روح جو انسانی صورت میں باقی حیوانات سے جدا ہوئی ہے وہ نفسِ ناطقہ کے سبب ہوئی ہے ورنہ ہوائی روح تمام حیوانات میں ایک جیسی ہے۔ اس کے بعد جب انسان کا بدن لطیف ہوا کے پیدا کرنے سے بالکل عاجز ہو گا تو وہ عاجزی ان کی موت ہے۔ بدن کے بیکار ہونے سے بعضے اس کو قبر میں دفن کرتے ہیں اور بعضے جلا دیتے ہیں۔ اس وقت باقی بچی ہوئی لطیف ہوا اور نورانی روح انسان کے بدن سے جدا ہوتی ہے پھر نورانی روح اس کو اس کی لیاقت کے موافق روشن جسم یا تاریک جسم عالم مثال سے دلاتا ہے اور وہ جسم لطیف ہوا کی کمی کو پورا کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح انسان کی اس کے مرنے کے بعد حفاظت کی جاتی ہے۔ عالم مثال کا یہ بدن قیامت کے قائم ہونے تک قائم رہے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو یا تو دنیاوی جسم دے گا یا ایسا جسم دے گا جو دنیاوی جسم سے بھی مناسبت رکھے گا اور عالمِ مثال والے جسم سے بھی۔

انسان کی حقیقت سمجھنے کے بعد دو باتیں سمجھنا چاہئیں: (ا) ایک یہ کہ دنیا میں انسان مذکورہ بالا اجزاء کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے۔ انسان کے مرنے کے بعد دنیا والے بدن کے علاوہ باقی تین اجزاء کے

مجموعہ کو انسان کہا جائے گا۔ اس کے بعد انسان ترقی کر کے جب اس درجہ کو پہنچے گا جہاں انسان کی ہوائی روح پہنچ نہیں سکتی بلکہ فقط اس کا نفسِ ناطقہ پہنچ سکے گا تو وہاں انسان ملکوتی روح اور نفسِ ناطقہ کو کہا جائے گا۔ اسی طرح جب انسان ترقی کر کے وہاں پہنچے گا جہاں اس کا نفس ناطقہ بھی نہیں پہنچ سکتا تو وہاں انسان فقط ملکوتی روح کو کہا جائے گا۔ اور ملکی روح اور روحِ الٰہی ایک ہی چیز ہے۔ تو یہ ذات پاک وہاں پہنچی جہاں کا خمیر تھا۔ یہ ہے مطلب اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کا۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ انسان کے یہ چار اجزاء ترتیب وار ہیں چنانچہ جو چیز ملکوتی روح میں ظاہر ہو گی وہ نفس ناطقہ میں بھی اس کے مزاج کے موافق ظاہر ہو گی اور جو چیز نفس ناطقہ میں ظاہر ہو گی وہ ہوائی روح میں بھی اس کے مزاج کے موافق ظاہر ہو گی۔ اور جو چیز ہوائی روح میں ظاہر ہو گی وہ بدن میں بھی اس کی قابلیت کے موافق ظاہر ہو گی۔ پس انسان کے ہر ایک جز میں سے اگرچہ ظاہر میں جدا جدا صورت نظر آئے گی لیکن حکیم کی نظر میں وہ ایک ہی چیز ہے۔ پس سمجھنا چاہئے کہ تجلی جو انسانی نوع کے امام پر پڑتی ہے وہ ملکوتی روح پر چمکتی ہوئی اور ترتیب وار نیچے اترتی ہوئی بدن تک پہنچتی ہے۔ بدن پر عمل کرنے کے بعد پھر جیسے نیچے اتری تھی ایسے ہی چڑھتی ہوئی ملکوتی روح تک پہنچے گی۔ یہ انسانی فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے۔ پس تمام ارتفاقات سے بہتر ارتفاق وہ ہے کہ انسان جب کوئی کام بدن سے کرے تو اس کام کا اثر ملکوتی روح تک پہنچے۔ اور سب سے بُرا ارتفاق وہ ہے کہ انسان جب کوئی کام بدن سے کرے تو اس کام کی روح کو اس کی ہوائی روح بھی قبول نہ کرے۔ جیسے زنا اور چوری جس پر انسان کو آخر پشیمان ہونا اور پچھتاوا کرنا پڑتا ہے۔ جو جہنم کی زندگی ہے۔ اس سے اچھا کام وہ ہے جس کی روح کو انسان کی ہوائی روح قبول کرے لیکن اس کو نفسِ ناطقہ اور الٰہی روح قبول نہ کرے جیسے بڑھئی کے پیشے اور دوسرے ہنر کہ لوگوں کو ان ہنروں کی اپنی زندگی کے لئے ضرورت بھی ہے لیکن گر ان کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے انہیں کیا جاتا۔ اور جیسے وہ کام جن سے انسان کا تعلق عالم مثال میں فقط جنوں سے ہوتا ہے اور ملائکہ کے ساتھ نہیں ہوتا۔

اس سے بھی زیادہ اچھا کام وہ ہے جس کو انسان کا نفسِ ناطقہ بھی قبول کرے لیکن اس کی الٰہی روح قبول نہ کرے۔ یہ عقلی بات ہے ورنہ اس کی ظاہر میں کوئی بھی مثال موجود نہیں۔

سب سے بہتر کام وہ ہے جسے انسان کی ملکوتی روح بھی قبول کرے کیونکہ وہ عمل ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا اور اس سے اسے انتہائی خوشی حاصل ہو گی اور اس سے زیادہ خوشی پہنچنے کا امکان ہی نہیں۔ جب انسان میں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے فائدہ حاصل کرنے کے وقت مذکورہ چار اخلاق ہوں گے اور انسان کا نفسِ ناطقہ شعائر اللہ کی عزت کرنے سے اللہ کی طرف دیکھنے والا ہو گا تب اس کی انانیت بھی کمال کو پہنچے گی اور اس کے کاموں کی روح بھی اس کی الٰہی روح تک پہنچے گی۔

۱۶۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا خلاصہ:

پندرھویں فائدہ میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان کے سمجھنے کے بعد یہ جاننا چاہئے کہ ہم جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی قوم کو راستہ دکھانے والے اور ان کو پاک کرنے والے ہیں اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو ارتفاقاتِ صالحہ یعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے اوزاروں کے ذریعہ تھوڑے وقت میں کم طاقت خرچ کرنے سے بہت سا فائدہ حاصل کرنے کا ایسا طریقہ سکھاتے ہیں جس سے ان کاموں کی روح ملکوتی روح تک پہنچتی ہے اور مذکورہ بالا چار اخلاق بھی ان میں پیدا کرتے ہیں اور شعائر اللہ کی تعظیم کرانے سے اللہ تعالیٰ کی تجلی کی طرف توجہ کرنا بھی سکھاتے ہیں پھر جب آپ کی قوم ہدایت پر آجائے گی اور پاک ہو جائے گی تو آپ ان کو حکم کریں گے کہ دنیا کی اقوام کو بھی اس تعلیم اور تہذیب پر اکٹھا کریں جس پر وہ خود ہیں لیکن اس تعلیم و تہذیب کا ان کو ایسا آسان طریقہ سکھائیں گے کہ وہ آسانی سے سکھا سکیں اور اس کام کو رسول اللہ ﷺ کا کام سمجھا جائے گا۔ یہ معنیٰ ہیں خلافت قائم کرنے کے۔

اس معنیٰ سے رسول اللہ ﷺ، اور ان کے بعد ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں سے یہ کام اللہ تعالیٰ نے پورا کیا اور ان دونوں خلفاء کے کام کو بھی رسول اللہ ﷺ کا کام سمجھا گیا۔ پس اس معنی سے رسول اللہ ﷺ نے ارضِ مقدسہ (پاک زمین) کو جس کا اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا ابراہیمی ملت کی روشنی سے روشن کیا اور مکہ معظمہ، بیت المقدس اور مدینہ منورہ کی مسجدوں کو اس تعلیم کا مرکز بنایا۔ اور قیصر و کسریٰ کی دو بڑی حکومتوں کو برباد کر کے ان کی رعایا کو دو راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ وہ راستے یہ ہیں کہ یا تو وہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے کو اختیار کر کے اسلامی اجتماع میں داخل ہو جائیں یا ذمی بن کر اسلامی اجتماع کو خراج تحسین دے کر ان کے حکم کے فرمان بردار رہیں اور اسلامی دین کی جو خاص نشانیاں (شعائر اللہ) ہیں ان کی بے حرمتی نہ کریں۔

رسول اللہ ﷺ کے سوا جن لوگوں نے آج تک خلافتیں قائم کی ہیں ان سب سے کامل خلافت وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے قائم کی اور اس کا پروگرام اللہ تعالیٰ نے ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں سے پورا کیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو انسانی نوع کے لئے ایک مقدس مثال بنایا ہے کہ ان کی ہمت سے ایک ایسی خلافت قائم ہو گئی جس کو پانچ سو برس تک آپ کی قوم قریش نے چلایا اور دوسرے پانچ سو برس دوسری اقوام نے چلایا جنہوں نے آپ کے دین کو سچے دل سے قبول کیا۔ سورہ جمعہ میں آیت ۲ سے ۴ تک اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ ان آیات سے آخرین کے لفظ سے مطلب فارس، روم، ہندوستان اور ترک ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو دنیا میں پھیلانے کے لئے حکومتیں قائم کیں۔ اس کے بعد جب

کبھی انسانی نوع کا نظام ارتقاقات میں ترقی کرنے سے بدلتا رہے گا تو حکومتوں کی صورت بھی انسانی اجتماع کے موافق ضرور بدلتی رہے گی۔

ہزار سال کے بعد جب لوگوں کا نظام ارتقاقات میں ترقی کرنے سے بدلا تو مسلمانوں کے رہنما اپنے پرانے طریقہ کو بدل نہ سکے۔ اس لئے ان کی شان و شوکت فنا ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جب ہمیں امام ولی اللہ دہلوی کے طریقہ پر چلنے سے دین کی سمجھ پیدا ہوئی تب ہم نے سمجھا کہ ہزار سال کے بعد جو مسلمانوں کی شان و شوکت فنا ہوئی اس میں قصور ہمارا ہی تھا۔ اللہ اور اس کے رسول کے تعلیم میں کوئی قصور نہ تھا۔ (تفسیر المقام المحمود ص ۱۶۱ سے ۱۸۳)

☆

حزب اللہ کی تاسیس مکہ معظمہ میں

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا حزب، مکہ معظمہ میں پیدا ہوا، وہاں وہ بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ چند آدمیوں سے زیادہ اس کے ماننے والے نہ تھے بایں ہمہ ایک دنیا ان کے نام سے کانپ رہی تھی۔ چنانچہ اس حزب کو فنا کرنا ہر شخص اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس لئے کہ وہ حضرت ابراہیم کی متابعت میں حنیفی دین کو قائم کرنے کا دعویٰ کرتا تھا اور کسی مخالف قوت کو نہیں مانتا تھا، خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ تھی۔ یہ حزب مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے اپنا نظام مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے فی الحال طرح دیتا جاتا تھا۔ جس نے مخالفت کی یا ضد، اس سے ہٹ گئے یہ ان کی سیاسی پالیسی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ان کے نزدیک لڑنا جائز نہ تھا۔ بارہا ایسے مواقع آئے کہ لوگوں نے خواہش کی کہ لڑنے کی اجازت مل جائے۔ مگر قرآن نے اس وقت یہی حکم دیا کہ "كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ" (۴:۷۷) (اپنے ہاتھ روک کر رکھو) اس سے بھی واضح سند یہ ہے کہ سورۃ کافرون مکی سورت ہے اور وہ تمام دنیا کے مخالفین کے لئے الٹی میٹم ہے کہ، "تم سے صلح کی کوئی گنجائش نہیں ہے"۔ جو لوگ دین کے اندر، "سیاست کیسے ترقی کرتی ہے" کے سیاسی اصول پر مطالعہ نہیں کرتے بلکہ سب چیزوں کو اخلاقی نقطہ نگاہ سے حل کرنا چاہتے ہیں وہ محمد رسول ﷺ کی زندگی اور قرآن حکیم کی تعلیم کو منظم طور پر کبھی بھی سمجھ نہیں سکتے۔

حزب اللہ مدینہ منورہ میں

حزب اللہ جس کی بنیاد مکہ معظمہ میں رکھی گئی تھی اب اپنا مرکز بدل کر مدینہ منورہ میں جمع ہوتا ہے۔ وہ یہاں نسبتاً آزاد ہے۔ یہاں کمزور طاقتوں نے حزب اللہ کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ سورۃ مجادلہ میں اس طرف توجہ دلائی گئی کہ ان مخالفین کو حقیر نہ سمجھو۔ اگر ان کا سدباب نہ کیا گیا تو یہ اس نئی

سوسائٹی کو کھا جائیں گے۔ اس پر مسلمان سنبھلے اور منافقین ڈر گئے۔

منافقین سے مقابلہ

منافقین جس طاقت کے بل بوتے پر باتیں بناتے تھے وہ یہود کی طاقت تھی جن کے قریب پاس ہی تھے۔ ادھر حجاز کی تمام سرمایہ داری یہود کے قبضے میں تھی۔ اور جاہلیت میں قریش بھی تاجر ہونے کی حیثیت میں سرمایہ داری سے کسی قدر اُنس پیدا کر چکے تھے۔ اس لئے یہود اور قریش ہم پیشگی کی وجہ سے آپس میں ملتے رہتے تھے۔ اب ان لوگوں نے ادھر تو مدینہ میں مسلمانوں کے گھروں میں فساد ڈلوانے کے لئے خفیہ سازشیں شروع کر دیں اور ادھر کسریٰ اور قیصر تک اپنے پیام پہنچانے شروع کر دیئے۔ اب اس سیاسی پارٹی کا جو اپنے آپ کو آزاد سمجھتی ہو ایسی حالت میں صبر سے بیٹھے رہنا جائز نہ تھا۔ اگر مخالفین حملہ نہیں کرتے تو یہ سیاسی حزب حملہ کرے گا۔ یہ ہے وہ حملہ جسے لِاَوَّلِ الْحَشْرِ (الحشر:۲) کہا گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں یہ پہلا اقدامی حملہ تھا۔ اس سے پہلے جتنی جنگیں تھیں وہ سب مدافعانہ تھیں۔ بعض لوگوں نے صرف ان مدافعانہ جنگوں سے قاعدہ بنالیا کہ حزب اللہ کا کام صرف مدافعانہ جنگ کرنا ہے۔ یہ لوگ ان اقدامی جنگوں کو بھی دیکھیں جو پیغمبر ﷺ اور آپ کے خلفاء نے کیں (غزوہ بنی نضیر اس قسم کی اقدامی جنگوں کی پہلی مثال ہے)۔

کیا اسلامی جنگ مدافعانہ ہے؟

مسلمانوں میں قدیم سے ایسی جماعتیں چلی آتی ہیں جو اسلام کا نام تو لیتی ہیں مگر اس کی سیاست نہیں سمجھتیں۔ ایسی جماعتوں کے لوگ اسلام کی تعلیم کو فقط اخلاقیات میں منحصر کر دیتے ہیں اور سیاسی تقدم کو ایسی شرطوں کے ساتھ مشروط کر دیتے ہیں جن کا تحقق ناممکن ہے، اسی طرح وہ قوم کو مار دیتے ہیں۔ اس قسم کی جماعتیں جہاں کہیں مسلمانوں میں پیدا ہوئیں انہوں نے فائدے کی بہ نسبت نقصان زیادہ پہنچایا۔

برصغیر میں انگریزی غلبے کے بعد مسلمانوں میں دو تحریکیں چلائی گئیں۔

بعض نے قرآنی حکمت کو سمجھتے ہوئے اس خیال کی تائید کی کہ اسلام کی جنگیں ہمیشہ مدافعانہ رہی ہیں۔ ان کا فیصلہ یہ ہے کہ اسلام نے کبھی حملہ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ مدافعت ہی کی ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

قرآن حکیم کی آیت "هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ" (التوبہ۔۳۳) سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن حکیم بین الاقوامی انقلاب کا پروگرام پیش کرتا ہے۔ چنانچہ ایک جماعت کی صورت میں انقلابی ذہنیت والے استاد ہر طبقے میں موجود رہے۔ مثلاً حضرت

مولانا محمد قاسم نانوتوی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن میں "قرآن اور آنحضرت ﷺ کی سیرت کا انقلابی تخیل" پایا گیا۔

اسلام اور جنگ :

الغرض انقلابی جماعت دیکھے گی کہ وہ مخالفوں کا مقابلہ کر سکتی ہے تو وہ اقدامی حملہ کرنے میں تاخیر نہیں کرے گی۔ اس مسئلے کو یوں حل کیا گیا کہ حملہ کرنے میں پیش قدمی کرنا یا مدافعت پر اکتفا کرنا یہ دوسرے درجے کی چیز ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا قائد لشکر کا کام ہے۔ یہ اصولی بحث نہیں ہے۔ کمانڈر اپنی فوج کی حالت کے مطابق مدافعت ہی کو کافی سمجھے گا تو فقط مدافعت ہی کرے گا، اور اگر حملہ کرنا ضروری خیال کرے گا تو حملہ کرنے میں پیش قدمی کرے گا۔

دنیا میں مذہبی پروگرام دو طریقوں پر چل رہے ہیں۔ بعض مذاہب وہ ہیں جو لڑنا اور حملہ کرنا کسی حالت میں بھی جائز نہیں سمجھتے جیسے بدھ دھرم والے جو اصولاً اہنسا کے قائل ہیں اور جنگ کو کسی شکل میں بھی جائز نہیں سمجھتے۔

دوسرے وہ مذاہب ہیں جن کے نزدیک حسب ضرورت لڑنا جائز ہے۔

پس اصولی بات یہ ہے کہ کسی مذہب کے نزدیک جنگ جائز ہے یا نہیں۔ اس معیار کے مطابق قرآن حکیم جنگ کو بالکل جائز رکھتا ہے۔ قرآن حکیم ایک عظیم الشان بین الاقوامی انقلاب کا زبردست حامی ہے۔ قرآن فقط انقلابیوں کی چیز ہے جو مناسب موقع پر اپنے انقلاب کی کامیابی کے لئے لڑنا جائز سمجھتے ہیں۔ (قرآنی شعور انقلاب۔ ص۱۸۶،۱۸۹)

قومی انقلاب کی دعوت

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (مزمل۔۱۴)

(ہم نے تم عربوں کی طرف اسی طرح نگرانی کرنے والا رسول بھیجا ہے جس طرح فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا)

بین الاقوامی انقلاب کے چند اصول بیان کرنے کے بعد ان کو قومی انقلاب میں استعمال کرنے کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ یہ قومی انقلاب آگے چل کر بین الاقوامی انقلاب کی شکل اختیار کرے گا۔ اور قومی انقلاب لانیوالی جماعت ہی اس بین الاقوامی انقلاب کی مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی Working Committee) بن جائے گی۔

نبی اکرم ﷺ کی دو حیثیتیں :

حضرت امام الائمہ امام ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ عرب کے لئے قومی نبی ہیں تا کہ اہل عرب کے اخلاق و عادات کی اصلاح کریں اور ان میں قانون الٰہی جاری کریں۔ دوسری یہ کہ آپ تمام اقوام عالم کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت امامؒ فرماتے ہیں کہ:

وَهٰذَا الْاِمَامُ الَّذِیْ یَجْمَعُ الْاُمَمَ عَلٰی مِلَّةٍ وَّاحِدَةٍ یَّحْتَاجُ اِلٰی اُصُوْلٍ اُخْرٰی غَیْرَ الْاُصُوْلِ الْمَذْکُوْرَةِ فِیْمَا سَبَقَ، مِنْهَا اَنْ یَّدْعُوَ قَوْماً اِلَی السُّنَّةِ الرَّاشِدَةِ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُصْلِحَ شَاْنَهُمْ ثُمَّ یَتَّخِذَهُمْ بِمَنْزِلَةِ جَوَارِحِه فَیُجَاهِدُ اَهْلَ الْاَرْضِ وَیُفَرِّقُهُمْ فِی الْاٰفَاقِ وَقَوْلُهٗ تَعَالٰی: (کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) وَذٰلِكَ لِاَنَّ هٰذَا الْاِمَامَ نَفْسَهٗ لَا یَتَاَتّٰی مِنْهُ مُجَاهَدَةُ اُمَمٍ غَیْرِ مَحْصُوْرَةٍ وَّاِذَا کَانَ کَذٰلِكَ وَجَبَ اَنْ تَکُوْنَ مَادَّةُ شَرِیْعَتِه هُوَ بِمَنْزِلَةِ الْمَذْهَبِ الطَّبِیْعِیِّ لِاَهْلِ الْاَقَالِیْمِ الصَّالِحَةِ عَرَبِهِمْ وَعَجَمِهِمْ ثُمَّ مَاعِنْدَ قَوْمِه مِنَ الْعِلْمِ وَالْاِرْتِفَاقَاتِ وَیُرَاعٰی فِیْهِ حَالُهُمْ اَکْثَرَ مِنْ غَیْرِهِمْ (حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۱۱۸)

”اس بین الاقوامی دعوت دینے والے نبی کی کامیابی کے اصول ان اصولوں سے مختلف ہوں گے جو ایک امام صرف اپنی قوم کے اندر دعوت کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ان میں سے ایک اصول یہ ہے کہ یہ بین الاقوامی امام اپنی قوم کو صحیح سنت کی دعوت دے گا۔ اور انہیں پاک کرے گا اور ان کی حالت درست کر کے ان کو اپنا آلہ کار بنائے گا۔ وہ ان کی مدد سے باقی اقوام عالم سے لڑے گا اور ان کو چاروں طرف اپنی دعوت کا پیام دے کر بھیج دے گا۔ چنانچہ قرآن حکیم کی آیت: کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران۔۱۱۰) (تم امت کا بہترین طبقہ ہو جو تمام دنیا کے لوگوں کے لئے پیدا کئے گئے ہو) اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ امام تنہا بنفس نفیس لاتعداد اقوام کے پاس شریعت نہیں پہنچا سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے قانون شریعت کا جوہر تمام اقوام کے لئے خواہ وہ عرب ہوں یا غیر عرب جو اچھی آب و ہوا کے خطوں میں بستی ہیں بمنزلہ مذہب طبیعی ہو۔ بایں ہمہ اس امام کی قوم کے علوم وارتفاقات کا دیگر اقوام کی بہ نسبت اس تعلیم میں زیادہ خیال رکھا گیا ہو۔) پس بین الاقوامی دعوت دینے والا امام اپنا کام بین الاقوامی دعوت سے شروع نہیں کرے گا۔ بلکہ سب سے پہلے اپنی قوم کے صالح عناصر کو جمع کر کے قومی انقلاب برپا کرے گا۔ اور پھر اس قومی انقلاب کی مجلس عاملہ (جیسے عشرہ مبشرہ اس قومی انقلاب کی مجلس عاملہ تھی) دوسری اقوام میں کام کرے گی اور ان کے اندر انقلاب برپا کرے گی۔ (قرآنی شعور انقلاب۔ ص ۳۴۰)

☆

بین الاقوامی درجہ

آپ کی نبوت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ مِلّتِ حَنِیْفِیَۃ ابراھِیْمِیَّہ پر تمام اقوام عالم کو جمع کریں گے۔ کیونکہ انسان کی نوعی ترقی کا یہی راستہ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس دعاء "الفاتحہ" میں اپنے آپ کو "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کی حیثیت سے شناخت کروایا ہے۔ اس تمہیدی دعا کے بعد سورۂ بقرہ وغیرہ باقی قرآن حکیم میں تمام اقوام عالم کے لئے بنیادی دستور حیات دیا گیا ہے، جس پر انہیں جمع کیا جائے گا۔

سورۃ فاتحہ قرآن حکیم کا مقدمہ ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کی دعوت کی عالمی حیثیت کی طرف اشارہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی نبوت کا یہ درجہ ہی آپ ﷺ کی بعثت کا اصل مقصد ہے۔ اور سورۃ العلق کو قرآن حکیم کے آخر میں لے جانا ظاہر کرتا ہے کہ قومی درجہ جس کی طرف سورۃ العلق میں اشارہ ہے، بین الاقوامی عالمی درجے کے لئے بطور تمہید اور وسیلے کے تھا۔ اس لئے انسانیت کے اندر عالمی تحریک ہی قرآن حکیم کی دعوت کا عنوان بن سکتی ہے۔

امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ:

اَلْاَنْبِیَآئُ قَبْلَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانُوْا یُبْعَثُوْنَ اِلٰی اَقْوَامِھِمْ خَاصَّۃً.... وَبُعِثَ نَبِیُّنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی کَافَّۃِ النَّاسِ

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۲۴)

(ترجمہ) یعنی نبی اکرم ا سے پہلے جو انبیاء گذرے ہیں وہ سب کے سب اپنی اپنی خاص قوم کی طرف بھیجے گئے تھے۔ لیکن حضرت محمد رسول اللہ ا دنیا کی تمام اقوام کی طرف مبعوث ہوئے ہیں۔

نیز فرماتے ہیں کہ:

"وَلَمَّا کَانَ الشَّرُّ السَّارِیُ فِیْ زَمَنِ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ ھُوَ نِسْیَانُ التَّوْحِیْدِ نَزَلَ الْحَقُّ بِاِزْآئِہٖ بِاِشَاعَۃِ التَّوْحِیْدِ وَتَوْلِیْدِ الْعِبَادَاتِ مِنْ طَھَارَۃٍ وَصَلٰوۃٍ وَزَکٰوۃٍ وَحَجٍّ وَّصَوْمٍ وَذِکْرٍ وَلَمَّا کَانَ الشَّرُّ السَّارِیُ فِیْ زَمَنِ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھو اخْتِلَالُ الْمِلَلِ وَانْقِلَابُ الْاِرْتِفَاقَاتِ خَاصَّۃً عَلٰی اَصْحَابِھَا وَکَانَ الْاَمْرُ اَشَدَّ وَاَقْسٰی نَزَلَ الْحَقُّ بِاِزْآئِہٖ بِالْجِھَادِ وَاِشَاعَۃِ الْعِبَادَاتِ وَتَوْقِیْتِھَا وَالْقَضَآئِ بِزَوَالِ دَوْلَۃِ الرُّوْمِ وَالْعَجَمِ وَانْتِظَامِ اَمْرِ النُّبُوَّۃِ کَھَیْئَۃِ الْاِرْتِفَاقِ الرَّابِعِ

(التفہیمات الاھیۃ جلد اول ص ۸۳،۸۲)

(ترجمہ: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں نسیان توحید کا معاشرہ انسانی میں پھیل چکا تھا اس لئے حق اس کے بالمقابل نازل ہوا یعنی اشاعت توحید اور طہارت صلوۃ، زکوٰۃ، روزوں اور ذکر الٰہی کی عبادات جاری کرنے کی شکل میں۔ لیکن چونکہ ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ ا کے زمانے میں اقوام عالم کی ثقافتوں میں خلل پڑ چکا تھا اور انکی ارتفاقی زندگی میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا اور یہ حالت نہایت شدید صورت اختیار کر گئی تھی اور یہ

خرابیاں اقوام دنیا کے بدن میں دور تک سرایت کر گئی تھیں۔ اس لئے اب حق ان ضرورتوں کے لئے نازل ہوا اور قرار پایا کہ ان خرابیوں کے خلاف جہاد کیا جائے اور عبادات کی اشاعت کی جائے، ان کے ادا کرنے کے اوقات معین کردیئے جائیں اور قضا و قدر نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ رومی اور ایرانی سلطنتیں برباد کرکے ان کی جگہ نبوی نظام بین الاقوامی پیمانے پر قائم کیا جائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے تشریف لاکر انسانی فلاح و خیر کا دروازہ کھولا جو آج تک نہ کھلا تھا اور اس خیر و فلاح انسانی کی تعلیم کے ذریعے سے انسانوں میں سے ایک ایسی امت (جماعت) منظّم کی جو نوع انسانی کے لئے بہترین (نمونے کی) جماعت بن گئی)

حنیفیّت عالمی تحریک ہے:

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ اکی تحریک عالمی تحریک (World Movement) ہے صرف عربی تحریک نہیں ہے۔ عربی تحریک اس عالمگیر تحریک کی ترقی کا ایک زینہ تھی اور اس کے ارتقاء کی ایک منزل۔ یہ عالمی تحریک اصل میں حنیفی تحریک ہی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی کو اس کی فطرت کے مطابق کمال تک پہنچایا جائے۔

دینی اور سیاسی تحریک میں فرق :

حنیفی تحریک میں ذہنی، عقلی، معاشی اور معاشرتی تمام پہلو موجود ہیں اور ان تمام پہلوؤں میں ترقی ہی، اسے تکمیل تک پہنچاسکتی ہے۔ ان پہلوؤں کے لحاظ سے یہ تحریک دینی بھی ہے اور سیاسی بھی، لیکن آج کل بعض لوگ دینی حرکت اور سیاسی حرکت میں فرق کرتے ہیں ۔ یہ لوگ دینی حرکت کو خیالی (Idealogical) تحریک کہتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ صرف رہبانیت کی تحریک بن کر رہ جاتی ہے۔

سیاسی تحریک کو حقیقت پسندانہ (Realistic) تحریک قرار دیتے ہیں ۔ لیکن ہمارے نزدیک حنیفی تحریک کے بارے میں "دینی" اور "سیاسی" کی یہ تقسیم صحیح نہیں ہے اور نہ یہ تقسیم کسی مضبوط بنیاد پر قائم ہے۔

اصل میں انسانیت شروع سے آخر تک ایک وحدانی (Unitar) چیز ہے اسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اجتماعیت انسانی، کسی تحریک کو عمل کی سہولت کی غرض سے دینی اور سیاسی اجزاء میں تقسیم بھی کرلے تو اس سے دو تحریکیں نہیں بن جاتیں۔ کیونکہ ان دونوں کا مقصد بہر کیف انسانیت عامہ کی ترقی ہی رہتا ہے۔ جب اہل دین ایسے خیالات اور اعمال کی طرف رجعت اختیار کرلیں جو غیر محققانہ (Unsceintific) ہوں یا اہل سیاست انسانیت کے صرف معاشی پہلو کو لیکر بیٹھ جائیں اور انسان کی مکمل انسانیت کی ترقی کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں تو یہ اختلاف صرف اصطلاحی اختلاف رہ جاتا ہے۔ ہم ان

دونوں کی طرف التفات نہیں کرتے۔ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہئے کہ ایک بادشاہ ممالک فتح کرنے کے درپے ہو جاتا ہے تاکہ ان میں ظلم دور کر کے انصاف وعدل قائم کرے۔ ایک اور شخص سوسائٹی میں صحیح علم پھیلانے میں لگ جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں انسانیت کی تکمیل کر رہے ہیں۔ ان میں آپس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اصل میں صحیح دین وہ ہے جس کے امام سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ وہی کامل اور مکمل انسانیت سے بحث کرتا ہے اور ان کی تحریک عالمی تحریک ہے جو ایک ہی وقت میں دینی بھی ہے اور سیاسی اور معاشی بھی۔ اس تحریک کو بین الاقوامی پیمانے پر ترقی دینے کے لئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں۔

دین کو سیاست کی ضرورت :

ایک علمی شخص اپنے علم کو انسانیت عامہ کے لئے مفید دیکھتا ہے۔ وہ یہ علم ان لوگوں کو سکھاتا ہے جو اسے سیکھتے ہیں۔ اس فکر پر ان کے جمع ہو جانے سے طبعی طور پر جماعت (Party) بن جاتی ہے جو اس اجتماع سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اگر وہ شخص چاہے کہ اس کے عمل کو دوسرے لوگ جو اس کے طریقے سے واقف نہیں ہیں یا جو اس فکر کی ترقی میں اپنے ذاتی مفادات (Vested Interestes) کا نقصان تصور کرتے ہیں قوت کے ذریعے سے خراب کر دیں تو کیا صحیح علم کے مالک کے لئے یہ ضروری نہ ہو گا کہ اپنے فکر کی حفاظت کے لئے قوت دفاع (Defence Power) مہیا کرے؟ اور کیا اس طرح اسے سیاست کے میدان میں آنا نہیں پڑے گا؟ اس سے ظاہر ہے کہ صحیح علم کے لئے سیاست (Politics) اور حکومت (State) ضروری اور ناگزیر ہیں۔ اس لئے جب ہم کہتے ہیں کہ انسانیت ناقابل تقسیم وحدت ہے تو اس سے ہماری یہی مراد ہوتی ہے۔

امام ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں کہ: وَيَجِبُ بَذْلُ الْجُهْدِ عَلٰى اَهْلِ الْآرَاءِ الْكُلِّيَّةِ فِيْ اِشَاعَةِ الْحَقِّ وَتَمْشِيته وِاِخْمَالِ الْبَاطِلِ وَصَدِّہ فَرُ بَّمَالَمْ يُمْكِنْ ذَلِكَ اِلاَّ بِمُخَاصَمَاتٍ اَوْ مُقَاتَلَاتٍ فَيُعَدُّ كُلُّ ذٰلِكَ مِنْ اَفْضَلِ اَعْمَالِ الْبِرِّ (حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ٥٠ طبع منیریہ مصر)

”جو لوگ انسانی معاشرے کی کلی اصلاح حال کے رنگ میں سوچتے ہیں ان پر واجب ہوتا ہے کہ اشاعت حق کرنے اور اسے معاشرے میں چلانے کے لئے اور باطل کا زور توڑنے اور اس کا نفاذ روکنے کے لئے پوری پوری (جانی مالی) کوشش کریں لیکن اکثر یہ کوشش صرف ان شکلوں ہی میں ممکن ہو پاتی ہے کہ مخالفین حق کے خلاف نشر واشاعت کی جائے اور قتال کیا جائے اس صورت میں یہ دونوں اعمال بہترین نیکی کے اعمال شمار ہوتے ہیں۔“

ایسے ہی یہ بھی صحیح ہے کہ جب کوئی جماعت انسانی منافع میں سے کسی ایک حصے کی خدمت کے لئے

اٹھے لیکن وہ اپنے آپ کو جامعہ انسانیہ (Human Society) کا ایک جزو تصور کرے تو اس کے پروگرام کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ غلط ہو گا کہ وہ جماعت اپنی جزوی خدمت کو کلی قرار دے کر دوسری جماعت کے خلاف صف آرا ہو جائے اور یہ تو اور بھی بڑی حماقت ہو گی کہ وہ کلی تحریک کا انکار کر دے یا اس کی طرف التفات نہ کرے۔

الغرض ائمہ ادیان ہی اصل میں جامع انسانیت (Human Society) کے حقیقی امام ہوتے ہیں ۔ جو لوگ انسانی سوسائٹی کے منافع میں سے چند ایک کو لے کر کام کرتے ہیں وہ انبیاء سے کم درجے کے لوگ ہوتے ہیں۔ جو اہل سیاست اور اہل فلسفہ و حکمت اور جو سائنسدان اپنے آپ کو ان ائمہ دین کے تحت بطور جزوی کارکن لے آئیں وہ طبعی طور پر ان آئمہ سے دوسرے درجے پر شمار ہوں گے۔ جو شخص دین کے معنی سمجھتا ہے اور اجتماعیت کا مفہوم بھی جانتا ہے اور اہل سیاست و فلسفہ میں سے خدام انسانیت کی بھی پہچان رکھتا ہے وہ ائمہ دین کے سوا کسی کو اجتماعیت انسانیہ کا امام تسلیم نہیں کر سکتا۔

عام مؤرخین بین الاقوامی تحریک کی ابتداء سکندر مقدونی (Alexander of Macedonia) سے کرتے ہیں لیکن ہماری تحقیق یہ ہے کہ عالمی انسانی تاریخ کا آغاز سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نسبت قرآن حکیم میں آیا ہے کہ (۲:۱۲۴) "میں تجھے نوع انسانی کا امام بناؤں گا"۔ اور ان کی اولاد اس عالمی پیشوائی کے لئے کام کرتی رہی۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ایسے ہی امام ہیں اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہی کی تحریک کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوئے ہیں۔

چونکہ قرآن حکیم بین الاقوامی تحریک پیدا کرتا ہے جس کی ابتداء سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کی اس لئے اس کی پہلی سورت میں "رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" کا تصور دیا گیا ہے۔

(قرآنی شعور انقلاب۔ ص ۶۰،۵۵)

☆

مقام نبوت

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قریش پر حملہ کرنے کے لئے آئے ہی نہیں ۔ بلکہ ان کی کمی پوری کرنے اور تعلیم دینے کے لئے آئے۔ چنانچہ امام ولی اللہ دہلوی "تفہیمات الٰہیہ جلد اول ص ۲۰۳ میں فرماتے ہیں کہ:

"واضح رہے کہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں دو خصوصیتیں جمع ہو گئی ہیں ۔

(۱) نبوت عامہ اور (۲) قریش کی سعادت کا سبب بننا۔

آپ کی نبوت میں مفہمیت کی تمام قسمیں آگئی ہیں ۔ اس سے ہر ایک رنگدار اور گوری قوم کو فیض پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب (رحمت الٰہی) کی مصلحت کلی کا تقاضا ہوا۔ کہ ترکوں کی سلطنت عام طور پر پھیل جائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توجہ اسلام قبول کرنے کی طرف پھیر دی۔

باقی رہی قریش کی سعادت تو ان کی لمبی حکومت کی وجہ یہی سعادت تھی۔

میرا وجدان گواہی دیتا ہے کہ اگر کسی سیاسی انقلاب کا تقاضا یہ ہوا کہ ہندوستان کے ہندو مستقل عمومی حکومت پیدا کریں ۔ تو یقینا قانون الٰہی کا فیصلہ یہ ہو گا کہ ہندو لے ڈر اسلام قبول کر لیں ۔ جیسے ترکوں نے قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ جناب نبی اکرم ﷺ کی نبوت کی عمومیت اور آپ کے صاحب ملت ہونے کا یہی طبعی تقاضا ہے۔

حضرت نبی اکرم ﷺ کے کلام کے ایک سے زیادہ پہلو ہیں ۔ کبھی تو آپ نبی ہونے کی حیثیت سے کلام فرماتے ہیں کبھی اس حیثیت سے کہ آپ قریش کی سعادت کا ذریعہ ہیں ۔

اسی فکر کو امام ولی اللہ حجتہ اللہ البالغہ (مطبوعہ مصر) جلد اول ص ۱۲۴ اور ص ۱۲۸ میں یوں ظاہر فرماتے ہیں :

> "واضح رہے کہ حضرت نبی اکرم ﷺ ملت حنیفیت اسماعیلیہ میں پڑی ہوئی کجی کو ٹھیک کرنے، اس کی بگڑی ہوئی شکل کو صاف کرنے اور اُس کا نور پھیلانے کے لئے تشریف لائے۔ جب حقیقت یہ ٹھہری تو لازم آیا کہ اس ملت کے اصول تو قائم رکھے جائیں اور اس کے طریقے نہ ہٹائے جائیں ۔ کیونکہ جب نبی اپنی قوم کی طرف مقرر ہو کر آتا ہے تو اس قوم میں کچھ اچھے طور طریقے باقی ہوں تو وہ انہیں نہیں بدلتا۔ کیونکہ ان کو بدلنا بالکل بے معنی ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت نبی اکرم ﷺ نے بھی ملت حنیفیہ اسماعیلیہ کی شریعت پر نظر ڈالی۔ تو جو چیز حضرت اسماعیل رضی اللہ عنہ کے اصل طریقے پر دیکھی اسے باقی رہنے دیا۔ اور جو چیز بدل چکی تھی اور جس میں فساد اور خرابی آچکی تھی اس کو ہٹا دیا۔ آپ نے ملت حنیفیہ کے اشاعت کی بے حد کوشش کی کہ یہ قانون تمام قوموں پر غالب آجائے۔ اس سلسلے میں ملت حنیفیہ میں جو تحریفات دیکھیں ان کو مٹا دیا اور بڑے زور سے ان کی نفی کی۔ اور جو ارتفاقات صحیح تھے۔ انہیں قائم رکھا۔ اور ان پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ ان میں جو خراب رسمیں آگئی تھیں۔ ان سے روکا اور جبراً منع کیا اور اس ملت کے اصول پر بین الاقوامی حکومت قائم کی اور جو لوگ اس بارے میں آپ کے ساتھ شریک ہوئے ان کی مدد سے جنگیں بھی کیں ۔ یہاں تک کہ مخالفین کی مخالفت دھری کی دھری رہ گئی اور خدا کا قانون سب قوموں پر چل کر رہا۔" (ملخصا)

اور خیر کثیر میں فرماتے ہیں کہ:

"حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کی طرح حضرت محمد رسول اللہ بھی پہلی حیثیت میں اپنی قوم کے لئے نبی بن کر آئے۔ جب اس پر ایک زمانہ گزر گیا تو آپ کی قوتیں چودھویں کے چاند کی جگہ سورج بن کر چمکنے لگیں۔ پھر ایک اور ترقی ہوئی کہ آپ کی شان کو پورا پورا کمال حاصل ہوا جس سے اوپر کوئی کمال نہیں ہے۔ اب آپ کرۂ زمین کے ہر ایک گوشے کے امام بنائے گئے۔"

آپ کی ان دو حیثیتوں کی حکمت حجتہ اللہ البالغہ میں یوں بیان فرماتے ہیں۔

"جو امام سب قوموں کو اپنی ملت پر جمع کرنے کے لئے اٹھتا ہے۔ وہ پہلے ایک قوم کو صحیح اصول کی دعوت دیتا ہے۔ انہیں غلط کاریوں سے پاک کرتا ہے ان کی حالت درست کرتا ہے اور پھر انہیں اپنا آلہ کار بنا کر دنیا کی سب قوموں سے جنگ کرتا ہے اور اپنی قوم کے لوگوں کو سب قوموں کے اندر پھیلا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ کسی امام کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اکیلا تمام قوموں سے جنگ کرتا پھرے۔" (جلد اول ص۱۱۸)

اس اصول نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں کس طرح کام کیا۔ اس کی تشریح آگے چل کر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"مہاجرین اور انصار کی پہلی جماعت، قریش اور ان کے ارد گرد کے قبیلوں کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب بنی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان عربوں کے ہاتھوں عراق اور شام فتح کرایا۔ کیونکہ ان علاقوں میں عرب عنصر موجود تھا۔ اسے اپنی اپنی قوم کے اندر عربی اسلامی انقلاب کے لئے تیار کیا گیا۔ پھر ان عراقیوں کے ہاتھوں ایران اور شامیوں کے ہاتھوں روم فتح کرائے (کیونکہ انہیں ان علاقوں کے باشندوں سے مناسبت تھی) پھر ایرانیوں کی مدد سے ہندوستان اور ترکستان اور ررومیوں کی مدد سے حبشہ وغیرہ کے علاقے فتح کرائے۔"

(قرآنی شعور انقلاب۔ ص۷ ۵۳)

☆

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجتماعی حیثیت

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک اجتماعی تحریک ہے۔ اکیلے حضرت محمد رسول اللہ کا کام نہیں ہے۔ (وہ مزمل۔ رفقاء کار جمع کرنے والے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اور ان کے مشورے سے کام

کرتے ہیں۔ ان کی نبوت کی حیثیت جداگانہ، مستقل حیثیت ہے۔ اس میں ان کا کوئی شریک نہیں اور نہ ان کا کوئی مشیر ہے)؟ قرآن حکیم میں حضرت نبی اکرم ﷺ کی اس اجتماعی حیثیت کی طرف جابجا اشارے موجود ہیں۔ مثلاً

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَأُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ (آل عمران. ۱۹۵)

(جن لوگوں کو گھر بار سے ہجرت کرنی پڑی اور جن کو اپنے وطن سے نکالا گے)

ظاہر ہے کہ وہ تنہا حضرت نبی اکرم ﷺ نہیں تھے بلکہ آپ اور آپ کے ساتھی سب مراد ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (انفال ۶۴)

"اے نبی! اللہ تجھے اور تیرے مومن ساتھیوں کے لئے کافی ہے"

اس میں بھی نبی اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو ملا کر ایک جماعت ظاہر کیا گیا ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

(یعنی پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنین سب پر اطمینان قلب نازل فرمایا (توبہ ۲۶)

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (توبہ۔۸۸)

یعنی رسول اور وہ لوگ جو اس کے شریک ایمان ہیں۔ اپنے مال و جان سے اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں۔ جملہ بھلائیاں ان سب کے لئے ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔(

یہاں بھی صحابہ کرام کو رسول کا شریک ایمان یا رفیق فکر اور جہاد میں شریک یعنی رفیق عمل ظاہر کر کے کامیابی کے نمونے کے لئے ساری جماعت کو پیش کیا گیا۔

یہی وہ چیز ہے جسے حضرت نبی اکرم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے بھی مَا اَنَا عَلَيْهِ وَ اَصْحَابِيْ)جس اصول کار پر میں اور میرے ساتھی ہیں) کے الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے۔

مشورہ کرنا آنحضرت ﷺ کے لئے ضروری تھا

آپ کی یہ اجتماعی حیثیت ہے جو مشورہ کرنے کے حکم کو قبول کر سکتی ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں ان الفاظوں میں آیا ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران ۱۵۹)

(ان سے معاملات ملی میں مشورہ (ضرور) لیا کرو۔ اور جب پختہ ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو)

امام ابو بکر جصاص الرازی الحنفی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"حضرت نبی اکرم ﷺ پر اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا لازم تھا۔ دینی امور میں

بھی اور ان امور میں بھی جن کے متعلق خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی صریح حکم موجود نہ تھا۔ اور دنیاوی امور میں بھی۔ یہ غلط کہا جاتا ہے کہ یہ مشاورت محض ان کا جی خوش کرنے اور ان کی قدر بڑھانے کے لئے تھی اور اس لئے بھی کہ آپ کی امت اسی طرح کرے۔ کیونکہ جب کسی کو معلوم ہو کہ مجھ سے جس امر کے متعلق مشورہ لیا جارہا ہے اور جس بارے میں صحیح رائے پوچھی جارہی ہے اس کے متعلق میں نے ایک مشورہ اپنی پوری کوشش سے پیدا بھی کرلیا۔ یا سوچ بچار کر کے کوئی صحیح رائے قائم کرلی تو بھی اس پر عمل نہ کیا جائے گا اور نہ اسے قبول کیا جائے گا۔ تو بھلا اس مشاورت سے اس کا جی کیا خوش ہو سکتا ہے اور اس کی قدر کیا بڑھ سکتی ہے؟ بلکہ اس کا اثر الٹا یہ ہوگا کہ ایسے مشورہ لینے والے سے وحشت بڑھے گی۔ کیونکہ اسے علم ہو گا کہ میری رائے نہ کسی کو سننی ہے اور نہ اس پر عمل کرنا ہے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے لئے ضروری تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں سے ان معاملات میں مشورہ کرتے جن میں کوئی صریح حکم موجود نہ تھا۔ البتہ صریح احکام کے بارے میں مشورہ ناجائز تھا۔ مثلاً یہ پوچھنا کہ نماز ظہر یا عصر کے بارے میں یا زکوٰۃ یا روزے کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ بالکل غیر ضروری تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مشورے کا حکم دیتے وقت یہ نہیں کہا کہ فلاں بات میں مشورہ کرو۔ اور فلاں میں نہ کرو۔ اس لئے لازم تھا کہ ہر دو معاملات میں صحابہ کرام سے مشورہ لیتے"۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"عزیمت (پختہ ارادہ) کا ذکر مشاورت کے بعد آیا ہے[1]۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں وہ عزیمت مراد ہے جو مشاورت سے پیدا ہو۔"

(احکام القرآن جلد دوم ص ۴۱ طبع بیروت)

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت کے مطابق آپ سے دریافت کیا گیا کہ عزم سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ مُشَاوَرَۃُ اَھْلِ الرَّأیِ ثُمَّ اِتِّبَاعُھُمْ یعنی جو لوگ مشورہ دینے کے قابل ہوں، ان سے رائے لے کر ان کی رائے کی پیروی کرنے کا نام عزم ہے۔

---

[1] قرآنی الفاظ کی ترتیب یوں ہے: وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ۔ ظاہر ہے کہ اس میں وَشَاوِرْھُمْ (ان سے مشورہ لیا کر) پہلے واقع ہوا ہے اور (فَاِذَا عَزَمْتَ جب تو پختہ ارادہ کرے) بعد میں آیا ہے۔ (مرتب)

مشاورت کی اہمیت :

لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے عام طور پر حضرت نبی اکرم ﷺ کے اس بلند اجتماعی تصور کو آپ کی انفرادیت میں گم کر دیا۔

مشاورت کا مسئلہ اسلام میں بہت بڑا مسئلہ ہے۔ لیکن اسلامی حکومتوں کو مشورے سے خالی کر کے مطلق العنان، جاہل حکمرانوں اور امیروں کا کھیل بنا دیا گیا۔ وہ مسلمانوں کی امانت (سرکاری خزانے) سے اپنی شہوت پرستیوں پر روپیہ صرف کرتے ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی مصلحت کے مقابلے میں خیانتیں کرتے ہیں اور ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

اس قسم کی غلطیوں کا خمیازہ مسلمانوں کو صرف اس غلط تفسیر کی وجہ سے بھگتنا پڑا۔ ورنہ ہر ایک مسلمان ایک حاکم کے اوپر ننگی تلوار ہے۔ وہ حاکم کیوں قانون الٰہی کی اطاعت نہیں کرتا؟ اگر وہ اطاعت نہیں کرتا تو کس بنا پر ہم سے اطاعت کا طلبگار ہوتا ہے؟ یہ طاقت مسلمانوں میں پھر سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور اس سے ان کی جماعتی زندگی آسانی کے ساتھ قرآن کے مطابق بن سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شوریٰ کو مستحب کا درجہ [2] بنا کر اسے سیاست اسلامی سے نکال ڈالنے والے لوگوں نے اسلام کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔

صحابی سے کون مراد ہیں؟:

ایسے ہی صحابی کی وہ تعریف عوام میں مشہور ہو گئی ہے جس سے بہت غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ صحابی کی یہ تعریف کہ اس نے ایمان کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہو۔ حدیث کی روایتیں جمع کرنے کی خاطر بنائی گئی ہیں ورنہ اصل میں سیرت نبوی کے اعتبار سے صحابی وہ ہے جس نے آپ کی معیت لازم پکڑی اور آپ کے ساتھ آخر تک انقلاب میں شریک رہا۔ تکلیفیں اٹھائیں اور اس تحریک کی صداقت کے متعلق پورے یقین کے ساتھ یہ اطمینان کر لیا کہ انسانیت کے لئے اس کے سوا اور کوئی پروگرام نہیں ہے۔[1] یہی وجہ وہ لوگ ہیں جن کی تعریف قرآن حکیم ان الفاظ میں کرتا ہے۔

---

[2] مستحب وہ امر ہے کہ اس پر عمل کریں تو اچھا ہے اور نہ کریں تو کوئی حرج بھی نہیں (مرتب)

[1] چنانچہ محدث مازری شرح برہان میں رقمطراز ہیں کہ: لسنا نعنی بقولنا "الصحابہ عدُول" کل من راہ صلعم یوما ما، اوزارہ لماما، او اجتمع بہ الغرض وانصرف مکثا انما نعنی بہ الذین لازموہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولائك هم المفلحون) منقول از اسوہ صحابہ از مولانا محمد سعید انصاری جلد اول ص ۱۱ بحوالہ "فتح المغیث" ص ۳۷۷) یعنی جب ہم کہتے ہیں کہ الصحابۃ عدول (صحابی سب عادل ہیں) تو اس سے ہماری مراد ہر وہ شخص نہیں جس نے آنحضرت ﷺ کو کسی روز دیکھ لیا یا کبھی زیارت کر گیا۔ یا کسی کام سے آیا اور فوراً واپس لوٹ گیا۔ بلکہ ہماری مراد ان بزرگوں سے ہے جنہوں نے آپ کی معیت لازم پکڑی، جہاد میں آپ کی مدد کی۔ آپ کی حمایت میں آپ کے دشمنوں سے لڑے۔ اور اس نور کی پیروی کی جو آپ پر نازل ہوا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حقیقی معنوں میں کامیاب ہوئے۔ (مرتب)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (انفال۔ ۷۴)

(یعنی جو لوگ ایمان لائے جنہوں نے اپنے گھر چھوڑے اور اللہ کی راہ میں لڑے اور جن لوگوں نے انہیں جگہ دی اور ان کی مدد کی وہی ہیں سچے مسلمان، ان کے لئے بخشش ہے اور عزت کی روزی ہے)

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور آپ کے ساتھیوں کی جنہوں نے آپ کی سیرت (حالات زندگی) کے بنانے میں حصہ لیا چند صفتیں ہیں۔

(۱) اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (الفتح۔۲۹) (کافروں پر سخت)

نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھی اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ہیں: ان کی سختی کے دو پہلو ہیں: یہ لوگ مخالفوں سے لڑنے میں بڑے سخت ہیں۔ کہ موت قبول کر کے لڑنے کے لئے جاتے ہیں۔

(۲) جو لوگ اس تحریک کے کھلم کھلا دشمن (کافر) ہیں۔ یہ لوگ ان کافروں کو انتہائی سزا دینے کے طرفدار ہیں۔ قتل کی ضرورت ہو تو قتل کر دئے جائیں۔ [2] ورنہ جو اس سے کم سزا ضروری ہو وہ دی جائے۔

قتل ہمیشہ اسی وقت کیا جائے گا جب انہوں نے قتل کیا ہو یا وہ لڑنے کے لیے تیار ہوئے ہوں۔ ورنہ ان کی انتہائی سزا یہ ہے کہ ان کی سیاسی تحریک روک دی جائے اور انہیں سیاست میں حصہ نہ لینے دیا جائے۔ ان کی عقلمندی سے جو ارتقاقی اور تمدنی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں، ان سے جماعت کو محروم کرنا مقصود نہیں ہے۔

(۲) رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (آپس میں رحمدل)

وہ "رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" بھی ہیں: جو لوگ اس تحریک کی تائید میں ان کے ساتھی ہیں ان کے لئے ان کے پاس سوائے رحمت کے اور کچھ نہیں۔ جیسے ماں باپ اپنی اولاد پر رحمت کرتے ہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رحمت سے پیش آتے ہیں اور اپنے بعد آنے والوں کے لئے بھی رحمت کے دروازے کھولتے ہیں جس شخص کے متعلق امکان نظر آتا ہے کہ وہ اس تحریک کی تائید کرے گا۔ اسے مخالف بننے کا موقعہ نہیں دیتے۔

ان کے جو ساتھی مظلوم اور ضعیف ہیں۔ اگرچہ یہ انہیں پہچانتے بھی نہیں۔ مگر ان پر رحم کرنے کے لئے اپنی تمام عزت قربان کر دیتے ہیں۔ جیسے انہوں نے حدیبیہ کی صلح میں کیا۔ یا حضرت فاروق اعظم نے عراق کی زمین فوجیوں میں تقسیم کرنے سے اس بناء پر انکار کر دیا تھا کہ ان اراضی کا فائدہ بعد میں آنے

---

[2] جنگ بدر میں جو کافر قیدی گرفتار ہو کر آئے حضرت عمرؓ نے ان کے متعلق تجویز کیا کہ ہر ایک مسلمان ان میں سے اپنے اپنے عزیزوں کو قتل کر دے۔ (مرتب)

والی نسلوں کو ملنا چاہئے۔ (ازالۃ الخفاء: امام ولی اللہ دہلوی مقصد دوم ص ۱۲۷)

(قرآنی شعور انقلاب۔ ص ۵۸۰)

☆

رسول اللہ ﷺ کی پارٹی کی ضرورت

اگر کتاب الٰہی کی اشاعت کو پارٹی پروگرام میں منضبط کر لیا جائے، جیسے ہم سورہ مجادلہ میں حزب اللہ کی تاسیس سے استنباط کرتے ہیں اور انسانی عقلمند جماعتوں کا فیصلہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ کوئی انقلاب پارٹی کی آمریت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا تو انبیاء کرام کی کامیابی کو ان کی پارٹی کی کامیابی تسلیم کرنا پڑے گا۔ انبیاء کرام اپنی پارٹیوں کے لیڈر ہوتے ہیں اس لئے دنیا غلطی سے رہنما کو ڈکٹیٹر سمجھ لیتی ہے۔ حقیقت میں کوئی نبی اپنے انقلابی رفقاء کی کامیابی کے بغیر کامیاب نہیں ہوا۔ بڑے بڑے اولوالعزم نبی اپنے رفقاء کی کمزوری کے سبب اپنی تعلیمات کے نتائج نہ دیکھ سکے جیسے موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ بذات خود بڑے اولوالعزم نبی تھے اور ان کی نظیر تاریخ میں بہت کم ملتی ہے، مگر ان کے رفقاء کی کمزوری سے انہیں بے حد تکالیف پیش آئیں اور منازل مقصود پر پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ آیت نمبر ۲۶ ملاحظہ ہو۔

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۛ يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ

ترجمہ: اللہ نے فرمایا تحقیق وہ زمین ان پر چالیس برس حرام کی گئی ہے وہ اس ملک میں سرگرداں پھریں گے۔ سو تو نافرمان قوم پر افسوس نہ کر!

یعنی کہ اگر یہ (بنی اسرائیل) ایسے ہی ڈرپوک اور بے حس ہو گئے ہیں تو ان کو ارض مقدس کی بادشاہی دینے سے کیا نفع ہو گا؟ لہٰذا سزا کے طور پر یہ چالیس سال یہاں جنگل میں پھریں تاکہ بے غیرت اور بے حس بڈھے مر جائیں اور ایک نئی نسل غیور اور حریت پسند پیدا ہو، وہ جا کر اپنے آبائی ملک پر قبضہ جما لے۔

ادھر قرآن حکیم رسول اللہ ﷺ کی کامیابی کو 'الذین معہ' کی کامیابی پر منحصر کرتا ہے۔

لٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٨٨﴾ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٨٩﴾

(۹: ۸۸-۸۹)

ترجمہ: لیکن رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان والے ہیں وہ اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں اور انہی لوگوں کے لئے بھلائیاں ہیں اور وہی نجات پانے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے باغ تیار کئے

ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا٘ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۛۖۚ وَ مَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــٴَـهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا۠ ﴿۲۹﴾ (سورہ الفتح: ۲۹)

ترجمہ: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں کفار پر سخت ہیں آپس میں رحم دل ہیں۔ تو انہیں دیکھے گا کہ رکوع و سجود کر رہے ہیں۔ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی تلاش کرتے ہیں۔ ان کی شناخت ان کے چہروں میں سجدے کا نشان ہے۔ یہی وصف ان کا تورات میں ہے اور انجیل میں ان کا وصف ہے۔ مثل اس کھیتی کے، جس نے اپنا انکھوا نکالا پھر اسے قوی کر دیا۔ پھر موٹا ہو گیا۔ پھر اپنے تنے پر کھڑا ہو گیا۔ کسانوں کو خوش کرنے لگا۔ تاکہ اللہ ان کی وجہ سے کفار کو غصہ دلائے۔ اللہ نے ان میں سے ایمانداروں اور نیک کام کرنے والوں کے لئے بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوی القربیٰ کون ہیں؟:

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کی کامیابی ان کے حزب کی کامیابی ہی ہوتی ہے اس کے بعد اگر یہ پوچھا جائے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوی القربیٰ کون ہیں؟ تو بلا تامل یہی جواب دیا جائے گا کہ "اس صلی اللہ علیہ وسلم کی پارٹی کے ممبر" مگر ایک ایسا آدمی جس نے انبیاء کی کامیابی کا ایسے نقطہ نگاہ سے مطالعہ نہیں کیا۔ کہے گا "رسول اللہ کے شخصی رشتہ دار!"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی قربیٰ

نبی اکرم کے نسبی رشتہ دار اولاد بنی ہاشم اور پھر اولاد علی رضی اللہ عنہ اور اولاد عباس رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کی سیاست کا مخصوص انداز یہی تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے طریق پر خلافت قائم کر کے اس کے مرکز میں آنا چاہتے تھے، مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس استحقاق کی ہرگز صراحت نہیں فرمائی۔ بنی امیہ کی خلافت کے زمانہ میں بنی ہاشم حزب مخالف کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ اب انہوں نے جماعت کے ذریعے سے کوشش کی اور کامیاب ہوئے۔ کامیابی کے بعد دو حصے ہو گئے (۱) بنی عباس (۲) علویین

نسبی قربیٰ کسی ترجیحی حق کے مستحق نہیں:

بنی عباس نے مرکزی خلافت پر قبضہ کر لیا اور علویوں نے اطراف مملکت پر، علوی، آیت:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی (شوریٰ۔۲۳)

ترجمہ: کہہ دو میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا بجز رشتہ داری کی محبت کے)۔... میں 'ذوی القربیٰ' سے اپنی ذات مراد لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اجر یہ ہونا چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کے خاندان کی حکومت قیامت تک تمام مسلمانوں کے گلے میں پڑی رہے خواہ وہ حکومت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ کی محنت کا اجر یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے اقرباء سے محبت سے پیش آنے لگیں۔

(نساء۔۱) میں دیکھیے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا

ترجمہ: اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کے واسطہ سے آپس میں سوال کرتے ہو اور قرابت والوں کے بارے میں سے خبر دار رہو! بیشک اللہ تم پر نگہبان ہے۔

شریعت اسلامیہ کی بنیاد اس پر ہے کہ یہ دعوۃ الی اللہ ہے، اللہ کے احکام کا اتباع ہے اور ان کا انصاف کے ساتھ قیام ہے۔ شریعت الھیہ کا دوسرا اجزو اعظم جو اس سے متفرع ہوتا ہے صلہ رحمی ہے یعنی اہل حق کے حقوق بے کم و کاست ادا کئے جائیں۔ انسانی فطرت اسی پر مجبور ہے اور قرآن حکیم اس فطرت انسانی ہی کے تقاضے پورا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر یہ فطرت خراب ہو جائے تو انسانیت خراب ہو جاتی ہے۔ پس نبی اکرم ﷺ لوگوں سے فرماتے ہیں کہ میری رسالت کا اجر اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تم آپس میں صلہ رحمی کرو اور اس باب میں گمراہی میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ واضح موجود نہیں ہے کہ مودۃ فی القربیٰ سے مراد رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں کے ساتھ مودۃ ہے۔

مودۃ فی القربیٰ کا اصل مفہوم

اس دعوت کی کہ لوگ اپنے اپنے اقربا کے حقوق ادا کریں یہ حکمت تھی کہ لوگ اس پر مطمئن تھے کہ نبی اکرم ﷺ ہمیں اس چیز کی طرف بلاتے ہیں جس میں ہمارا ہی نفع ہے۔ پس اہل بیت اور سب مائیں اس دعوت کو سنتی تھیں کیونکہ قطع رحم سے سب سے زیادہ نقصان امہات ہی کو پہنچ سکتا ہے۔ جب انہوں نے سنا کہ نبی اکرم ﷺ اپنی تبلیغ و سعی اصلاح کا اس کے سوا اور کوئی اجر طلب نہیں کرتے کہ ہماری اولاد ہماری خدمت کرے تو وہ اسلام کی طرف زیادہ مائل ہو جاتی تھیں۔ جو شخص مکہ معظمہ میں اسلام کے پھیلنے کی رفتار کا مطالعہ کرے وہ اس چیز کو نہایت بیّن پائے گا۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلْ مَا سَاَلْتُکُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَکُمْ (سبا۔۴۷)

ترجمہ: کہہ دیجئے میں نے تم سے جو کچھ معاوضہ مانگا ہو تو وہ تم ہی رکھو

پس نبی اکرم ﷺ بھی دوسرے انبیاء کی طرح امت سے کوئی مادی یا غیر مادی اجر طلب نہیں کرتے۔ وہ تو ساری عمر یہی فرماتے جاتے ہیں کہ

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ (۳۴:۴۷) ۱۰:۷۲، ۱۱:۲۹، ۵۱:۱۱، ۲۶:۱۰۹، ۳۴:۴۷،

اور یہی سنت انبیاء ہے۔

البتہ یہ صحیح ہے کہ متقدم فی الاسلام ہونے کی وجہ سے بنو ہاشم عجمیوں سے افضل واولیٰ ہیں، بشرطیکہ ان میں شرائط خلافت پائی جائیں۔

الغرض قرآن حکیم رسول اللہ ﷺ کے نسبی رشتہ داروں کا اس آیت میں کوئی ذکر نہیں کرتا۔ اس لئے ان سے مراد وہ رشتہ دار ہیں جو حضور ﷺ کی تحریک میں جان ومال لٹا کر شریک ہوتے ہیں۔ وہ حزب اللہ کے مندرجہ ذیل تین اجزاء ہیں۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کے تین قسم کے ذوی القربیٰ:

(۱) مہاجرین۔ آیت نمبر ۸ (۲) انصار آیت نمبر ۹ (۳) تابعین باحسان آیت نمبر ۱۰۔ یہ تینوں قسم کے لوگ ذوی القربیٰ کی تفسیر ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی صحیح پوزیشن

فے میں سے جو حصہ ۵ا رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا ہے وہ کافی بڑی مقدار ہے۔ یہ اس لئے دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ذاتی یعنی نسبی رشتہ دار بہت سے ہیں جن کے رسول اللہ ﷺ پر طبعی حقوق ہیں۔ ان کے مصارف اس حصے میں سے نکلیں گے۔ ذی القربیٰ کا جو ۵ا حصہ ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے ذاتی اور نسبتی رشتہ داروں کے لئے نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا اسوہ حسنہ تو یہ ہے کہ وہ اپنا ذاتی پانچواں حصہ بھی کبھی پورا وصول نہیں کرتے بلکہ ازواج مطہرات اور قریبی رشتہ داروں کے واجبی حقوق ادا کرنے کے بعد باقی ماندہ رقم پھر یتامی اور مساکین کے حصے میں لوٹا دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ خیال بنانا کہ رسول اللہ ﷺ ۵ا حصہ اپنے ذاتی نام سے اور ۵ا حصہ اپنے ذوی القربی کے نام سے لیتے ہیں یہ اس پرانی سرمایہ دارانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے لئے شہنشاہیت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بنی ہاشم میں چند آدمی اس خیال کے ضرور پیدا ہو گئے تھے مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو کامیاب ہونے نہیں دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا نسلی حق جس کے بعض بنی ہاشم مدعی تھے قائم نہ ہو سکا۔ یہ اسلامی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کا بہت بڑا شرف ہے۔ اس لئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت بڑی عزت کے مستحق ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا بلکہ بعض بنی ہاشم کی پالیسی چل جاتی تو ساری دنیا یہی کہتی کہ رسول اللہ ﷺ نے رسالت کا دعویٰ کر کے اپنے خاندان

کے لئے چند روزہ شہنشاہی پیدا کرلی۔ (قرآنی شعور انقلاب ص ۲۰۲،۱۹۷)

☆

نبی اکرم ﷺ کی جماعت کی خوبی

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗٓ (الفتح۔۲۹) محمد رسول اللہ اور ان کے ساتھی) سے جو جماعت پیدا ہوئی ہے اس کی زندگی ارتفاق اور اقتراب دونوں کے لحاظ سے نمونے کی زندگی ہے۔ انہوں نے بین الاقوامی حکومت بھی پیدا کی اور قرب الٰہی کے بھی اونچے سے اونچے درجوں تک پہنچے۔ ان کا یہ کارنامہ قیامت تک کے انقلابیوں کے لئے اعلیٰ درجے کا نمونہ ثابت ہوگا۔ بیچ میں اس نمونے پر اور نمونے ڈھلتے رہیں گے۔ لیکن اصل نمونہ یہی ہوگا۔ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ نمونے کے اس اولین دور کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ختم مانتے ہیں۔

اور اس دور کی تاریخ کے جس اعلیٰ پائے کے وہ شرح کرنے والے ہیں اس سے بہتر کوئی دوسرا عالم نہیں مل سکتا۔

پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ قرآن کا قانون بین الاقوامی درجے پر غالب رہنا چاہئے۔ یہ جماعت اپنے فیصلے سے اس ذمہ داری کو قبول کرتی ہے۔ یبتغون (چاہتے ہیں) سے یہی مراد ہے کہ اپنی مرضی اور فیصلے سے "چاہتے ہیں"۔

(ہ) سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (الفتح۔۲۹)
(ان کی نشانی ان کے مونہوں پر ہے سجدے کے اثر سے)

سجدے کی روح۔۔۔۔ قربانی۔۔۔۔۔ ان کے اندر داخل ہو چکی ہے اور اس سے وہ اس قدر نڈر ہو چکے ہیں کہ ان کے چہرے سے ایک نور ابلتا ہے وہ ہر ایک مصیبت کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ انہیں راہ حق سے کوئی مصیبت ہٹا نہیں سکتی۔

(و) ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ (الفتح۔۲۹)
ان کی یہ تمثیل تورات میں (پہلے ہی) بیان کر دی گئی ہے

تورات اور انجیل میں اس جماعت کا ذکر:

تورات میں اس کا اشارہ مجمل ہے۔ چنانچہ تورات میں ہے کہ میں بنی اسماعیل کو اتنا ہی بڑھاؤں گا جتنا بنی اسحاق کو۔ میں انہیں ایک بڑی قوم بناؤں گا۔

(ز) وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ

(اور انجیل میں ان کی تمثیل جیسے کھیتی نے نکالا اپنا پٹھا، پھر اس کی کمر مضبوط کی۔ پھر وہ موٹا ہوا پھر کھڑا ہو گیا اپنی نال پر۔ خوش لگتا ہے کھیتی والوں کو) (الفتح۔۲۹)

اس سلسلے میں انجیل کے مندرجہ ذیل مقامات لائق توجہ ہیں:

انجیل مرقس باب ۴ آیات ۳۔۹ میں ہے کہ:

"سنو، دیکھو، ایک بونے والا بیج بونے نکلا اور بوتے وقت ایسا ہوا کہ کچھ راہ کے کنارے گرا اور پرندوں نے آکر اسے چگ لیا۔ اور کچھ پتھریلی زمین پر گرا جہاں اسے بہت مٹی نہ ملی، اور گہری مٹی نہ ملنے کے سبب جلد اگ آیا۔ اور جب سورج نکلا تو جل گیا اور جڑ نہ ہونے کے سبب سوکھ گیا۔ اور کچھ جھاڑیوں میں گرا۔ اور جھاڑیوں نے بڑھ کر اسے دبالیا۔ اور وہ پھل نہ لایا۔ اور کچھ اچھی زمین پر گرا۔ وہ اگا اور بڑھکر پھلا اور کوئی تیس گنا کوئی ساٹھ گنا کوئی سو گنا پھل لایا"۔

پھل لانے کی مزید کیفیت آگے چل کر آیات ۲۶۔۲۷۔۲۸ میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

اور اس نے کہا: خدا کی بادشاہت ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے، اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے، اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے، زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے پہلے پتی، پھر بالیں، بعد اس کے بالوں میں تیار دانے"

(ح) لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۔(تاکہ ان سے کافروں کا جی جلائے)

خدا نے قوموں کو رسولوں کے ذریعے سے اپنی کتابیں اور ہدایتیں دیں۔ وہ لوگ اس دین کی عزت کرتے اور اپنی کتاب پر عمل کرتے تو ان کی عزت قائم رہتی اور ان پر کوئی دوسرا حاکم نہ ہو سکتا مگر انہوں نے ان کتابوں کی عزت نہ کی اور اپنے دین کا احترام قائم نہ رکھا۔ بلکہ اس کی عملاً مخالفت کی یہ کفار ہیں۔

اب ایک دیندار جماعت پیدا ہوتی ہے جو ان پر غالب آجاتی ہے۔ کفار اپنے آپ کو بھی دیندار سمجھتے ہیں۔ انہیں غصہ آتا ہے کہ یہ لوگ ہمارے دین پر غالب کیوں آگئے؟ لیکن حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ یہ باعمل جماعت جو مرنے پر آمادہ ہے۔ ان ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والوں یا نیم دلی سے اپنے دین کے ماننے والوں پر غالب آجائے۔

ان نام نہاد "دیندار" قوموں کو مغلوب کرنا ایک دن کا کام نہیں ہے۔ یہ انقلاب قیامت تک جاری رہے گا۔ کیا مہاجرین کی پہلی جماعت کے ذریعے ہندوستان، ترکستان اور سوڈان فتح ہو سکتے تھے؟ پس قرآنی تحریک کی ترقی ایسی ہے جیسے کھیتی کا نشو و نما پانا۔ یہ چھو منتر کا کام نہیں ہے۔ ارتقائی کام ہے۔ یہ طبعی چیز ہے ہو کر رہے گی۔ مگر بعض لوگ جن کی نظر قرآن پر گہری نہیں ہے طبعی رفتار کو دین سے الگ کرتے ہیں لیکن ہم امام ولی اللہ کے واسطے سے نیچر اور دین کو ایک ہی چیز مانتے ہیں۔ یہ تحریک اس کی مثال ہے یعنی

جس طرح بیج بونے کے بعد کھیتی طبعی رفتار سے ترقی کرتی ہے۔ ایسے ہی یہ قرآنی تحریک طبعی طور پر ترقی کرے گی۔ اور تمام دنیا پر چھا جائے گی۔

یہاں تک حضرت نبی اکرم ﷺ کی جماعت کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں جو ان کی کامیابی کے کفیل بنے۔ اب ایک کُلیے کے طور پر جامع اصول بیان کیا جاتا ہے۔

(ط) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔ ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ انہیں معافی ملے گی اور بڑا اجر ملے گا)

یہ نمونے کی جماعت ہے: اس انٹر نیشنل تحریک کو چلانے والی جتنی جماعتیں ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔ان سب سے وعدہ ہے کہ ان کی غلطیاں معاف کر دی جائیں گی۔ بشرطیکہ وہ اس پروگرام پر چلتی رہیں۔ وہ اس تحریک سے بڑے بڑے فائدے حاصل کریں گے۔ اِس دنیا میں بھی اور اُس دنیا میں بھی۔

رسول اللہ کی جماعتی کامیابی جو نمونے کے طور پر قرآن کی عملی زندگی پیش کرتی ہے۔ وہ سورہ فتح کی آخری آیت میں ضبط کر دی گئی ہے اس نمونے پر قیامت تک عمل کرنا ہوگا۔ اب قرآن شریف کو کسی اور نمونے کی ضرورت نہیں ہوگی اور نہ انسانیت کو کسی اور کتاب الٰہی کی حاجت ہوگی۔ تمام مسلمانوں پر ایسی جماعت کا قائم رکھنا فرض ہے۔ (قرآنی شعور انقلاب ص ۵۹۱،۵۸۸)

نبی اکرم ﷺ بطور معلم اور نذیر

رسول اکرم ﷺ کی یہ دو حیثیتیں اس طرح ہیں ۔

(۱) معلم (۲) جماعت کا لیڈر

معلم کی حیثیت سے آپ شاگردوں کے متعلق شہادت دیتے ہیں کہ فلاں شاگرد فلاں قابلیت کا ہے۔ اور فلاں شاگرد فلاں قابلیت کا۔ یہاں آپ کی شان معلمی ختم ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد وہ شاگرد آپ کے ساتھ ایک جماعت کی حیثیت سے کام کرتے ہیں ۔ آپ اس جماعت کے رہنما ہیں ۔ یہ جماعت منافقوں اور مشرکوں سے بالکل الگ اور خاص صفتوں کی مالک ہے۔ یہ جماعت قرآن کے اس پروگرام پر چلتی ہے کہ مظلوم انسانیت کی خدمت کرو۔ ظالموں کو گراؤ اور مظلوموں کی داد رسی کرو۔ اور اس سارے کام کا بدلہ صرف اللہ سے مانگو۔ اس پروگرام پر جو ٹھیک ٹھیک طور پر کام کرتا ہے اسے حضرت نبی اکرم ﷺ کامیاب زندگی کی بشارت دیتے ہیں۔ (مبشراً) اور اسے یقین دلاتے ہیں کہ اس کی دنیاوی اور اخروی زندگی کے فوائد محفوظ ہیں۔ جو لوگ اس پروگرام پر ٹھیک ٹھیک نہیں چلتے انہیں خبردار کرتے ہیں کہ جن کی دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی ناکام رہے گی۔ وہ بہانے بنا کر دل کو خوش کر لیں ، لیکن کامیابی نصیب نہ ہوگی۔ (نذیرا)

لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ؕ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝ (الفتح۔۹)

"تم ضرور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اس کی مدد کرو۔ اور اس کا وقار قائم کرو۔ اور صبح وشام اس کی پاکیزگی بیان کرو۔"

خدا کی محبت کی معنی

حضرت نبی اکرم کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں خدا کی محبت ہے انہیں ایک استاد کی ضرورت ہے جو انہیں بتائے کہ محبت کیسے کی جاتی ہے اور خدا کی محبت کے دعوے سے انسانوں کی خدمت کس طرح ہونی چاہیے۔

(قرآنی شعور انقلاب ص۵۴۶)

☆

سیدھی راہ

رسول اللہ کی کامیابی کا صحیح پروگرام یہ ہے کہ قریش آپ کی تعلیم کے خادم بنیں ۔ اور آپ کے اصول پر جو حکومت پیدا ہو اسے چلائیں ۔ تاکہ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہم السلام کی دعا عمل میں آئے۔[1]

اگر یہ صورت پیدا نہ ہو اور آپ دوسری قوموں کی مدد سے اپنا پروگرام کامیاب بنا کر دکھادیں ۔ تو گو آپ انسانیت پر ایک بہت بڑا احسان کرنے والے گنے جائیں گے۔ لیکن ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام

---

[1] ان کی دعا کے الفاظ یہ ہیں: رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۱۲۷ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۱۲۸ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ (البقرہ۱۲۷۔۱۲۹) (اے ہمارے رب! (اسے) قبول فرما۔ بے شک تو سننے والا جاننے والا ہے اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا تابع بنائے رکھ اور ہماری نسل سے ایک ایسی امت پیدا کر جو تیرے حکموں کے نیچے رہ کر زندگی بسر کرے۔ اور ہمیں مناسک سکھا اور ہم پر رحم فرما۔ تو رحمت کرنے والا مہربانی کرنے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! ہماری اس نسل میں (جس کی ہم نے دعا کی ہے) انہی میں سے ایک (ایسا) رسول پیدا کر جو انہیں تیرے حکم پڑھ کر سنائے، قانون سکھائے (اس قانون کی) حکمت بتائے اور انہیں پاک کرے بے شک تو عزت دینے والا حکمت والا ہے۔)

کی دعا کا مصداق نہ ٹھہریں گے۔ پہلے نبیوں کی برکتوں کا مصداق بننا تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ قریش کو اپنا مددگار بنائیں ۔ پہلے سب نبی اپنی اپنی قوم کو دعوت دیتے چلے آئے ہیں اور انہیں ساتھ ملا کر کام کرتے رہے ہیں ۔ اس لئے آپ کا بھی فرض ہے کہ اپنی قوم کو ساتھ ملائیں ۔ کیوں کہ کام کرنے کا طبعی طریقہ یہی ہے اس سے آپ کا طریقہ وہ ہو جائے گا جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر آپ تک ایک ہی طرح قائم رہا۔ یعنی پہلے قومی انقلاب مکمل کرنا پھر اسے بین الاقوامی درجے تک کامیاب بنانے کی کوشش کرنا۔ اگر آپ بھی اس طریق پر کام کریں تو؟ یہ طریقہ رہتی دنیا تک انسانیت کے لئے مستقل پروگرام بن جائے گا اگر آپ پہلے نبیوں کے طریق سے ہٹ کر طریقہ اختیار کریں تو وہ آئندہ انسانیت کے لئے تبدیل نہ ہو سکنے والا پروگرام نہ ہو گا۔ غرض حضرت نبی اکرم ﷺ یہی طریق اختیار کیا کہ پہلے اپنی قوم کو درست کیا اور انہیں اپنا دست و بازو بنایا۔ پھر ان کی مدد سے دوسری قوموں کے ایک ایک حصے کو ساتھ ملایا۔ پھر اس حصے نے اپنی اپنی قوم میں یہ انقلابی کام کیا اور قرآن حکیم کی تعلیم پھیلا کر اس انقلاب کی تکمیل کی۔ چنانچہ حضرت امام ولی اللہ دہلوی نے قوم بقوم اسلام پھیلنے کا جو طریق تاریخی طور پر ثابت کیا ہے اس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں ۔ آج بھی جو قوم قرآن کے انقلاب کو بین الاقوامی درجے پر کامیاب بنانے کا تہیہ کرے وہ اسی طریق سے اسلام کی تعلیم کو کامیاب بنا سکتی ہے۔ یہ تنظیم و تربیت ہی انقلاب کی روح ہے۔

وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا (الفتح۔۳)

(اور اللہ مجھے زبردست مدد دے)

کل قومی حکومت تیری اس کمزور جماعت ہی کے ذریعے سے مہیا ہو جائے گی۔ چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے ان غریب اور بے کس عربوں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے تختے الٹ کر رکھ دئے۔ اور ان کی جگہ قرآن کا قانون چلایا۔ اس انقلاب کی بنیاد انسانی فطرت کی ضرورتوں پر تھی۔ اس لئے رفتہ رفتہ سب قوموں کے عقلمند لوگوں نے اسے مان لیا۔ اس طرح یہ تحریک روز بروز بڑھتی گئی۔ یہ سب کچھ اس صلح حدیبیہ کا نتیجہ تھا۔

(قرآنی شعور انقلاب ص۵۳۸،۵۳۷)

☆

اب انقلاب عمومی حضرت محمد ﷺ ہی کی اتباع سے آسکتا ہے

حنیفی اولوالعزم انبیاء علیہم السلام مثلاً حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوشش کرتے رہے کہ تمام دنیا میں تورات کو پھیلا کر امامت کبریٰ (بین الاقوامی قیادت) حاصل کریں لیکن یہ مقام محمود حضرت محمد

مصطفیٰ ﷺ ہی حاصل کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب انقلاب عمومی اپنے مختلف ادوار میں آپ کے اتباع سے باہر نہیں جا سکتا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جو انقلاب رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا خاصہ ہے وہ ایک دن میں ساری دنیا میں نہیں پھیل سکتا۔ اس انقلاب کا پہلا حصہ وہ تھا جو خلافت راشدہ سے شروع ہو کر عباسی حکومت کے خاتمے تک کامیاب رہا۔ جب قریش میں اس انقلاب کو آگے بڑھانے کی طاقت نہ رہی تو اس انقلاب کے آگے بڑھنے کے لئے ایک اور قوم ایرانیوں کو ذریعہ بنایا گیا۔ لیکن قریش کے تنزل اور ایرانیوں کے عروج کا درمیانی وقفہ انقلاب کی "رات" تھی۔ اس میں نئی قوم تیار ہوئی۔ اس کے بعد ترکمانی قوموں نے اس انقلاب کو آگے بڑھایا اور پھر ہندوستانی قوم نے اسے اپنایا۔ اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر یہ انقلاب ساری دنیا میں کامیاب رہا۔ ان ٹکڑوں کو علیحدہ علیحدہ خیال کرنا غلطی ہے۔ یہ سب ایک سلسلے کی کڑیاں ہیں جب تک انسان روئے زمین پر قائم ہے، یہ انقلاب کسی نہ کسی شکل میں آگے بڑھتا رہے گا۔ اور آخر میں ایک ایسا زمانہ آسکتا ہے کہ تمام اقوام جو اس انقلاب سے مانوس ہو چکی ہوں ایک سطح پر آکر اس کے ماتحت مل جائیں۔ اس وقت یہ انقلاب عمومی، مکمل ہو گا۔

پس المزمل سے مراد وہ صاحب امامت کبریٰ ہے جس کے ماتحت تمام اقوام عالم جمع ہوں گی۔ یہ گویا الحاشر ہی کا دنیاوی مظہر ہے۔

المزمل کے دوسرے معنی: امام ائمہ انقلاب

(۲) اِزْمَلَ یا اِزْدَمَلَ کے دوسرے معنی ہیں حَمَلَ بِمَرَّةٍ وَاحِدَةٍ (المنجد) (یعنی اونٹ کی طرح بوجھ اٹھا کر ایک ہی ہچکے سے اٹھ کھڑا ہوا)

اِزْدَمَلَهٗ : اِحْتَمَلَهٗ یعنی بوجھ اٹھالیا۔ (صراح) وَمِنْهُ قَوْلُهٗ تَعَالیٰ یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ یا ایھا المزمل بھی اسی معنی میں ہیں۔

رازیؒ نے عکرمہؒ کا قول نقل کیا ہے۔ کہ مزمل کے معنی ہیں وہ شخص جس پر بھاری کام ڈال دیا گیا ہو۔ کیونکہ زَمَّل کے معنی ہیں حَمَلَ

یہ بار کیا ہے؟: قومی اور بین الاقوامی انقلاب

یہ بار جو نبی اکرم ﷺ نے اٹھایا قومی اور بین الاقوامی انقلاب کا بار تھا۔ اور تعجب یہ ہے کہ آپ نے پہلے اپنی قوم کو ترقی دے کر بین الاقوامی درجے کے کام کرنے والے کارکن تیار کرنے کا انتظار نہیں کیا۔ گو اگر آپ ایسا کرتے تو بھی کسی عقلمند کو اس پر اعتراض نہ ہوتا لیکن آپ نے بین الاقوامی انقلاب کو موخر نہیں کیا۔ بلکہ دونوں کام ایک ہی وقت شروع کر لئے۔ یہ نہایت مشکل کام تھا۔ لیکن آپ نے

جوانمردی، ہمت، محنت اور مشقت سے کام لیا اور پورے کے پورے بوجھ کو سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اللہ کے فضل سے بہت جلد منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے قریش کی ذہنیت ایسی تیار کی کہ وہ جہاں امرائے مدینہ کے ساتھ مل کر کام کر سکے وہاں بلال حبشی رضی اللہ عنہ، صہیب رومی رضی اللہ عنہ اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ وغیرہ غیر عربوں کے ساتھ اور ان کے ماتحت بھی کام کر سکے۔

جو شخص سیاسی اجتماعیت میں اس قسم کا بار گراں اٹھاتا ہے وہ امام انقلاب کہلاتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ المزمل یعنی آخری درجے کے امام ائمہ انقلاب ہیں۔ مولانا محمد قاسم رضی اللہ عنہ اس آخری درجے کا نام خاتم النبین رکھتے ہیں۔ اس سے اوپر کوئی درجہ ہی نہیں ہے۔

(قرآنی شعور انقلاب ص۳۱۸،۳۱۷)

☆

مدثر کے معنی

موطا امام مالکؒ میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا ایک نام الماحی بھی ہے جس کے معنی خود حضرت نبی اکرم ﷺ نے بتائے ہیں کہ: "یَمْحُو اللّٰہُ بِیَ الْکُفْرَ" (یعنی میرے ذریعے سے اللہ کفر کو محو کرے گا) چنانچہ لغوی طور پر دثر کے معنی اھلك (ہلاک کرنا) بیان کئے گئے ہیں جو بالکل الماحی کے معنوں کے مترادف ہیں۔ پس مدثر کے معنی ہیں دنیائے انسانیت سے ہر قسم کا ظلم وجور مٹانے والا۔ نبی اکرم ایسا کام ملت حنیفیہ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصول حیات کے دوبارہ زندہ کرنے سے کریں گے جو آپ کی گھٹی میں پڑی تھی، اور جس کے نمائندے قریش تھے۔

نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر ایک نکتہ :

سیرت نبی (علیٰ صاحبھا التحیۃ والسلام) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ملت حنیفیہ ابراھیمیہ کے قیام کے لئے طبعاً بے تاب تھے۔ آپ کی تربیت بھی قریش کے اونچے گھرانوں میں ہوئی۔ جن میں اس ملت کی اچھی اچھی باتیں باقی تھیں۔ [1]

پھر وہ انقلاب کا زمانہ تھا۔ فارس اور روم آپس میں لڑ رہے تھے اور چاہتے تھے کہ دنیا کی اقوام کو اپنے قبضے میں لائیں۔ ان سیاسی اور جنگی حالات کا اثر قریش پر بھی پڑ رہا تھا۔ کیونکہ ان کے تجارتی تعلقات دونوں

---

[1] یہ خیال غلط ہے کہ قریش اور اہل عرب افریقہ کے وحشیوں کی طرح بالکل وحشی لوگ تھے جن میں کوئی انسانی خوبی باقی نہ رہی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ قریش اور اکثر اہل عرب میں ملت حنیفیہ کا اچھا خاصہ حصہ باقی تھا۔ جیسے آج کل مسلمانوں کی تباہی کے باوجود ان میں اپنے بزرگوں کی بہت سی اچھی باتیں موجود ہیں تفصیل کے لئے دیکھو (حجۃ اللہ البالغہ ج اول ص ۱۲۴)

ممالک کے ساتھ تھے اور ان ملکوں میں ان کی کافی آمد و رفت تھی۔ چنانچہ قریش کا سمجھدار طبقہ سیاسی میلانات کے لحاظ سے تین طبقوں میں تقسیم ہو گیا تھا:

(۱) ایک طبقہ قیصر کی طرف مائل تھا۔

(۲) دوسرا طبقہ کسریٰ ایران کی طرف مائل تھا۔

(۳) تیسرا طبقہ دونوں سے الگ تھا اور حنیفیت پر قائم تھا۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ طبعاً اس تیسرے گروہ کے سرگرم رکن تھے یہ گروہ اگرچہ اقلیت میں تھا لیکن عرب پر قریش کی سیادت قائم کر کے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ میں اس قسم کی قیادت کی طبعی خداداد استعداد بھی موجود تھی۔ آپ کو اس انقلاب میں کامیابی کے لئے جس ہدایت کی ضرورت تھی اور جس کے لئے آپ سرگرداں تھے (وَوَجَدَكَ ضَآلًّا)[2] وہ خداوند تعالیٰ نے فراہم کر دی (فَهَدٰى)[3]

آپ قرآن حکیم کے ذریعے سے دنیائے انسانیت میں جو انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ ہو گا کہ انسانی معاشرہ (سوسائٹی) میں سے ہر قسم کا ظلم خواہ وہ خدا اور بندوں کے تعلقات میں ہو یا فقط بندوں کے باہمی تعلقات میں یعنی روحانی ہو یا اقتصادی سب مٹا دیا جائے گا۔ اور اس کی جگہ خدا کے ساتھ صحیح طریق پر تعلقات قائم کئے جائیں گے اور انسانیت میں معاشیات، معاشرت اور اقتصادیات میں ایک نظم جدید پیدا کیا جائے گا۔ اس انقلاب میں کسی خاص قوم یا ملک کی خصوصیت نہ ہو گی۔ بلکہ وسیع ترین معنوں میں عالمگیر اور ہمہ گیر ہو گا۔

اسلام کا جامع انقلاب :

دنیا میں اب تک جو انقلابات ہوئے ہیں وہ سب کے سب جزوی انقلابات ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی عالمگیر اور جامع انقلاب نہیں ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ آخری امام انقلاب ہیں۔ جن کی دعوت جامع عالمگیر انقلاب کے لئے ہے اور آپ نے اس جامعیت کا بہترین نمونہ سرزمین حجاز میں قائم کر کے دکھا دیا۔ جسے دنیا اب تک اس حیثیت سے جانتی اور مانتی ہے۔ آپ کے انقلاب میں اس وقت کی مہذب اقوام کا بیشتر حصہ آ گیا۔ اور سب کو خدمت انسانیت کے ایک نقطے پر جمع کر کے نہ صرف یہ کہ ان کے تعلقات ان کے خالق کے ساتھ درست کر دیئے۔ بلکہ ان کے آپس کے تعلقات بھی درست کر دیئے۔ اب جب کبھی کوئی جماعت جامع بین الاقوامی انقلاب پیدا کرنا چاہے گی اسے آپ ہی کے نقش قدم پر چلنا

---

[2] اللہ تعالیٰ نے تمہیں سرگرداں پایا۔

[3] پھر ہدایت دی۔

ہو گا۔ جو جماعت اس لائحہ عمل کے خلاف کوئی اور لائحہ عمل لے کر اٹھے گی وہ یا تو سرے سے ناکام رہے گی یا صرف جزوی طور پر کامیاب ہو گی۔ چنانچہ فرانس، جرمنی، ٹرکی اور روس کے انقلابات اس اصول کی بین مثالیں ہیں۔ ان انقلابوں میں وہ جامعیت نہیں جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے پیدا کردہ حجازی انقلاب میں تھی۔ جس نے بعد میں قیصر و کسریٰ کو بھی ہضم کر لیا۔

الغرض ہمارے نزدیک المدثر کے معنی ہیں "المھلك الکفر" یعنی انسانیت میں سے ہر قسم کا کفر (انکار) نکالنے والا وہ انکار خواہ خدا کے حقوق کے متعلق ہو یا انسانوں کے حقوق کے متعلق یہ انقلاب اسے انسانیت میں سے نکال باہر کرے گا۔

اس لفظ میں جو مبالغہ پایا جاتا ہے وہ حضرت نبی اکرم ﷺ کا طبعی اور فطرتی عزم و استقلال ظاہر کرتا ہے جو اس کفر کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے بارے میں ان کے دل میں پوشیدہ ہے۔

انقلاب میں اشاعت کی ضرورت :

(۲) قُمْ: (اٹھ)

یعنی اے وہ کہ تو دنیائے انسانیت سے ہر قسم کا ظلم اور کفر مٹانے کا تہیہ اور پختہ عزم کئے ہوئے ہے، ہم سے ہدایت لے اور محنت سے کام کر۔ اور جن لوگوں تک تیری آواز پہنچ سکتی ہے ان کو انسانی انقلاب کا یہ پیام سنا دے۔ اور ایسے لوگ تیار کر جو یہ انقلابی تعلیم دوسرے لوگوں تک پہنچا دیں۔ ایسے خاص لوگوں کی مرکزی قوت راتوں کو کھڑے ہو کر قرآن حکیم کی تعلیم پر تدبر کرنے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے جس کا ذکر سورۂ مزمل میں آچکا ہے۔ چنانچہ تجربے نے ثابت کر دیا کہ اس شبانہ تعلیم نے وہ لوگ پیدا کر دیئے جنہوں نے اس انقلاب کو فارس اور روم تک پہنچا دیا۔ اور پھر آگے وہ لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اسے حبشیوں، ترکوں اور ہندیوں تک پہنچا دیا۔ اب پھر یہ انقلاب پہلو بدل رہا ہے اور انشاءاللہ اس کی دعوت ہندوستان سے یورپ کی اقوام تک پہنچے گی۔

(قرآنی شعور انقلاب ص ۳۶۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال:

حضرت نبی اکرم ﷺ کی شاندار بین الاقوامی کامیابی اسی اصول طبعی کی پابندی کی رہین منت ہے۔ یہ اصول اس سے پہلے بھی برتنے کی کوشش کی گئی تھی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے بین الاقوامی مرکزیت کو توڑنے کے لئے اسی حربے سے کام لیا۔ جب خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت حنیفی کی ریاست سپرد کی (جو بین الاقوامی دعوت ہے) تو ان کو اور ان کے رفیق کار حضرت

ہارون علیہ السلام کو حکم دیا:

فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۖ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ ۖ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ (طٰہٰ ۴۷)

(یعنی دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم تیرے پرورد گار کے پیامبر ہیں اس لئے بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور ان کو عذاب مت دے! ہم تیرے پاس تیرے رب کی کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے ہیں۔ اب جو ہدایت کی پیروی کرے گا وہی سلامت رہ سکتا ہے۔)

چنانچہ خدا کے دونوں پیامبر فرعون کے پاس جاتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بطور نمائندہ گفتگو کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ (الاعراف ۷: ۱۰۵)

(میں یقیناً تمہارے رب کی طرف سے کھلی نشانی لے کر آگیا ہوں۔ اس لئے اب بنی اسرائیل کو میرے ساتھ روانہ کر دو)

بالکل ایسے ہی حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے قریش اور عرب میں بین الاقوامی کام کو قومی رنگ میں کرنا شروع کیا اور ان مظالم سے پاک کرنے کی کوشش کی جو وہ انسانیت پر کر رہے تھے۔ اور ان کو تعلق باللہ کا وہ سبق یاد دلایا جو وہ بھول چکے تھے۔

(۱۶) فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا (فرعون نے اس پیامبر کا کہنا نہ مانا تو ہم نے اسے دردناک عذاب میں مبتلا کر دیا)

فرعونی ملوکیت کا خاتمہ :

فرعون کی ملوکیت، بنی اسرائیل اور سب مصریوں سے ناجائز انتفاع (Exploitation) کر رہی تھی۔ اس نے ان کو غلامی کی انتہائی ذلالت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ان سے اتنی محنت و مشقت لی جاتی تھی کہ ان کو بیلوں اور گدھوں کی طرح تمام گھریلو کاموں کے لئے استعمال کیا جانے لگا تھا۔ اہرام مصر (Paramids) جیسی عظیم الشان عمارتیں جن کی تعمیر میں لاکھوں من پتھر کی سلیں لگی ہیں سب مصریوں کے ہاتھوں بنوائی گئیں۔

جب حکمران طبقہ اپنی قوم کو یوں ذلیل بنائے تو اسے کیوں زندہ رہنا چاہئے؟ وہ تو اپنی قوم کو آدمی ہی نہیں مانتے! بنی اسرائیل کی ان کے ہاں کیا قیمت ہو سکتی ہے؟ چنانچہ فرعون نے بھی بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ کے ساتھ جانے دینے سے انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو

آزادی کے پروگرام پر منظم کر لیا اور بالآخر ان کو مصر سے نکال لے گئے۔ اب خداوند تعالیٰ نے بھی بنی اسرائیل کی خاص مدد فرمائی۔ اور ان کے دشمنوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے برباد کر دیا۔

چھٹی صدی عیسوی کے فراعنہ: کسریٰ اور قیصر

اسی طرح چھٹی صدی عیسوی کے فراعنہ (Pharoas) کسریٰ ایران اور قیصر روم۔۔۔۔ کے لئے ایک نبی عظیم ﷺ آیا جس نے ان کو دعوت دی کہ وہ اسلام کا قانون قرآن حکیم قبول کر کے اسے رائج کریں اگر وہ اس قانون کو رائج نہ کریں گے تو کسانوں پر جو ظلم وہ کر رہے ہیں اس کے وہ ذمہ دار ہوں گے۔ چنانچہ قیصر روم کو جو خط لکھا گیا اس میں یہ الفاظ خاص ہیں:

اِنِّیْ اَدْعُوْكَ بِدَاعِيَةِ الْاِسْلَامِ، اَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِيكَ اللهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَاِنَّ عَلَيْكَ اِثْمَ الْيَرِيْسِيْنَ

(الصحیح البخاری باب بدء الوحی)

(میں تم کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر اسے مان لوگے تو دنیا میں بھی بچ رہو گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا دگنا اجر بھی دے گا اگر تم نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو تمہارے کسانوں پر جو مظالم ہو رہے اور وہ اپنی جہالت کے باعث جو غلطیاں کر رہے ہیں ان کے تم ذمہ دار ہوں گے)

اس خط سے ظاہر ہے کہ حضرت نبی اکرم ﷺ کی انسان دوستی شروع ہی سے ملوکیت پرستوں کے جوئے تلے دبے ہوئے لوگوں خصوصاً کسانوں کے ساتھ تھی کیونکہ ان ممالک کی غالب آبادی ان کسانوں وغیرہ ہی پر مشتمل تھی۔ چنانچہ امام الائمہ امام ولی اللہ دہلویؒ نے حجتہ اللہ البالغہ (ص ۱۰۵) میں اس طبقے کی زبوں حالی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ نہایت عبرت انگیز ہے۔

کسریٰ و قیصر نے یہ دعوت قبول نہ کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح فرعون کو دنیا میں سزا دی گئی اسی طرح یہ دونوں سلطنتیں صفحہ ہستی سے مٹا دی گئیں۔ اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد صحیح ثابت ہوا کہ هَلَكَ كِسْرٰى فَلَا كِسْرٰى بَعْدَهٗ وَهَلَكَ قَيْصَرُ فَلَا قَيْصَرَ بَعْدَهٗ (کسریٰ و قیصر ہلاک کر دیئے جائیں گے اور ان کے بعد ان کا کوئی جانشین نہیں ہوگا)

یہ تھا بین الاقوامی انقلاب، جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے ذریعے سے پیدا کیا اور جس کا فائدہ تمام کمزور جماعتوں کو پہنچا۔

(۱۷) فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَا ۨ

(۱۸) (الف) السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ: (تم کس طرح بچ سکو گے؟ اگر تم نے انکار کیا اس دن کا جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور جس سے آسمان پھاڑا جائے گا۔)

وہ یوم انقلاب آنے والا ہے اور جس طرح قیامت کبریٰ کا عذاب ایسا خوفناک ہوگا کہ بچے بوڑھے

ہو جائیں گے اور آسمان پھٹ جائیں گے اسی طرح چھوٹے پیمانے پر آنے والے ایام انقلاب میں تمام مخالفین کو سخت سزا دی جائے گی۔ اس یوم انقلاب کے لانے کے لئے خدائے قدیر اور مدبر السموت والارض تدابیر کر رہا ہے۔ اگر اسے قریب ترلانے کے لئے آسمانی قوتوں کو پھاڑنا (یا بقول حضرت مسیح علیہ السلام "ہلانا") پڑے گا تو وہ بھی کر ڈالے گا۔

انقلاب کے لئے تدبیر الٰہی کے طریقے :

تبدیر الٰہی کے انہی اصول کار کی تشریح کرتے ہوئے امام ولی اللہ فرماتے ہیں:

وَإِذَا تَهَيَّأَتْ أَسْبَابُ هٰذَا الشَّرِّ اِقْتَضَتْ رَحْمَةُ اللّٰهِ بِعِبَادِهٖ وَلُطْفُهٗ بِهِمْ وَعُمُوْمُ قُدْرَتِهٖ عَلَى الْكُلِّ وَشُمُوْلُ عِلْمِهٖ بِالْكُلِّ اَنْ يَّتَصَرَّفَ فِيْ تِلْكَ الْقُوٰى وَالْاُمُوْرِ الْحَامِلَةِ لَهَا بِالْقَبْضِ وَالْبَسْطِ وَالْاِحَالَةِ وَالْاِلْهَامِ حَتّٰى تَقْضِيَ تِلْكَ الْجُمْلَةُ اِلَى الْاَمْرِ الْمَطْلُوْبِ

یعنی جب عارضی قباحت کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی مہربانی تقاضا کرتی ہے کہ اس عارضی قباحت کو دور کر کے مصلحت عامہ کے مطابق حالت پیدا کر دی جائے اور یہ اللہ تعالیٰ کے لئے مشکل نہیں ہے اس لئے کہ وہ ہر چیز پر براہ راست قادر ہے۔ اور کائنات کے ذرے ذرے کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔ اس غرض کے لئے وہ مخلوقات اور ان کی قوتوں میں تصرف کرتا ہے اس کے تمام تصرفات چار قسموں میں منقسم ہو جاتے ہیں:

(۱) قبض: (یعنی جو قوتیں مصلحت کلیہ کے خلاف ہوں ان کی قوت عاملہ روک دی جاتی ہے)
(۲) بسط: (یعنی جو قوتیں مصلحت کلیہ کے لئے مفید ہوں مگر کمزور ہوں ان کو قُوٰی مثالیہ سے مدد پہنچا کر طاقتور بنا دیتا ہے)
(۳) احالہ: (یعنی مصلحت کلیہ کے قیام کی غرض سے اگر ضرورت پڑے تو ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کر دیا جاتا ہے)
(۴) الہام: (یعنی مصلحت کلیہ کے قیام کے اصول کی محبت یا اس کے مخالف قوتوں کی نفرت لوگوں کے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے اور وہ اس کے حق میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

کسریٰ و قیصر اور ان کے متبع میں قریش کو انذار:

الغرض ان تدابیر کے ذریعے سے قرآنی انقلاب لایا جائے گا اور کوئی قوت اسے روک نہ سکے گی اور نہ حجاز میں کوئی غیر انقلابی رہنے پائے گا۔ اب اگر فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تحریک انقلاب کی مخالفت کر کے بچ نہ سکا تو قیصر و کسریٰ اور ان کے مکی اور حجازی متبعین اس انقلاب سے جو قرآن حکیم لانے والا ہے

کس طرح بچ سکتے ہیں؟

اس پیشگوئی کی تصدیق:

تاریخ شاہد ہے کہ یہ پیشگوئی حرف بحرف صحیح نکلی اور اس اعلان کے تیرہ سال کے بعد جنگ بدر میں ابوجہل اور اس کے متبعین اور چند سال کے بعد ایرانی اور رومی جنگوں میں کسریٰ ایران اور قیصر روم ہلاک ہوگئے۔

(ب) كَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا: (یہ بات ہوکر رہنے والی ہے) یہ انقلاب ہوکر رہے گا اور کوئی طاقت اسے روک نہ سکے گی!

یہ اعلان جنگ بدر سے تیرہ سال پہلے کیا گیا تھا۔ اور بدر میں عین اس کے مطابق ہوکر رہا۔

انقلاب کا مطالعہ کرنے کی ضرورت:

ہمارے اکثر مفسرین نے اپنی تفسیریں اس زمانے میں لکھیں جب قرآنی انقلاب دنیا کے اکثر حصوں پر چھا چکا تھا اور قرآنی نظام (Quranic Order) کے مطابق مسلمانوں کی زندگی کی تنظیم ہو چکی تھی اس لئے یہ مفسرین انقلاب کی وہ کیفیت سمجھنے سے معذور رہے جو صدر اسلام میں پیش آئی تھی اور جس میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے واقعۃً زندگی بسر کی۔ اس لیے یہ مفسرین اکثر واقعات کو جو انقلاب کے زمانے میں پیش آیا کرتے ہیں اور جو واقعی قیامت کبریٰ کا نمونہ ہوتے ہیں، قیامت کبریٰ ہی پر محمول کرکے خاموش ہوگئے۔ اس انقلاب کی حقیقت کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے اس قسم کا انقلاب دیکھا ہو۔

(قرآنی شعور انقلاب ص۳۴۶،۳۴۱)

☆

سورۂ فتح کا مرکزی واقعہ

سورۂ فتح میں صلح حدیبیہ کے واقعات کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے کہ ذی قعدہ ۶ ہجری میں حضرت نبی اکرم ﷺ نے ایک خواب دیکھا کہ گویا آپ اور مسلمان مکہ مکرمہ پہنچ گئے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں۔ اس خواب کی کیفیت سن کر غریب الوطن مسلمان جو عرصے سے خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے بے تاب تھے اور بھی بے چین ہوگئے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر آنحضرت ﷺ بھی عمرہ کے لئے جانے پر تیار ہوگئے۔ آنحضرت ﷺ اور آپ کی جماعت ذی قعدہ ۶ ھ میں

مدینہ منورہ سے نکلی۔

اس سفر میں آپ کے ساتھ پندرہ سو صحابہ تھے۔(رضوان اللہ علیہم اجمعین) جن میں کچھ سوار تھے اور کچھ پیدل۔

جب آنحضرت ﷺ ذی الحلیفہ کے گاؤں پہنچے تو آپ نے عمرے کا احرام باندھا اور قبیلہ خزاعہ کے ایک آدمی کو بطور جاسوس بھیجا کہ قریش کی خبر لائے۔ چنانچہ جب آپ عسفان کے قریب پہنچے تو وہ سکاؤٹ واپس آیا اور اس نے خبر دی کہ قریش آپ کو روکنے اور آپ سے لڑنے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔

جب حضرت نبی اکرم ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم کسی سے لڑنے کے لئے گھر سے نہیں نکلے لیکن اگر کوئی ہمیں بیت اللہ (کعبہ) تک پہنچنے سے روکے گا تو اس سے لڑیں گے۔ یہ سن کر حضرت نبی اکرم ﷺ آگے بڑھے اور کچھ دور جا کر آپ نے فرمایا کہ خالد بن ولید غمیم میں ہے ہم دائیں کو ہو چلیں۔ یہاں تک کہ آپ اپنی جماعت سمیت اس وادی تک پہنچ گئے جہاں سے مکہ کو جاتے ہیں۔ یہاں آپ کی اونٹنی یکا یک ٹھہر گئی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر قریش مجھ سے کسی ایسی بات کا مطالبہ کریں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حرمات کی تعظیم ہوتی ہو تو میں ان کی بات مان لوں گا۔ آگے بڑھ کر آنحضرت ﷺ حدیبیہ کے مقام پر اترے یہاں سے مکہ صرف ۱۹ میل تھا۔

یہاں سے آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان کو سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا تا کہ انہیں خبر دیں کہ مسلمان صرف عمرہ ادا کرنے آئے ہیں ساتھ ہی انہیں ہدایت کر دی کہ مکہ مکرمہ میں جو مسلمان چھپے چھپے رہتے ہیں ان سے بھی ملیں۔ اور انہیں فتح کی خوشخبری دیں اور انہیں اطمینان دلا دیں کہ مکہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا اور کسی کو اپنا ایمان چھپانے کی ضرورت نہ رہے گی۔ چنانچہ حضرت عثمان بلوح کے مقام پر قریش کی جماعت سے ملے اور پھر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔

اس اثناء میں آنحضرت ﷺ کو یہ خبر پہنچی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں پر اس خبر کا اثر پڑ سکتا تھا۔ ظاہر ہے آنحضرت ﷺ نے کیکر کے ایک درخت کے نیچے تمام حاضرین سے اس امر پر اقرار لیا کہ اگر اب لڑنا پڑے تو ثابت قدم رہیں گے۔ مسلمانوں نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ بیعت کی۔ سب سے پہلے حضرت ابوسنان الاسدی نے بیعت کی۔ ایک صحابی حضرت سلمہ بن اکوع نے تین مرتبہ بیعت کی یعنی شروع میں، بیچ میں اور آخر میں۔

یہ خبر سن کر قریش کے ہوش جاتے رہے اور انہوں نے صلح کے لئے آدمی بھیجے۔ آخر ان باتوں پر صلح ہو گئی۔

(۱) یہ صلح دس سالوں تک رہے گی۔

(۲) جو قبیلے قریش سے ملنا چاہیں، قریش سے مل جائیں اور جو مسلمانوں سے ملنا چاہیں مسلمانوں سے مل جائیں۔

(۳) مسلمان ابھی واپس جائیں اور اگلے سال کعبہ کا طواف کر لیں۔
(۴) اگر مکہ والوں میں سے کوئی شخص مسلمان ہو کر نبی اکرم ﷺ کے پاس چلا جائے تو اسے قریش کے طلب کرنے پر واپس کر دیا جائے اور اگر کوئی مسلمان قریش میں چلا گیا تو اسے واپس نہیں دیا جائے گا۔

اس شرائط پر ابھی بحث ہو رہی تھی کہ مسلمان ابو جندل رضی اللہ عنہ بن سہیل مکہ سے آیا اور تمام مسلمانوں کے سامنے گر گیا۔ قریش کے سفیر نے معاہدے کی شرط کے مطابق اسے طلب کیا حالانکہ ابھی اس شرط پر بحث ہو رہی تھی۔ اس آخری شرط سے سب مسلمان سوائے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سخت پریشان ہوئے۔ اس پریشانی کی ترجمانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کی۔ آپ نے حضرت نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا کہ "یارسول اللہ کیا آپ اللہ کے نبی نہیں ہیں؟" آپ نے فرمایا یقینا۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ "کیا ہم حق پر اور ہمارا دشمن ناحق پر نہیں ہیں؟" آپ نے فرمایا یقیناً۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ "کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم عنقریب بیت اللہ کا طواف کریں گے؟" آپ نے فرمایا کہ "کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسی ہی سال کریں گے؟" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ "نہیں"۔ تو آپ نے فرمایا کہ "یقین رکھو ہم ضرور یہاں آئیں گے اور طواف کریں گے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی قسم کی باتیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بھی کیں۔ حضرت صدیق اکبر نے بھی وہی جوابات دے ئے، جو آنحضرت نے دیئے تھے بلکہ یہ بھی فرمایا کہ آنحضرت جو بات فرمائیں اسے مرتے دم تک بے چون و چرا مانتے رہو۔ غرض یہ شرط منظور ہو گئی اور آنحضرت ﷺ نے ابو جندل رضی اللہ عنہ کو قریش کے سفیر کے حوالے کر دیا۔ اور ابو جندل رضی اللہ عنہ نے صبر کے ساتھ اپنی مصیبت کو قبول کر لیا۔ اور تمام مسلمان یہ تلخ گھونٹ پی کر بھی چپکے ہو رہے۔

ابھی حضرت نبی اکرم ﷺ حدیبیہ ہی میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ اسی (۸۰) آدمی کوہ نعیم سے صبح کے وقت اس ارادے سے اترے کہ مسلمانوں کو نماز کی حالت میں قتل کر دیں۔ یہ سب لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ لیکن آنحضرت نے انہیں معاف کر کے رہا کرا دیا۔

اس معاہدے کے بعد آپ حدیبیہ سے مدینہ منورہ کو واپس تشریف لے گئے۔ راستے میں سورہ فتح کے شروع کی آیتیں اتریں۔

ترجمہ: ہم نے تجھے کھلی فتح دی اور تیری پہلی لغزشیں اور پچھلی لغزشیں معاف کر دیں اور اپنی نعمت تجھ پر تمام کر دی اور (یہ کہ وہ) سیدھی راہ کی طرف تیری راہنمائی کری اور تجھے زبردست مدد دی۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا یہ فتح ہے؟(یعنی حدیبیہ کا صلح نامہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں یہی چیز ہے جسے فتح قرار دیا گیا ہے۔

آپ مدینہ منورہ میں ذی الحجہ کے شروع میں واپس تشریف لے آئے۔ یہاں کوئی تین ہفتے ٹھہرے ہوں گے کہ محرم میں خیبر پر چڑھائی کر دی۔ اس معرکے میں صرف ان مسلمانوں کو شامل ہونے کی اجازت تھی جو حدیبیہ کے واقعے میں شریک رہ چکے تھے۔

صلح کا نتیجہ اور اثر:

اس صلح کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں اور ان کے مخالفوں میں راہ و رسم بڑھا اور میل جول زیادہ ہوا تو اسلام کے متعلق غلط فہمیوں کے بادل چھٹنے لگے اور لوگ مسلمانوں کے اچھے سلوک سے اثر لے کر مسلمان ہونے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ کی چوتھی شرط کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ مخالفین میں سے جو شخص مسلمان ہو کر شرط کے مطابق مخالف کیمپ میں بھیجا جائے گا، وہ ضرور وہاں بھی اپنا کام کرتا رہے گا۔ چنانچہ حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے عین معاہدہ لکھے جانے کے وقت قریش کے حوالے کر دئے گئے۔ انہیں مکہ معظمہ لے جا کر قید کر دیا گیا۔ لیکن جو شخص ان کی نگرانی پر مقرر ہوتا۔ وہ ان کے سمجھانے سے مسلمان ہو جاتا۔ اب دونوں مل کر تلقین کرتے۔ اس طرح ان قیدیوں کی تلقین سے تین سو کے قریب آدمی مسلمان ہو گئے۔ قریش مکہ نے بہتیرا چاہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معاہدے کی اس شرط کو توڑ کر ان مسلمانوں کو اپنے ہاں لے لیں۔ لیکن آپ نے معاہدہ توڑنا قبول نہیں فرمایا۔ آخر قریش کو خود ہی ان مسلمانوں کو مکے سے نکال دینا پڑا۔

حدیبیہ میں اسلامی جماعت کے ضبط کا حال اوپر بیان ہو چکا۔ یہ لوگ تو آنحضرت کے سامنے تھے لیکن حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ آپ سے دور ہوتے ہوئے بھی جماعتی ضبط کے اتنے پابند نکلے کہ جب مدینہ منورہ کے مسلمانوں نے قرار دیا کہ ابو جندل رضی اللہ عنہ نے ابو العاص مکی کے جس قافلے کو لوٹا ہے اس کا مال اسے واپس کر دیں تو انہوں نے اس فیصلے کی اطلاع پاتے ہی ابو العاص کے قافلے کا سارا اسباب یہاں تک کہ رسی اور اونٹ کی مہار تک ابو العاص کے حوالے کر دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ابو العاص نے سارا مال حقداروں تک پہنچا کر اسلام قبول کر لیا۔

غرض اس صلح کے نتیجے کے طور پر لوگ کثرت سے اسلام لانے لگے۔ چنانچہ جہاں حدیبیہ کے واقعے میں آنحضرت کے ساتھ پندرہ سو آدمی تھے وہاں ایک سال بیچ دے کر اگلے سال فتح مکہ کے وقت آپ کے ساتھ دس ہزار "قدوسی" تھے۔ یہ نتیجہ تھا اس بات کا کہ اب مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیوں کے بادل چھٹ رہے تھے۔ گویا اس صلح نے اسلام کی فتح کا دروازہ کھول دیا۔

(قرآنی شعور انقلاب ص ۵۲۱،۵۲۵)

اختتامیہ

اظہار رسالت عہدِ حاضر میں

پیغمبر اسلام ﷺ کو خصوصی طور پر اظہار* کی نسبت دی گئی ہے۔ آپ کے دین کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے کہ وہ تمام ادیان پر غالب و سربلند ہو۔ یہی نسبتِ غلبہ آپ کی امت کو بھی حاصل ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا کہ ڈھائی ہزار سال کے ایک خصوصی منصوبہ کے ذریعہ وہ اسباب فراہم کئے جن کو استعمال کر کے آپ دین خدا کو غالب و ظاہر کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ آپ ﷺ کی امت کے ساتھ ہے۔ چنانچہ پچھلے ہزار سال کے عمل کے نتیجہ میں خدا نے وہ موافق حالات کامل طور پر فراہم کر دئے ہیں جو دور جدید میں اسلام کے غلبہ کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ پیغمبر کے امتی اگر ان موافق حالات کو حکمت اور صبر کے ساتھ استعمال کریں تو خدا کا وعدۂ نصرت دوبارہ پیغمبر کے امتیوں پر اسی طرح واقعہ بن سکتا ہے جس طرح وہ خود پیغمبر کے اوپر واقعہ بنا تھا۔

امریکہ سے ایک انسائیکلو پیڈیا چھپی ہے جس کا نام ہے: انسان اور اس کے معبود (Man and his Gods) اس کتاب میں مختلف مذاہب پر مقالے ہیں۔ اسلام پر جو مقالہ ہے، اس کے عیسائی مقالہ نگار نے اسلامی انقلاب کے بعد پیدا ہونے والے عظیم نتائج کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں— "اس کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا:"

(Its advent changed the course of human history (p.389)

یہ ایک مستشرق کی زبان سے اسلامی انقلاب کی پیدا کردہ ان تبدیلیوں کا اعتراف ہے جنہوں نے تاریخ میں ایسے دور رس امکانات کھولے جن کے بعد اسلام کو غیر اسلامی ادیان پر غالب و برتر کرنا اسی طرح آسان ہو گیا ہے، جس طرح بارش آجانے کے بعد کھیت سے فصل اگانا۔

پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے ساتھیوں کے ذریعہ جو انقلاب برپا کیا گیا وہ اگرچہ اصلاً توحید اور آخرت کی فکر پر مبنی ایک دینی انقلاب تھا۔ لیکن اس نے بہت سے دور رس دنیوی نتائج بھی پیدا کئے۔ آپ

---

* لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ (توبہ۔۳۳)

کے لائے ہوئے انقلاب کے دنیوی نتائج میں سب سے اہم وہ نتائج ہیں جنہوں نے قدیم زمانہ کے سماجی اور اجتماعی نظام کو اس طرح بدل دیا کہ وہ حالات ہی ختم ہو گئے جن میں دعوت حق کا کام ایک انتہائی مشکل کام بنا ہوا تھا۔

سورہ براءۃ نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا تاکہ وہ اعلان کر دیں کہ اس سال کے بعد کسی مشرک کو حج بیت اللہ کی اجازت نہ ہو گی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حج کے اجتماعات میں بلند آواز سے اس کا اعلان کرتا پھرتا تھا، یہاں تک کہ میری آواز بھاری ہو گئی (فکنت انادی حتی صحل صوتی، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۱۲۴) مگر آج لاؤڈ اسپیکر و دیگر وجود میں آنے کے بعد یہ مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اعلان حق کا کام کتنا زیادہ آسان ہو چکا ہے۔

دین کی دعوت کے دو بڑے دور ہیں۔ ایک پیغمبر آخر الزماں کے ظہور سے پہلے۔ دوسرا، پیغمبر آخر الزماں کے ظہور کے بعد۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے خدا کی جو کتابیں آئیں ان کی حفاظت کی ذمہ داری خود ان امتوں پر ڈالی گئی جن کے پاس وہ کتابیں بھیجی گئی تھیں۔ چنانچہ ان کے بارے میں قرآن میں استحفاظت (طلب حفاظت) کا لفظ آیا ہے

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ (المائدہ۔۴۴)

(کیونکہ وہ کتاب اللہ کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے اور اس (کے حکموں اور ہدایتوں) پر گواہ تھے)

مگر قرآن کی حفاظت کے بارے میں فرمایا گیا کہ خدا نے اس کتاب کو اتارا ہے اور وہی اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر۔۹)

(بلاشبہ خود ہم نے "الذکر" (یعنی قرآن کہ سرتاپا نصیحت ہے) اتارا ہے اور بلاشبہ خود ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔)

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے ساتھ خدا کا یہ منصوبہ تھا کہ شرک کو مغلوب کیا جائے اور توحید کو دنیا میں غالب فکر کا مقام عطا کیا جائے (الانفال ۳۹) یہ کام اتنے مختلف اسباب کی مساعدت چاہتا ہے جو صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ موافق حالات پیدا کئے جن کو استعمال کر کے آپ نے شرک کو مغلوب کیا اور توحید کو فکری غلبہ کے مقام پر پہنچا۔

رسول اور اصحاب رسول کی کوششوں سے جو انقلاب آیا اس کے بعد شرک ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گیا۔ اب اس کی کوئی امید نہیں کہ شرک دوبارہ ایک غالب فکر کی حیثیت سے دنیا میں چھا سکے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں دوبارہ یہ واقعہ ہوا کہ توحید والوں نے غالب فکر کی حیثیت سے اپنا مقام کھو دیا۔ اس بار یہ

واقعہ 'الحاد' کے ہاتھوں سے ہوا۔ چنانچہ آج کی دنیا میں الحاد نے غالب فکر کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ بے خدا ذہن یا سیکولر ذہن آج دنیا کا غالب ذہن ہے۔ اس کے مقابلہ میں توحید کا ذہن عملاً دوسرے درجہ پر چلا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یقیناً معلوم تھا کہ آئندہ دور الحاد آنے والا ہے۔ اس لئے اس کی نصرت دوبارہ متحرک ہوئی۔ پچھلے ہزار سالہ عمل کے دوران اس نے دوبارہ ایسے حالات پیدا کرنے شروع کئے جو بالآخر غلبہ توحید کی جدوجہد کے لئے موافق زمین کا کام کرسکیں۔ یہ عمل اب اپنی تکمیل کے مرحلہ میں پہنچ گیا ہے۔ آج اگرچہ بظاہر الحاد کا غلبہ ہے مگر وہ موافق حالات پوری طرح پیدا ہو چکے ہیں جن کو استعمال کرکے دوبارہ توحید کو غالب فکر کا مقام دیا جاسکے۔

ا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تقریباً چار ہزار سال پہلے قدیم عراق کے دارالسلطنت (اُر) کے لوگوں کو پکارا کہ ایک خدا ہے جس کا حکم اور بندگی ہے، جو نفع ونقصان کا مالک ہے۔ خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اسی لئے تم اسی سے حاجتیں مانگو اور اسی کی پرستش کرو۔ اس دعوت توحید کے خلاف اس وقت کے مشرک بادشاہ نمرود کلدانی نے اتنا سخت رد عمل ظاہر کیا کہ آپکو آگ کے الاؤ میں ڈال دیا۔

آج بھی دنیا کے ہر ملک میں شرک کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ لیکن آج آپ کسی ملک میں دعوت ابراہیمی کو لے کر اٹھیں تو موجودہ زمانہ کا کوئی حکمران آپ کے ساتھ اس قسم کا شدید سلوک نہیں کرے گا۔

اس کی وجہ فلسفۂ حکومت کی تبدیلی ہے۔ نمرود کے زمانہ میں شرک ایک سیاسی عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب کہ آج وہ صرف ایک محدود مذہبی عقیدہ ہے۔ قدیم زمانہ میں عام طور پر مشرکانہ نظریۂ سیاست دنیا میں رائج تھا۔ نمرود، دور قدیم کے دوسرے بادشاہوں کی طرح، اسی قسم کے نظریہ کی بنیاد پر حکومت کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہے، اس لئے وہ دوسروں سے برتر ہے اور اس کو دوسروں کے اوپر حکمرانی کرنے کا فوق الفطری حق حاصل ہے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے حکمراں اس قسم کے نظریہ حکومت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ انہوں نے عوامی رائے کی بنیاد پر اپنے لئے حکمرانی کا حق حاصل کیا ہے نہ کہ کسی فق الفطری عقیدہ کی بنیاد پر۔ یہی وجہ ہے کہ توحید کی دعوت میں موجودہ حکمرانوں کو اپنے اقتدار کے لئے کوئی چیلنج نظر نہیں آتا۔ جب کہ نمرود اور دور قدیم کے دوسرے بادشاہوں کو توحید کا عقیدہ پھیلنے میں اپنی سیاسی جڑ کٹتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

قدیم زمانہ میں جب کوئی پیغمبر اٹھتا تو اکثر پہلے ہی مرحلہ میں وقت کے اقتدار سے اس کا ٹکراؤ شروع ہوجاتا اور غیر ضروری قسم کی مشکلات اس کی راہ میں حائل ہوجاتیں۔ اس کی وجہ سیاسی ادارہ کے ساتھ فوق الطبیعی عقائد کی یہی وابستگی تھی۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ عوام کو یہ یقین دلا کر ان کے اوپر حکومت

کرتے تھے کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں، خدا ان کے اندر حلول کر آیا ہے۔ ایسے ماحول میں جب توحید کی آواز بلند ہوتی تو ان کو نظر آتا کہ وہ ان کے سیاسی استحقاق کو بے اعتبار بنا رہی ہے۔ یہ اعتقادی پیچیدگی ان کو داعی حق سے ٹکرا دیتی تھی۔ اسلام نے ثابت کیا کہ ہر قسم کی فوق الفطری حیثیت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ تمام انسان برابر ہیں، ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اس طرح اسلام نے سیاسی ادارہ کو اعتقادیات سے جدا کر دیا۔ اب حکومت کرنے کا حق کسی کو عوامی رائے سے ملتا تھا نہ کہ خدا سے کسی قسم کے پُر اسرار رشتہ کی بنیاد پر۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے قدیم زمانہ میں کچھ لوگ یہ بات مشہور کر کے اپنا طبی کاروبار چلاتے تھے کہ انہوں نے ایک جن کو مسخر کر رکھا ہے اور وہ ان کے پاس آکر ان کو فن طب کے رموز بتاتا ہے۔ ایسے ماحول میں اگر کوئی شخص یہ آواز بلند کرے کہ علم طب میڈیکل کالج میں سکھایا جاتا ہے نہ کہ جنات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے تو مذکورہ قسم کے طبیب ایسے شخص کے سخت مخالف ہو جائیں گے۔ مگر موجودہ زمانہ کے ایم بی بی ایس ڈاکٹر کو ایسی تحریک سے کوئی عداوت نہ ہوگی۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب کے ذریعہ تاریخ کا رخ موڑنے کا عمل ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا۔ اب وہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ دین کے داعیوں کے لئے اب خود انسانی اسلحہ خانہ میں ہر قسم کے تائیدی اسباب موجود ہیں۔ جدید قانونی اور سماجی تبدیلیوں نے اب اس کا موقع دے دیا ہے کہ دعوت دین کا کام کھلے طور پر کیا جائے اور کوئی فرعون یا نمرود اس کا راستہ روکنے کیلئے میدان میں موجود نہ ہو، حقائق کی دنیا جواب انسان کے علم میں آئی ہے اس نے ایسے دلائل جمع کر دئے ہیں جو دین کی صداقت کو خالص علمی طور پر ثابت شدہ بنا سکیں۔

موجودہ زمانہ میں ایک عظیم فکری انقلاب آیا ہے۔ یہ انقلاب وہی ہے جس کو عام طور پر سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔ جدید سائنسی انقلاب نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ایسی فکری تبدیلیاں پیدا کی ہیں جو دعوت توحید کے عین موافق ہیں۔ ان کو مناسب طور پر استعمال کیا جائے تو صرف قلمی اور لسانی تبلیغ کے ذریعہ غلبۂ توحید کا وہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے جس کے لئے پچھلے زمانوں میں تلوار اٹھانی پڑتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنسی انقلاب زمانۂ رسالت کے اسلامی انقلاب کا ایک ضمنی حاصل (By-product) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر آخر الزماں کے لائے ہوئے انقلاب کے ذریعہ ایسے اسباب پیدا کئے جنہوں نے تاریخ کے اندر اپنا عمل شروع کیا۔ تبدیلی کا یہ عمل مسلسل جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ اس انقلاب تک پہنچا جس کو جدید سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔ گویا خدا نے صدر اول میں شرک کے اوپر توحید کو غلبہ دیا تو اسی کے اندر وہ اسباب بھی پیدا کر دئے جو بعد کے زمانہ میں الحاد پر توحید کو غالب کرنے میں مددگار بن سکیں۔

اسلام کے ذریعہ آنے والے توحیدی انقلاب سے پہلے ساری دنیا میں شرک کا غلبہ تھا۔ شرک دراصل مفادات و مظاہر پرستی کا دوسرا نام ہے۔ دنیا کی ہر چیز جو نمایاں اور اغراض کا محور نظر آئی اسی کو انسان نے اپنے غرض کا خدا بنا کر پوجنا شروع کر دیا، خواہ وہ آسمان کا سورج ہو یا زمین کا بادشاہ۔ اس کی وجہ سے دور شرک میں سائنسی تحقیق کا کام ممکن نہ ہو سکا۔ آرنلڈ ٹوائن بی کے الفاظ میں، فطرت کے مظاہر اس وقت پر ستش کا موضوع (Object of Worship) بنے ہوئے تھے، پھر وہ تحقیق کا موضوع (Object of Investigation) کیسے بنتے۔ اسلام نے شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب کیا تو ایک خدا کے سوا ہر چیز مخلوق نظر آنے لگی، اس انقلاب نے یہ ممکن بنادیا کہ چیزوں پر تحقیق کا عمل جاری کیا جاسکے۔ یہ عمل ابتدائی صورت میں دور اول ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ ایک بار چاند گرہن کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ وہ کسی بڑے آدمی کی پیدائش یا موت کی بنا پر نہیں ہوتے۔ اس طرح آپ نے مادی بڑائی کی بھی نفی کر دی اور انسانی بڑائی کی بھی۔ یہ فکری لہر عقیدہ سے الگ ہو کر یورپ پہنچی اور بالآخر جدید انقلاب کا سبب بنی۔

۱۔ اس انقلاب کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ توہماتی دور کا خاتمہ ہو گیا۔ توہم پرستی کیا ہے؟ توہم پرستی نام ہے حقائق کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کے بجائے مفروضات و قیاسات کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کا۔ (مثلاً یہ فرض کر لینا کہ جب کسی بڑے آدمی کی موت ہوتی ہے تو سورج یا چاند گہنا جاتے ہیں) یہ ذہن اسلام کی طرف بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ایسا آدمی حقائق واقعی کی بنیاد پر اسلام اور غیر اسلام کا جائزہ نہیں لیتا بلکہ پیشگی مفروضات کی بنیاد پر بلا دلیل ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط مان لیتا ہے۔ مثلاً اسلام تاریخی طور پر ایک مستند دین ہے اور دیگر تمام مذاہب اپنی اوریجن کی تاریخی استناد سے محروم ہیں۔ مگر توہمات کے دور میں انسان اس کو اہمیت نہیں دے پاتا تھا۔ جدید دور نے اس کو پوری اہمیت کے ساتھ لیا۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں تنقید عالیہ (Higher Criticism) کے نام سے ایک مستقل فن وجود میں آگیا ہے۔ اس فن کے تحت یہ حقیقت پوری طرح مسلّم ہو گئی ہے کہ تاریخی طور پر معتبر دین صرف اسلام ہے۔ دوسرے ادیان کو تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل نہیں۔

۲۔ سائنسی ذہن نے کائنات کو تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں جاننے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجہ میں کائنات میں چھپے ہوئے ایسے فطری حقائق انسان کے علم میں آئے جو اسلام کی تعلیمات کی تصدیق اعلیٰ سطح پر کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر انسان کی تحقیق نے بتایا کہ کائنات میں ہر جگہ ایک ہی قانون فطرت کارفرما ہے۔ جو قانون زمین کے احوال پر حکمراں ہے وہی قانون کائنات کے دور دراز مقامات پر بھی حکمران ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کا خدا صرف ایک ہے۔ دو

خدا یا بہت سے خداؤں کی اس کائنات میں گنجائش نہیں۔

۳۔ دین توحید کو قدیم زمانہ میں اختیار کرنے کے لئے، ایک علمی رکاوٹ، قدیم فلسفہ بھی تھا۔ قدیم زمانہ میں فلسفہ کو غالب علم کا مقام حاصل تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ کے سوچنے کی ذہنی زمین اس زمانہ میں فلسفہ ہوتا تھا۔ اس کے نتیجہ میں دین توحید کی راہ میں ایک بہت بڑی مصنوعی رکاوٹ حائل ہو گئی تھی۔

قدیم فلسفہ کا آخری نشانہ ہمیشہ سے آخر سچائی کی تلاش رہا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ تقریباً پانچ ہزار سال کی شان دار تاریخ کے باوجود فلسفہ اپنے نشانہ تک پہنچنے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فلسفہ انسان کی محدودیتوں (Limitations) کا ادراک نہ کر سکا۔ وہ آخری سچائی تک پہنچنے کے لئے ساری کوششیں صرف کرتا رہا۔ جب کہ انسان اپنی محدود صلاحیتوں کی وجہ سے بطور خود آخری سچائی تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔

اس فلسفیانہ طرز فکر کی وجہ سے ہزاروں برس تک انسان یہ چاہتا رہا کہ دین توحید کی بنیاد جن اساسی عقائد پر قائم ہے اس کو انسان کے لئے مکمل طور پر معلوم اور مشاہد بنا دیا جائے۔ مگر یہ تمام غیبی حقیقتیں تھیں اور انسان اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ آپ ہی آپ ان غیبی حقیقتوں کا کامل ادراک نہیں کر سکتا۔

جدید سائنس کا، دینی نقطۂ نظر سے، سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس مفروضہ کو ڈھا دیا۔ اس نے آخری طور پر یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ وہ اپنی محدودیت کی وجہ سے حقیقت کا کلی ادراک نہیں کر سکتا۔ قدیم فلسفہ کی پیدا کردہ ذہنی زمین اب ساری دنیا میں دفاعی حیثیت کے مقام پر جا چکی ہے اور اب سائنس کی دریافت کردہ ذہنی زمین کو علمی دنیا میں غالب مقام حاصل ہے۔

ذہن کی اس تبدیلی نے دین توحید کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ اب اس نقطۂ نظر کو، کم از کو بالواسطہ طور پر، مکمل علمی تائید حاصل ہے کہ انسان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ حقیقت اعلیٰ کو پانے کے لئے وہ پیغمبر کی اطلاع کا اعتبار کرے۔ اب یہ مطالبہ سراسر غیر علمی مطالبہ بن چکا ہے کہ خدا اور وحی اور آخرت کو ہماری آنکھوں سے ہمیں دکھاؤ، اس کے بعد ہی ہم اس پر ایمان لائیں گے۔

معلوم تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ خود علم انسانی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کا علم محدود ہے اور ہمیشہ محدود رہے گا۔ انسان سائنسی ذرائع سے جب کائنات کی کھوج کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کائنات اس سے زیادہ پیچیدہ ہے کہ انسان کا محدود ذہن اس کا احاطہ کر سکے۔ سائنس کی یہ دریافت اسلامی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے۔ کیونکہ اس سے رسالت کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ ایک طرف انسان کا یہ حال ہے کہ وہ حقیقت کو آخری حد تک جان لینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف انسان اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ایسی محدودیت کا شکار ہے کہ وہ کبھی بھی حقیقت کو آخری حد تک نہیں جان سکتا۔ انسانی زندگی کا یہ خلا واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ اس کو ایک برتر رہنما کی ضرورت ہے۔ اسی برتر رہنما کا

دوسرا نام پیغمبر ہے۔ انسانی محدودیت کے بارے میں سائنس کے اقرار نے پیغمبر کی ضرورت کو خالص علمی سطح پر ثابت کر دیا ہے۔

۴۔ قدیم زمانہ میں انسان کو اظہار رائے کی آزادی حاصل نہ تھی۔ اس کی اصل وجہ بادشاہوں اور بڑے انسانوں کے تقدس کا عقیدہ تھا۔ جو لوگ کسی وجہ سے اونچے مقام پر پہنچ جاتے ان کو مقدس سمجھ لیا جاتا ان کی رائے دوسروں سے برتر مانی جاتی۔ ان کو یہ حق مل جاتا کہ جس طرح چاہیں دوسروں کو اپنی مرضی کا پابند بنائیں۔ توحید کے انقلاب نے ہر سطح پر انسانی غلامی اور بڑائی کا خاتمہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر فضیلت نہیں۔ اس کے بعد تاریخ میں ایک نئی فکری لہر چل پڑی۔ یہی وہ فکری لہر ہے جس کی سیاسی تکمیل بالآخر یورپ میں جمہوریت کی صورت میں ہوئی۔ جمہوری انقلاب نے تمام انسانوں کو برابر ٹھہرادیا۔ ہر شخص کے لئے یہ فکری حق تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق جو چاہے لکھے اور جو چاہے بولے۔ اس انقلاب نے تاریخ میں پہلی بار اس بات کو ممکن بنادیا کہ خدا کے دین کی تبلیغ اس طرح کی جائے کہ تبلیغ کرنے والے کے لئے کسی طرح کی پکڑ دھکڑ کا اندیشہ نہ ہو۔

۵۔ سائنس نے آج کے انسان کے لئے خدا کی بہت سی وہ مادی نعمتیں کھولی ہیں جو ہزاروں برس سے کائنات کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ ان میں اسلامی دعوت کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم جدید ذرائع مواصلات ہیں۔ پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن مانیٹ اور اسی طرح مختلف قسم کی تیز رفتار سواریاں ۔ یہ چیزیں اسلام کے حق میں عظیم نعمتیں ہیں۔ ان کو استعمال کر کے اسلامی دعوت کو عالمی سطح پر پھیلایا جا سکتا ہے۔

یہ مواقع جو عین اسلامی دعوت کے حق میں ہیں، پچھلے ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔ پچھلے زمانہ میں جس طرح اللہ تعالیٰ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ اسلام کے غلبۂ اول کے حالات فراہم کئے، اسی طرح اس نے دوبارہ ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں اسلام کے غلبہ ثانی کے حالات فراہم کر دئے ہیں۔ تاہم یہ حالات و مواقع خود اپنے زور پر واقعہ نہیں بن جائیں گے۔ اس امکان کو واقعہ بنانے کے لئے زندہ انسانوں کی ایک جماعت درکار ہے۔ ایسی ایک جماعت اگر کھڑی ہو جائے تو قریبی مستقبل میں اسی طرح دوبارہ اسلام کو فکری غلبہ مل سکتا ہے جس طرح قرن اول میں اس کو شرک کے مقابلہ میں فکری غلبہ حاصل ہوا تھا۔ (مولانا وحید الدین خان)

اس غلبہ کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ قرآن کے ان پہلے مخاطبین کے سامنے روایات کا مسخ شدہ دین نہیں تھا بلکہ قرآن کی ہدایت ان کا اصل الاصول تھی۔ انہوں نے توحید کے عظیم تصور کو صرف غیر اللہ کے سامنے ماتھا نہ ٹیکنے کا پیغام نہیں جانا بلکہ توحید کے تصور عظیم سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا

عبدیت اور غلامی کے تمام تصورات کو خاتمہ یقینی بنایا۔ اور ہر سطح پر انسانی آزادیوں کی داغ بیل ڈال دی۔

اس طرح توحید میں اللہ تعالیٰ کی عبدیت کے ساتھ اس کی ربوبیت اور اس کی حاکمیت کے تصورات پر قرآنی ہدایات کے عین مطابق عمل پیرا ہوئے۔ اس طرح انسانی کو معاشرت و اقتصاد کی بے مثال فیض رسانی ہوئی انہوں نے دنیا کو باطل قرار دیکر آخرت کی تیاری کا سامان نہیں بنایا بلکہ قرآن کی ہدایت کے مطابق حسنۃ فی الدنیا۔ دنیا کی حسنا کیوں سے حسنۃ فی الآخرت کا سامان تیار کیا۔ انہوں نے استخلاف فی الارض یعنی زمین پر خدائی خلافت کا ایسا مثالی نمونہ قائم کیا کہ انسانی فلاح و کامرانیوں کے میدان میں آئندہ کی انسانیت کیلئے شاندار روایتیں قائم ہو گئیں۔

اب بھی قرآن حکیم کے بتائے ہوئے توحید کے انہی تصورات سے جن کو پیغمبر اسلام ﷺ اور اس کی جماعت نے اختیار کر کے بڑی عالمی تبدیلیوں کی بنیاد ڈالی، اس مضطرب و مسائل میں گھری ہوئی دنیا کو امن و آشتی کا گہوارہ بنایا جا سکتا ہے۔ (مرتب)